فی سبیل اللہ فساد

یہودیوں، عیسائیوں اور مسلمانوں کی مذہبی شدت پسندی
کا تاریخی جائزہ



کیرن آرم سٹرانگ

ترجمہ: یونس منصور

مشعل

فی سبیل اللہ فساد

کیرن آرمسٹرانگ

مشعل بکس
آر بی۔۵، سیکنڈ فلور، عوامی کمپلیکس، عثمان بلاک، نیو گارڈن ٹاؤن
لاہور۔54600، پاکستان

فی سبیل اللہ فساد

کیرن آرمسٹرانگ
اردو ترجمہ: یونس منصور

ناشر: مشعل بکس
آر۔ بی۔۵، سیکنڈ فلور،
عوامی کمپلیکس، عثمان بلاک، نیو گارڈن ٹاؤن، لاہور۔54600، پاکستان
فون و فیکس 042-35866859

پہلا حصہ

پرانی دنیا اور نئی دنیا

دوسرا حصہ

بنیاد پرستی

تعارف

بیسویں صدی کے آخر دور میں جو حیرت انگیز رجحانات سامنے آئے ہیں، ان میں سے ایک نہایت اہم رجحان، ہر مذہبی روایت میں پارسائی کا جارحانہ تصور ہے۔ جسے عام طور پر بنیاد پرستی کہتے ہیں اس کے مظاہر بعض اوقات بڑے دل خراش ہوتے ہیں۔ مسجدوں میں جا کر نمازیوں کو گولیاں مارنا لیڈروں اور حکمرانوں کو قتل کرنا اسقاط کے ہسپتالوں میں جا کر ڈیوٹی پر موجود نرسوں اور ڈاکٹروں کو قتل کرنا، یہاں تک کہ حکومت کا تختہ الٹ دینا بنیاد پرستوں کے لئے معمول کی بات ہے۔ مٹھی بھر بنیاد پرست ہیں جو ان بھیانک جرائم میں ملوث ہیں۔ حیرت تو یہ کہ بنیاد پرستوں میں جو لوگ امن پسند ہیں اور قانون کا احترام کرتے ہیں، وہ بھی جدید معاشرے کی بے شمار مثبت قدروں کے سخت مخالف ہیں۔ بنیاد پرستوں کی نظر میں جمہوریت، رواداری، امن و آشتی، آزادی اظہار اور مذہب و سیاست کے باہمی تضادات کی کوئی اہمیت نہیں۔ عیسائی بنیاد پرست زندگی کے آغاز کے متعلق فزکس و سیاست کے باہمی تضادات کی کوئی اہمیت نہیں۔ عیسائی بنیاد پرست زندگی کے آغاز کے متعلق فزکس اور بیالوجی کے انکشافات رد کرتے ہیں۔ انہیں اصرار ہے کہ اس سلسلہ میں انجیل نے جو بات بتائی ہے وہ سائنسی نقطۂ نظر سے مستند ہے۔ ایسے وقت جب لوگ ماضی کی زنجیریں توڑ کر ان سے آزاد ہو رہے ہیں۔ یہودی بنیاد پرست اپنی قدیم رسموں اور قوانین پر زیادہ شدت سے عمل پیرا ہیں۔ مسلمان عورتیں، مغربی عورتوں کی آزادی کی مذمت کرتے ہوئے اپنے

آپ کو برقعوں اور چادروں میں لپیٹ رہی ہیں۔ مسلمان اور یہودی بنیاد پرست عرب اسرائیل بحران کی توجیہہ مذہبی حوالوں سے کرتے ہیں حالانکہ شروع ہی سے اس کی نوعیت سیکولر تھی۔ خیال رکھنا چاہئے کہ بنیاد پرستی ایک خدا کے ماننے والوں تک محدود نہیں بلکہ اس کے ڈانڈے بدھ، ہندو اور کنفیوشس بنیاد پرستی سے ملے ہوئے ہیں جس کی وجہ سے وہ اپنے لبرل کلچر کے ذریعے بڑی دل سوزی کے ساتھ حاصل ہونے والی بصیرت سے بھی ہاتھ دھو بیٹھے ہیں۔ مذہب کے نام پر لڑنا جھگڑنا اور قتل کرنا بنیاد پرستوں کا شیوہ بن گیا ہے۔ صرف یہی نہیں بلکہ وہ مذہب کا تقدس اور حرمت خاک میں ملانے کے لئے اسے قومی اور سیاسی خارزار میں لے جانے سے بھی دریغ نہیں کرتے جو مذہب کی شان کے سراسر خلاف ہے۔

مذہب کا ایک بار پھر ابھرنا بہت سے لوگوں کو حیران کر گیا ہے کیونکہ بیسویں صدی کے وسط میں تو یہ سمجھ لیا گیا تھا کہ سیکولرازم ایک ناقابل شکست طاقت ہے اور یہ کہ مذہب اب کبھی بھی دنیاوی معاملات میں کوئی نمایاں کردار ادا نہیں کر سکے گا۔ یہ سمجھ لیا گیا تھا کہ چونکہ انسان پہلے سے زیادہ ریشنل اور سمجھدار ہو گیا ہے اس لئے اب وہ مذہب کا محتاج نہیں رہا۔ اگر اس کی ضرورت کبھی اس نے محسوس کی تو بھی مذہب اس کا پرائیویٹ معاملہ ہوگا اور ذاتی مسائل تک محدود رہے گا۔ 1970 کی دہائی کے آخری مرحلہ میں بنیاد پرستوں نے سیکولرازم کے خلاف بغاوت کی اور مذہب کو گوشۂ گمنامی سے نکال کر اسے مرکزی مقام پر کھڑا کر دیا۔ اپنی اس کوشش میں انہیں نمایاں کامیابی حاصل ہوئی۔ مذہب ایک بار پھر ایک ایسی طاقت بن گیا ہے جسے کوئی حکومت نظرانداز نہیں کر سکتی۔ بنیاد پرستی کو شکستیں تو ہوئی ہیں مگر مذہب کا اثر زائل نہیں ہوا۔ اب وہ نئے دور کا ناگزیر حصہ ہے اور مستقبل میں قومی اور بین الاقوامی ادارے پوری توجہ سے سمجھنے کی کوشش کریں گے کہ یہ مذہبیت کیا اور اس کے تقاضے کیا ہیں۔ ہمارے کلچر کے بارے میں اس کا رویہ کیا ہے اور ہم اس کا سامنا مؤثر طریقے پر کیسے کر سکتے ہیں اور اس سے پیشتر کہ ہم آگے بڑھیں ہمیں طے کر لینا چاہئے کہ بنیاد پرستی سے کیا مراد ہے؟

سب سے پہلے امریکی پروٹیسٹنٹ فرقہ نے اس ترکیب سے کام لیا۔ بیسویں صدی کی ابتدائی دہائیوں میں ان میں سے بعض لوگ اپنے آپ کو بنیاد پرست کہلانے لگے تاکہ لبرل پروٹیسٹنٹ طبقہ سے ان کی شناخت الگ ہو سکے جو ان کے خیال مین عیسائی مذہب کو بگاڑ رہے

تھے۔ بنیاد پرست اپنی مذہبی روایات کے ان بنیادی اصولوں کی طرف لوٹنا اور انہی پر زور دینا چاہتے تھے جو انجیل کی حرف بہ حرف توجیہہ اور اس کی روح سے ہم آہنگ ہوں۔ اس وقت سے دنیا کے تمام مذاہب کی ہر اصلاحی تحریک بنیاد پرستی کہلائی۔ مگر یہ صحیح نہیں اس سے تو یہ ظاہر ہوتا ہے کہ بنیاد پرستی کی تمام تحریکیں ایک سی ہیں مگر یہ بات نہیں۔ بنیاد پرستی خود اپنی ذات میں ایک الگ قانون اور ایک الگ عقیدہ ہے۔ ہر بنیاد پرست تحریک کی کچھ اپنی خصوصیات اور اپنے محرکات ہیں۔ اس ترکیب سے یہ تاثر بھی ملتا ہے کہ بنیاد پرست بہرحال قدامت پسند اور ماضی پرست ہوتے ہیں جبکہ حقیقت یہ ہے کہ وہ اپنے خیالات کے لحاظ سے ماڈرن اور جدت پسند ہوتے ہیں۔ امریکی پروٹیسٹنٹ بے شک یہ چاہتے ہوں گے کہ وہ اپنے مذہب کے بنیادی اصولوں کی طرف لوٹ جائیں مگر انہوں نے یہ کام بڑے نئے انداز سے کیا ہے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اس مسیحی اصطلاح کا اطلاق صحیح معنوں میں ان تحریکوں پر نہیں ہوتا جن کی ترجیحات مختلف ہیں۔ مثال کے طور پر مسلمان اور یہودی بنیاد پرستوں کو ڈاکٹرین (مذہبی عقائد) سے کچھ ایسا سروکار نہیں ہوتا، ڈاکٹرین بنیادی طور پر عیسائی بنیاد پرستوں کا مسئلہ ہے۔ بنیاد پرستی کا عربی ترجمہ اصولیہ ہے۔ ایک ایسا لفظ جس سے مراد اسلامی قوانین کے مختلف قواعد اور اصولوں کے ذرائع کا مطالعہ ہے۔ بے شمار اکٹیوسٹ (سرگرم عمل کارکن) مغرب میں بنیاد پرست کہلاتے ہیں۔ حالانکہ انہیں بنیاد پرست کہنا ہی سرے سے غلط ہے۔ بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ کوئی چاہے یا نہ چاہے لفظ بنیاد پرستی باقی رہے گا۔ مجھے اتفاق ہے اس کا استعمال بے شک صحیح نہ ہو مگر ان تحریکوں کے لئے یہ ایک مشترکہ لیبل تو ہے جو اپنے اختلافات کے باوجود ایک مضبوط خاندان کی طرح ہیں۔

مارٹن، ای مارٹی اور آر سکاٹ اپیل نائی نے ''فنڈامینٹل پروجیکٹ'' میں کہا ہے کہ ''بنیاد پرست ایک مخصوص پیٹرن پر چلتے ہیں۔ بنیاد پرستی دراصل برسر پیکار روحانیت ہے۔ جو متوقع بحران کے توڑ کے لئے ابھری ہے۔ بنیاد پرست ایسے دشمنوں کے خلاف صف آرا ہیں جن کی سیکولر پالیسیاں مذہب کے خلاف ہیں۔ ان کے لئے یہ جنگ عام رسمی جنگ نہیں بلکہ نیکی اور بدی کی طاقتوں کے درمیان ایک ایسی جنگ ہے جس کا میدان کارزار پوری کائنات ہے۔ انہیں اپنے مٹ جانے کا ڈر ہے۔ اس لئے وہ بعض مخصوص اور منتخب مذہبی تصورات، ماضی کی رسموں اور عبادات کے پیچھے پناہ لیتے ہیں تاکہ ان کی محصور شخصیتیں قلعہ بند ہو کر محفوظ ہو جائیں۔

اپنی پارسائی میں ملاوٹ سے بچنے کے لئے وہ زندگی کے بڑے دھارے سے کٹ کر رہتے ہیں اور اس طرح کلچر دشمن رجحانات پیدا کرتے ہیں۔ بنیاد پرست بے عمل نہیں ہوتے نہ انہیں خوابوں میں کھوئے رہنے کی عادت ہوتی ہے۔ انہوں نے نئے دور کی عملی دانش اپنے اندر جذب کی ہے۔ اپنے کرشماتی لیڈر کی قیادت میں وہ بنیادی اصولوں کو سنوارنے اور نکھارنے کی کوشش کرتے ہیں تاکہ لوگوں کو ایسی آئیڈیالوجی دے سکیں جو ان کے لئے صرف نظریہ نہیں بلکہ لائحہ عمل بھی ہو۔ وہ جوابی لڑائی لڑتے ہیں اور کوشش کرتے ہیں کو لمحہ بہ لمحہ بے یقینی کی طرف بڑھتی ہوئی دنیا کو یقین دے سکیں۔ ماڈرن کلچر پر اس عالمی رجحان کے اثرات کا جائزہ لینے کے لئے ضروری ہے کہ بنیاد پرستی کی چند تحریکوں کو فوکس میں لیا جائے۔ وہ تحریکیں جو یہودیت، عیسائیت اور اسلام میں نمودار ہوئی ہیں۔ یہ تینوں مذاہب ایک دوسرے سے الگ کر کے دیکھنے کی بجائے میری خواہش ہے کہ تینوں کو مجموعی طور پر سامنے رکھتے ہوئے تاریخی ترتیب اور پس منظر کے ساتھ انہین سمجھنے کی کوشش کروں تاکہ ان کی باہمی مشابہت کا صحیح اندازہ ہو سکے۔ اس ضمن میں جن تحریکوں کا انتخاب کیا گیا ہے۔ اُمید ہے کہ ان کا گہرا مطالعہ کیا جا سکے گا۔ امریکی پروٹیسٹنٹ بنیاد پرستی، اسرائیل میں یہودی بنیاد پرستی اور مصر میں مسلم بنیاد پرستی، ہمارے موضوع ہیں۔ مصر سنی ملک ہے اور ایران شیعہ ہے۔ مجھے یہ دعویٰ نہیں کہ میرے انکشافات کا اطلاق بنیاد پرستی کی باقی تحریکوں پر بھی ہو سکے گا، جو کسی نہ کسی صورت میں ان سے مختلف ہیں مگر اُمید ہے کہ یہ مخصوص تحریکیں جو انتہائی بااثر ہیں اور امتیازی حیثیت میں ہیں۔ ان سب کے خوف، بے چینی اور اُمنگیں ایک جیسی ہیں۔ جو نئے سیکولر دنیا کے بعض مسائل اور مشکلات کا ردِ عمل ہیں اور یہ کوئی خلاف معمول بات نہیں۔ ہر دور میں ایسے لوگ موجود رہے ہیں جنہوں نے اپنے زمانے کے نئے رجحانات کی سخت مخالفت کی ہے مگر بنیاد پرستی کی بات اور ہے۔ یہ تحریک بیسویں صدی کی پیداوار ہے اور مغرب کے سیکولر اور سائنسی کلچر کے خلاف ایک صدائے احتجاج ہے۔ یہ کلچر پہلے تو صرف مغرب میں پھیلا تھا مگر رفتہ رفتہ دنیا کے دوسرے حصوں میں بھی جڑ پکڑ گیا۔ مغرب میں ایک ایسی تہذیب نے جنم لیا ہے جس کی پہلے کوئی مثال نہیں مگر مذہب نے بھی ایسا جواب دیا ہے کہ اس جواب کی یکتائی میں کلام نہیں۔ بنیاد پرستی کی تحریکیں ہمارے دور میں پھیلی ہیں۔ ان کا تعلق جدیدیت سے کچھ ایسا ہے کہ وہ مغرب کی سائنسی دانش کا انکار بے شک کرتی رہیں مگر اس سے بچ کر نہیں

جاسکتیں۔مغربی تہذیب نے دنیا بدل دی ہے۔،اب مذہب پہلے جیسا کبھی نہیں ہوگا نہ کوئی اور چیز پہلے جیسی ہوسکتی ہے۔ساری دنیا میں لوگ اس نئی سچوئیشن کے ساتھ دست و گریباں ہیں اور مجبور ہوگئے ہیں کہ اپنی مذہبی روایات کا نئے سرے سے جائزہ لیں کیونکہ وہ ایک بالکل مختلف سوسائٹی کے لئے تھیں۔700 سے 260 قبل مسیح تک زمانہ قدیم میں ایک ایسا ہی عبوری دور آیا تھا۔مؤرخ اسے ایکسئیل دور یعنی تشکیلی دور کہتے ہیں کیونکہ انسان کی روحانی ترقی میں اس نے مرکزی کردار ادا کیا تھا۔وہ دور بذات خود ہزاروں سال کی معاشی اور نتیجتاً سماجی اور کلچری ترقی کی پیداوار تھا۔اس کا آغاز سمیر (جسے اب عراق کہتے ہیں) اور قدیم مصر سے ہوا تھا۔جب لوگ اپنی فوری ضرورتیں پوری کرنے کے لئے فصلیں اُگانے کے علاوہ فالتو زرعی پیداوار حاصل کرنے میں کامیاب ہوگئے تھے فالتو زرعی پیداواران کے لئے اضافی آمدنی کا ذریعہ بنی اس طرح وہ اس کے اہل ہوئے کہ پہلی نئی تہذیبوں کی داغ بیل ڈال سکیں،فنون کو ترقی دیں اور مضبوط و مستحکم طرز حکومت کا آغاز کریں۔جس کے مظاہر کے طور پر شہر،سٹی اسٹیٹ اور بالآخر سلطنتیں قائم ہوئیں۔زرعی معاشرہ میں طاقت کا مرکز صرف بادشاہ یا پادری نہیں ہوتے بلکہ منڈیاں بھی ہوتی ہیں جو ہر کلچر کی تشکیل کا ذریعہ بنتی ہیں۔ان بدلے ہوئے حالات میں آخر کار لوگوں نے محسوس کرنا شروع کر دیا کہ وہ پرانا الحاد جس سے ان کے آباؤاجداد نے خوب فائدہ اٹھایا تھا شاید اب وہ مشکل سے ہی ان کے کام آئے۔ایکسئیل دور کے شہروں اور سلطنتوں میں لوگوں کے اندازفکر اور تناظر میں وسعت آرہی تھی۔جس کی وجہ سے پرانے مسلک اور عقائد تنگ نظری اور تعصب پر محمول نظر آنے لگے۔خدا کی ذات کو مختلف اور کئی صورتوں میں تقسیم کرنے کی بجائے لوگ اسے وحدت اور برگزیدگی کی اعلیٰ وارفع صورت میں ماننے اور اس کی عبادت کرنے لگے۔ان دنوں زندگی لوگوں پر آسان تھی اور انہیں فرصت بھی بہت تھی۔اس لئے انہوں نے اپنی داخلی زندگی بھرپور طریقہ سے منظّم کی۔جس سے یہ ہوا کہ ان میں ایک ایسی روحانیت کے لئے تڑپ پیدا ہوگئی۔جس کا تمام تر انحصار خارجی ذرائع پر نہ ہو۔جو لوگ حساس تھے انہیں غریب کسانوں کا خیال ستانے لگا جن کی محنت اور مشقت پر زرعی معاشرہ قائم تھا مگر وہ خود اس معاشرہ کی ناانصافیوں اور ظلم کی چکی میں پس رہے تھے۔اس لئے اونچے کلچر کی آسائشوں اور سہولتوں میں ان کا کوئی حصہ ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ایسی صورت میں پیغمبر اور ریفارمر ظاہر ہونے لگے جنہوں نے اس بات پر اصرار کیا کہ ہر روحانیت

کی بنیاد انسان دوستی ہے اور یہ کہ ہر انسان میں حرمت اور پاکیزگی دیکھنے کی صلاحیت ہے اور کمزور انسانوں کی عملی مدد سے پارسائی کا درجہ حاصل ہوتا ہے۔ اس طرح ایکسئیل دور میں وہ مذہب دنیا میں ظہور پذیر ہونے لگے جنھوں نے ہمیشہ انسان کی خدمت اور ہدایت کا کام جاری رکھا جیسے ہندوستان میں بدھ ازم اور ہندوازم، مشترق بعید میں کنفیوشس ازم اور تاؤازم، مشرق وسطیٰ میں توحید اور یورپ میں ریشنل ازم (عقلیت)

اپنے نمایاں اختلافات کے باوجود ایکسئیل دور کے ان بڑے مذاہب میں بہت سی باتیں مشترک تھیں ان سب کی بنیاد اس قدیم روایت پر تھی جس کا محور اعلیٰ وارفع واحدانیت تھی۔ انہوں نے باطنی روحانیت اور خلق کی خدمت پر زبردست زور دیا تھا۔ آج پھر ہم کسی ایسی ہی صورتحال سے دوچار، ایک ایسے ہی عبوری دور سے گزر رہے ہیں جس کی جڑیں سولھویں اور سترھویں صدی کے جدید دور میں ہیں جب مغربی یورپ میں ایک مختلف معاشرہ ابھرنے لگا تھا جس کی بنیاد زائد زرعی پیداوار کی ایک ایسی ٹیکنالوجی پر تھی جس نے لوگوں کو اس قابل کر دیا تھا کہ وہ اپنے ذرائع پیداوار لامحدود بنادیں۔ پچھلے چار سو سال کی اقتصادی تبدیلیوں کے ساتھ ساتھ زبردست سماجی، سیاسی اور فکری انقلاب بھی آتے رہے اور سچائی کے تصور کے بارے میں ایک بالکل مختلف قسم کی سائنسی اور ریشنل اپروچ بھی آگے بڑھتی رہی۔ اس طرح ایک بار پھر ایک بہت بڑی مذہبی تبدیلی ضروری ہوگئی۔ ساری دنیا کے لوگ محسوس کر رہے تھے کہ حالات مین ڈرامائی تبدیلیوں کے بعد ان کے مذاہب اپنی پرانی شکل میں ان کی کوئی مدد نہیں کر سکتے وہ آج کے انسان کو حوصلہ دے سکتے ہیں نہ اسے راستہ دکھا سکتے ہیں اس لئے مرد اور عورتیں ایکسئیل دور کے مصلحین اور پیغمبروں کی طرح اپنے مذہب کے لئے نئے راستے تلاش کر رہے ہیں۔ وہ ماضی کی بصیرتوں کے سہارے ایسا راستہ بنا رہے ہیں جس پر چل کر انسان اس نئی دنیا میں آگے بڑھ سکیں جو انہوں نے اپنے لئے تخلیق کی ہے۔ ان تجربات میں سے ایک تجربہ جو بظاہر چاہے کتنا ہی متضاد ہو بنیاد پرستی ہے۔

ہم سمجھتے ہیں کہ ماضی میں بھی لوگ کم وبیش ہم جیسے ہی ہوتے ہوں گے مگر دراصل ان کی روحانی زندگی ہم سے مختلف تھی۔ انہوں نے سوچنے، بولنے اور علم حاصل کرنے کے دو طریقے وضع کئے تھے جنہیں سکالر مائتھوس اور لوگوس کہتے ہیں۔ دونوں ہی انتہائی ضروری تھے کیونکہ خیال کیا جاتا تھا کہ سچ کی تلاش میں ایک دوسرے کے معاون ہیں مگر دونوں اپنی انفرادی حیثیت میں

بھرپور تاثر کے مالک تھے۔ متھ ابتدا تھی مگر اسے دائمی اور وقت کی قید سے آزاد سمجھا جاتا تھا۔ متھ کا تعلق زندگی کے آغاز، کلچر کی جڑوں اور انسانی ذہن کی گہرائیوں سے ہے۔ عملی معاملات کی بجائے اس کی تمام تر توجہ زندگی کی معنویت اور گہرائی پر ہوتی ہے۔ جب تک ہمیں اپنی زندگی میں کوئی معنی نہ ملیں ہم فانی انسان بڑی آسانی سے دل برداشتہ ہوجاتے ہیں۔ معاشرے کی مائتھوس لوگوں کو جینے کا شعور دیتی ہیں۔ ایسی آگاہی دیتی ہے جس سے انہین اپنے ہونے میں، اپنی روزمرہ زندگی میں معنی نظر آتے ہیں۔ وہ ان کی توجہ زندگی کے دائمی اور کائناتی پہلوؤں کی طرف موڑ دیتی ہے جبکہ اس کی جڑیں جسے ہم لاشعور کہتے ہیں اس میں بھی موجود ہوتی ہیں۔ کئی دیومالائی کہانیاں اس لئے نہیں کہ انہیں لفظی معنوں میں لیا جائے، نفسیات کی ایک قدیم شکل ہیں۔ جب لوگ عفریتوں کے ساتھ بہادروں کی لرائیوں کے قصے سنایا کرتے تھے تو ایسا کرتے ہوئے دراصل وہ تحت الشعور کے وہ مخفی گوشے اور پہلو سامنے لاتے تھے جو ریشنلزم (عقلیت) کی پہنچ سے باہر ہیں۔ مگر جو ہمارے تجربہ اور زاویہ پر بہت گہرا اثر کرتے ہیں۔ اپنی ماڈرن سوسائٹی میں متھ کے قحط کی وجہ سے ہمیں نفسیاتی تجزیئے کی بنیاد رکھنی پڑی تا کہ اپنی باطنی دنیا سے عہدہ برآ ہونے میں مدد مل سکے۔ متھ کو ثابت کرنا ریشنلزم کے بس کی بات نہیں نہ اس کے ذریعہ متھ کی توجیہہ ہوسکتی ہے۔ آرٹ، موسیقی، شاعری اور صنم تراشی کی طرح اس کی بصریتیں وجدانی ہوتی ہیں۔ متھ صرف اس وقت حقیقت بنتی ہے جب وہ مراسم، مسلک اور تہواروں کا حصہ بن کر ان میں جلوہ گر ہو۔ جو لوگوں پر جمالیاتی لحاظ سے اثر انداز ہوتے ہیں، انہیں ایک گہری معنویت کا شعور دیتے ہوئے اس قابل بناتے ہیں کہ زندگی کی گہرائیوں کا ادراک کرسکیں۔ متھ اور مسلک یک جا نہیں ہوسکتے۔ ویسے اس پر بحث ہوسکتی ہے کہ دیومالائی بیانیہ یا اس سے منسلک ہونے والے مسلک میں سے پہلے کس کا ظہور ہوا تھا۔ متھ تصوف سے بھی وابستہ ہے۔ سائیکی میں اس کا نزول دھیان فوکس اور استغراق کے ذریعہ ہوتا ہے جن کے وسیلہ سے ہر کلچر میں وجدانی بصیرت حاصل کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ کسی مسلک یا صوفیانہ ریاضت کے بغیر مذہبی متھ کے کوئی معنی نہیں ان کے بغیر وہ مجرد اور غیر معتبر ہوتی ہے۔ جدید دور سے پہلے تاریخ کے متعلق دنیا کا نقطۂ نظر کچھ اور تھا۔ پہلے لوگ تاریخی واقعات میں کم دلچسپی لیتے تھے۔ ان کی تمام دلچسپی واقعہ کی معنویت میں تھی۔ وہ اس کی تہہ تک پہنچنا چاہتے تھے۔ انہیں تاریخی واقعات انوکھے نہیں لگتے تھے۔ ان کا

خیال تھا کہ وہ دائمی اور وقت سے آزاد حقیقتوں کے ظاہری مظہر ہیں۔ ان کی خارجی شکلیں ہیں۔ اسی لئے تاریخ لازمی طور پر اپنے آپ کو دہراتی ہے کیونکہ دنیا میں ماضی سے کٹ کر کبھی کوئی نئی بات نہیں ہوتی کوئی نیا واقعہ نہیں ہوتا۔ تاریخ کا مقصد اسی دائمی حقیقت پر زور دینا ہے۔ ہم نہیں جانتے کہ دور قدیم میں جب اسرائیلی جانیں بچا کر مصر سے نکلے اور پانی نے انہیں راستہ دے دیا تو اس واقعہ کی اصل حقیقت کیا ہے۔ یہ کہانی جان بوجھ کر متھ کے انداز میں لکھی گئی ہے اور اسے اس جیسی ہی دوسری کہانیوں سے جوڑا گیا ہے۔ پانیوں کی گہرائیوں میں اترنا اور سمندر کا دونیم ہوکر راستہ دینا، ایک نئی حقیقت کو جنم دینا ہے۔ یہودی ہر سال یہ واقعہ اپنا مذہبی تہوار منا کر یاد کرتے ہیں اور اس تجربہ کو ذاتی سطح پر دہراتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ یہ ان کا ذاتی تجربہ ہے۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ اگر کوئی تاریخی واقعہ اسی طرح متھ کی شکل اختیار نہ کرے اور ایک زندہ مسلک بن کر اپنے آپ کو ماضی سے آزاد نہ کر سکے تو یقیناً ایسا واقعہ مذہبی نہیں ہوسکتا۔ اب یہ سوال کہ کیا مصر سے یہودیوں کا اخراج بالکل اسی طرح ہوا تھا جیسا کہ انجیل میں بیان ہوا ہے؟ یا اس واقعہ کی صداقت کے تاریخی اور سائنسی ثبوت طلب کرنا، اس کہانی کے مقصد اور نوعیت کے خلاف ہے۔ یہ ایسا ہی ہے کہ جیسے مائتھوس کو لوگوس سے کنفیوز کیا جائے۔ لوگوس کی اہمیت کم نہیں۔ لوگوس ہی وہ ریشنل (عمل پسند) اور سائنسی انداز فکر ہے جس نے مردوں اور عورتوں کو دنیا میں اچھی طرح رہنے کے قابل بنایا ہے۔ آج مغرب میں ہمیں شاید مائتھوس کا شعور نہ رہا ہو مگر ہم لوگوس سے خوب واقف ہیں کہ وہی تو ہماری سوسائٹی کی خشت اول ہے۔ متھ کے برعکس لوگوں کو حقائق کے عین مطابق اور خارجی اصلیتوں سے ہم آہنگ ہونا چاہیے اگر اسے مؤثر ہونا ہے۔ اسے اس بے کیف دنیا میں اپنا بھرپور کردار ادا کرنا ہے۔ ہم اس منطقی اور کسی حد تک بے ترتیب استدلال کا سہارا اس وقت لیتے ہیں جب ہم چاہتے ہیں کہ کچھ ہو کر رہے، ہم کچھ کر لیتے ہیں یا دوسروں کو ایک خاص طرز عمل کی ترغیب دیتے ہیں۔ لوگوس باعمل ہے متھ کے برعکس جو پیچھے دیکھتی ہے اور ابتداؤں اور بنیادوں پر نظر رکھتی ہے۔ لوگوس کو آگے بڑھنا اور نئی دریافتوں کا عمل تیز کرنا ہوتا ہے کہ پرانی دانش اور بصیرتوں کو نئے معنی ملیں۔

جدید دور سے پہلے متھ اور لوگوس کا ساتھ ناگزیر خیال کیا جاتا تھا۔ ایک کے بغیر زندگی نامکمل سمجھی جاتی تھی۔ اس کے باوجود دونوں کی انفرادیت الگ الگ اور نمایاں تھی۔ دونوں کو آپس میں

الجھانا خطرناک سمجھا جاتا تھا۔ دونوں کے مدارا الگ تھے۔ متھ ہر دلیل سے بے نیاز ہے۔ اس کے بیان اس کی کہانیوں کو کسی مشاہدہ اور تجربہ کا سہارا لینے کی ضرورت نہیں۔ متھ ہماری عملی زندگی اور سرگرمیوں کو معنی دیتے ہوئے ان کا ایک مقام متعین کرتی ہے۔ مگر ہمیں یہ نہیں کرنا کہ اپنی عملی زندگی اور حکمت عملی کی بنیاد مائتھوس پر رکھیں۔ اگر ہم نے ایسا کیا تو اس کے نتائج تباہ کن ہو سکتے ہیں۔ اس لئے کہ جو بات سائیکی کی داخلی دنیا میں صحیح ثابت ہوتی ہے اس پر ہم خارجی دنیا میں عمل پیرا نہیں ہو سکتے۔ مثال کے طور پر جب پوپ اربن دوم س1095 میں پہلی صلیبی جنگ کا حکم دیا تو اس کا فیصلہ لوگوس کے زیر اثر تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ یورپ کے عیسائی بادشاہ آپس میں لڑنا بند کریں اور اس کی پاپائیت کی دھجیاں نہ بکھیریں بلکہ اپنی طاقت مشرق وسطیٰ کی جنگ میں خرچ کریں اور کلیسا کی طاقت بڑھائیں مگر جب یہ جنگی مہم متھ اور انجیل کی کہانیوں میں الجھا دی گئی تو اس کے نتیجہ میں اخلاقی، نفسیاتی اور جنگی لحاظ سے انتشار کا شکار ہو گئی۔ صلیبی جنگوں پر جب تک لوگوں کا اثر و نفوذ باقی رہا کامیابیاں حاصل ہوتی رہیں۔ میدان جنگ کی کارکردگی اچھی رہی۔ مشرق وسطیٰ میں نوآبادیاں بنائی گئیں اور مقامی آبادی سے بھی رابطے قائم ہوئے مگر جب انہوں نے متھ اور تصوف کو اپنی پالیسیوں کی بنیاد بنایا تو ناکامیوں کا سلسلہ شروع ہو گیا اور صلیبی جنگجو بدترین مظالم کے مرتکب ہوئے۔

لوگوس کی کچھ مجبوریاں اور اس کی اپنی حدیں ہیں۔ انسانی دکھ درد میں کمی کرنا اس کے بس کی بات نہیں۔ عقلی دلائل سے ٹریجیڈی میں معنی پیدا نہیں ہوتے۔ لوگوس کے پاس انسانی زندگی کی قدر و قیمت کے متعلق کہنے کے لئے کچھ بھی نہیں ہوتا۔ سائنسدان بڑی قابلیت کے ساتھ جسمانی کائنات کا مشاہدہ کر سکتا ہے۔ اس کے بارے میں نئی حیرت انگیز باتوں کا انکشاف کر سکتا ہے۔ مگر یہ نہیں بتا سکتا کہ زندگی کیا ہے اور زندگی کے معنی کیا ہیں۔ زندگی کے معنی بتانا مسلک اور متھ کا اعزاز ہے۔

اٹھارویں صدی تک یورپ اور امریکہ کے لوگوں نے سائنس اور ٹیکنالوجی میں حیرت انگیز کامیابیاں حاصل کر لی تھیں، ایسی کہ وہ لوگوس کو ہی سچائی کا ذریعہ سمجھنے لگے اس طرح انہوں نے متھ کو جھوٹ پر مبنی سمجھا اور توہم پرستی کا نام دے کر اسے نظرانداز کرنے لگے۔ یہ بھی سچ ہے کہ وہ جس دنیا کی تخلیق کر رہے تھے اس دنیا کو قدیم دیومالائی روحانیت سے انکار تھا۔ وہ اسے رد کرتی

تھی۔ نئے زمانہ میں ہمارے مذہبی تجربے کی نوعیت بدل گئی ہے۔اس لئے کہ لوگوں کی بڑی تعداد سائنسی عقلیت ہی کو سچ سمجھتی ہے۔انھوں نے یہ کوشش اکثر کی ہے کہ اپنے مذہب کی متھ کو لوگوس میں بدل دیں۔ یہ کوشش بنیاد پرستوں نے بھی کی ہے مگر اس کنفیوژن سے نئے مسائل پیدا ہوئے ہیں۔

ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ ہماری دنیا کیسے بدلی ہے۔اس کتاب کا پہلا حصہ پندرھویں صدی کے آخر اور سولھویں صدی کے اوائل سے متعلق ہے جب مغربی یورپ میں نئی سائنسی ترقی کا آغاز ہوا تھا۔ہم جدیدیت سے پہلے دور کی زرعی تہذیب کی دیو مالائی پارسائی کا جائزہ بھی لیں گے تاکہ ہمیں اندازہ ہو کہ مذہب اپنی پرانی شکل میں انسانی زندگی پر کیسے اثر انداز ہوا کرتا تھا۔اس بہادر نئی دنیا میں پرانی مذہبیت سے وابستگی بہت دشوار ثابت ہو رہی ہے۔ نئے رستوں پر چلنا ہمیشہ محنت طلب اور تکلیف دہ عمل رہا ہے۔سوسائٹی میں بنیادی تبدیلیوں کی وجہ سے دنیا اجنبی لگتی ہے۔ پہچانی نہیں جاتی۔لوگ اپنے آپ کو پریشان تنہا اور الگ تھلگ محسوس کرتے ہیں۔ہم دیکھیں گے کہ یورپ اور امریکہ کے عیسائیوں یہودیوں اور مصر و ایران کے مسلمانوں پر جدیدیت کا کیا اثر ہوا ہے۔تب ہم یہ جاننے کی پوزیشن میں ہوں گے کہ اس وقت بنیاد پرستوں کے ارادے کیا تھے جب وہ انیسویں صدی کے آخر میں مذہب کو نئی شکل میں تخلیق کر رہے تھے۔

بنیاد پرست سمجھتے ہیں کہ وہ ان طاقتوں کے خلاف لڑ رہے ہیں جن سے ان کی مقدس قدروں کو خطرہ ہے۔حالات جنگ میں فریقین کے لئے مشکل ہوتا ہے کہ وہ ایک دوسرے کا نقطۂ نظر سمجھ سکیں۔جدیدیت نے معاشرے کو دو حصوں میں بانٹ تو دیا ہے مگر بعض وقت یہ بھی کیا ہے کہ تصادم کو پھیلنے سے روکا ہے۔ہمیں ان کی مشکلات اور انداز فکر کا اندازہ ہونا بھی ضروری ہے میرے سمیت وہ سب لوگ کہ جنہیں جدیدیت کی آزادیاں اور سہولتیں میسر ہیں مذہبی بنیاد پرستوں کی پریشان حالی کا اندازہ نہیں کر سکتے۔جدیدیت کو اکثر آزادی کی بجائے جارحیت کے طور پر لیا جاتا ہے نئی دنیا میں یہودیوں جیسے مسائل کا سامنا کم لوگوں نے کیا ہوگا۔سو مناسب ہے کہ بات انہی سے شروع کی جائے۔ پندرھویں صدی کے آخر میں مغرب کی عیسائی دنیا کی ماڈرن سوسائٹی کے ساتھ ان کی آویزش کی بات کی جائے جس کی وجہ سے بعض یہودیوں نے نئی دنیا میں رائج ہونے والی حکمت عملیوں کا وقت سے پہلے ہی اندازہ کر لیا۔

پہلا حصہ

پرانی دنیا اور نئی دنیا

یہودی نقیب
(1492-1700)

1492 میں تین نہایت اہم واقعات سپین (ہسپانیہ) میں ہوئے۔ اس وقت بھی ان واقعات کو بڑی اہمیت دی گئی تھی۔ دراصل وہ واقعات اس نئی سوسائٹی کی نمایاں خصوصیات ہیں جو پندرھویں صدی کے آخر اور سولھویں اور سترھویں صدی کے دوران مغربی یورپ میں ابھر رہی تھیں۔ وہ زمانہ مغربی کلچر کی نشوونما کا زمانہ تھا۔1492 ہماری بھی بعض الجھنیں اور مسائل سامنے لاتا ہے۔ پہلا واقعہ 2 جنوری کو ہوا جب کیتھولک حکمرانوں شاہ فرڈیننڈ اور ملکہ ازابیلا کی شادی سے پرانی آئبیرین بادشاہتوں اراگون اور کاسٹیل میں اتحاد قائم ہوا۔ اور ان کی فوجوں نے غرناطہ کی شہری ریاست پر قبضہ کرلیا۔غرناطہ عیسائی دنیا میں مسلمانوں کا آخری قلعہ تھا۔مشرق وسطیٰ میں صلیبی جنگ ناکام ہوگئی لیکن یورپ سے آخری مسلمان بھی نکال دیا گیا۔1499 میں اسپین کے مسلمانوں کو حکم دیا گیا کہ وہ عیسائی ہوجائیں ورنہ ملک سے چلے جائیں۔ اب وہاں کوئی مسلمان نہیں رہا۔ دوسرا واقعہ اسی سال 31 مارچ کو پیش آیا جب فرڈیننڈ اور ازابیلا نے ایک فرمان جاری کیا جس کے تحت یہودیوں سے کہا گیا کہ وہ عیسائی ہوجائیں یا ملک چھوڑ دیں۔ بہت سے یہودی اندلس میں بس گئے تھے کہ وہ عیسائی ہوگئے لیکن 80 اسی ہزار کے قریب سرحد پار کر کے پرتگال چلے گئے جب کہ پچاس ہزار یہودی مسلمانوں کی نئی عثمانی سلطنت میں جا پہنچے جہاں ان

کی بہت آ وَ بھگت ہوئی۔ تیسرے واقعہ کا تعلق فریڈرک کولمبس سے ہے جو غرناطہ پر عیسائیوں کے قبضے کے وقت وہاں موجود تھا۔ اگست میں کولمبس ہندوستان کے ساتھ تجارت کے لئے نئے راستے کی تلاش میں بحری سفر پر روانہ ہوا مگر ہندوستان کی بجائے امریکہ دریافت کر لیا۔ یہ تینوں واقعات نئے دور کی شان اور تباہی دونوں کے عکاس ہیں۔ کولمبس کے سفر سے یہ یقین پیدا ہو گیا کہ یورپ نئی دنیا کی دہلیز پر ہے اور وہاں کے لوگوں کی ذہنی سطح بلند اور وسیع ہو رہی ہے۔ سیاسی، معاشی، سماجی، فکری اور جغرافیائی لحاظ سے وہ بے مثال کامیابیاں حاصل کر رہے تھے جن کی وجہ سے انہیں دنیا بھر کی رہنمائی کا اعزاز حاصل ہوا۔ جدیدیت کے تاریک پہلو بھی تھے۔ اسپین یورپ کے سب سے طاقتور اور ترقی یافتہ ملکوں میں سے تھا۔ فرڈیننڈ اور ازابیلا اس کوشش میں تھے کہ باقی عیسائی دنیا کی طرح وہ بھی اسپین میں ایک مضبوط مرکزیت پسند حکومت بنائیں۔ ظاہر ہے کہ ایسی حکومت کارپوریشن، گلڈ اور یہودی کمیونٹی جیسے خود مختار اور خودنگر ادارے برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ اسپین کی یکجہتی تو غرناطہ پر قبضے کے بعد حاصل ہو گئی تھی اس کے بعد نسلی قتل و غارت گری کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ جس کی وجہ سے مسلمان اور یہودی اپنا سب کچھ گنوا بیٹھے۔ بعض لوگوں کے لئے جدیدیت کا مطلب طاقت اور آزادی تھی جبکہ دوسروں کے لئے اس کا مطلب جبر، جارحیت اور تباہی تھی۔ مغربی جدیدیت جب دنیا کے دوسرے حصوں میں پھیلی تو بھی اس کا کردار، اس کا پیٹرن یہی رہا اور یہی رہے گا۔ جدیدیت کا عمل روشن خیالی کی ترویج کا عمل تھا۔ اس سے انسانی قدروں کو فروغ ملا، مگر وہ جارحیت پسندی کا عمل بھی تھا۔ بیسویں صدی میں جن لوگوں کو جدیدیت کا تجربہ ایک یلغار کے طور پر ہوا، وہ بنیاد پرست بن گئے۔

مگر وہ تو دور کی بات ہے۔ پندرھویں صدی کے آخر میں یورپ کے لوگ یہ پیش بینی نہیں کر سکے تھے کہ جس تبدیلی کا آغاز انہوں نے کیا ہے وہ کتنی ہمہ جہت ہے۔ اگلے تین سو سال کے دوران انہوں نے نہ صرف سیاسی اور معاشی طور پر اپنی سوسائٹی بدل دی بلکہ فکری انقلاب بھی برپا کیا۔ سائنسی ریشنلزم پوری طرح چھا گیا اور اس نے بتدریج دل و دماغ بدل دیے۔ ہم آگے چل کر اس دور کا تفصیلی جائزہ لیں گے جسے گریٹ ویسٹرن ٹرانسفارمیشن کا نام دیا گیا ہے۔ اس سے پیشتر کہ ہم اس کے مختلف پہلوؤں کا اندازہ کر سکیں ہمیں یہ جاننا ہے کہ نئے دور سے پہلے دنیا کے متعلق لوگوں کا کیا تجربہ اور تجزیہ تھا۔ اسپین کی یونیورسٹیوں میں استاد اور طلبا اطالوی نشاۃ کے جدید

خیالات پر خوب بحث کرتے تھے۔ کولمبس کا بحری سفر مقناطیسی قطب نما(Compass) کے سائنسی انکشاف یا علم النجوم میں نئی بصیرت حاصل کئے بغیر ناممکن تھا۔1462 تک مغربی سائنسی ریشنلزم پوری طرح عروج پر تھا۔لوگ پہلے سے زیادہ تندہی سے لوگوں کے امکانات سے مغرب کے لوگوں نے ایک بالکل نئی دنیا دریافت کر لی تھی۔انہوں نے ماحول پر ایسا اختیار حاصل کر لیا جس کی پہلے کوئی مثال نہیں مگر ابھی انہوں نے دیومالا کا انکار نہیں کیا تھا۔کولمبس سائنس سے واقف تھا مگر قدیم دیومالائی کائنات سے بھی اسے لگاؤ تھا۔لگتا ہے کہ کولمبس کا تعلق کسی ایسے یہودی خاندان سے تھا جو بعد میں عیسائی ہوگیا تھا۔ اس نے یہودیت کی صوفیانہ روایت (Kaballai) میں اپنی دلچسپی برقرار رکھی مگر وہ سچا عیسائی تھا اور چاہتا تھا کہ دنیا حضرت عیسیٰ کی پیروی کرے اور عیسائیت کا غلبہ ہو۔اس کا خیال تھا کہ وہ ہندوستان گیا تو وہاں پر وہ یروشلم کی تسخیر کے لئے عیسائی محاذ قائم کرے گا۔مغرب کے لوگوں نے جدیدیت کا سفر تو شروع کر دیا تھا مگر ہماری رائے ہے کہ ابھی وہ پوری طرح جدید نہیں ہوئے تھے۔ان کے خیال میں عیسائیت کی دیومالائیں اب بھی ان کے سائنسی اور عقلی تصورات کو معنی دیتی تھیں۔ کچھ بھی ہو عیسائیت بدل رہی تھی۔ادھر اسپین کے لوگ اصلاح کی مخالف تحریک کے رہنما بن گئے تھے۔اس تحریک کی داغ بیل، ٹرینٹ کونسل نے(63-1545) ڈالی تھی۔ یہ تحریک ایک ماڈرن تنظیم تھی جو قدیم کیتھولک ازم کو نئے یورپ کی منظم صلاحیتوں کی صف میں لے آئی۔نئی ریاست کی طرح چرچ بھی اور زیادہ مرکزیت پسند ادارہ بن گیا۔کونسل نے پوپ اور ہر بشپ کی طاقت بحال کر دی۔ پہلی دفعہ فرمان جاری کیا گیا کہ تمام لوگ نظریاتی ہم آہنگی کو اولیت دیں۔ طے ہوا کہ پادریوں کو اعلیٰ تعلیم دلائی جائے تا کہ ان کے وعظ کا معیار بہتر ہو سکے۔دعا و مناجات کے طور طریقے عقلی سطح پر رکھے گئے۔ مذہبی رسمیں جو ایک سو سال پہلے بامعنی سمجھی جاتی تھیں نئے دور میں متروک ہو کر غرق دریا ہوئیں۔

بہت سے اسپینی کیتھولک ایک ڈچ مصنف ٹیمیر(1536-1466) کی تحریروں سے متاثر ہوئے جو چاہتا تھا کہ عیسائی اپنے مذہب کی بنیادی تعلیم کی طرف لوٹ کر اسے نئی توانائی دیں۔ اس کا نعرہ تھا کہ اپنی اصلیت کی طرف واپس جاؤ۔اس کا خیال تھا کہ ابتدائی دور کی مستند عیسائیت زمانہ وسطی کی بے روح مذہبیت کے بوجھ تلے دفن ہوگئی ہے۔ بعد میں جو اضافے انجیل میں کیے گئے ہیں انہیں منسوخ کر دینا چاہیے اور انجیل کے علاوہ چرچ کے رہنماؤں سے رجوع کرتے

ہوئے انجیل کی اصلی روح بحال کرنی چاہیے۔اصلاحی تحریک کے خلاف ہسپانوں کا سب سے اہم کارنامہ عبریہ تصوف ہے۔عبریہ کے صوفی روحانی دنیا کے نادریافت کو دریافت کرنے میں ایسے لگ گئے جیسے بڑے بڑے جہاز راں زمین کے نئے خطوں کی تلاش میں تھے۔تصوف کا تعلق مائیتھوس سے ہے جو لاشعور میں جاگزیں ہے۔وہ ریشنلزم کی پہنچ سے باہر ہے۔اس تک رسائی کے لئے کوئی اور راستہ اختیار کرنا ہوتا ہے۔پھر بھی تصوف میں اصلاح کے علمبردار چاہتے تھے کہ روحانیت کی اس قسم میں اس کے نااہل ماہرین پر انحصار کم ہو اور اس کی افسردگی میں کوئی کمی آئے۔ جان آف دی کراس (91-1552) نے تصوف کی وہ ریاضتیں موقوف کیں جو زیادہ مبہم تھیں اور توہمات کی سرحدیں چھوسکتی تھیں۔اس نے صوفیانہ عمل کو زیادہ باقاعدہ بنایا۔اس نے کہا کہ نئے دور کے صوفیا کو سمجھ لینا چاہیے کہ تصوف کے ایک مقام سے دوسرے مقام تک اپنی باطنی زندگی کی دشواریوں کا شعور ہونا چاہیے تاکہ وہ اپنی روحانی صلاحیتیں تخلیقی عمل میں ڈھال سکیں۔

سوسائٹی آف جیسس (Society of Jesus) اس سے بھی زیادہ ماڈرن تھی۔اگنیٹس آف لائیولا (Ignatius of Lyolaa)(1491-1555) نے اس کی بنیاد رکھی۔ یہ سوسائٹی ماڈرن یورپ کی ان صلاحیتوں اور اثر آفرینی کا مرقع تھی جو آگے چل کر جدید یورپ کی پہچان بنی۔اگنیٹس نے طے کرلیا تھا کہ وہ مائیتھوس کی طاقت کو عملی طور پر کام میں لائے گا۔اس کے مقلد سمجھتے تھے کہ ان کے پاس اتنا وقت نہیں ہے کہ وہ کراس کے طویل تفکراتی عمل کے روادار ہوسکتے۔ اس کے برعکس اگنیٹس نے روحانی ریاضت کے لئے وقت کا لحاظ رکھتے ہوئے باقاعدہ کریش کورس بنا رکھا تھا جس کے تحت ہر طالب علم ایک ماہ کے لئے تنہائی اختیار کرتا اور تصوف کی تربیت کے مراحل طے کرتا۔ایک بار جب کوئی عیسائی حضرت عیسیٰ کا راستہ اختیار کرلیتا تو اپنی ترجیحات طے کرکے آمادہ عمل ہوجاتا۔صحیح طریقہ کار تنظیم اور ڈسپلن پر اصرار نئے سائنسی تقاضوں سے ہم آہنگ تھا۔خدا کو ایک حرکی (dynamic) قوت سمجھا گیا۔جس نے طلباء کو تمام دنیا میں عیسائیت کی تبلیغ کے لئے متحرک کردیا۔جدید اسپین کے ابتدائی دور میں مذہب کو ہنوز پیچھے نہیں چھوڑا گیا تھا کیونکہ مذہب بھی کچھ اس طور بدلا تھا کہ جدیدیت کے اثرات جذب کرنے سے اس کے وژن اور رینج میں نمایاں اضافہ ہوا تھا۔

جدید اسپین اپنے ابتدائی دور میں جدیدیت کے ہراول دستے کا حصہ تھا۔مگر فرڈیننڈ اور

ازابیلا کو اس کی طاقت محدود کرنا پڑی۔ انہیں ان تمام بادشاہتوں کو اپنے جھنڈے تلے لانا تھا جوخودمختار اور اپنی الگ الگ حیثیتوں میں قائم تھیں اس لئے 1483 میں انہوں نے اپنا احتسابی ادارہ قائم کرلیا جس کا مقصد لوگوں کے عقائد کی انکوائری اور نظریاتی یکجہتی نافذ کرنا تھا۔ دونوں حکمران ایک ماڈرن ریاست قائم کررہے تھے۔ مگر اس پوزیشن میں نہیں تھے کہ اپنی رعایا کو بے روک ٹوک آزادی دیں۔ احتساب نے سرکاری نقطۂ نظر سے اختلاف کرنے والوں کا پتہ لگایا اور انہیں اپنا راستہ بدلنے پر مجبور کیا۔ اسپینی احتساب گئے گزرے زمانے کو محفوظ کرلینے کی دقیانوسی کوشش نہیں تھی بلکہ اس کی حیثیت ایک ترقی پسند ادارے کی تھی۔ جس کا مقصد قومی اتحاد قائم کرنا تھا۔ وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ مذہب ایک زبردست انقلابی طاقت ثابت ہوسکتا ہے۔ انگلستان جیسے ملکوں کے پروٹیسٹنٹ حکمران اپنی کیتھولک رعایا کے ساتھ اتنا ہی ظالمانہ سلوک کررہے تھے جنہیں وہ مذہبی اختلاف کی بناء پر ملک دشمن قرار دیتے تھے۔ اس قسم کا جبر اکثر جدیدیت کے عمل کا حصہ تھا۔ اسپین میں اس احتسابی عمل کا سب سے بڑا نشانہ یہودی تھے۔ اس جارحانہ جدیدیت کے خلاف یہودیوں کے ردعمل پر ہم اس باب میں بات کریں گے۔ دنیا کے دوسرے حصوں میں جدیدیت کا سامنا کرنے والے ان کے تجربے کو اپنے سامنے رکھ سکیں گے۔

اندلس کے مسلم علاقوں پر اسپین کا قبضہ یہودیوں کے لیے بہت تباہ کن ثابت ہوا۔ اسلامی ریاست میں یہودی، عیسائی اور مسلمان تینوں چھ سو سال سے امن اور دوستی کے ساتھ اکٹھے رہ رہے تھے وہاں یہودی خاص طور پر اپنی کلچری اور روحانی نشاۃ ثانیہ کی کیفیت میں تھے اور وہ اس منظّم قتل عام سے بالکل محفوظ رہے تھے جو باقی یورپ میں یہودیوں کا مقدر تھا۔ اسلامی علاقوں پر عیسائیوں کے قبضے سے یہودیوں پر بڑی آفت آئی۔ 1378 اور 1391 میں عیسائیوں نے اراگون اور کاسٹیل میں یہودیوں پر حملے کئے اور انہیں گھسیٹتے ہوئے عیسائی بنانے لے گئے۔ اراگون مین ڈومینکن پادری ونسنٹ فیر (1350-1419) مسلسل یہودی دشمن فسادات بھڑکاتا رہا۔ یہودیت کو رد کرنے کے لیے وہ عیسائیوں اور یہودیوں کے مذہبی رہنماؤں کے درمیان مناظرے بھی کرواتا۔ بعض یہودی ایذاؤں سے بچنے کے لیے رضاکارانہ طور پر عیسائی بن گئے۔ انہیں سرکاری طور پر تو عیسائی کہا جاتا تھا مگر عیسائی انہیں خنزیر (Marranos) کہتے تھے بعض عیسائی بننے والے یہ گالی اعزاز کے طور پر اپنا لیتے تھے۔ یہودی کے مذہبی رہنماؤں نے انہیں

عیسائیت اختیار کرنے سے منع کیا مگر پہلے تو یہ ہوا کہ نئے عیسائی (عیسائی بننے والے یہودی) مال دار اور کامیاب ہوئے۔ کئی اونچے درجے کے پادری بن گئے۔ وہ بھی تھے کہ جنھوں نے اعلیٰ خاندانوں میں شادیاں کرلیں۔ اور بہتوں نے تجارت میں شاندار کامیابیاں حاصل کیں لیکن اس سے نئے مسائل پیدا ہوئے کیوں کہ پرانے عیسائی نئے یہودی عیسائیوں کو ترقی کرتے ہوئے نہیں دیکھ سکتے تھے۔1449 اور 1474 کے درمیان نئے عیسائیوں کے خلاف بار بار فسادات ہوتے رہے، جن میں انہیں قتل کر کے ان کی جائیدادیں تباہ کردی جاتیں یا انہیں شہر سے باہر نکال دیا جاتا۔

فرڈیننڈ اور ازابیلا اس صورت حال سے پریشان ہوگئے۔ یہودیوں کو عیسائی بنانے سے ان کی متحدہ بادشاہت مستحکم نہیں ہوئی بلکہ اس میں نئی درازیں پڑ گئیں۔ انہین یہ جان کر بھی پریشانی ہوئی کہ بعض نئے عیسائی پھر یہودی ہوگئے ہیں اور انہوں نے زیر زمین تحریک بنالی ہے تاکہ نئے عیسائیوں کو یہودیت یعنی ان کے قدیم مذہب میں واپس لائیں۔ ایسے یہودیوں کا پتا چلانے کے لیے محتسب ان کے پیچھے لگادیئے گئے۔ ان کی پہچان یہ بتائی گئی کہ وہ ہفتہ کے روز کام نہیں کرتے اور خنزیر کھانے سے انکار کرتے ہیں۔ مشتبہ لوگوں کو اذیتیں دی جاتیں حتیٰ کہ وہ اپنے ارتداد کا اعتراف کر لیتے اور اپنے انڈرگراؤنڈ ساتھیوں کے متعلق اطلاعات مہیا کرتے۔ اس کے نتیجے میں تیرہ ہزار نئے عیسائی قتل کردیئے گئے مگر ان میں اکثر تو وہ تھے جو ایماندار کیتھولک تھے اور کسی انڈرگراؤنڈ تحریک سے ان کا کوئی واسطہ نہ تھا۔ اس کے باوجود وہ قتل ہوئے، جیل میں ڈالے گئے اور ان کی جائیدادیں ضبط کرلی گئیں۔ اس تجربہ سے نئے عیسائیوں کی آنکھیں کھل گئیں۔ وہ بہت خفا ہوئے اور اپنے نئے مذہب کی صداقت پر شک کرنے لگے۔1492ء میں جب فرڈیننڈ اور ازابیلا نے غرناطہ پر قبضہ کیا تو وہاں یہودی خاصی بڑی تعداد میں تھے انہوں نے سمجھ لیا تھا کہ وہ اس صورتحال سے عہدہ برآ نہیں ہوسکیں گے۔ یہودیوں کے مسئلہ کا حل انہوں نے یہ نکالا کہ ان کے اخراج کا فرمان جاری کردیا۔ یہودی بستیاں تباہ کردیں اور ستر ہزار یہودی جبراً عیسائی بنالیے۔ باقی ایک لاکھ تیس ہزار یہودی جلاوطن کردیئے گئے۔ یہودی بستیوں کی تباہی کا ماتم دنیا بھر کے یہودیوں نے کیا۔ یروشلم میں ان کی عبادت گاہ کی تباہی کے بعد ان بستیوں کی بربادی کو یہودیوں نے سب سے بڑا المیہ قرار دیا۔ یروشلم سے انہیں جلاوطن کر کے باہر مختلف گروہوں میں

بکھیر دیا گیا تھا۔ یہ واقعہ دیا سپورا(Diaspora) کے نام سے جانا گیا۔ اس وقت سے جلاوطنی یہودیوں کی زندگی کا حصہ بن گئی۔1462 میں اسپین سے یہودیوں کا اخراج ایک ایسی صدی کے اختتام پر ہوا کہ جس صدی کے دوران یہودی لگاتار یورپ کے مختلف حصوں سے نکالے گئے۔ آہستہ آہستہ یہودیوں نے مشرق کا رخ کیا اور پولینڈ میں بزعم خود اپنے قدم جمانے لگے۔ جلاوطنی ان کے لیے ایک ناگزیر صورتحال بن گئی جس سے کوئی مفر نہیں تھا۔

اسپین سے نکالے جانے والے یہودیوں کو بالخصوص یہ یقین تھا کہ وہاں ان کے قدم اکھڑ گئے ہیں۔ انہوں نے سلطنت عثمانیہ کے صوبوں بلقان اور شمالی افریقہ میں پناہ لی۔ انہیں مسلمانوں کے ساتھ رہنے کی عادت تھی۔ اسپین ان کی سائیکی پر بڑا گہرا گھاؤ تھا۔ انہیں لگتا تھا کہ کوئی چیز ٹھکانے پر نہیں نہ وہ خود ٹھکانے پر ہیں۔ جلاوطنی کے معنی جسمانی اور روحانی لحاظ سے اپنا مقام اپنی سمت کھودینا ہے۔ جلاوطنی کی دنیا بالکل اجنبی اور اسی لیے بالکل بے معنی ہوتی ہے۔ جلاوطنی نہ صرف ہمیں ہر اس چیز سے محروم کر دیتی ہے جسے ہم اپنا کہہ سکیں بلکہ ہماری دنیا اور ہمارے خوابوں کو بھی پاش پاش کر دیتی ہے۔ ہم سے ہماری وہ یادیں چھن جاتی ہیں جو ہماری شناخت ہیں۔ ہم ایسی تنہائی میں دھکیل دیئے جاتے ہیں کہ ہمیں اپنے ہونے پر شک ہونے لگتا ہے۔ جلاوطنی ظلم وتشدد کی وجہ سے ہو تو بدی کی طرف دھیان جاتا ہے اور یہ شک ہونے لگتا ہے کہ کیا وہ ایک ایسی دنیا میں موجود ہے جس کی تخلیق منصف اور مہربان خدا نے کی ہے؟

اسپین کے یہودیوں نے بدترین غارت گری کا سامنا کیا مگر ایسی ہی صورتحال ان قوموں کو بھی پیش آئی جو بعد میں جدیدیت کے جارحانہ عمل کا نشانہ بنیں۔ جدید مغربی تہذیب نے اجنبی زمینوں میں جڑیں پکڑیں تو وہاں کے کلچر کو یکسر بدل دیا۔ وہاں کے لوگ تبدیلی کے اس شدید جھٹکے سے بدحواس ہو گئے اور ان کی سمجھ میں نہ آیا کہ کیا کریں۔ پرانی دنیا ختم ہو چکی تھی اور نئی دنیا اتنی نئی اور اتنی عجیب تھی کہ اس میں انہیں اپنی شناسا اور مانوس دنیا کا شائبہ بھی نہ ملا، تو انہیں زندگی بے مقصد اور بے جواز لگنے لگی۔ انہیں خطرہ تھا کہ ان کا نام ونشان مٹا دیا جائے گا۔ اسی خوف اور کنفیوژن میں بہتوں نے اسپین کے یہودیوں کی طرح مذہب سے رجوع کیا مگر اس عرصے میں معروضی حقیقتیں بدل چکی تھیں۔ یہودیوں کے حالات میں انقلابی تبدیلیاں آ چکی تھیں۔ اس لیے ضروری تھا کہ وہ مذہب کو ایسی شکل دیں کہ اس کی پرانی قدریں ان کے نئے حالات سے ہم

آہنگ ہوسکیں مگر اس میں تو وقت لگتا تھا۔ سولھویں صدی میں یہودیوں نے محسوس کیا کہ روائتی یہودیت کا دامن ان کے لیے خالی ہے اور اس سے انہیں کوئی مدد نہیں مل سکتی۔ ان کی تباہی بے مثال اور بے حساب تھی مگر انہوں نے دیکھ لیا کہ اس تباہی میں ان کی پرانی عقیدتیں اور پرہیزگاریاں ان کے کسی کام نہیں آئیں۔ مایوسی کے عالم میں بعض نے تو مسیحائی کا سہارا لیا کیونکہ وہ صدیوں سے کسی مسیحا کے منتظر تھے کہ حضرت داؤد کے خاندان میں سے کسی کو آنا تھا جو انہیں ان کے مصائب سے نجات دلواتا اور واپس یروشلم بھیج دیتا۔ بعض یہودی روائیتوں کے مطابق مسیحا کے ظہور سے پہلے یہودیوں پر کڑی آزمائشیں آئیں گی۔ اسپین کے یہودیوں نے اپنی بربادیاں اور اذیتیں یاد کیں تو انہیں یقین ہو گیا کہ ان کے مصائب مسیحا کے ظہور کا پیش خیمہ ہیں۔ بلقان میں پناہ لینے والے اسپینی یہودیوں نے طے کر لیا کہ ان پر اور ان کے ہم مذہبوں پر جو مصائب نازل ہوئے ہیں اس کی بس یہی ایک توجیہہ ہے کہ انہیں ان مصائب سے مسیحا کے ذریعے نجات ملنے والی ہے۔ دوسرے لوگ جنہوں نے محسوس کیا تھا کہ ان کی تباہی کی وجہ جدیدیت کا اچانک آغاز ہے انہوں نے بھی اپنی اُمیدیں مسیحائی سے وابستہ کر لی تھی مسیحائی بڑا مشکوک معاملہ تھا کیونکہ مسیحا کی اُمید پر جینے والے ہر فرد اور جماعت کو بالآخر مایوسی ہوئی کیوں کہ مسیحا نہیں آیا۔ اسپین کے جلاوطن یہودیوں نے اس مسئلہ کا یہ حل سوچا کہ انہوں نے ایک نئی مائیتھوس ایجاد کر لی۔ اسپینی یہودیوں کا ایک گروپ بلقان سے فلسطین چلا گیا اور گلیلی میں رہائش اختیار کر لی۔ روایت تھی کہ جب مسیحا آئے گا تو اس کا ظہور گلیلی میں ہوگا۔ جلاوطن یہودی چاہتے تھے کہ وہ سب سے پہلے مسیح کو خوش آمدید کہیں۔ ان میں سے بعض تو دعویٰ کرنے لگے کہ انہوں نے مسیحا کو ایک یہودی صوفی آئزاک لوریا (Isaac Loria)(1534-72) کی شکل میں پا لیا ہے جو سیفڈ میں رہ رہا تھا۔ اسی نے سب سے پہلے یہ نئی متھ بیان کی تھی۔ چنانچہ وہی کبالہ کا بانی ہے اور اس کے ساتھ اب بھی لوریا کا نام ہی لیا جاتا ہے۔ نئے زمانے کے لوگ تو یہ کہیں گے کہ یہ متھ لوریا کی اپنی تخلیق ہے اور یہ کہ اسے اپنے لوگوں کے ذہنوں میں بسی ہوئی خواہشات اور خدشات سے اتنی گہری واقفیت تھی کہ اس کی مدد سے اس نے ایک خیالی داستان بنالی جو تمام دنیا کے یہودیوں کے لئے اُمید اور دلاسہ کا سبب بنی۔ ہم اس لیے یہ نہیں کہیں گے کیونکہ بنیادی طور پر ہماری سوچ کا انداز ریشنل ہے اور ہمیں جدیدیت سے پہلے کی دیومالائی دنیا کو سمجھنے کی توفیق نہیں۔ اس کے شاگرد یہ

سوچ ہی نہیں سکتے تھے کہ یہ متھ لوریا کی اپنی اختراع ہے بلکہ وہ تو اسے کشف کا درجہ دیتے تھے۔
کہتے تھے کہ یہ متھ اپنے آپ لوریا کی اپنی اختراع نہیں بلکہ وہ تو اسے کشف کا درجہ دیتے تھے۔
کہتے تھے کہ یہ متھ اپنے آپ لوریا پرظاہر ہوئی ہے۔ ایک اجنبی جولوریا کی کبالہ ریاضتوں میں شامل نہ رہا ہو اسے یہ کہانی فضول نظر آئے گی پھر یہ بات بھی ہے کہ یہ کہانی انجیل کی کتاب پیدائش کی کہانیوں سے مشابہ نہیں۔ پھر بھی سیفڈ کے کبالہ پھیلانے والے لوریا کی بتائی ہوئی ریاضتوں اور مشقتوں میں کھوئے رہتے اور گو کہ جلاوطنی کو ایک زمانہ ہو چلا تھا مگر ان کے گھاؤ نہیں بھرے تھے ان کے لیے مائیتھوس میں بڑی کشش اور بڑی جان تھی۔ اس نے ایک ایسی صداقت سے پردہ اٹھایا تھا جو پہلے بھی کچھ ایسی ڈھکی چھپی نہیں تھی۔ جدیدیت کے ابتدائی دور میں بھی اس کے ذریعے یہودیوں کی تاریک زندگی میں روشنی کی ایسی کرن تھی جس سے ان کی زندگی قابلِ برداشت بلکہ خوشگوار ہوگئی۔ ایک جدید انسان کی حیثیت سے اگر ہم اس متھ سے دوچار ہوں تو ہمارے ذہن میں فوراً سوال ابھرے گا کہ کیا واقعی ایسا ہو سکتا ہے؟

اس لیے کہ اس میں ہونے والے واقعات معتبر نہیں نہ ان کی صداقت کا کوئی ثبوت ہے اس لیے ہم انہیں جھوٹ سمجھ کر رد کر دیں گے۔ کیونکہ ہم سچائی کو صرف ریشنل نقطۂ نظر سے دیکھتے اور مانتے ہیں کسی اور زاویے سے اسے دیکھنے کا شعور نہیں رکھتے۔ مثال کے طور پر ہم تاریخ کو سائنسی نقطۂ نظر سے دیکھتے ہیں یعنی تاریخ انوکھے واقعات کا تسلسل ہے۔ جدید دور میں پہلے تاریخی واقعات اپنی واحد شکل میں نہیں دیکھے جاتے تھے۔ بلکہ ابدی قوانین کی مثالوں اور ایک ایسی مسلسل حقیقت کا اظہار تھے جو شاید وقت کی گرفت سے بھی آزاد ہے۔ اس کا امکان ہے کہ تاریخ بار بار اپنے آپ کو دہرائے۔ کیونکہ زندگی کے بنیادی قوانین تو ایک جیسے ہیں۔ مثال کے طور پر انجیل میں ہے کہ ایک دریا معجزانہ طور پر کم از کم دومرتبہ دونیم ہو جاتا ہے تاکہ اسرائیلی وہاں سے گزر سکیں۔ جلاوطنی ایک ایسا موضوع ہے جس کا ذکر بار بار انجیل میں آیا ہے اور اسپین میں یہودیوں کی تباہی کے بعد تو ایسا لگتا ہے کہ یہودیوں کی تمام زندگی جلاوطنی سے عبارت ہے۔ لوریائی کبالہ نے اس مسئلے کا حل اس کے آغاز کی طرف لوٹ جانے میں دیکھا۔ ہر دیومالا میں یہی ہوتا ہے۔ آغاز کی طرف واپسی اس لیے ضروری ہوتی ہے کہ جلاوطنی کا تفصیل سے جائزہ لیا جائے اور اس کی پوری معنویت سمجھی جا سکے۔

لوریا کی متھ میں تخلیقی عمل، رضا کارانہ جلاوطنی سے شروع ہوتا ہے۔ پہلا سوال ہی یہ ہے کہ اگر خدا ہر وقت ہر جگہ موجود ہے تو پھر دنیا کیسے اور کہاں قائم ہے۔ اس کا جواب ضِم ضُم (Zimzum) یعنی پسپائی کا اصول ہے۔ خدا کی ذات جس کی کوئی انتہا نہیں اور جسے پانا ممکن نہیں وہی اپنے آپ میں سمٹ کر دنیا کو قدم جمانے کے لیے جگہ دیتی ہے کیونکہ وہ لاانتہا اور لامحدود ہے۔ تخلیق کا عمل شروع ہو چکا تھا اس لیے اس کی مخلوق میں اس کا ظہور ہوا اور اس ذات لامحدود اور بے انتہا نے اپنی ہی ذات کے ایک حصے سے جلاوطنی اختیار کر لی۔ بائبل کی کتاب پیدائش میں بیان ہونے والی باقاعدہ اور پرامن تخلیق کے برعکس ابتدائی تخلیق کا عمل متشدد، تباہ کن اور اس کا آغاز غلط تھا۔ یہ تو جیسے اسپین کے یہودی جلاوطنوں کے لیے زیادہ صحیح تھی اور اس دنیا کی بہتر تصویر تھی جس میں وہ رہے تھے۔ لوریائی عمل کے ابتدائی مراحل میں اس ذات لامحدود نے پسپائی سے پیدا ہونے والے خلا کو اپنے نور سے بھر دینے کی کوشش کی مگر خلا کے رستے اس نور کے متحمل نہ ہو سکے جن سے ہو کر اس کو خلا میں جانا تھا۔ اس نور کے بعض حصے ٹوٹ کر ایسی پاتال میں جا گرے جو غیر خدا کی حدود میں تھی، نور کی شعاعیں بدی کی قوتیں تھیں جن سے ذات اعلیٰ نے پسپائی اختیار کر کے نجات حاصل کی تھی۔ اس المیے کے بعد تخلیق خامیوں سے پاک نہ رہ سکی اور چیزیں اپنے اصلی مقام سے ہٹ گئیں۔ آدم جب پیدا ہوئے تو وہ اس صورتحال کو سنبھال سکتے تھے۔ اگر وہ ایسا کرتے تو سبت، کے پہلے موقعہ پر ہی جلاوطنی ختم ہو جاتی۔ مگر حضرت آدم نے گناہ کر لیا اور وہ نورانی شعاعیں مادی دنیا میں اسیر ہو کر رہ گئیں۔ اس وقت اور حضور سے خدائی طاقتوں کے زمین پر ہونے کا ادارک ہوتا ہے کہ شاید وہ دنیا کی دائمی جلاوطنی میں یہ آرزو لیے بھٹک رہی ہیں کہ شاید ایک بار پھر خدا سے جا ملیں۔

یہ کہانی عجیب ہے لیکن کبالہ والوں سے پوچھا جائے کہ کیا وہ واقعی یہ سمجھتے ہیں کہ ایسا ہوا ہوگا تو ان کے خیال میں ایسا سوال بے معنی ہوگا۔ متھ میں بیان کیا جانے والا اولین واقعہ ایک ایسا حادثہ نہیں ہے جو بس ایک دفعہ ماضی بعید میں پیش آیا ہو بلکہ اس کا سلسلہ تو ہمیشہ جاری رہتا ہے۔ ایسے واقعات کا کوئی تصور ہمارے پاس نہیں، نہ ہی ان کے لیے کوئی مناسب الفاظ ہیں۔ ہماری ریشنل سوسائٹی کے پاس وقت کا جو تصور ہے اس کا گہرا تعلق تاریخی ترتیب و تسلسل سے ہے۔ اگر قدیم یونان میں الیوسس کے عبادت گزاروں سے پوچھا جائے کہ کیا وہ ثابت کر سکتے ہیں کہ

پرسیفون کو پلوٹو نے پاتال میں قیدی بنا رکھا تھا اور یہ کہ اس کی ماں ڈیمیٹر اس کے غم میں ماتم کرتی ہوئی بھٹکتی رہتی تھی؟ تو یہ سوال سن کر غالباً وہ سٹ پٹا جائیں گے۔ انہیں کیونکر یقین ہو کہ پرسیفون زمین پر واپس آ گئی ہے جیسا کہ متھ میں بیان ہوا ہے؟ کیونکہ اس متھ سے ظاہر ہونے والی زندگی کا بنیادی لحن (ردم) بروئے کار آ رہا تھا۔ کھیتوں میں فصلیں بو دی گئیں، ٹھیک وقت پر بیج زمین ڈال دیئے گئے اور آخر کار اناج پیدا ہوا۔ مائیتھوس اور فصل بونے کا عمل دونوں ہی دنیا کے لیے بنیادی اور کائناتی اہمیت رکھتے ہیں۔ ایسے ہی جیسے کہ انگریزی لفظ ''Boat'' اور فرانسیسی ''Bateau'' ایک ایسی حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہیں جو دونوں تراکیب سے بلند ہیں۔ اسپین کے یہودی بھی شاید کچھ اسی قسم کا جواب دیتے۔ جلاوطنی زندگی کا بنیادی قانون ہے۔ جدھر بھی نظر جاتی یہودی بے سہارا بے وطن اور اجنبیوں کی زندگی گزارنے پر مجبور تھے۔ یہاں تک کہ غیر یہودی بھی محسوس کرتے تھے کہ یہ دنیا ان کی نہیں بالخصوص جب انہیں دنیا کے پہلے انسانوں کا خیال آیا جنہیں جنت سے نکال دیا گیا تھا۔ لوریا کی پیچیدہ پیدائش کہانی نے یہ واقعہ بالکل نئے انداز میں بیان کیا تھا۔ شیخینا کی جلاوطنی اور ان کی اپنی بے آسرا زندگی ایک دوسرے سے جدا حقیقتیں نہیں تھیں بلکہ بالکل ایک جیسی تھیں۔ ضمِ ضم سے اندازہ ہوا کہ جلاوطنی انسان کے خمیر میں شامل ہے۔

لوریا لکھاری نہیں تھا اس کی زندگی میں اس کی تعلیمات سے بہت کم لوگ واقف تھے مگر اس کے ملفوظات اس کے شاگردوں نے آنے والی نسلوں کے لیے محفوظ کئے اور بعضوں نے یورپ میں ان کی تشہیر کی۔ 1650ء تک لوریائی کبالہ یہودیوں میں ایک عوامی تحریک بن چکی تھی، ایک واحد مذہبی سسٹم جسے قبول عام کی سند حاصل تھی۔ اس لیے نہیں کہ اسے سائنسی اور عقلی طور پر ثابت کیا جا سکتا تھا، ظاہر ہے کہ یہ تو ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ اس نے بالکل واضح طور پر کتاب پیدائش کو تقریباً ہر معاملے میں رد کیا تھا مگر انجیل کا لفظی مطالعہ جدید طرزِ فکر ہے جس کا سرچشمہ دیومالائی فکر پر عقلی شعور کا حاوی ہوتا ہے۔ نئے دور سے پہلے یہودی، عیسائی اور مسلمان سبھی اپنی مقدس الہامی کتابوں کی آیات کی تفسیر علامتی اور تمثیلی انداز میں کیا کرتے تھے اس لیے کہ خدائی کلام لامحدود اور بے کراں ہے۔ اس سے کئی معانی اخذ کئے جا سکتے تھے اس لیے کئی جدید مذہبی لوگوں کی طرح یہودی اس بات سے پریشان نہیں ہوئے تھے کہ لوریا نے انجیل کے سیدھے سادے معنوں سے اختلاف کرتے ہوئے الگ راستہ اختیار کیا ہے۔ لوریا کی دیومالا ان کے لیے سند تھی کیونکہ وہ اس

میں اپنی زندگی کی جھلک دیکھتے تھے اس کے معنی اور جواز تلاش کرتے تھے۔ وجود میں آنے والی نئی دنیا میں سے ایک کمزور اور بے آسرا مخلوق کی طرح باہر دھکیلے جانے کی بجائے ان کا تجربہ زندگی کی بنیادی حقیقتوں سے جڑا ہوا تھا۔ لوریائی دیومالا کی رو سے تو خدا کو بھی جلاوطن ہونا ہوتا ہے۔ تخلیق کے عمل میں ہر چیز اپنے مقام سے ہٹ جاتی ہے۔ خدا کا نور مادیت میں اسیر ہو جاتا ہے اور نیکی اس پر مجبور ہے کہ وہ بدی کو چیلنج کرے اور یہ کہ تلافی کے عمل میں یہودی مردود اور مقہور نہیں تھے بلکہ اس عمل کا مرکزی کردار تھے۔ حضرت موسیٰ کی شریعت اور تورات کے احکام کی مکمل تعمیل کے ساتھ سیفڈ کے مذہبی جشن سے یہ کائناتی جلاوطنی ختم ہو سکتی ہے۔ اس کے بعد یہودی شیخناہ کو خدا سے ملانے اور یہودیوں کو ان کی موعودہ سرزمین اور باقی دنیا کو اس کے صحیح راستہ پر لے جانے میں مدد کر سکتے ہیں بحالی کے اس عمل کا نام (Tikkun) ہے یہ متھ یہودیوں کے لیے بدستور اہم ہے۔ یہودیوں پر ہٹلر کے مظالم کے المیہ کے بعد بعضوں کا خیال ہے کہ انہوں نے خدا کو اپنی خدائی میں بے بس پایا ہے۔ کیونکہ اس کی تخلیق اس کے قابو سے باہر ہو چکی ہے۔ خدا کے نور سے نکلنے والی شعاعوں اور مادے میں ان کی اسیری کی امیجری اور تکن (واپسی) کا تصور آج بھی یہودیوں کی دیومالا میں موجود ہیں۔ کبالائی دیومالا نے یہودیوں کو شعور دیا کہ وہ اپنی موجودہ زندگی اور اس زندگی میں تمیز کر سکیں جس کی انہوں نے آرزو کی تھی۔ وہ خود اپنے آپ میں ایک سچائی تھی اور کسی گہری سطح پر اس سچائی کی مظہر بھی تھی۔ اپنے اظہار کے لیے وہ نہ توریشنلزم کی محتاج تھی اور نہ اسے اس کی ضرورت تھی۔ آج ہم کہہ سکتے ہیں کہ لوریائی متھ ایک استعارہ یا علامت تھی مگر ایسا کہنا بھی تو اسے ریشنلزم کے زاویے سے دیکھنا ہوا۔ اوریجنل یونانی میں علامت (Symbol) کا مطلب ہے کہ دو چیزیں اکٹھی اس طرح پھینکی جائیں کہ وہ جدا نہ ہو سکیں مگر مغرب نے جب سے کہنا شروع کیا کہ مذہبی رسم یا مقدس امیج کی حیثیت صرف ایک علامت کی ہے تو اس سے جدید آگہی کا دور شروع ہوا جو ایسی جدائیوں پر مصر ہے۔

روائتی مذہب میں متھ کو مسلک سے جدا نہیں کیا جا سکتا کیونکہ اسی سے تو عبادت گزاروں کی زندگی میں بہار آتی ہے۔ ان کی معمول کی زندگیوں میں حقیقت کا رنگ بھرا جاتا ہے جس کا ذریعہ مذہبی تہوار، رسمیں اور ریاضتیں ہیں۔ اپنے طاقتور سمبلزم کے باوجود لوریائی کبالہ یہودیوں کے لیے اتنا اہم اور ناگزیر نہ ہوتا اگر اس کے اظہار اور رابطہ کا ذریعہ مذہبی رسمیں اور تہوار وغیرہ نہ

ہوتے جن کی وجہ سے یہودی جلاوطنوں میں سرفرازی اور سربلندی کا احساس پیدا ہوتا تھا۔ سیفڈ میں کبالائی خصوصی طور پر مذہبی رسمیں اس طرح ادا کرتے کہ لوریا کے مذہبی تصورات دہرائے جاتے۔ وہ شب بیداری کا اہتمام کرتے تا کہ شیخنا سے ان کا تعلق ان کی پہچان ہو سکے جو ان کے خیال میں ایک عورت ہے جو دل میں خدا کی آرزو لیے دنیا بھر میں بھٹکتی رہتی ہے۔ یہودی آدھی رات کو بیدار ہو جاتے تھے۔ اپنے جوتے اتار دیتے، خوب روتے اور اپنے چہرے مٹی میں رگڑتے اس طرح وہ اپنا غم اور اپنے ٹھکرائے جانے کا دکھ ظاہر کرتے تا کہ کھوئے جانے کے تجربے کو خدا کی ذات سے جوڑ سکیں جس نے ایسا ہی دکھ برداشت کیا ہے۔ وہ رات بھر آہ وزاری کرتے، عاشقوں کی طرح خدا سے فریاد کرتے۔ جدائی کے دکھ کا اظہار کرتے کہ جس کا مرکز اور سرچشمہ جلاوطنی کا عذاب ہے۔ پچھتاوے کے طور پر وہ اپنے آپ کو اذیتیں دیتے۔ برف میں لوٹتے، فاقے کرتے یا کوڑوں کی مار برداشت کرتے ہوئے تکن کے تقاضے پورے کرتے۔ شیخناہ کی طرح دیہات میں دور دور بھٹکتے پھرتے اور اس طرح خود اپنے بے گھر، بے در ہونے کا احساس اُجاگر کرتے۔ یہودی قانون کے مطابق لازم تھا کہ عبادت اجتماعی طور پر ادا کی جائے کیونکہ اسی صورت میں اس کے اندر گہرائی اور معنویت آسکتی تھی۔ عبادت کے موقعہ پر کم از کم دس مردوں کا ہونا ضروری تھا۔ مگر سیفڈ میں یہودیوں کو تنہا عبادت کرنے کی ہدایت کی گئی تا کہ بالکل صحیح معنوں میں انہیں اپنی تنہائی اور غیر محفوظ ہونے کا تجربہ ہو۔ تنہائی میں عبادت کرنے سے یہودی باقی سوسائٹی سے کچھ دور ہو جاتا۔ اسے بالکل مختلف تجربے کے لیے تیار کیا جاتا تھا جس سے اسے ایک ایسی دنیا میں یہودیوں کی تباہ کن تنہائی کا اندازہ ہوتا جس سے یہودیوں کے وجود کو ہمیشہ خطرہ رہتا تھا۔

لوریا سختی سے اس بات پر قائم تھا کہ آوارگی کی اجازت نہیں ہے۔ کبالائی اپنے غم والم کے ساتھ ضبط، نظم اور سٹائل کے ساتھ اس طرح زندہ رہیں کہ انہیں سچی مسرت نصیب ہو، شب بیداری کی ریاضتیں طلوع سحر کے وقت ختم ہوتیں جب ذات پاک کے ساتھ شیخناہ کا دوبارہ ملاپ ہوتا اور اس طرح انسان کی خدا سے دوری ختم ہو جاتی۔ کبالائیوں کو تلقین کی گئی کہ وہ اپنی زندگی خدا کی امانت سمجھیں۔ دنیا کے تمام مذاہب اس پر زور دیتے ہیں کہ عملی خدا ترسی اور رواداری کے بغیر ہر روحانیت بے معنی ہے لوریائی کبالہ کی مذہبی بصیرت کا بھی یہی تقاضا تھا۔ والدین کی نافرمانی،

غیبت، جنسی جرائم اور لوگوں کی عزتِ نفس مجروں کرنے کی شدید سزائیں مقرر تھیں۔ آخر میں دنیا کے اکثر مذاہب کی صوفیانہ ریاضتیں کبالائیوں کو سکھائی جاتیں۔ جو سانگی کی گہرائیوں میں اتر کر ان کے لیے وجدانی بصیرت کا ذریعہ بنتیں۔ سیفڈ میں یہ کیا جاتا کہ جن حروف سے خدا کا نام مرتب ہوتا تھا انہیں مراقبہ کا محور بنایا جاتا۔ جس سے کبالا کرنے والے کو اپنی ذات کے ایک حصے میں خدا کے جلوہ گر ہونے کا احساس ہوتا۔ جو کبالائی اس روحانی واردات سے دوچار ہوتا اس کا درجہ بہت بلند ہو جاتا بلکہ بڑے بڑے کبالائی اسے پیغمبر کا رتبہ دیتے۔ وہ گویا کہ ایک نئی مائیتھوس کی تخلیق کرتا اور لوریا کی طرح مذہب کی نامعلوم صداقتوں کا انکشاف کر سکتا تھا۔ ان مراقبوں سے کبالائیوں کو بڑی مسرت حاصل ہوتی تھی۔ ہیم وائٹل (1542-1620) لوریا کا شاگرد تھا۔ اس کا کہنا ہے کہ میں وجد کے عالم میں کانپنے اور جلال وسرور کی کیفیت میں جھومنے لگتا ہوں۔ کبالائیوں کو اس سے نئی بلندیوں اور ایسے نئے وژن کا احساس ہوتا تھا جو اس ظالم اور جاہل دنیا کو بدل سکتا تھا۔

ریشنلزم نے عملی دنیا میں تو حیرت انگیز کامیابی حاصل کی ہے مگر اس سے ہمارے دکھوں میں کمی نہیں ہوئی۔ اسپین کے تباہ کن تجربے کے بعد کبالائیوں نے دیکھا کہ وہ ریشنلزم ہمارے تو کسی کام نہ آیا جو اندلس کے یہودیوں میں بہت مقبول تھا۔ زندگی میں کوئی معنی باقی نہیں رہے تھے۔ اور یہ تو مانی ہوئی بات ہے کہ بے معنی زندگی انسان کا مایوسیوں میں دھکیل دیتی ہے۔ زندگی قابل برداشت بنانے کے لیے جلاوطن یہودیوں نے مائیتھوس اور تصوف کا رخ کیا۔ جنھوں نے انہیں اس قابل بنادیا کہ وہ اپنی اُمنگوں اپنے زیاں اور دکھ کے غیر شعوری ذرائع سے رابطہ کر سکیں اور ان کی زندگی کو ایک ایسا وژن دیا جس سے انہیں سکون میسر ہوا۔

اس بات کا بھی خیال رکھنا چاہیے کہ اگنٹیئس کے برعکس لوریا اور اس کے رفیقان کار، یہودیوں کا کوئی سیاسی لائحہ عمل نہیں دے سکے۔ یہ ٹھیک ہے کہ کبالائی اسرائیل میں آباد ہو گئے مگر وہ صیہونی (Zionist) نہیں تھے۔ لوریا نے ان سے یہ نہیں کہا تھا کہ وہ مقدس سرزمین میں جا کر اپنی جلاوطنی ختم کر دیں۔ اس نے اپنی دیومالا یا اپنے صوفیانہ وژن سے کوئی آئیڈیالوجی تخلیق نہیں کی جو سیاسی طور پر عملی قدم اٹھانے کے کام آتی۔ دراصل یہ کام مائیتھوس کے کرنے کا نہیں ہے۔ سیاسی سرگرمی، لوگوں کا میدان ہے جہاں ریشنلزم کی بالادستی ہے۔ لوریا جانتا تھا کہ ایک

صوفی کی حیثیت سے اس کا کام یہودیوں کو روحانی اور جسمانی اذیت سے بچانا ہے مگر جب اس کی دیومالا سے سیاست کی عملی دنیا میں کام لیا گیا تو اس کے نتائج تباہ کن ثابت ہوئے۔

کسی مسلک، عبادت اور مذہبی مراسم کے بغیر، متھ اور ڈاکٹرین کے کوئی معنی نہیں۔ خصوصی مذہبی تقریبات اور رسوم کے بغیر لوریا کی پیدائش کہانی ایک بے معنی فکشن ہوتی۔ مذہبی عبادت کے واسطے سے ہی مذہبی عقیدوں میں جان پڑتی ہے اگر لوگ مذہبی اور روحانی سرگرمیاں چھوڑ دیں تو ان کا ایمان ان کے ہاتھوں سے جاتا رہے۔ ان یہودیوں کے ساتھ بھی یہی ہوا جنہوں نے عیسائیت اختیار کر لی تھی اور ان جدید خیالات کے لوگوں کے ساتھ بھی یہی ہوا جنہوں نے ان رسوم و عبادات کو ترک کیا اور سمجھا کہ مذہبی دیومالا کی نظر میں کوئی حیثیت کوئی معنی نہیں۔ نئے عیسائیوں میں سے اکثر نے اپنا رشتہ مکمل طور پر کیتھولک ازم سے جوڑ لیا۔ ان میں سے بعض جیسے (Juan Luis Vives 1492-1520 or Juan de Valder 1500-41) کاؤنٹر ریفارمیشن کے لیڈر بن گئے اور اس طرح انہوں نے ماڈرن کلچر کے ابتدائی دور میں اہم کردار ادا کیا۔ اسی طرح جیسے بعد میں سیکولر یہودیوں نے شاہراہ زندگی کے عظیم دھارے میں ڈوب کر ماڈرن ازم پر اپنا گہرا اثر چھوڑا۔ ان میں کارل مارکس سگمنڈ فرائڈ، ایمل ڈرکیم، البرٹ آئن سٹائن اور لڈوگ کے نام بہت اہم ہیں۔

نامور نئے عیسائیوں میں ایک نام ٹریسا آف اویلا (1515-82) ہے جو جان آف کراس کی ٹیچر تھی۔ اسے ڈاکٹر آف دی چرچ ہونے کا اعزاز حاصل تھا۔ وہ اسپین میں روحانیت کے اندر اصلاح کی پہلی علمبردار تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ جن عورتوں کو اچھی مذہبی تعلیم نہیں مل سکی اور جس کی وجہ سے وہ نااہل استادوں کے اثر میں آ کر صحیح راستے سے بھٹک گئی ہیں انہیں اعلیٰ مذہبی تعلیم دی جائے۔ اس کا کہنا تھا کہ ہسٹریائی وژن اور وجد و سرور کا تقدس سے کوئی واسطہ نہیں۔ تصوف کا تقاضا تو منظم نارمل زندگی، متوازن شخصیت اور اعلیٰ قابلیت ہے۔ جان آف کراس کی طرح ٹریسا بھی تصوف میں جینئس کا درجہ رکھتی تھی۔ اسے جدیدیت سے بھی وابستگی تھی۔ اگر وہ یہودیت کی پیرو ہی رہتی تو اس میں یہ خوبیاں نہیں پیدا ہو سکتی تھیں کیونکہ کبالا کے حلقے میں تو صرف مرد ہی شامل ہو سکتے تھے مگر اس کے باوجود ٹریسا کی روحانیت پر یہودیت کی گہری چھاپ تھی۔ "The Interior castle" میں اس نے بتایا کہ خدا تک پہنچنے کے لیے روح کو سات ملکوتی مدارج سے

ہو کر جانا ہوتا ہے۔ یہ سکیم واضح طور پر Throne Mysticism کے تصوف سے مشابہہ تھی جو پہلی صدی سے بارھویں صدی تک یہودی دنیا میں مقبول رہا۔ ٹریسا عیسائیت کے ساتھ سچی وفادار تھی اس کے باوجود یہودیوں کی طرح عبادت کرتی تھی اور یہی طریقہ اس نے اپنی پیروکاروں کو بتایا تھا۔

ٹریسا کے معاملہ میں یہودیت اور عیسائیت کا امتزاج نتیجہ خیز ثابت ہوا مگر اس سے کم تر ذہن اور شخصیت والے نئے عیسائیوں کی زندگی میں ان دونوں مذاہب نے تصادم کی صورت اختیار کر لی۔ اس کی مثال پہلا محتسب Thomas de Torquemada (1420-98) ہے جس نے اسپین میں رہی سہی یہودیت ملیامیٹ کرنے میں بڑے جوش اور سرگرمی سے حصہ لیا۔ شاید ایسا کر کے وہ غیر شعوری طور پر خود اپنے دل سے یہودیت کے اثرات مٹا رہا تھا۔ زیادہ تر لوگوں نے جبراً عیسائیت اختیار کی تھی اور ایسا لگتا تھا کہ ان میں سے بہت سے لوگ نئے مذہب سے پوری طرح مانوس نہ ہو سکے۔ اس میں حیرانی کی بات کوئی نہیں کیوں کہ جب عیسائی بن جاتے تو فوراً ہی احتساب کی تلوار ان کے سروں پر لٹکنے لگتی اور وہ خوف میں زندگی گزارنے پر مجبور ہو جاتے کیونکہ بے ہودہ الزام لگا کر انہیں گرفتار کر لیا جاتا مثلاً یہ کہ جمعے کی شام بتیاں روشن کرنا یا صدری مچھلی کھانے سے انکار کرنا ایسے جرائم تھے جن کی وجہ سے انہیں قید، اذیت بلکہ موت کی سزا بھی دی جاتی تھی۔ ان جرائم کی کم از کم سزا جائیداد کی ضبطی تھی۔ اس ظلم وستم سے تنگ آ کر بعض لوگوں نے تو مذہب کو سلام کیا اور اس سے الگ ہو گئے۔ وہ اپنا رشتہ کیتھولک ازم سے نہیں جوڑ سکے اس لیے کہ اس نے ان کی زندگی جہنم بنا دی تھی اور یہودیت اب ایک بھولی بسری، بے حقیقت اور بے روح کہانی تھی۔ 1492 کی جلاوطنی کے بعد اسپین میں ایسے یہودیوں کا کوئی وجود باقی نہ رہا جو عبادت گزار تھے۔ اگر نئے عیسائی بھی یہ چاہتے کہ وہ خفیہ طور پر اپنی مذہبی عبادات ادا کریں تو انہیں یہودی شریعت اور مذہبی مراسم سکھانے والا کوئی نہیں تھا۔ چنانچہ انہوں نے بیزار ہو کر اپنا تعلق تمام مذاہب سے توڑ لیا۔ سیکولرازم سے بہت پہلے یورپ کے ان حصوں میں مذہب سے بے تعلقی عام ہو گئی تھی۔ بنیادی طور پر یہ ایک ماڈرن رویہ تھا جن کی مثالیں ہمیں آئبیریائی نما ان یہودیوں میں ملتی ہیں جو بالجبر عیسائی بنائے گئے تھے۔

اسرائیلی سکالر Yermicjher Yahu کے مطابق یہودی سے عیسائی بننے والوں میں یہ

بات عام تھی کہ وہ تمام مذاہب کو شک کی نظر سے دیکھنے لگے۔1492 کی جلاوطنی سے پہلے بھی Fernando dela caballeria/Pedro جیسے اسپین کے بڑے خاندانوں سے تعلق رکھنے والے سیاست، آرٹ اور لٹریچر میں کھوئے ہوئے تھے اور انہیں مذہب کی کوئی پرواہ نہیں تھی۔ پیڈروا پنے نقلی عیسائی بھائی کا کھلم کھلا مذاق اڑاتا اور کہتا کہ اس کے مذہب نے اسے کھلا چھوڑ دیا ہے کہ وہ جو چاہے کرے اس پر کسی مقدس قانون قاعدے کا اطلاق نہیں ہوتا۔1490 سے ذرا پہلے Alraso de Montalban کو احتساب کے سامنے لایا گیا تھا کہ اس نے روزوں میں پنیر اور گوشت کھالیا تھا چنانچہ اس نے صرف عیسائی روزہ ہی نہیں توڑا تھا بلکہ اس نے یہودیت کے قانون کی خلاف ورزی بھی کی تھی کہ جس نے گوشت اور دودھ سے بنی ہوئی چیزیں بیک وقت استعمال کرنے سے منع کیا تھا۔ ظاہر ہے کہ الوارد کا دونوں میں سے کسی مذہب کے ساتھ کوئی کمٹمنٹ نہیں تھا۔ کیتھولک ازم سے اسے کوئی گہرا لگاؤ نہیں ہوسکتا تھا۔ کیونکہ اسکے والدین احتساب نے قتل کروادیے تھے ان پر الزام تھا کہ خفیہ طور پر وہ یہودیت پر عمل پیرا تھے۔ ان کی لاشیں قبریں کھود کر نکالی گئیں اور ان کی ہڈیاں جلادی گئیں ان کی جائیداد بھی ضبط کر لی گئی۔ یہودیت کے ساتھ معمولی سا تعلق بھی نہ رہنے سے الوارد مذہبی بے یقینی کی طرف دھکیلا گیا۔ آخر کار ستر برس کی عمر میں وہ قید کر لیا گیا۔ اس پر الزام تھا کہ وہ حیات بعدالموت کے تصور کا منکر ہے۔ ''مجھے اس دنیا میں اچھی زندگی بسر کرنے دو'' وہ اکثر کہتا تھا کہ'' کیوں کہ میں نہیں جانتا کہ اس دنیا کے علاوہ بھی کوئی دنیا ہے۔''

الوارد کی سزایابی کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس کے داماد Femando de Rojas کی حیثیت بھی مشکوک ہوگئی۔ وہ "La Cebstina" کے عنوان سے ایک بلیک کامیڈی کا مصنف تھا۔ اس کی تصنیف پہلی بار 1499 میں شائع ہوئی اس میں سیکولر نظریہ کی ایک ہلکی سی جھلک موجود ہے۔ ''خدا کا کوئی وجود نہیں محبت سب سے اعلیٰ قدر ہے۔ محبت مر جاتی ہے تو دنیا ویسٹ لینڈ، ایک بنجر سرزمین بن جاتی ہے۔ ڈرامہ کے آخر میں پلیبیر یو اپنی بیٹی کی خودکشی کا ماتم کرتا ہے کہ صرف وہی پلیبیر یو کی زندگی کو معنی دیتی تھی۔ دنیا، اے دنیا وہ آخر کہتا ہے'' میں جوان تھا تو سمجھتا تھا کہ کوئی قانون ہے جو تجھے چلا رہا ہے اور تیرے اعمال کا نگراں ہے مگر اب تو خامیوں کا پہاڑ ہے، ایک ڈراؤنا صحرا درندوں کی کچھار، ایک لایعنی کھیل جس میں انسان کولہو کے بیل کی طرح ایک دائرے

میں گھومتا رہتا ہے۔ایک سنگلاخ میدان،سانپوں کا جنگل،اندیشوں کا سیلاب،آنسوؤں کا دریا، اذیتوں کا سمندر اور ایک لاحاصل اُمید ہے۔روجاس اپنے پرانے مذہب پر تو عمل نہیں کر سکتا تھا جب کہ نئے مذہب سے اس لیے دور ہوا کہ راستے میں احتساب کی شقاوت حائل تھی۔آخری کام جو فرڈیننڈ اور ازابیلا کر سکتے تھے۔وہ یہودیوں کو یقین اور ایمان سے محروم کرنا تھا مگر جبر کا تو الٹا اثر ہوتا ہے۔لوگوں کی مرضی کے خلاف ان پر نظریات مسلط کرنے سے برے نتائج پیدا ہوتے ہیں۔ جدیدیت پسندوں کی حیثیت سے فرڈیننڈ اور ازابیلا دونوں کا انداز جارحانہ تھا۔وہ ہر اختلاف کچل دینا چاہتے تھے مگر ان کے تعزیری ہتھکنڈوں کے سبب یہودیوں کی خفیہ انڈر گراؤنڈ تنظیم قائم ہوئی اور یورپ سے پہلی بار دہریت اور سیکولرازم کا نعرہ بلند ہوا۔بعد میں کئی عیسائی اس مذہبی ظلم و تشدد سے اس قدر بیزار ہوئے کہ انہوں نے تمام مذاہب سے انکار کر دیا۔مگر سیکولرازم بھی اتنا ہی سخت گیر ثابت ہوا۔بیسویں صدی میں اس کے تسلط کے دوران ہی بنیاد پرستی کی انتہا پسند تحریکوں نے سر اُٹھایا۔

1492 میں تقریباً اسی ہزار یہودیوں کو پرتگال میں پناہ ملی۔یہ پرتگالی یہودی اور ان کے جانشین دہریت کے زبردست علمبردار تھے۔ان میں سے بعض یہودی تو بڑی شدت کے ساتھ اپنے مذہب پر قائم رہنا چاہتے تھے مگر ایسا ہونا مشکل بلکہ ناممکن تھا کہ وہ کسی مسلک سے پوری طرح وابستہ نہیں تھے جو یہودی 1492ء میں جلاوطن ہو کر پرتگال چلے گئے تھے ان میں ان یہودیوں سے زیادہ جان تھی جو اپنا مذہب ترک کر کے عیسائی بن گئے تھے کیونکہ انہوں نے مذہب چھوڑنے پر جلاوطنی کو ترجیح دی تھی۔پرتگال میں جب 1495 میں Manuel تخت نشین ہوا تخت نشین ہوا تو اسے فرنینڈس اور ازابیلا نے مجبور کیا کہ وہ اپنی سلطنت میں بسنے والے یہودیوں کو جبراً عیسائی بنائے۔مگر اس نے سمجھوتے کی یہ راہ نکالی کہ ایک نسل تک کے لیے یہودیوں کو احتساب سے چھٹکارا دلوا دیا۔ان پرتگالی یہودیوں نے ایک انڈر گراؤنڈ تنظیم قائم کر لی جہاں تقریباً پچاس برس تک یہودی خفیہ طور پر اپنی مذہبی رسوم ادا کرتے رہے اور دوسروں کو بھی اپنے پرانے مذہب کی طرف بلاتے رہے۔

مگر یہ یہودیت کی تبلیغ کرنے والے باقی یہودی دنیا سے کٹ گئے تھے۔انہوں نے عیسائیت جبراً اختیار کی تھی مگر کیتھولک تعلیم تو حاصل کی تھی۔چنانچہ ان کے ذہن عیسائیت سے متاثر

تھے۔ان کے خیالات،تصورات پر بھی اسی کا غلبہ تھا۔ وہ اکثر عیسائیوں کے انداز سے یہودیت کے متعلق باتیں کرتے اور سوچتے تھے۔مثال کے طور پر انہیں یقین تھا کہ انہوں نے حضرت عیسیٰ کی بجائے حضرت موسیٰ کے قانون کے وسیلے سے نجات حاصل کی ہے۔ یہ ایک ایسا تصور ہے کہ جس کی گنجائش یہودیت میں بہت کم ہے۔ وہ یہودیت اوراس کے قانون کا بہت بڑا حصہ فراموش کر چکے تھے اور وقت گزرنے کے ساتھ یہودیت میں ان کی بصیرت بتدریج کم ہوتی چلی گئی۔کبھی اپنے مذہب سے ان کی واقفیت کا واحد ذریعہ یہود دشمن عیسائیت کی مناثراتی تحریریں ہوتیں۔ آخرکار یہ ہوا کہ وہ جس مذہب پر عمل کر رہے تھے وہ صحیح معنوں میں نہ تو یہودیت تھی اور نہ ہی عیسائیت تھی۔ان کا معاملہ ترقی پذیر ملکوں کے ان لوگوں سے مختلف نہیں تھا جن میں مغربی کلچر کی واجبی سی سمجھ تو موجود ہے مگر جن کا روائتی طرز زندگی، جدیدیت کے بوجھ تلے اس طرح دب گیا ہے کہ وہ اپنے پرانے طور طریقے بھی اپنا نہیں سکتے۔ پرتگال کے یہودیوں کو بس ایسی ہی تنہائی کا سامنا تھا۔انہیں ایک ایسے کلچر میں جذب ہونے کے لیے مجبور کیا گیا تھا جو ان کی باطنی زندگی سے مطابقت نہیں رکھتا تھا۔سولھویں صدی کے آخر میں بعض یہودیوں کو آئبیریا کے جزیرہ نما سے چلے جانے کی اجازت مل گئی تھی۔ نئے عیسائیوں نے پہلے ہی اسپین کی نوآبادیوں اور جنوبی فرانس میں اپنی بستیاں بسالی تھیں مگر پھر بھی وہاں یہودیوں کو اپنے مذہب کی آزادی نہیں تھی۔مگر سترھویں صدی میں یہودیت کی تبلیغ کرنے والے نئے عیسائی، وینس،ہیمبرگ اور لندن چلے گئے جہاں وہ آزادی سے یہودیت کا پرچار کر سکتے تھے۔سب سے بڑی بات یہ کہ احتساب کے ستائے پناہ گزین، ایمسٹرڈم میں آنا شروع ہوگئے جو ایک نئے یروشلم کی حیثیت اختیار کر گیا تھا۔ ہالینڈ، یورپ میں سب سے زیادہ روادار ملک تھا۔اس کی حیثیت ری پبلک کی تھی مگر اپنی زوردار تجارت کی وجہ سے ایک کمرشل ایمپائر کا درجہ رکھتا تھا۔ اسپین سے آزادی حاصل کرنے کے لیے اپنی جدوجہد کے دوران آزاد خیالی اس کی شناخت بن گئی تھی جبکہ عبرانیوں کی قدریں اور رویہ اس کے برعکس تھا۔1657 میں یہودی ری پبلک کے باقاعدہ شہری بن گئے اور اپنی مخصوص اور محدود آبادیوں سے باہر آ کر آباد ہونا شروع ہوگئے حالانکہ اکثر یورپی شہروں میں انہیں ان کی آبادیوں تک محدود رکھا گیا تھا۔ان کی کاروباری صلاحیتوں کی وجہ سے ڈچ انہیں اچھا سمجھنے لگے۔ یہودی وہاں نمایاں تاجروں کی پوزیشن اختیار کر گئے اور غیر یہودیوں کے ساتھ گھل مل گئے۔ان کی سماجی

زندگی میں بھی جان پڑ گئی اور تعلیمی نظام بھی شاندار ہو گیا۔

بے شک بہت سے یہودی سماجی اور معاشی مواقع کی تلاش میں ایمسٹرڈم آئے مگر ایک معقول تعداد ان یہودیوں کی بھی تھی جو یہودیت کی تعلیمات پر عمل کرنے کے لیے بے چین تھے مگر یہ کام آسان نہیں تھا۔ نئے یہودی جو آئبیریا سے آئے تھے انہیں ایک ایسے مذہب میں لانا جس سے وہ زیادہ تر واقف نہ تھے بہت مشکل تھا۔ انہیں اپنے مذہب میں واپس لانا اور ان کی مشکلات کا خیال رکھتے ہوئے اپنی روایات سے بھی انحراف نہ کرنا آسان نہ تھا۔ انہیں داد دینی چاہیے کہ زیادہ تر یہودی ابتدائی تناؤ کے باوجود اس عبوری دور سے سرخرو نکل آئے اور اپنے آبائی مذہب کی طرف واپسی ان کے لیے خوشگوار تجربہ بن گیا۔ اس کی ایک مثال Orobio de Castro ہے۔ کاسترو ڈاکٹر اور میٹافزکس کا پروفیسر تھا۔ وہ برسوں اسپین میں خفیہ طور پر یہودیت کی تلقین کرتا رہا تھا۔ آخر گرفتار ہوا اور احتساب کے ہاتھوں بڑی اذیتیں برداشت کیں پھر تائب ہو کر اپنی جان چھڑائی اور عیسائی بن کر ڈاکٹری پڑھانے لگا۔ آخر کار اپنی منافقانہ زندگی سے تنگ آ کر ایمسٹرڈم چلا آیا اور یہودیت کی زبردست حمایت کے علاوہ واپس آنے والے یہودیوں کی تعلیم و تربیت کرنے لگا۔

کاسترو نے ایک ایسے طبقے کا ذکر کیا ہے جس کے لیے روائتی یہودیت کے قوانین اور ضابطوں کی پیروی کرنا بہت مشکل تھا۔ کیونکہ وہ بے معنی اور دشوار تھے۔ کاسترو کی طرح انہوں نے بھی سائنس میں اعلیٰ تعلیم حاصل کی تھی انہیں فزکس، ریاضی اور کیمسٹری وغیرہ سے واقفیت حاصل تھی مگر کاسترو نے ان کے متعلق کہا کہ وہ تکبر، غرور اور خود ستائی میں مبتلا ہیں اور سمجھتے ہیں کہ وہ سب کچھ جانتے ہیں۔

''ان کا خیال ہے کہ اگر وہ ان لوگوں سے کچھ سیکھنے پر آمادہ ہو گئے کہ جنہیں مقدس قانون کے جاننے میں کمال حاصل ہے تو ایسا کرنا ان کی شان کے خلاف ہو گا اس لیے وہ ایسے علوم رد کر دیتے ہیں جنہیں وہ نہیں جانتے۔'' یہ یہودی برسوں سے مذہبی لحاظ سے تنہا اور الگ تھلگ رہ رہے تھے۔ وہ مجبور تھے کہ اپنی ریشنل صلاحیتوں پر بھروسہ کریں۔ ان کی کوئی مذہبی زندگی نہیں تھی۔ رسوم و عبادات نہیں تھیں۔ نہ انہیں تورات کی شریعت پر عمل کرنے کا تجربہ تھا۔ جب وہ پہلی مرتبہ ایمسٹرڈم آئے تو انہوں نے اپنے آپ کو ایک باعمل یہودی برادری میں پایا جس سے ان میں بے

سمت ہونے کا احساس ختم ہوگیا۔ ایک اجنبی کی نظر میں کتاب مقدس کے 613 احکام جابرانہ اور ناقابل فہم تھے۔ بعض احکام تو بوسیدہ ہو کر متروک ہو چکے تھے۔ دیگر احکام جن کا تعلق ناگوار غذائی پرہیزوں اور تزکیہ نفس سے تھا انہوں نے انہیں وحشیانہ اور بے معنی قرار دیا۔ بات یہ تھی کہ پرتگال میں بسنے والے یہودیوں کو غور و فکر کی عادت تھی۔ وہ ریشنل نقطۂ نظر سے چیزوں کو پرکھنے لگے تھے انہیں ان زبانی احکام کی پرواہ بھی نہیں تھی جو حلاکا Halakhah کے نام سے ابتدائی صدیوں میں مرتب ہوئے تھے وہ انہیں بھی جابرانہ اور غیر منطقی گردانتے تھے۔ اس لیے بھی کہ انہیں تو انجیل کی حمایت بھی حاصل نہیں تھی۔

مگر موسوی قوانین تورات کی اپنی ایک الگ مائیتھوس تھے۔ جب اسرائیلی جلاوطن کیے گئے ان کی عبادت گاہیں مسمار اور ان کی مذہبی زندگی منتشر کر دی گئی تو موسوی قوانین میں انہوں نے نئی امان اور اپنی منزل پائی۔ مقدس کو غیر مقدس اور حق کو باطل سے الگ کرنے کا تخلیقی عمل، دنیا کو ایک نئی ترتیب اور نیا چہرہ دینا تھا۔ جلاوطنی میں یہودیوں نے محسوس کیا کہ الہامی قانون سے ان کی واقفیت ان کے لیے زبردست مذہبی واردات ہے نئے زمانے کے لوگوں کی طرح یہودی اسے صرف ماضی کے حالات جاننے کا ذریعہ نہیں سمجھتے تھے بلکہ اس سے علم و بصیرت حاصل کرتے تھے جس سے انہیں قدرت کے اشارے سمجھنے میں مدد ملتی تھی۔ تورات خدا کا کلام تھا۔ اس کی گہرائیوں میں ڈوب کر یہودی وہ مقدس باتیں یاد کرتے جو خدا نے خود حضرت موسیٰ سے کہی تھیں۔ مقدس کلام بلند آواز میں دہرانے سے انہیں یہ عرفان حاصل ہوتا کہ وہ خدا کو اپنی ذات کا حصہ بنا رہے ہیں اور ایسا کرتے ہوئے وہ ایک نئی مقدس دنیا میں قدم رکھ رہے ہیں۔ خدا کے احکام پر عمل کرنے سے خدا کے ساتھ ان کی شدید روحانی وابستگی ان کی زندگی کے عام معمولات میں بھی عکس ریز ہوتی۔

ان میں سے کوئی بات بھی فوری طور پر اس ریشنل اندازِ فکر کی گرفت میں نہیں آ سکتی تھی کہ جس پر (Marronos) نئے عیسائی ساری عمر آس لگائے رہے۔ ان کے لیے مذہب کا یہ دیومالائی تصور بالکل نیا اور اجنبی تھا۔ کاسترو کا کہنا تھا کہ بعض نئے یہودی ناقابل بیان حد تک دہریئے بن گئے ہیں مگر وہ ایسے دہریئے نہیں تھے جیسے کہ بیسویں صدی میں ہوتے ہیں کیونکہ دہریت کے باوجود انہیں خدا پر ایمان تھا۔ وہ اور بات ہے کہ ان کا خدا انجیل کا خدا نہیں تھا۔ نئے

عیسائیوں نے ایک ریشنل مذہب بنالیا تھا جو خدا کے اس تصور سے مشابہ تھا جو بعد میں اٹھارھویں صدی کی عیسائی تحریک میں ابھرا جس میں خدا کے وجود کا اقرار مگر وحی سے انکار کیا گیا تھا۔ اس تحریک کی رو سے ان کا خدا تمام تخلیق کا باعث (First Cause) تھا اس کا وجود ارسطو نے منطقی طور پر ثابت کیا تھا۔ اس خدا کے تمام کام ریشنل انداز سے ہوتے ہیں اور وہ انسانی تاریخ میں خواہ مخواہ دخل نہیں دیتا۔ نہ نرالے معجزوں کے زور پر فطرت کے قوانین درہم برہم کرتا ہے اور نہ پہاڑوں کی چوٹیوں سے مہمل اور ناقابل فہم قوانین جاری کرتا ہے۔ اسے اس کی ضرورت بھی نہیں کہ اپنے قوانین وحی کے ذریعے نافذ کرے کیونکہ قوانین قدرت تو سب کی پہنچ میں ہیں۔ خدا کا یہی تصور انسانی ذہن میں آ سکتا تھا۔ ماضی میں یہودی اور مسلمان فلسفیوں نے خدا کا ایسا ہی تصور پیش کیا تھا مگر اہل ایمان نے یہ تصور قبول نہ کیا کیونکہ مذہبی نقطۂ نظر سے یہ تصور بالکل بے کار تھا۔ اس لیے کہ یہ تو پتہ ہی نہیں تھا کہ فرسٹ کاز کو انسان کے ہونے کا علم بھی ہے یا نہیں۔ کاملیت سے کم درجے کی بات تو وہ سوچ نہیں سکتا تھا۔ ایسے خدا کو انسان کے دکھ درد سے کیا دلچسپی ہو سکتی تھی۔ یہ اعزاز تو دیومالائی روحانیت کا تھا جو نئے عیسائیوں کی پہنچ سے باہر تھی۔

بہت سے نئے عیسائی (Morronos) جنہوں نے دوبارہ یہودیت اختیار کر لی تھی کسی نہ کسی حد تک حلاخی روحانیت سے متاثر ہوئے مگر بعضوں کے لیے یہ ممکن نہ تھا اس ضمن میں سب سے دردناک مثال (Uriel da Costa) کی ہے۔ وہ نئے عیسائیوں کے خاندان سے تھا۔ عیسائیوں نے ہی اسے تعلیم دلوائی تھی مگر بعد میں اسے احساس ہوا کہ عیسائیت ظلم و ستم اور انسان کے بنائے ہوئے قوانین کا مجموعہ ہے جس کا انجیل سے کوئی تعلق نہیں۔ اس کے بعد ڈا کوسٹا نے یہودیوں کے مذہبی لٹریچر سے رجوع کیا تو اس کے نتیجے میں اس نے یہودیت کا ایک ریشنل اور مثالی تصور پیش کیا۔ سترھویں صدی کے آغاز میں جب وہ ایمسٹرڈم گیا تو اسے یہ دیکھ کر صدمہ ہوا کہ عصری یہودیت کا بھی وہی حال ہے جو کیتھولک ازم کا تھا۔ یہودیت میں بھی انسانوں کے بنائے ہوئے قوانین اور قاعدے رواج پا چکے تھے۔

حال ہی میں بعض سکالروں نے ڈا کوسٹا کے بیان پر شک ظاہر کیا اور کہا کہ کسی نہ کسی سطح پر حلاخی یہودیت کے ساتھ پہلے ہی اس کی جھڑپ ہو چکی تھی اسے اس بات کا اندازہ نہیں تھا کہ یہودیوں کی عام زندگی پر حلاخا کا کتنا گہرا اثر ہے۔ ایمسٹرڈم میں ڈا کوسٹا یہودیت سے کوئی تعلق

قائم نہ کر سکا۔ اس نے حیات بعد الموت اور یہودیوں کے قوانین کے خلاف خوب لکھا اور دعویٰ کیا کہ اسے صرف فطرت کے قوانین اور انسانی شعور پر بھروسہ ہے۔ یہودی ملاؤں نے فوراً اس کا نوٹس لیا اور برسوں تک اس کا بائیکاٹ کیے رکھا۔ درد اور تنہائی کی بے رحم زندگی سے تنگ آ کر ڈا کو سٹا تائب ہو گیا تو یہودیت کے دامن میں اسے پناہ مل گئی مگر اس کے خیالات نہیں بدلے تھے اس کے لیے یہ ممکن نہیں تھا کہ وہ ان رسوم کے تحت زندگی بسر کرے جنہیں وہ فضول اور بے معنی سمجھتا تھا۔ چنانچہ دوبارہ پھر اس کا حقہ پانی بند ہوا۔ بالآخر 1640 میں اپنی مایوسیوں اور اذیتوں سے بددل ہو کر اس نے اپنے سر میں گولی مار لی۔

ڈا کوسٹا کے المیے سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس وقت تک سیکولرازم کسی طور پر بھی مذہب کا بدل نہیں بن سکا تھا۔ یہ تو ممکن تھا کہ کوئی شخص اپنا مذہب بدل دے مگر یہ ممکن نہیں تھا کہ مذہب کے بغیر زندہ رہ سکے۔ برسوں ڈا کوسٹا ایک اچھوت کی طرح تنہائی کا عذاب سہتا رہا۔ یہودیوں کی طرح عیسائی بھی اس سے دور رہتے تھے۔ بچے گلیوں میں اس کا منہ چڑاتے اور مذاق اُڑایا کرتے تھے۔ Juan do Peroda کو بھی اسی قسم کی صورت حال کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ وہ 1655 میں ایمسٹرڈم آیا تھا۔ اس نے ڈا کوسٹا کے معاملے میں ثالثی بھی کی ہوگی۔ وہ پرتگال میں یہودیوں کی زیرزمین تحریک کا بیس سال پرانا ممبر تھا مگر لگتا ہے کہ 1645 کے آس پاس وہ نئے عیسائیوں (Morranos) کے خیالات سے متاثر ہوا۔ وہ کوئی بڑا ذہین اور تیز فہم مفکر نہیں تھا مگر اس کے تجربے سے پتہ چلتا ہے کہ ریزن (عقل) پر انحصار کرنے سے یہودیت پر عمل ناممکن ہے۔ عبادت مسلک اور دیو مالائی شعور سے محروم پراڈو اسی نتیجے پر پہنچ سکتا تھا کہ خدا فطری قوانین کے ساتھ منسلک ہے۔ پھر بھی اس نے اپنی انڈر گراؤنڈ سرگرمیاں مزید دس سال تک جاری رکھیں۔ اس کے لیے یہودیت باہمی تعاون اور بھائی چارے کا نام تھا۔ جس کا تجربہ اسے یہودیوں کے ایک منظّم گروپ میں رہ کر ہوا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اسی تجربہ سے اس کی زندگی میں معنی آئے ہیں کیونکہ جب وہ ایمسٹرڈم پہنچا اور یہودی ملاؤں سے اس کا پالا پڑا تو بھی وہ یہودیوں ہی میں رہنا چاہتا تھا۔ ڈا کوسٹا کی طرح اس نے زندگی میں وہی سوچا اور کیا جو اسے اچھا لگا۔ یہودیت کے متعلق اس کے اپنے تصورات تھے مگر جب اسے حقیقت کا سامنا کرنا پڑا تو وہ سٹ پٹا گیا۔ اس نے کھلم کھلا اپنے اختلاف کا اظہار کیا کہ یہودیوں کو یہ خوش فہمی کیوں ہے کہ صرف وہی خدا سے

قریب ہیں اور یہ خدا کیا ہے کیا فرسٹ کاز اس سے بہتر نہیں ہے۔ اس کی بجائے ایک ایسی شخصیت کو خدا کیوں سمجھا جائے۔ جس نے اپنے وحشیانہ اور احمقانہ احکام پر عمل کرنے کا حکم دیا ہے۔ پروڈا مصیبت بن گیا کیونکہ یہودی معلم نئے یہودیوں کو نئے سرے سے مذہب کی تعلیم دے رہے تھے (جن میں اکثر پروڈا کے ہم خیال تھے) وہ اس طرح کی باتیں برداشت نہیں کر سکتے تھے چنانچہ 14 فروری 1657 کو پراڈو کا بائیکاٹ کیا گیا مگر اس نے اپنی کمیونٹی چھوڑنے سے انکار کر دیا۔

یہ دو انتہائی مخالف نظریات کا آپس میں تصادم تھا۔ اپنے اپنے نقطۂ نظر کے لحاظ سے پراڈو اور یہودی ملا دونوں ہی سچے تھے۔ پراڈو روایتی یہودیت میں کسی گہری معنویت کا سراغ نہ پا سکا۔ اس کا ذہن دیو مالائی اثر سے بالکل کورا ہو چکا تھا۔ نہ اس نے کبھی یہ کیا تھا کہ عبادات میں ڈوب کر کسی مسلک کے زور پر مذہب کی گہرائی تک پہنچ سکے وہ ہمیشہ ریزن (عقل) کا سہارا لیتا یا اپنی بصیرت پر بھروسہ کرتا تھا جنہیں اب وہ ترک بھی نہیں کر سکتا تھا مگر ملا بے چارے بھی سچے تھے۔ خدا کے متعلق پراڈو کے تصور کا یہودیت کی کسی فارم سے کوئی واسطہ نہ تھا۔ دراصل پراڈو ایک سیکولر یہودی بننا چاہتا تھا مگر سترھویں صدی میں ایسی کوئی جنس کہیں موجود نہیں تھی۔ دراصل یہ چپقلش کا آغاز تھا جو بالکل ایک ریشنل ماڈرن ورلڈ ویو اور متھ اور مسلک کی آغوش میں پلے ہوئے مذہبی شعور کے مابین ناگزیر تھی۔

اصولوں پر مبنی ان آویزشوں میں کسی فرق کا رویہ معقول نہیں تھا۔ پراڈو گستاخ شخص تھا۔ وہ ملاؤں کو گالیاں بکتا بلکہ ایک موقعہ پر تو اس نے سیناگوگ (یہودی معبد) میں آ کر تلوار سے ان کے سر قلم کرنے کی دھمکی دے دی۔ ملاؤں نے بھی کوئی کسر باقی نہ چھوڑی۔ انہوں نے پراڈو کے پیچھے جاسوس لگا دیا۔ جس نے بتایا کہ پراڈو کے خیالات اور زیادہ باغیانہ ہو گئے ہیں۔ بائیکاٹ کے بعد اس نے اپنا مؤقف بنا لیا کہ سب مذاہب فضول ہیں اور نام نہاد وحی کی بجائے صرف ریزن (عقل) کو یہ حق حاصل ہونا چاہیے کہ وہ فیصلہ کرے کہ سچ کیا ہے۔ پتہ نہیں کہ پراڈو کا کیا انجام ہوا۔ اسے کمیونٹی سے نکل جانے پر مجبور کیا گیا۔ کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ اس نے کیتھولک چرچ کے ساتھ صلح کرنے کی کوشش بھی کی۔ اگر واقعی ایسا ہوا تھا تو اس سے ایک دفعہ پھر اس بات کی تصدیق ہوتی ہے کہ سترھویں صدی میں ایک کمزور دل و دماغ کے آدمی کے لیے کتنا مشکل تھا

کہ وہ مذہب کے دائرے سے باہر ہوکر زندہ رہ سکے۔ پراڈو اور ڈا کوسٹا دونوں نئے زمانے کے پیش رو تھے ان کی کہانی سے پتہ چلتا ہے کہ روحانی ریاضتوں کے بغیر کنفیشنل مذاہب کی مائیتھوس بے سہارا ہے۔ مائیتھوس ہی تو ہے جو انسانی ذہن میں چھپے ہوئے وجدانی حصوں کو منور کرتی ہے۔ ریزن (عقل) کے ذریعے خدا کا جو تصور سامنے آتا ہے اسے بھی جلد ہی ترک ہونا ہوتا ہے کہ وہ مصیبت اور پریشانی کے عالم میں کوئی مدد نہیں کرتا۔ پراڈو اور ڈا کوسٹا اس لئے مذہب سے باغی ہوئے کہ انہیں مذہب پر عمل کرنے کا موقعہ نہیں ملا مگر ایمسٹرڈم کے ایک اور مرانو یہودی نے بتایا کہ ریزن (عقل) سے مدد لینا ایسا جاذب اور حیات انگیز عمل ہے کہ متھ کی ضرورت نہیں رہتی۔ یہ دنیا توجہ اور غور وفکر کا واحد مرکز بن جاتی ہے اور خدا کی بجائے انسان تمام چیزوں کو کسوٹی اور معیار بناتا ہے۔ ریزن (عقل) بذات خود غیر معمولی ذہن کے لوگوں میں صوفیانہ دانش بیدار کرتی ہے۔ اس سے انکار مشکل ہے کہ یہ حقیقت نئے زمانے کے تجربہ کا حصہ بن چکی ہے۔

عین اس وقت جبکہ یہودی ملاؤں نے پہلی دفعہ پراڈو کا بائیکاٹ کیا انہوں نے Baruch Espinoza کے خلاف بھی کاروائی شروع کر دی۔ سپینوزا کی عمر اس وقت صرف تیئس برس تھی۔ پراڈو کے برعکس سپینوزا ایمسٹرڈم میں پیدا ہوا تھا۔ اس کے والدین پرتگال میں رہ چکے تھے۔ وہاں وہ نئے عیسائیوں کی حیثیت میں رہ رہے تھے مگر جب ایمسٹرڈم آئے تو قدیم یہودیت سے رشتہ استوار کرنے میں کامیاب ہو گئے اس لیے سپینوزا کے لئے کوئی خطرہ نہیں تھا وہ ہمیشہ ایمسٹرڈم کے آزاد خیال حلقوں میں رہا۔ وہاں اس کا رابطہ غیر یہودی دانش وروں سے بھی تھا۔ وہ اپنے مذہب کا حلیہ بگاڑے بغیر اس پر عمل کرتا رہا۔ اس نے اپنی مذہبی تعلیم تورات سکول میں پائی مگر اسے جدید ریاضی نجوم اور فزکس کا علم بھی حاصل تھا۔ وہ بڑی دلچسپی سے کاروباری زندگی بسر کرنے پر تیار تھا مگر 1955 میں ایمسٹرڈم میں پراڈو کے آنے کے بعد اچانک اس نے سینا گوگ میں عبادت کے لئے جانا چھوڑ دیا اور مذہبی معاملات میں شک وشبے کا اظہار شروع کر دیا۔ اس نے بتایا کہ انجیل کے متن میں تضادات ہیں جس سے پتہ چلتا ہے کہ وہ انسانی تخلیق ہے۔ اس نے وحی کے امکان کو بھی رد کر دیا اور کہا کہ خدا فطری قوتوں کا مظہر اور مجموعہ ہے۔ آخر کار یہودی عالموں نے 27 جولائی 1655 کو بائیکاٹ کی سزا نافذ کر دی مگر پراڈو کی طرح اس نے کمیونٹی میں رہنے کی خواہش ظاہر نہ کی بلکہ وہ خوش تھا کہ اس کی جان چھوٹی۔ وہ سرکاری مذہب کی گرفت سے دور

یورپ میں کامیاب زندگی گزارتا رہا۔ ڈاکوسٹا اور پراڈو کی نسبت سپنوزا کے لئے آسان تھا کہ وہ غیر یہودیوں میں زندگی بسر کرے۔ سپنوزا ایک جینئس تھا۔ وہ اپنے خیالات اور مؤقف بڑی وضاحت کے ساتھ بیان کرسکتا تھا اور ایک آزاد وخود مختار انسان کی حیثیت سے اس کے نتائج بھی بھگت سکتا تھا۔ ہالینڈ میں وہ اچھی زندگی گزارتا رہا۔ وہاں اس کے حامی اور مددگار بھی تھے جو اسے مفلسی سے بچانے کے لئے مناسب امداد دیتے تھے۔ وہاں اس کی دوستی بعض مشہور غیر یہودی سائنس دانوں، فلسفیوں اور سیاست دانوں سے ہوئی مگر اس کی تنہائی میں کمی نہ ہوسکی۔ مذہب سے اس کی بیگانگی یہودیوں اور غیر یہودیوں دونوں ہی کے لئے پریشان کن تھی۔

مگر سپنوزا کی دہریت کا ایک روحانی پہلو بھی تھا کیونکہ وہ دنیا کو خدائی درجہ دیتا تھا۔ اس کے خیال میں دنیا ایک خدائی وژن ہے جو دنیاوی حقیقت میں جذب ہوکر اسے تحیر میں مبتلا کرتی ہے۔ اس نے فلسفہ کے مطالعہ اور تعلیم کو عبادت کی ایک شکل جانا۔ جیسا کہ اس نے اپنی تصنیف "Short Treatise on God" میں وضاحت کی ہے کہ خدا کوئی مادی شے نہیں جسے ہم جاننے کی کوشش کریں بلکہ ہمارے سوچنے کا انداز ہماری فکر کا اصول ہے اور یہ کہ جب ہمیں علم حاصل کرکے خوشی ہوتی ہے تو دراصل وہ خوشی خدا سے ہماری دانش ورانہ محبت ہے۔ سپنوزا کا خیال تھا کہ فلسفیوں کو وجدانی علم حاصل کرنا چاہیے بصیرت کی ایک ایسی چمک جو مختلف ذرائع سے حاصل ہونے والی منتشر معلومات اور علم کو ایک اکائی میں بدل دے۔ سپنوزا کے لئے یہ تجربہ خدائی عمل تھا۔ وہ اسے ایک بشارت سمجھتا تھا۔ اس کیفیت میں فلسفی محسوس کرتا ہے کہ اسے خدا سے الگ نہیں کیا جاسکتا اور یہ کہ خدا انسانی وجود میں جلوہ گر ہے۔ اس فلسفے کا تعلق تصوف سے ہے۔ جسے Teresa of Avila اور John of the Cross کی روحانیت کا ریشنل پہلو سمجھا جاسکتا ہے مگر سپنوزا یہ روحانی بصیرت برداشت نہیں کرسکتا تھا۔ وہ سمجھتا تھا کہ بزرگ وبرتر خدا کی آرزو انسان کو تنہا اور اس کی اپنی فطرت سے الگ کردیتی ہے۔ بعد میں فلسفیوں کے لئے سپنوزا کی وجد آفرین بشارت وبال جان بن گئی تو انہوں نے سپنوزا کے خدا ہی سے پیچھا چھڑا لیا مگر اس دنیا پر اس کے اصرار اور فطرت سے ماورا اونچی طاقتوں سے انکار نے سپنوزا کو یورپ کے سیکولر مفکروں کی پہلی صف میں کھڑا کردیا۔

اکثر ماڈرن لوگوں کی طرح سپنوزا بھی رسمی مذہب سے بیزار تھا بائیکاٹ کے سلسلے میں اسے

جو تجربہ ہوا اسے سامنے رکھا جائے تو اس کی بیزاری حیرانی کی بات نہیں۔ اس نے الہامی مذاہب ظن وتخمین اور بے معنی پراسراریت کے مجموعے کہہ کر رد کردیئے۔ اسے ریزن (عقل) کے آزادانہ اور بے روک ٹوک استعمال میں مزا آتا تھا۔ وہ اپنے آپ کو انجیل کے حوالے نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس نے الہامی کتابوں کو بالکل معروضی نقطۂ نظر سے دیکھا۔ انجیل کو خدا کا کلام سمجھنے کی بجائے اس نے اصرار کیا کہ انجیل کو بھی دوسری کتابوں کی طرح پڑھا جائے۔ وہ ان پہلے لوگوں میں سے تھا جنہوں نے انجیل کو سائنسی انداز میں پڑھا اور اس کے تاریخی پس منظر اور ادبی معیار کا جائزہ لیا۔ اس نے اپنے سیاسی تصورات کے معاملے میں بھی انجیل کو پرکھا۔ سپنوزا ان لوگوں میں سے تھا جنہوں نے سب سے پہلے سیکولرازم اور جمہوریت کو اپنا آئیڈیل بنایا جو مغربی جدیدیت کا سنگ میل ثابت ہوا۔ اس کا کہنا تھا کہ جب اسرائیل کے بادشاہوں کی نسبت وہاں کے پادریوں کو زیادہ طاقت حاصل ہوگئی تو ریاست کے قوانین کی نوعیت امتناعی اور تعزیزی ہوگئی۔ درحقیقت اسرائیلی سلطنت ایک مذہبی سلطنت تھی مگر سپنوزا کی رائے میں خدا اور مخلوق جب ایک تھے تو خدا کی آواز سب سے بلند اور زوردار تھی مگر جب پادریوں کو اختیار حاصل ہوگیا تو پھر خدا کی آواز کہیں نہیں تھی۔ اسے کوئی نہیں سن سکتا تھا۔ سپنوزا عوامی سطح پر کام کرنے والا نہیں تھا۔ جدیدیت سے پہلے دور کے فلسفیوں کی طرح وہ بھی نمایاں اور ممتاز افراد سے واسطہ رکھتا اور سمجھتا تھا کہ عوام میں توریشنل انداز سے سوچنے کی صلاحیت سے ہی نہیں۔ انہیں تو کسی قسم کا کوئی مذہب چاہیے جو ان کی کچھ رہنمائی کرتا رہے۔ مذہب کوئی سا ہو پہلے اس کی اصلاح ہونی چاہیے۔ اس کی بنیاد نام نہاد الہامی قوانین پر نہیں بلکہ آزادی، بھائی چارے اور انصاف کے فطری اصولوں پر ہو۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ سپنوزا آنے والے نئے دور کے نقیبوں میں سے تھا۔ بعد میں وہ سیکولر سوچ کے ان یہودیوں کا ہیرو بن گیا جو مذہب کی پناہ سے اس کے اصولی اخراج کو پسندیدگی کی نظر سے دیکھتے تھے مگر سپنوزا کی زندگی میں یہودیوں میں سے اس کے ماننے والے سامنے نہیں آئے حالانکہ لگتا تھا کہ ان میں سے اکثر اس کے خیالات سے متفق تھے۔ جب سپنوزا اپنے سیکولر ریشنل ازم پر کام کررہا تھا اس وقت یہودی دنیا مسیحائی کے ہیجان میں مبتلا تھی۔ اس ہیجان نے عقل واستدلال کے تقریباً پرخچے اڑا دیئے تھے۔ یہ نئے دور کی ہزار سالہ تحریکوں میں پہلی تحریک تھی جس نے یہودیوں کو ایک شرعی بہانہ مہیا کیا تاکہ وہ اپنے ماضی سے رشتہ توڑ لیں اور اپنی

اُمیدیں آنے والے نئے زمانے سے وابستہ کریں۔ تھوڑے لوگ ان دانشوروں کی بات سمجھنے کے لائق ہوتے ہیں جنہوں نے جدید دور میں سیکولر فلسفہ پیش کیا۔ ان میں سے اکثر نے تو مذہب کا سہارا لے کر ہی نئی دنیا میں قدم رکھا۔ بہرحال اس سے اتنا تو ہوا کہ ماضی کے ساتھ تسلسل برقرار رہا اور ماڈرن لوگوں کے لئے دیومالائی فریم ورک میں ایک شکل نکل آئی۔

ایسا لگتا ہے کہ سترھویں صدی کے وسط تک کئی یہودی ایک فیصلہ کن نتیجے پر پہنچ چکے تھے۔ یورپ کے دوسرے یہودیوں کو وہ آزادی حاصل نہ تھی جو ان کی میرونو کمیونٹی کو ایمسٹرڈم میں میسر تھی۔ سپینوزا کا باغیانہ انحراف بھی اس لئے ممکن ہوا کہ وہ غیر یہودیوں کے ساتھ گھل مل کر رہ رہا تھا اور جدید سائنس کا مطالعہ کر رہا تھا۔ باقی دنیا میں یہودی معاشرے کے بڑے دھارے سے کٹ کر رہ رہے تھے۔ سولھویں صدی تک کسی یہودی کو یہ اجازت نہیں تھی کہ وہ اپنی مخصوص بستی گیٹو (Ghetto) سے باہر آباد ہو سکے۔ اس علیحدگی اور تنہائی نے یہود دشمن جذبات کو فروغ دیا۔ قدرتی طور پر یہودیوں میں بھی اپنے دشمنوں کے خلاف شک اور نفرت پیدا ہوئی۔ گیٹو ایک خودنگر دنیا تھی جہاں سکول اور دیگر ادارے تھے وہ آزاد اور خودمختار تھے۔ کہیلا (Kehillah) (مشترکہ حکومت) منتخب ملاؤں اور بزرگوں پر مشتمل تھی جو یہودیوں کے قوانین کے مطابق ان کی عدالتوں کا نظام چلاتی تھی۔ گیٹو دراصل ریاست کے اندر ریاست اور اپنی دنیا کے اندر ایک دنیا تھی۔ یہودیوں کو اس کی ضرورت کم ہی پڑتی تھی کہ وہ باہر کی دنیا سے رابطہ کریں مگر سترھویں صدی کے وسط تک بہت سے یہودی ان پابندیوں کے خلاف آواز اٹھانے لگے۔ گیٹو عام طور پر غلیظ اور صحت دشمن علاقوں میں واقع ہوتے تھے ان کے آس پاس اونچی دیواروں کا حصار ہوتا تھا جس سے پتہ چلتا کہ آبادی بہت گنجان ہے مگر وسعت کی کوئی صورت نہیں۔ وینس اور روم کے بڑے بڑے گیٹوز میں بھی باغات کی گنجائش نہیں تھی۔ یہودیوں کے پاس رہائشی سہولت بڑھانے کی ایک ہی صورت تھی کہ عمارت کے اوپر عمارت تعمیر کرتے جائیں۔ بنیادیں زیادہ بوجھ برداشت نہ کرتیں تو ساری عمارت دھڑام سے زمین پر ڈھیر ہو جاتی۔ آگ لگنے اور بیماریاں پھیلنے کا خطرہ اس کے علاوہ تھا۔ انہیں مجبور کیا جاتا کہ وہ امتیازی لباس پہنیں تاکہ ان کے یہودی ہونے کا پتہ چلے۔ ان پر معاشی پابندیاں بھی عائد تھیں وہ درزیوں کا پیشہ اختیار کر سکتے تھے یا پھیری لگاتے تھے۔ انہیں بڑی سطح پر تجارتی ادارے قائم کرنے کی اجازت بھی نہیں تھی۔ چنانچہ یہودی آبادی کا غالب حصہ

خیرات پر گزارہ کرتا تھا دھوپ تازہ ہوا صاف پانی اور مناسب خوراک کے بغیر ان کی جسمانی حالت بھی خراب ہونے لگی تھی۔ ذہنی لحاظ سے بھی وہ پیچھے رہ گئے۔ یورپ کے آرٹ اور سائنس کے ساتھ ان کا کوئی رابطہ نہیں تھا۔ ان کے سکول اچھے تھے مگر جب عیسائیوں کے تعلیمی نصاب آزاد خیالی پر مبنی تھے تو یہودیوں نے اپنے آپ کو تورات اور تلمود تک محدود رکھا تھا۔ اپنی پرانی بوسیدہ دنیا میں ایسے ڈوبے کہ یہودیوں کے علم کا مطلب بس بال کی کھال اتارنا رہ گیا۔

اسلامی دنیا میں یہودیوں پر ایسی پابندیاں نہیں لگائی گئی تھیں۔ اگرچہ عیسائیوں کی طرح انہیں بھی ذمی (محفوظ اقلیت) کا درجہ دیا گیا تھا تاہم انہیں سول اور فوجی تحفظ حاصل تھا۔ بشرطیکہ وہ اسلامی ریاست اور اس کے قوانین کا احترام کریں۔ وہاں انہیں اذیتیں اور سزائیں نہیں دی جاتی تھیں نہ ہی مسلمان ملکوں میں یہود دشمنی کی کوئی روائت موجود تھی۔ اگرچہ ذمی سیکنڈ کلاس شہری ہوا کرتے تھے مگر انہیں مکمل مذہبی آزادی حاصل تھی۔ وہ اپنے تمام معاملات اپنے مذہبی قوانین کے مطابق طے کرتے تھے اور یورپ کے یہودیوں سے کہیں زیادہ بہتر طریقہ سے ثقافتی اور تجارتی دھارے میں شامل ہوتے تھے مگر حالات بتائیں گے کہ اسلامی دنیا کے یہودی بھی بے چین ہو رہے تھے وہ اور زیادہ آزادی کے لئے پر تول رہے تھے۔1492 سے یورپ میں ایک تباہی کے بعد دوسری تباہی کی خبریں آتی رہی تھیں مگر پولینڈ میں ہونے والے ظلم وستم نے تو یہودیوں کے ہوش اڑا دیئے۔1648 کے اس قتل عام جیسی کوئی اور مثال بیسویں صدی تک یہودیوں کی تاریخ میں نہیں ملتی۔

پولینڈ نے حال ہی میں اس علاقے کو اپنے ساتھ شامل کر لیا تھا جسے اب یوکرین کہتے ہین جہاں کسانوں نے اپنی حفاظت کے لئے گھڑ سواروں کے دستے بنائے تھے۔ ان قازقوں کو یہودیوں اور پولوں دونوں سے نفرت تھی۔ کیونکہ وہ پول امراء کی زمینوں کی دیکھ بھال کرتے تھے۔1648 میں قازق لیڈر Boris Chamielnicki نے پولوں کے خلاف بغاوت کر دی۔ قازقوں نے یہودیوں اور پولوں دونوں پر حملے کئے۔ آخر جب 1667 میں جنگ ختم ہوئی تو پتہ چلا کہ ایک لاکھ یہودی جنگ میں مارے گئے۔ شاید اس تعداد میں مبالغہ بھی ہو تو بھی ان کے خطوط اور جنگ کی کہانیوں نے دنیا کے مختلف حصوں کے یہودیوں پر لرزہ طاری کر دیا۔ انہیں بتایا گیا کہ یہودیوں کے ٹکڑے کئے گئے ان کی اجتماعی قبریں بنائی گئیں جن میں یہودی عورتوں اور بچوں کو

زندہ دفن کیا گیا۔ انہیں رائفلیں دی گئیں تا کہ وہ ایک دوسرے کو گولیاں ماریں۔ اکثر یہودیوں کو یقین تھا کہ یہ واقعات مسیح کی آمد کے آثار ہیں۔ انہوں نے گناہوں سے توبہ کی اور اس سلسلے میں لوریائی کبالا رسموں کے تقاضے پورے کئے تا کہ نجات کی گھڑی جلد آئے جب Chamielnicki کے ہاتھوں یہودیوں کے قتل عام کی خبر سمرنا (ترکی) پہنچی تو ایک نوجوان یہودی نے شہر سے باہر ٹہلتے ہوئے ایک آواز سنی جس کے ذریعے اسے بتایا گیا کہ وہ اسرائیل کا نجات دہندہ ہے۔ اس نوجوان کا نام Shabbetai Zevi تھا۔ وہ پڑھا لکھا کبالائی تھا (اگرچہ اس وقت تک وہ لوریائی کبالہ کے اصولوں سے واقف نہیں تھا) اس وقت بھی چند لوگ اس کی تقلید پر آمادہ تھے جن سے وہ اپنے روحانی تجربوں کا ذکر کرتا تھا۔ اس کی شخصیت پرکشش تھی مگر جب وہ بیس برس کا ہوا تو اس کے مزاج میں اشتعال اور دماغ میں فتور سا ظاہر ہونے لگا۔ وہ کئی کئی دن تنہا ایک چھوٹے سے کمرے میں کسمپرسی کے عالم میں پڑا رہتا مگر جب یہ کیفیت ختم ہوتی تو تبلیغ و ہدایت کا ہیجان خیز دور شروع ہو جاتا۔ جب وہ مضطرب ہوتا تو اس کی نیند اڑ جاتی۔ اسے محسوس ہوتا کہ روحانی طاقتوں کے ساتھ اس کا رابطہ قائم ہوا ہے۔ کبھی وہ تورات کے احکام کی کھلم کھلا خلاف ورزی پر اپنے آپ کو مجبور پاتا مگر یہ نہیں بتا سکتا تھا کہ وہ ایسا کیوں کرتا ہے۔ وہ سمجھتا کہ کسی وجہ سے خدا اس سے ایسے کام کرواتا ہے بلکہ اسے تو یہ خیال تھا کہ ان اعمال کا تعلق اس کے نجات دہندہ ہونے سے ہے۔ ''خدا جلد ہی اس پر ایک نیا قانون اور نئے احکام نازل کرے گا جن کے ذریعے وہ تمام دنیاؤں کی اصلاح کر سکے گا۔'' اس سے سرزد ہونے والی خلاف ورزیاں مقدس گناہ تھے جنہیں کبالائی اصطلاح میں 'تکن' کہا جاتا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ اس کی یہ حرکتیں یہودیوں کی رسمی زندگی کے خلاف ایک غیر شعوری بغاوت اور ایک بالکل نئے دور کی آرزو ہو۔

آخر شبتائی کی حرکتیں سمرنا کے یہودیوں کے لئے ناقابل برداشت ہوگئیں اور اسے 1650 میں شہر چھوڑنا پڑا۔ پھر اس کی زندگی کا ایک پندرہ سالہ دور شروع ہوا جسے اس نے سیاہ دور کہا ہے۔ اس دور میں وہ سلطنت عثمانیہ کے ہر حصے میں بھٹکتا پھرا مگر کسی سے اپنی مسیحائی کا ذکر نہیں کیا۔ ممکن ہے کہ وہ خدائی مشن کا آئیڈیا ہی ترک کر چکا ہو۔ 1665ء تک وہ اس کوشش میں رہا کہ اپنے ساتھ لگی ہوئی روحوں سے نجات پائے اور یہودی سکالر بن جائے۔ اس نے سنا کہ غزہ میں ایک نوجوان کبالائی ہے جو بہت لائق شخص ہے اور لوگوں کا علاج بھی کرتا ہے۔ تو شبتائی اس سے

ملنے کے لئے غزہ روانہ ہو گیا۔ اس یہودی سکالر کا نام ناتھن تھا۔ وہ شبتائی کا ذکر پہلے ہی سن چکا تھا۔ غالباً کبھی وہ دونوں ایک ہی زمانے میں یروشلم میں رہ چکے تھے مگر ایک دوسرے سے ناواقف تھے۔ شبتائی کی نرالی حرکتوں کا بھی اسے ضرور علم ہوگا کیونکہ شبتائی کی آمد سے ذرا پہلے ہی کسی غیبی اشارے سے اسے شبتائی کے آنے کی خبر مل گئی تھی۔ ناتھن نے انہی دونوں ایک کبالائی ریاضت شروع کی تھی۔ وہ سب سے الگ ہو کر کمرے میں بند ہو گیا تھا اور گریہ وزاری میں مشغول ہو گیا تھا۔ مراقبے کی حالت میں اسے شبتائی کی جھلک نظر آئی۔ اس نے خود اپنی آواز سنی کہ خدا نے کہا ''تمہارا نجات دہندہ آنے والا ہے'' شبتائی خود ہی اس کے دروازے پر آ گیا تو ناتھن نے اسے اپنے خواب کی معجزانہ تعبیر سمجھا۔

یہ کیسے ہوا کہ ناتھن جیسے ذہین فطین مفکر نے ایک اداس اور مصیبت زدہ شخص کو اپنا نجات دہندہ مان لیا۔ لوریائی کبالہ کے مطابق مسیح کی روح غیر خدا کے اس علاقے میں گھر گئی ہے جو شروع ہی سے ZimZum کے حقیقی عمل کے تحت وجود میں آئی تھی۔ مسیح مجبور اُبدی کی طاقتوں کے خلاف مصروف عمل ہے مگر ناتھن کو یقین تھا کہ کبالائیوں کے احساس ندامت اور ان کی توجہ کے طفیل اب بدی کی قوتیں زائل ہو رہی ہیں اور مسیح پر ان کی گرفت کمزور ہو رہی ہے۔ مسیح کی روح کبھی کبھی آزادی میں سانس لیتے ہوئے مسیحی دور کے لئے نئے قوانین کا انکشاف کرتی ہے مگر فتح ابھی مکمل نہیں ہوئی کہ مسیح کسی وقت پھر تاریکی کا شکار ہو جاتا ہے۔ یہ سب کچھ شبتائی کی شخصیت اور تجربے کے مطابق تھا۔ جب شبتائی آیا تو ناتھن نے اسے بتا دیا کہ انجام قریب ہے اور جلد ہی بدی کی طاقتوں پر اس کی فتح مکمل ہو جائے گی اور وہ یہودیوں کی نجات کا باعث بنے گا۔ پرانے قوانین معطل ہو جائیں گے اور وہ اعمال جو کبھی گناہ سمجھے جاتے تھے مقدس قرار پائیں گے۔

پہلے پہل تو شبتائی نے ناتھن کی کہانی سے کوئی سروکار نہ رکھا مگر آہستہ آہستہ اس نوجوان ربی کے زور بیان سے متاثر ہو کر اس کی طرف مائل ہو گیا۔ 28 مئی 1665 کو اس نے اپنے مسیح ہونے کا اعلان کر دیا۔ ناتھن نے فوری طور پر مصر اور سمرنا وغیرہ خط بھجوا دیئے کہ نجات کا وقت آ گیا ہے اور جلد ہی نجات دلانے والا عثمانی سلطان کو شکست دے گا۔ یہودیوں کی جلاوطنی ختم ہو گی اور انہیں واپس مقدس سرزمین لے جائے گا اور تمام غیر یہودی قومیں اس کے سامنے جھک جائیں گی۔ یہ خبر دنیا میں جنگل کی آگ طرح پھیل گئی۔ 1666 تک ایران سلطنت عثمانیہ اور یورپ کے

تمام حصوں کے یہودیوں میں جوش وخروش پھیل گیا اور گلی کوچوں میں ناچتے گاتے پھرتے۔ ناتھن نے احکام جاری کئے کہ نجات کا عمل تیز کرنے کے لئے یہودی تجربہ توبہ اور شرمساری کی رسمیں زور وشور سے ادا کریں۔ چنانچہ یورپ، مصر، ایران، بلقان، اٹلی، ایمسٹرڈم اور فرانس میں یہودیوں نے روزے رکھے، خود اذیتی کے لئے برفانی پانی میں غوطے لگائے، کانٹوں پر لوٹے اور غریبوں میں خیرات بانٹی۔ جدیدیت کے ابتدائی دور کی بیداریوں میں سے یہ پہلی بڑی بیداری تھی جب لوگوں کو وجدانی طور پر آنے والی کسی بڑی تبدیلی کا احساس ہوا۔ شبیتائی کے متعلق بہت کم لوگ کچھ جانتے تھے اس سے بھی کم لوگ ناتھن کے مہمل کبالائی وژن سے واقف تھے۔ عام لوگوں کے لئے یہی کافی تھا کہ مسیح آ گیا ہے اور اب منزل دور نہیں۔ ان کے اندر ان پر کیف مہینوں میں نئی اُمید پیدا ہوگئی تھی جو ان کی پہلی زندگی سے سراسر مختلف تھی نہ ہی انہیں پہلی زندگی کے پلٹ آنے کا کوئی ڈر تھا۔ ان کے سامنے نئے امکانات تھے جو ان کی مٹھی میں بند تھے وہ آزاد تھے اور جانتے تھے کہ برے دن ہمیشہ کے لئے جا چکے اور اب کبھی پلٹ کر نہیں آئیں گے۔

جو یہودی ناتھن اور شبیتائی کے براہ راست اثر میں تھے وہ اس پر تیار تھے کہ تورات میں وسیع پیمانے پر کاٹ چھانٹ کر دی جائے اگرچہ وہ جانتے تھے کہ ایسا کرنے سے اس مذہبی زندگی کا خاتمہ ہو جائے گا جس سے وہ اچھی طرح واقف تھے۔ جب شبیتائی مسیح کا شاہانہ لباس پہنے سینا گوگ میں آیا اور خدا کو اس کے ممنوعہ نام سے پکارا ممنوعہ کھانا کھایا، عورتوں سے الہامی کلام پڑھوایا تو لوگ بہت خوش ہوئے مگر سب نہیں۔ ان میں ایسے علما اور عام لوگ بھی تھے جو اس منظر سے بہت دل گرفتہ ہوئے مگر مختلف طبقوں نے شبیتائی کو اپنا رہنما بنا لیا۔ قانون، یہودیوں کو نہیں بچا سکا اور شاید وہ اس کا اہل بھی نہیں تھا یہودی بدستور ظلم کا نشانہ تھے بدستور جلاوطن تھے اور لوگ ایک نئی آزادی کے لئے تیار ہو رہے تھے۔

مگر یہ سب کچھ خطرناک تھا۔ لوریائی کبالہ ایک متھ تھی وہ اس طریقے سے ایک عملی سیاسی پروگرام میں نہیں بدل سکتی تھی اس کا مقصد باطنی زندگی کو روشن کرنا تھا۔ مائیتھوس اور لوگوس ایک دوسرے کے معاون ہیں مگر ان کے میدان اور کردار بالکل ایک دوسرے سے الگ ہیں۔ سیاست کا تعلق عقل واستدلال اور منطق سے ہے۔ متھ اسے معنی تو دیتی ہے مگر حرف بہ حرف توجیہہ کی روادار نہیں جیسی توجیہہ کہ لوریا کے تصوف کی ناتھن نے کی تھی۔ یہودیوں کو بے شک اپنی طاقت اور

آزاری کا احساس تھا اور یہ کہ ان کی تقدیر خود انہی کے ہاتھوں میں ہے مگر بنیادی طور پر ان کے حالات نہیں بدلے تھے۔ یہودی بدستور کمزور اور غیر محفوظ تھے اور اپنے حکمرانوں کی خیر سگالی کے محتاج تھے۔ مسیح کا لوریائی امیج جس میں وہ بدی کے خلاف جدوجہد میں مصروف ہے بدی کے خلاف عالمی جدوجہد کی زبردست علامت تھی مگر جب کوشش کی گئی کہ اس امیج کو ایک حقیقی انسانی شکل دی جائے تو اس کے تباہ کن نتائج سامنے آئے۔

یہ بات ثابت ہو کر رہی۔ فروری 1666 میں شبیتائی، سلطان کا سامنا کرنے کے لئے روانہ ہوا۔ ناتھن کی حمایت اور دعائیں اس کے ساتھ تھیں یہودیوں کے جوش و خروش کی وجہ سے سلطان محتاط ہو چکا تھا۔ شبیتائی گیلی پولی پہنچا تو اسے گرفتار کر کے سلطان کے سامنے استنبول لے جایا گیا۔ جب اس سے پوچھا گیا کہ وہ مرنا پسند کرے گا یا مسلمان ہونا؟ تو اس نے مرنے پر مسلمان ہونے کو ترجیح دی۔ تمام دنیا کے یہودی یہ خبر سن کر کانپ اُٹھے کہ ان کا مسیح مرتد ہو گیا ہے۔

یہ معاملہ یہاں پہنچ کر ختم ہو جانا چاہیے تھا۔ یہودیوں کی بہت بڑی اکثریت شبیتائی کے خلاف پیچ و تاب کھاتی ہوئی اپنی معمول کی زندگی کی طرف لوٹ آئی۔ اس المناک واقعہ کو پس پشت ڈالتے ہوئے تورات کے احکام پر پورا پورا عمل ہونے لگا مگر ایک معقول اقلیت بدستور آزادی کے خواب دیکھتی رہی۔ انہیں یقین نہیں آتا تھا کہ آزادی کے لئے لڑنے کا ہنگامہ خیز دور محض ایک سراب تھا۔ انہوں نے مسیح کے مرتد ہونے کا دکھ رفتہ رفتہ برداشت کر لیا جیسے پہلے عیسائیوں نے اتنا بڑا اسکینڈل مسیح کے متعلق برداشت کر لیا تھا کہ اسے ایک مجرم قرار دے کر سولی پر چڑھایا گیا تھا۔

شدید مایوسی کے دور سے نکل آنے کے بعد ناتھن نے اپنے مذہبی تصور میں کچھ تبدیلیاں کیں۔ نجات کا عمل شروع ہو چکا تھا مگر اسے ایک صدمہ سہنا پڑا۔ ناتھن اپنے پیروکاروں کو سمجھایا کرتا کہ شبیتائی کو مجبور ہو کر کثافت کے علاقے میں اور آگے جانا پڑا اس نے بدی کی صورت خود ہی اختیار کر لی ہے۔ یہ آخری 'مقدس گناہ' ہے تکن کا فیصلہ کن عمل۔ شبیتائی کے پیرو جو اس کے ساتھ صدق دل سے تھے انہوں نے اس تصور کو مختلف صورتوں اور زاویوں سے سمجھا۔ ناتھن کے مذہبی تصورات ایمسٹرڈم میں بہت مقبول تھا۔ اب مسیح بھی مرانو (Marrano) بن گیا تھا۔ مخفی طور پر وہ یہودیت سے وابستہ تھا مگر بظاہر مسلمان ہو گیا تھا۔ جو مرانو تورات پر اعتراض کرتے تھے وہ اس

انتظار میں تھے کہ موقعہ ملے تو اس سے جان چھڑائیں اگر پہلے نجات کا عمل ایک دفعہ مکمل ہوجائے۔ دوسرے یہودیوں کا خیال تھا کہ تورات پرعمل جاری رہنا چاہیے یہاں تک کہ مسیح کے ذریعے مکمل نجات حاصل ہوجائے پھروہ نیا قانون وضع کرے گا جس سے پرانا قانون پر اعتبار سے منسوخ ہوجائے گا۔شبتائیوں کی ایک چھوٹی سی اقلیت اس سے بھی آگے جانے کے لئے تیار تھی۔ پرانے قانون کی طرف واپس آنے کے لئے تو وہ تیارنہیں تھے چاہے یہ واپسی عارضی کیوں نہ ہواس لئے وہ سمجھتے تھے کہ یہودیوں کواپنے مسیح کی تقلید کرتے ہوئے بدی کی دنیامیں داخل ہوکر مرتد ہوجانا چاہیے۔ یورپ میں انہوں نے عیسائیت اختیارکرلی جبکہ مشرق وسطیٰ میں اسلام قبول کیا مگر اپنے گھروں میں انہوں نے یہودیت ہی اختیار کئے رکھی۔ انہوں نے پیش بنی کرتے ہوئے یہودی مسئلے کا نیا حال ڈھونڈلیا کہ یہودی مختلف انداز سے غیر یہودی کلچر میں جذب ہوجائیں مگر ذاتی طور پر یہودیت پر قائم رہیں۔

شبتائیوں کا خیال تھا کہ شبتائی بڑے کرب کے عالم میں اپنی دوہری زندگی گزار رہا ہوگا مگر درحقیقت وہ بڑے مزے سے مسلمانوں میں رہ رہا تھا۔ اپنا بہت سا وقت وہ اسلامی شریعت کے مطالعے میں گزارتا اور سلطان کے مذہبی مشیر کو یہودیت پر پڑھایا کرتا تھا۔ اسے لوگوں سے ملاقات کی کھلی اجازت تھی تمام دنیا سے یہودی وفود اس سے ملنے آیا کرتے جو اس کی پارسائی کی تعریف کیا کرتے تھے۔ لوگ اس کی اس حیرت انگیز صلاحیت سے بھی متاثر ہوتے کہ وہ بڑی آسانی سے دوسروں کے دل میں اپنی جگہ بنالیتا تھا۔ ناتھن کے حلقے کی نسبت شبتائی کے پیروؤں کے خیالات مختلف اور غیر یہودیوں کے متعلق مثبت تھے شبتائی تمام مذاہب کو برحق سمجھتا تھا۔ وہ اپنے آپ کو اسلام اور یہودیت کے درمیان پل کا درجہ دیتا اور عیسائیت سے بھی بہت متاثر تھا۔ کئی مہمانوں نے بتایا کہ بعض وقت تو وہ مسلمانوں جیسا لگتا اور کبھی یہودی سکالر لگتا تھا۔ عثمانیوں نے اسے یہودیوں کے تہوار منانے کی اجازت دے رکھی تھی اور شبتائی اکثر ایک ہاتھ میں قرآن اور دوسرے ہاتھ میں تورات لئے نظر آتا۔ شبتائی یہودیوں کو اس بات پر آمادہ کرتا کہ وہ مسلمان ہوجائیں صرف اسی صورت میں وہ ارض مقدس جاسکیں گے۔1669 میں تحریر شدہ ایک خط کے ذریعے اس نے سختی سے اس بات کی تردید کی کہ وہ کسی دباؤ میں آکر مسلمان ہوا ہے۔ ''مذہب اسلام ایک مکمل صداقت ہے''۔ اس نے واضح کیا یہودیوں اور غیر یہودیوں دونوں کے لئے مسیح

کی حیثیت میں اس کا ظہور ہوا ہے۔ 17 ستمبر 1676 کو شبتائی اس دنیا سے رخصت ہو گیا۔ اس کی موت شبتائیوں کے لئے بہت بڑا صدمہ تھا وہ سمجھتے تھے کہ اس کی موت کی وجہ سے نجات کی تمام اُمیدیں ختم ہو گئی ہیں۔ مگر انہوں نے اپنی زیرِ زمین سرگرمیاں جاری رکھیں۔ یہ ظاہر کرتے ہوئے کہ مسیحائی واقعہ مذہبی زندگی میں بنیادی اہمیت رکھتا ہے۔ بعضوں کی نظر میں اس مذہبی تحریک کی حیثیت ایک ایسے پُل کی تھی جس کے ذریعے انہوں نے جدیدیت کی ریشنل دنیا میں قدم رکھا۔ جس تیزی کے ساتھ بہت سے لوگ تورات میں کاٹ چھانٹ پر تلے ہوئے تھے اور شبتائیوں کا نئے قانون پر اصرار اس بات کا غماز تھا کہ لوگ اصلاح اور تبدیلی چاہتے ہیں۔ Gershom Scholem نے شبتائی اور شبتائی ازم کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ان خلوت پسند شبتائیوں میں سے کتنے ہی یہودیوں کی اصلاحی تحریکوں کے پیش رو ہوں گے۔ اس نے پراگ کے Joseph Wehte کا ذکر کیا ہے جو کبھی شبتائی تھی اور جس نے انیسویں صدی کے شروع میں مشرقی یورپ میں روشن خیالی کے آئیڈیا کو رواج دیا تھا اور Aron Chovin جس نے ہنگری میں اصلاحی تحریک کا اجراء کیا تھا وہ بھی جوانی میں شبتائی تھا۔ شولم کی تھیوری متنازعہ سہی مگر یہ حقیقت تو تسلیم کی جاتی ہے کہ شبتائی ازم نے یہودی ملاؤں کا اثر ورسوخ کم کیا اور یہودیوں کو ایسی تبدیلی پر آمادہ کیا جو کبھی ناممکن خیال کی جاتی تھی۔

شبتائی کی موت کے بعد اس کی دو تحریکوں نے یہودیوں کو اجتماعی طور پر مذہب بدلنے کی راہ دکھائی۔ 1683 میں سلطنت عثمانیہ میں تقریباً دو سو یہودی خاندانوں نے اسلام قبول کیا۔ اس فرقے کی اپنی خفیہ سینا گوگ تھیں مگر وہ مسجدوں میں بھی نماز پڑھنے جایا کرتے تھے۔ انیسویں صدی کے دوسرے نصف میں یہ فرقہ عروج پر تھا۔ اس وقت تک اس مین شامل لوگوں کی تعداد 115,000 تک پہنچ چکی تھی۔ انیسویں صدی کے آغاز میں اس فرقے نے بکھرنا شروع کیا۔ جب اس کے پیروؤں نے سیکولر ماڈرن تعلیم حاصل کرنی شروع کی اور جب انہیں کسی مذہب کی ضرورت باقی نہ رہی اس کے بعض نوجوانوں نے 1908 میں سیکولر نوجوان ترکوں کی بغاوت میں عملی حصہ لیا۔ ان میں سے دوسری تحریک زیادہ شر انگیز اور منظّم زندگی کی دشمن تھی۔ جس سے پتہ چلتا ہے کہ متھ کو عملی شکل دینے کے کیا نتائج ہو سکتے ہیں۔ 91-1726 میں Jacob frank نے اپنے دورہ بلقان میں شبتائی تحریک میں شمولیت اختیار کی۔ جب وہ اپنے وطن

پولینڈ واپس آیا تو اس نے انڈر گراؤنڈ تنظیم بنائی جس کے رکن اعلانیہ طور پر یہودی قانون پر عمل کرتے مگر مخفی طور پر جنسی بے راہ روی میں حصہ لیتے۔1756 میں جب اس کا بائیکاٹ کیا گیا تو اس نے پہلے تو اسلام (ترکی میں قیام کے دوران) اختیار کیا پھر اپنے ساتھیوں سمیت کیتھولک بن گیا۔

فرینک نے صرف یہی نہیں کیا کہ تورات میں عائد شدہ پابندیوں کی خلاف ورزی کی بلکہ بداخلاقی کو اپنا مسلک بنالیا۔ اس کے خیال میں تورات صرف بوسیدہ ہی نہیں خطرناک اور بے فائدہ بھی تھی۔ الہامی احکام موت کے وارنٹ کی حیثیت رکھتے تھے ضروری تھا کہ انہیں رَد کر دیا جائے۔ خدا کو پانے اور نجات حاصل کرنے کا واحد ذریعہ بے حیائی اور گناہ ہیں۔ فرینک کا مقصد بنانا نہیں بلکہ بگاڑنا اور تباہ کرتا تھا۔ اس کے ساتھی تمام مذاہب کے خلاف برسرِ پیکار تھے، جنگ میں مصروف لوگوں کا کوئی مذہب نہیں ہونا چاہیے، مطلب یہ کہ آزادی زور بازو سے حاصل کرنی چاہیے۔ آج کے سیکولر انقلابیوں کی طرح فرینک ہر مذہب کو مضر سمجھتا تھا۔ فرینک کی تحریک کو پذیرائی ملی تو اس کے ساتھی سیاست میں دلچسپی لینے لگے۔ وہ بہت بڑے انقلاب کا خواب دیکھ رہے تھے جو ماضی کو مٹا کر دنیا بچالے گا۔ وہ فرانسیسی انقلاب کو اپنے خواب کی تعبیر سمجھنے لگے کہ خدا نے ان کی طرف سے دنیا میں مداخلت کی ہے۔ یہودیوں نے نئے دور کے کتنے ہی رجحانات کا پہلے سے اندازہ کر لیا تھا۔ یورپ کے جارحیت پسند جدید معاشرے کے ساتھ ان کے تلخ تجربہ نے انہیں سیکولرازم، دہریت، انتشار پسندی اور مذہب کی نج کاری کا رستہ دکھا دیا۔ اکثر یہودیوں کی رائے میں یورپ کے ترقی پذیر نئے معاشرے کا رشتہ مذہب سے منسلک تھا مگر وہ مذہب بیسویں صدی کے اس مذہب سے بالکل مختلف تھا جس کی ہمیں عادت تھی۔ جدید معاشرے کا رہنما مذہب اور دیومالا سے زیادہ قریب تھا۔ الہامی لٹریچر کا حرف بہ حرف مطالعہ بھی اس کا مسئلہ نہیں تھا۔ اس میں اتنی جان تھی کہ وہ مسائل کو نئے زاویے سے دیکھے اور حل کرے۔ جدیدیت سے پہلے کے معاشرے میں مذہب کا کردار سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ ہم مسلم دنیا کا رخ کریں جو اس وقت اپنے ہی کرب میں مبتلا تھی کہ اسے ماڈرن دور میں مختلف زاویوں سے یہ خیال رکھنا تھا کہ مسلمان اپنے روحانی ورثے اور قدروں سے انحراف نہ کریں۔

قدامت پسندی
(1492-1799)

یورپ میں ابھرتے ہوئے نئے دور کا پہلا شکار یہودی تھے۔ اس ہنگامہ خیز سال (1492) کا دوسرا نشانہ سپین کے مسلمان تھے۔ یورپ میں ان کا سب سے مضبوط مرکز ان سے چھن گیا تھا۔ مگر وہ بدستور طاقتور تھے۔ سولھویں صدی میں اسلام سب سے بڑی عالمی طاقت کی حیثیت رکھتا تھا۔ ہر چند کہ منگ خاندان (1260-960) کی بدولت چین سماجی حیثیت اور اپنی طاقت کے لحاظ سے اسلامی دنیا سے کہیں آگے تھا اور اطالوی نشاۃ ثانیہ نے مغرب کو کلچری شاہراہ پر گامزن کر دیا تھا مگر مسلمانوں میں یہ اہلیت تھی کہ وہ اس نئے چیلنج کا سامنا کر سکیں اور ان کا سیاسی اور معاشی عروج بھی انتہا پر رہے۔ ویسے تو مسلمان دنیا کی آبادی کا صرف تیسرا حصہ تھے مگر وہ تمام مشرق وسطیٰ، ایشیا اور افریقہ کی وسعتوں میں اس طرح پھیلے ہوئے تھے کہ اسلامی دنیا تمام تاریخ عالم پر ایک کھلا دریچہ تھی۔ جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ نئے دور کے ابتدائی ایام میں مہذب دنیا کے اکثر علاقوں پر پہلے سے اس کا تسلط تھا۔ مسلمانوں کے لئے یہ تخلیقی لمحہ تھا۔ سولھویں صدی کی ابتدا میں ہی تین نئی اسلامی سلطنتیں قائم ہو چکی تھیں۔ عثمانی سلطنت ایشیا، اناطولیہ، عراق، شام اور شمالی افریقہ میں صفوی سلطنت ایران میں اور جنوبی ایشیا میں مغل سلطنت۔ تینوں اسلامی روحانیت کے مختلف مظاہر کی نمائندہ تھیں۔ مغل سلطنت رواداری اور کائناتی فلسفیانہ ریشنلزم کی نمائندہ تھی۔

صفوی بادشاہوں نے شیعہ ازم کو اپنے ملک کا مذہب قرار دیا۔ عثمانی ترک جو سنی تھے انہوں نے اسلامی شریعت پر مبنی نظام حکومت بنایا۔

ان تین سلطنتوں سے ایک نئے سفر کا آغاز ہوا۔ تینوں کا تعلق زمانہ جدید کے ابتدائی دور سے تھا۔ ان میں انتظامی لحاظ سے اعلیٰ درجے کی حکومتیں قائم تھیں ان کا انداز نظر ریشنل تھا۔ شروع کے برسوں میں عثمانی ریاست یورپ کی تمام بادشاہتوں سے زیادہ طاقتور اور باصلاحیت تھی۔ سلطان سلیمان (66-1520) کی قیادت میں اس کا عروج اپنی انتہا کو پہنچ گیا۔ عثمانی سلطنت، ہنگری، بلقان اور یونان کی طرف سے مغرب کی طرف پھیلی۔ یورپ کی طرف اس کی پیش قدمی 1529 کے اندر ویانا میں اس کی ناکامی سے رکی۔ ایران میں صفوی بادشاہوں نے سڑکیں اور کاروان سرائیں تعمیر کیں معیشت کو حقیقت کا رنگ دیا اور بین الاقوامی تجارت میں اسے پہلے صف میں کھڑا کر دیا۔ تینوں سلطنتیں کلچری تجدید اور احیاء کے معاملے میں اطالوی نشاۃ ثانیہ کی ہم پلہ تھیں۔ سولھویں صدی ترک طرز تعمیر، صفوی پینٹنگ اور تاج محل کے عظیم دور کی صدی تھی۔

ہر چند کہ تینوں جدیدیت پسند معاشرے تھے مگر انہوں نے انقلابی تبدیلیوں سے گریز کیا۔ اٹھارویں صدی کے مغربی کلچر کے انقلابی ہیجان سے انہوں نے دامن بچائے رکھا۔ بلکہ تینوں سلطنتوں نے قدامت پسندانہ جذبہ، کا راستہ اختیار کیا جو یورپ سمیت، جدید دور سے پہلے ہر سوسائٹی کا مشترکہ کردار تھا۔ درحقیقت یہ سلطنتیں قدامت پسندی اور اس کی روح کی آخری بڑی سیاسی مثالیں تھیں اور چونکہ وہ جدید دور کے آغاز کی انتہائی ترقی یافتہ ریاستیں تھیں اس لئے انہیں قدامت پسندی کے عروج کی نمائندہ کہہ سکتے ہیں۔ آج قدامت پسند معاشرہ مشکلات میں ہے یا تو اس پر جدید مغربی کردار کا سایہ غالب آگیا ہے یا یہ قدامت پسندی سے جدیدیت میں بدلنے کا دشوار عمل ہے۔ بنیاد پرستی کا بہت سا حصہ تو تغیر کے اس مرحلہ کا نتیجہ ہے۔ اس لئے بہت ضروری ہے کہ ان مسلم ممالک میں اعتدال پسندی کی رفتار کا جائزہ لیا جائے تا کہ ہم اس کی خوبیوں کے ساتھ اس کی خامیوں کا بھی اندازہ کر سکیں۔

جب تک کہ مغرب میں ایک بالکل نئی قسم کی تہذیب کا آغاز نہیں ہوا (جس کی بنیاد مسلسل سرمایہ کاری اور فنی مہارت پر تھی) اور جو تہذیب انیسویں صدی تک اپنے قدم نہیں جما سکی، اس وقت تک ہر کلچر کا معاشی انحصار فالتو زرعی پیداوار پر تھا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ کسی بھی زرعی

معاشرے کی کامیابی اور وسعت کی ایک حد مقرر تھی۔ ورنہ اس کے وسائل کا خاتمہ ہو جاتا۔ سرمایہ کاری کے لئے سرمائے کی رقم کی ایک حد مقرر تھی۔ عام طور پر ایسا منصوبہ رد کر دیا جاتا جس کے لئے بڑے سرمایہ کی ضرورت ہوتی۔ ہمارے مغربی کلچر سے پہلے کسی کلچر میں اتنا دم نہیں تھا کہ وہ مسلسل نئی ایجادوں کی منصوبہ بندی کرتا ہم اپنی پچھلی نسل کی نسبت زیادہ جاننا چاہتے ہیں اور ہمیں یقین ہے کہ ہمارے معاشرے، فنی مہارت میں ہمیشہ مزید آگے بڑھیں گے۔ ہمیں مستقبل کی فکر رہتی ہے ہماری حکومتیں اور ادارے ایسے منصوبے بناتے ہیں جن کا اثر ہماری آنے والی نسلوں پر پڑے گا۔ ایک دن یہ بات صاف ہو جائے گی کہ ہمارا معاشرہ ہمارے مسلسل ریشنل انداز فکر کا حاصل ہے۔ اس نے لوگوں کی کوکھ سے جنم لیا ہے جسے ہمیشہ آگے دیکھنا آگے بڑھنا ہوتا ہے جسے اور زیادہ جاننا ہوتا ہے تاکہ ہماری کامیابیوں اور صلاحیتوں کے دائرے اور زیادہ پھیل سکیں مگر انداز نظر کتنا ہی ریشنل ہو ایک متحرک اور زوردار سوسائٹی کا تصور، جدید معیشت کے بغیر ممکن نہیں۔ مغربی معاشرے کے لئے یہ ناممکن نہیں ہے کہ وہ اپنا طریق کار بار بار اس طرح بدلتا رہے کہ نئی ایجادات کے لئے راستہ ہموار ہو سکے کیونکہ بار بار سرمایہ کاری سے بنیادی سرمائے میں اضافہ ہو جاتا ہے جس کی مدد سے فنی ترقی کے ساتھ شانہ بہ شانہ چلنا ممکن ہوتا ہے مگر ایسا ہونا زرعی سوسائٹی میں ممکن نہیں جہاں لوگوں کی توانائیاں اس فکر میں خرچ ہو جاتی ہیں کہ جو کما چکے ہیں اسے کیسے بچا کر رکھیں۔ نئے زمانے سے پہلے کی قدامت پسند سوسائٹی کا یہ رویہ کسی بنیادی بزدلی کی بنا پر نہیں تھا بلکہ اس کی بنیاد اپنے کلچر کی حدود اور امکانات کے حقیقت پسندانہ جائزے پر تھی۔ جیسے تعلیم کا زیادہ زور رٹہ لگانے پر تھا اور یجنل کی حوصلہ افزائی نہیں کی جاتی تھی۔ نہ ہی طالب علموں کہ یہ ترغیب دی جاتی تھی کہ وہ نئے اور انقلابی خیالات کو اپنے ذہن میں جگہ دیں کیونکہ معاشرہ ان کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا۔ نئے خیالات سوسائٹی میں انتشار اور بدنظمی کا باعث بن سکتے تھے۔ قدامت پسند معاشرے میں نظم وضبط اور سماجی استحکام کو آزادی اظہار سے زیادہ اہمیت دی جاتی ہے۔

جدید معاشروں کی طرح مستقبل کی طرف دیکھنے کی بجائے قدامت پسند معاشرے ماضی سے انسپائر ہوتے ہیں مسلسل بہتری کی اُمید رکھنے کی بجائے یہ فرض کر لیا جاتا ہے کہ آنے والی نسل کے قدم پیچھے ہٹ سکتے ہیں۔ ترقی کی نئی بلندیاں اور منزلیں طے کرنے کی بجائے معاشرے اس سطح سے بھی نیچے گر جاتے ہیں جو قدیم زمانے کے سنہری دور کی سطح تھی۔ وہ قدیم

سنہری دور حکومتوں اور افراد کے لئے ایک ماڈل جانا جاتا ہے۔ ماضی کے اس آئیڈیل کو حقیقت سے قریب جانتے ہوئے معاشرہ اپنی اہلیتوں کو بروئے کار لاتا ہے۔ ان کا خیال تھا کہ تہذیب غیر معتبر اور تباہ کن بھی ہوسکتی ہے جیسے پانچویں صدی میں رومنوں کے زوال کے بعد مغربی یورپ میں ہوا۔ نئے زمانے کے آغاز میں بھی اسلامی دنیا کے اندر تیرھویں صدی میں ہونے والے منگولوں کے حملوں کی یاد ابھی تک تازہ تھی۔ اس دور میں ہونے والا قتل عام ایک بڑے اسلامی شہر کے بعد دوسرے اسلامی شہر کی تباہی اور لاکھوں انسانوں کا بے گھر، بے وطن ہو جانا ایسی دلدوز یادیں تھیں جن کی وجہ سے لوگ کانپ جاتے تھے۔ لائبریریاں اور تعلیمی ادارے تباہ کر دیئے گئے تھے جن کے ساتھ صدیوں میں حاصل کیا جانے والا علم بھی ضائع ہوگیا۔ وقت گزرنے کے ساتھ مسلمانوں کی حالت سنبھل گئی۔ اس عمل میں مرکزی کردار ان کے صوفیا نے ادا کیا۔ تین نئی سلطنتیں ان کے سنبھل جانے کی واضح مثالیں تھیں۔ ان سلطنتوں کے جلال و جمال ان کے کلچر اسلامی قدروں کی تجدید اور احیاء کے زندہ ثبوت تھے۔ ان سے واضح تھا کہ مسلم تاریخ اپنے راستے پر واپس آ گئی ہے۔

مگر اس قیامت خیز تباہی کے بعد جدید دور سے پہلے کی قدامت پسندی کو اور زیادہ زور پکڑنا ہی تھا۔ مسلمان جو کھو چکے تھے اسے پانے کی کوشش بڑی توجہ اور دل سوزی سے کر رہے تھے۔ وہ کسی نئی مہم کا آغاز نہیں چاہتے تھے۔ سنی مسلمانوں کے اسلامی تصور میں کہ جس پر اکثر مسلمان عمل کرتے ہیں اور جو سلطنت عثمانیہ کا تسلیم شدہ مذہب تھا اس امر پر اتفاق رائے ہوا کہ اجتہاد (آزاد استدلال) کے دروازے بند ہو چکے ہیں۔ اس سے پہلے یہ اجازت تھی کہ مذہب یا شریعت کے کسی مسئلے پر قرآن یا حدیث خاموش ہوں تو فقیہہ کو چاہیے کہ ان کے معاملے میں اپنا فیصلہ صادر کرے۔ مگر نئے دور کے آغاز میں اس روایت کو محفوظ کرنے کی کوشش میں جو قریب قریب ختم ہوچکی تھی۔ سنی مسلمانوں نے فیصلہ کرلیا کہ آزادئی خیال کی مزید گنجائش نہیں ہے۔ ہر سوال کا جواب شریعت میں موجود ہے جو ایک مکمل نظام زندگی ہے۔ اجتہاد ضروری ہے نہ پسندیدہ ہے۔ مسلمانوں کو (ماضی کی) تقلید کا پابند ہونا چاہیے۔ مسئلوں کے نئے حل تلاش کرنے کی بجائے انہیں مصدقہ کتابوں میں موجود فتاویٰ سے رجوع کرنا چاہیے اور ان میں دیئے گئے فیصلوں پر عمل ہونا چاہیے۔ ان فیصلوں سے الگ نیا رستہ اختیار کرنے کو بدعت کہا گیا۔ جس کی

حیثیت سنی مسلمانوں کی نظروں میں خطرناک اور تخریبی تھی۔ یہ نئے دور کے آغاز کا وقت تھا اسی طرح مغرب میں عیسائیوں نے بھی اپنے مروجہ مذہبی تصورات سے گریز کو بدعت قرار دیا تھا۔

ایسے رویے کا تصور بھی ممکن نہیں تھا جو مغرب کی جدید باغیانہ روح کے مماثل ہو۔ مغرب میں جان بوجھ کر استدلال کو دبانے کی کوشش اب قابلِ نفرت تھی۔ جیسا کہ ہم آگے چل کر دیکھیں گے کہ ماڈرن کلچر اس وقت پیدا ہوا جب لوگوں نے اس قسم کی پابندیوں کے سامنے سر جھکانے سے انکار کر دیا۔ اگر مغربی جدیدیت لوگوس کی پیداوار ہے تو یہ اندازہ کرنا تو اور بھی آسان ہے کہ مائیتھوس قدامت سے کس قدر قریب ہے۔ دیو مالائی سوچ آگے نہیں دیکھتی اس کی نظر گئے دنوں پر ہوتی ہے۔ یہ کہ دنیا کا آغاز کیسے ہوا۔ وہ واقعات کیا ہیں جنہیں اولیت کا شرف حاصل ہوا یا یہ کہ انسانیت کی بنیاد کیا ہے اور انسانی زندگی کی اصلیت کیا ہے۔ متھ نئی چیز کی طرف نہیں دیکھتی اس کا فوکس اس پر ہوتا ہے جو ہمیشہ سے موجود ہے۔ وہ ہمیں تازہ خبر نہیں دیتی بلکہ جو ہمیشہ سے موجود ہے اس کے متعلق بات کرتی ہے یہ کہ جو اہم تھا وہ سوچا جا چکا ہے اور جو اہم تھا وہ کیا جا چکا ہے۔ ہم اپنے بزرگوں کی باتوں پر عمل کر کے زندہ ہیں بالخصوص مذہب کے معاملے میں۔ مذہب ہمیں وہ سب کچھ بتا دیتا ہے جو ہم جاننا چاہتے ہیں۔ یہ قدامت پسندی کے دور کی روحانیت تھی مذہبی ریاضتیں، مسلک اور دیو مالائی کہانیاں نہ صرف افراد کو جینے کا جواز دیتی ہیں جو ان کے لاشعور سے جڑا ہوا ہوتا ہے بلکہ ان رویوں اور رجحانات کو تقویت بھی دیتی ہیں جو زرعی معیشت کی سلامتی کے لئے ضروری ہیں۔ شیتائی زیوی کی ناکامی سے یہ امر بالکل واضح ہو گیا تھا کہ متھ عملی سطح پر تبدیلی یا تغیر لانے کے لئے نہیں ہے۔ وہ ایسا رویہ پیدا کر دیتی ہے کہ لوگ پہلے سے موجود طریقے اور راستے اختیار کر لیتے ہیں۔ یہ رویہ ایسے معاشرے کے لئے ضروری ہے جو آزاد خیالی اور نئی سوچ کا روادار نہ ہو۔

جیسا کہ مغربی معاشرے نے تغیر کو اصول بنالیا ہے ان کے لئے دیو مالا کے کردار کو سمجھنا مشکل بلکہ ناممکن ہے اور جن کی سیرت اور کردار میں قدامت پسندی کی روح کارفرما ہو وہ جدید کلچر کی آگے دیکھنے کی حرکیات، اس کے ڈائنامکس کو نہیں سمجھ سکتے۔ جدیدیت پسندوں کے لئے ان لوگوں کو سمجھنا انتہائی مشکل ہے جو اب بھی روائتی دیو مالائی قدروں سے فیض حاصل کرتے ہیں۔ آج اسلامی دنیا میں اکثر مسلمان دو باتوں کے لئے فکر مند ہیں۔ پہلی بات یہ کہ وہ اس مغربی

سیکولرازم سے بیزار ہیں جو مذہب کو سیاست اور چرچ کو ریاست سے الگ کرتا ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ اکثر مسلمان یہ خواہش رکھتے ہیں کہ اسلامی شریعت کی حکومت قائم ہو۔ نئے لوگ ڈرتے ہیں کہ ملاؤں کی حکومت ترقی کی رفتار روک دیتی ہے جو معاشرے کی ترقی اور زندگی کے لئے لازمی ہے۔ وہ دیکھ چکے ہیں کہ چرچ اور ریاست کی علیحدگی میں کتنی آزادی، کتنی بھلائی ہے۔ وہ یہ سوچ کر بھی کانپ جاتے ہیں کہ کوئی احتسابی ادارہ اجتہاد کے دروازے بند کردے۔ اسی طرح الہامی قانون کا تصور بھی ان کے لئے ناقابل قبول ہے کہ انسان سے بڑی کوئی طاقت اس پر اپنا ناقابلِ تغیر قانون مسلط کردے۔ سیکولرازم کے ماننے والے قانون کو مائیتھوس کی بجائے لوگوں کی پیداوار سمجھتے ہیں کیونکہ قانون ریشنل ہے اور حقیقت پر مبنی ہے اور عصری تقاضوں کے تحت اس میں تبدیلیاں ہمیشہ ہوسکتی ہیں۔ یہ اہم ایشوز ہیں جو نئی سوچ کے لوگوں اور مسلمان بنیاد پرستوں کے درمیان خلیج بن کر حائل ہیں۔

ترکی کے سازگار ماحول میں شرعی حکومت کا تصور گہرے اطمینان کا باعث تھا۔ یہ عثمانی سلطنت کا کارنامہ تھا جس نے اسلامی قانون کے ساتھ اپنی وابستگی کے ذریعے یہ عظیم کام سرانجام دیا۔ شریعت کی حمایت کرنے سے سلطان کی عزت واحترام میں بھی اضافہ ہوا۔ اگرچہ سلطان اور اس کے صوبائی گورنروں کے اپنے الگ دیوان تھے جہاں انصاف کے مطابق فیصلے کئے جاتے مگر شرعی عدالتوں کے سربراہ قاضی تھے۔ شرعی عدالتوں کی باقاعدہ تنظیم پہلی دفعہ عثمانیوں نے کی تھی جن کی حیثیت باقاعدہ ججوں کے برابر تھی۔ قاضی ان کے مشیر مفتی اور تمام علماء جو مدرسوں میں فقہ پڑھاتے تھے عثمانی سلطنت میں ان سب کو سرکاری افسروں کا درجہ حاصل تھا۔ فوج اور بیوروکریسی کی طرح ان کا ہونا ناگزیر تھا۔ عرب صوبوں کے باشندوں نے بھی ترکوں کی قیادت قبول کرلی تھی کیونکہ سلطنت کی حکومت میں علماء کو بھی رسوخ حاصل تھا جنہیں اسلامی قانون کی حمایت حاصل تھی۔ چنانچہ سلطان اور اس کی رعایا، استنبول اور دور کے صوبوں کے مابین علماء اہم رابطہ تھے۔ علماء عوام کے مسائل سلطان کے سامنے پیش کرسکتے تھے۔ سلطان اگر اسلامی اصولوں کی خلاف ورزی کرے تو علماء اسے ٹوک دیتے تھے۔ اس طرح علماء سمجھتے تھے کہ عثمانی ریاست ان کی اپنی ریاست ہے۔ عثمانی سلاطین نے علماء کا دباؤ بہت حد تک برداشت کیا اس لئے کہ اقتدار میں علماء کی شراکت نے ان کے اختیارات بڑھادیئے تھے۔ اس سے پہلے شریعت نے حکومت کے

روزمرہ کے معاملات میں اتنا نمایاں کردار کبھی ادا نہیں کیا تھا جیسا کہ اس نے عثمانی سلطنت میں ادا کیا۔ سولھویں صدی کے دوران عثمانیوں کی کامیابی سے عیاں ہے کہ اسلامی قانون سے ان کی وفاداری نے انہیں فی الحقیقت صحیح راستے پر ڈال دیا تھا۔

جیسا کہ ہم جانتے ہیں تمام قدامت پسند معاشرے کسی سنہرے دور کی تلاش میں رہتے ہیں۔ سنی مسلمانوں اور عثمانی سلطنت کے لئے محمد رسول ﷺ اور ان کے چار خلفائے راشدین کا زمانہ سنہرا دور تھا۔ انہوں نے اسلامی قانون کے مطابق حکومت کی تھی۔ مذہب اور ریاست دونوں ایک تھے۔ محمد رسول ﷺ بیک وقت پیغمبر اور سیاسی رہنما تھے۔ ساتویں صدی میں قرآن مجید ان پر وحی کے ذریعے نازل ہوا۔ اس میں حکم دیا گیا تھا کہ مسلمانوں کا پہلا فرض انصاف پسند اور مساوات پر مبنی معاشرہ قائم کرنا ہے جس میں غریبوں اور کمزوروں کی عزت نفس کا خیال رکھا جائے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ معاشی، ذاتی، سماجی، سیاسی اور روحانی تمام محاذوں پر جہاد کیا جائے۔ (جہاد کا ترجمہ جدوجہد یا کوشش ہے مقدس جنگ نہیں ہے جیسا کہ مغرب میں اس کا ترجمہ کیا گیا ہے)۔ تمام زندگی خدا کی رضا کے مطابق بسر کی جائے اور خلق کی بہتری کے لئے تمام کوششیں وقف کی جائیں۔ اس طرح مسلمان انفرادی اور اجتماعی سطح پر ایک ہو جائیں گے اور انہیں خدا کی قربت حاصل ہوگی۔ زندگی کے کسی حصے کو جہاد کے دائرے سے خارج کرنا توحید کے اصول کی نفی ہے جو اسلام کا بنیادی اصول ہے اس کی نفی خود ذات حق کی نفی ہے۔

مسلمانوں کے دین کے پانچ ارکان ہیں۔ جن پر شیعہ سنی کو عمل کرنا ہوتا ہے۔ ہر مسلمان کو خدا کے ایک ہونے اور محمد ﷺ کے نبی ہونے پر شہادت کلمہ کے ذریعے دینا ہوتی ہے۔ دن میں پانچ نمازیں ادا کرنا ہوتی ہیں۔ زکوٰۃ کے ذریعے دولت کی منصفانہ تقسیم، غریبوں کی حالت محسوس کرنے کے لئے رمضان میں روزے اور حج کا فریضہ ادا کرنے مکہ جانا ہوتا ہے۔ زکوٰۃ اور روزوں کا سیاسی پہلو بھی ہے مگر حج کو زبردست سیاسی اہمیت حاصل ہے۔ جو اجتماعی سطح پر ایک دینی فریضہ ہے جس کے دوران تمام مسلمان ایک ہی جیسا لباس پہنتے ہیں تاکہ غریب اور امیر کی تمیز باقی نہ رہے۔

حج کعبہ میں ادا کیا جاتا ہے جو مکہ میں واقع ہے۔ کعبہ محمد ﷺ کے زمانے میں بھی انتہائی قدیم مقام ہے۔ جس میں خدائے واحد کی بجائے بتوں کی پرستش ہوتی تھی۔ محمد ﷺ نے کعبے کو

بتوں سے پاک کرکے اسے ایک خدا کی عبادت کا مرکز بنایا۔ حج آج بھی مسلمانوں کی مرکزیت اوراجتماعیت کا شاندار تجربہ ہے۔

حج، جوکہ آج بھی حاجیوں کے لئے چوٹی کی مذہبی اورروحانی روایت ہے اس میں قدامت پسندی کی روح پوری طرح کارفرما ہے۔ آرکی ٹائپ کی غیرشعوری دیومالائی دنیا میں جڑیں پکڑے ہوئے حقیقی مائتھوس کی طرح مسلمانوں کی توجہ اس حقیقت کی طرف دلاتی ہے جو بنیادی ہے اور جس سے آگے جانا ناممکن ہے۔ وہ ذہنی سطح سے بھی کسی اعلیٰ سطح پر ان کی دستگیری اس امر میں کرتی ہے کہ جو کچھ اور جیسا پہلے سے ہے اسے ویسے ہی قبول کیا جائے اور کوئی الگ راستہ اختیار نہ کیا جائے۔ سیاست، معیشت تجارت یا سماجی تعلقات اور ریشنل نوعیت کے تمام اجتماعی کام دیومالائی حوالے سے انجام پاتے ہیں۔ پتھر کے مرکز میں واقع ہونے اور بعد میں مسلم دنیا کا مرکز ہوتے ہوئے، کعبہ نے ان ریشنل سرگرمیوں کو تناظر اور معنی دیئے ہیں۔ قرآن نے بھی اس کی طرف اشارہ کیا ہے بار بار کہا گیا ہے کہ وہ دنیا میں کوئی نیا سچ لے کر نہیں آیا بلکہ اس کے ذریعے انسانی زندگی کے بنیادی اصول سکھائے گئے ہیں۔ قرآن ان سچائیوں کی یاددہانی ہے جو پہلے ہی معلوم ہیں۔ محمدﷺ نے یہ نہیں فرمایا کہ وہ نیا دین لے کر آئے ہیں بلکہ وہ ایسا مذہب لائے ہیں جسے اولیت کا مقام حاصل ہے عربوں کے پاس پہلے کوئی پیغمبر نہیں آیا تھا اور نہ ہی ان کی زبان میں خدا کا کلام نازل ہوا تھا۔ حضرت آدمؑ (جنہیں پہلا پیغمبر کہا گیا ہے) کے وقت سے خدا نے ہر قوم کی طرف پیغمبر بھیجے ہیں تاکہ انہیں زندگی بسر کرنے کے اصول سمجھائیں۔ جانوروں اور پودوں کی مثال دی گئی ہے۔ جو خدا کی رضا پر سر جھکاتے ہیں مگر انسانوں کو آزادی دی گئی ہے۔ انہیں اختیار ہے کہ وہ چاہیں تو نافرمان ہو جائیں۔ جب انسانوں نے زندگی کے اصولوں کی پرواہ نہیں کی اور ظالم معاشرے بنائے جنہوں نے کمزوروں پر ظلم کیا اور دولت منصفانہ طور پر بانٹنے سے انکار کیا تو ان کی تہذیبیں تباہ ہوگئیں۔ قرآن نے بتایا ہے کہ آدمؑ، نوح، موسیٰ عیسیٰ اور دوسرے بے شمار پیغمبر ایک ہی پیغام دہراتے چلے آئے ہیں۔ اب قرآن نے عربوں کو بھی خدا کا وہی ایک پیغام دیا ہے۔ انہیں حکم دیا ہے کہ سماجی انصاف اور مساوات پر مبنی معاشرہ قائم کریں جو زندگی کے بنیادی اصولوں کے مطابق ہو۔ جب مسلمان خدا کے احکام بجالاتے ہیں تو جانتے ہیں کہ ان کا عمل فطرت کے عین مطابق ہے۔ خدا کے احکام کی خلاف ورزی غیرفطری عمل سمجھا جاتا ہے۔ جیسے

مچھلی پانی کے بغیر زندہ رہنے کی کوشش کرے۔

سولھویں صدی میں عثمانیوں کی حیرت انگیز کامیابی کو ان کی رعایا نے اس بات کا ثبوت سمجھا کہ وہ انہی بنیادی اُصولوں کی پیروی کررہے ہیں۔ اسی وجہ سے اس معاشرے نے شاندار کام کئے۔ عثمانی حکومت میں شریعت کی بے مثال اہمیت کو بھی انہوں نے انہی معنوں میں لیا ہوگا۔ جدید دور کے آغاز میں مسلمانوں نے خدا کے قانون کو اپنی آزادی کے لئے رکاوٹ نہیں جانا۔ یہ تو دیومالائی آرکی ٹائپ کا مسلکی احساس تھا جس کے ذریعے وہ سمجھتے تھے کہ انہیں خدا کا قرب حاصل ہوتا ہے۔ اس دنیا سے حضرت محمدﷺ کے رخصت ہونے کے صدیوں بعد تک مسلم لاء بتدریج آگے بڑھتا رہا کیونکہ قرآن میں تو قانون سازی برائے نام تھی۔ اس لئے یہ امت کا تخلیقی کارنامہ تھا۔ رسولﷺ کے بعد ایک صدی کے عرصے میں مسلمانوں نے ایک وسیع سلطنت بنائی جو ہمالیہ سے پائیرینس(Pyreness) تک پھیلی ہوئی تھی۔ جس کے لئے مضبوط قانونی نظام درکار تھا۔ آخرکار اسلامی فقہ کے چار سکول منظر عام پر آئے۔ چاروں کم وبیش ایک جیسے تھے اور ان کی قانونی حیثیت بھی اسی طرح مسلم تھی۔ قانون کی بنیاد رسولﷺ کی شخصیت ہے نزول وحی کے عرصہ میں انہوں نے تسلیم ورضا کے عمل میں کمال حاصل کرلیا تھا۔ عینی شاہدوں کے ذریعے ان کی تعلیم اور سیرت وکردار کے متعلق معلومات جمع کی گئیں ان کے ارشادات حدیث نبوی کہلائے۔ نویں صدی میں بڑی احتیاط کے ساتھ ان کی چھان بین ہوئی تا کہ ان کی احادیث وسنت کا معتبر ریکارڈ مسلمانوں کے پاس موجود رہو۔ مدرسوں نے انہیں اپنے نصاب میں شامل کرلیا تا کہ تمام مسلمان اپنے نبیﷺ کے اعمال واقوال کی تقلید کرسکیں۔ ظاہری معاملات میں نبیﷺ کی تقلید کرتے ہوئے ان کی یہ خواہش بھی ہوتی ہے کہ وہ باطنی سطح پر خدا کی خوشنودی حاصل کرسکیں۔

مسلم لاء پر عمل نے حضرت محمدﷺ کی تاریخی شخصیت کو متھ میں بدل دیا۔ انہیں اس وقت کی حدوں سے آزاد کردیا جس میں وہ رہتے تھے۔ وقت سے اوپر اٹھ کر وہ ہر سچے مسلمان کے دل میں زندہ ہیں۔ اسی طرح اسوۂ رسولﷺ پر بار بار عمل کرنے سے صحیح اسلامی معاشرہ وجود میں آیا۔ اسوۂ رسولﷺ کے ذریعے محمدﷺ کی ذات سے قربت کے احساس نے انہیں سکھادیا ہے کہ اچھا مسلمان بننا کیسے ممکن ہے۔ تیرھویں صدی میں منگولوں کے حملوں تک یہ شرعی روحانیت تمام مسلم دنیا میں (سنی ہو کہ شیعہ) جڑ پکڑ چکی تھی۔ اس لئے نہیں کہ اسے خلفاء اور علماء نے لوگوں پر مسلط

کیا تھا بلکہ اس لئے کہ اس نے انہیں خدا کے ہونے کا احساس دیا تھا اور ان کی زندگیوں کو معنی دیئے تھے۔ ماضی سے اُن کی وابستگی نے ان کے پاؤں میں زنجیریں نہیں ڈال دی تھیں کہ وہ آگے نہ بڑھیں ابتدائی سولھویں صدی میں عثمانی ریاست دنیا بھر میں سب سے زیادہ ترقی یافتہ ریاست تھی۔ اس کا طرزِ حکومت نہایت شاندار تھا۔ انہوں نے بالکل نئے سٹائل کی بیوروکریسی ایجاد کی تھی۔ فکری ذہنی اور عملی معاملات میں وہ اپنی قوم کی حوصلہ افزائی کرتے تھے۔ دوسری تہذیبوں کے لئے عثمانیوں کے سینے کشادہ تھے وہ مغرب کے فن جہاز رانی کے متعلق بہت گرم جوش تھے اور اس سلسلہ میں ان کے انکشافات میں گہری دلچسپی لیتے تھے۔ وہ مغرب کی جنگی ایجادات مثلاً گن پاؤڈر اور اسلحہ وغیرہ کا فن بھی سیکھنا چاہتے تھے۔ یہ علماء کا کام تھا کہ وہ دیکھیں کہ اسلامی قانون کی رو سے ان ایجادات کی کیا حیثیت ہے۔ فقہ کی تعلیم کا مقصد محض پرانا سبق دہرانا نہیں تھا بلکہ کئی پہلوؤں سے ایک نئے چیلنج کا سامنا کرنا تھا۔ اس وقت اسلام اور مغربی دنیا میں کوئی بڑا فرق نہیں تھا۔ خود مغرب میں قدامت پسندی کی لہر موجود تھی۔ نشاۃ ثانیہ کے علمبردار اپنے بنیادی وسائل کی طرف لوٹ کر اپنے کلچر کی تجدید کر رہے تھے۔ ہم یہ تو جان چکے ہیں کہ عام فانی انسان کے لئے مذہب سے منہ موڑنا ممکن نہیں۔ اپنی نئی ایجادوں کے باوجود یورپ بدستور قدامت پسندی کے زیر اثر تھا۔ اس سے گریز اس وقت ہوا جب ماضی کی طرف مڑ کر دیکھنے والی دیو مالائی زندگی کی جگہ مغربی جدیدیت نے لی۔ جس کے ریشنل ازم کا رخ مستقبل کی طرف تھا۔ یہ سوچنا بھی غلط ہے کہ قدامت پسند معاشرہ متحرک نہیں ہوتا۔ مسلمانوں کی تاریخ میں اصلاح اور تجدید کی ایسی کئی تحریکیں ہیں جو اکثر انقلاب پسند تھیں۔ مثال کے طور پر دمشق کے احمد بن تیمیہ (1263-1328) نے یہ ماننے سے انکار کر دیا تھا کہ اجتہاد کے دروازے بند ہو چکے ہیں۔ وہ منگولوں کے حملوں کے دوران اور ان کے بعد بھی زندہ تھے۔ جب مسلمان اس قیامت خیز المیے سے سنبھلنے اور اپنے معاشرے کو نئے سرے سے منظم کرنے کی کوشش میں تھے۔ اصلاحی تحریکیں عام طور پر کلچری تبدیلی یا کسی زبردست سیاسی بربادی کے عرصے میں نمودار ہوتی ہیں۔ ایسے وقتوں میں مسائل کے پرانے حل کسی کام نہیں آتے اس لئے ریفارمر، حالات بدلنے کے لئے اجتہاد کی ریشنل قوت سے کام لیتے ہیں۔ ابن تیمیہ کی خواہش تھی کہ وہ شریعت کو عصری تقاضوں سے ہم آہنگ کریں تاکہ ان انتہائی برے حالات میں مسلمان اس سے صحیح رہنمائی حاصل کریں۔ ابن

تیمیہ انقلابی تھے مگر ان کے پروگرام نے بنیادی طور پر قدامت پسندانہ شکل اختیار کی۔ ابن تیمیہ کا خیال تھا کہ اس عظیم بحران سے نکلنے کے لئے مسلمانوں کو قرآن اور سنت رسول ﷺ پر عمل کرنا چاہیے۔ ان کی طرف لوٹ جانا چاہیے۔ ابن تیمیہ سمجھتے تھے کہ مذہب کے اندر بعد میں جو ترامیم اور اضافے کئے گئے انہیں منسوخ کر کے صرف بنیادی اصولوں سے رجوع کرنا چاہیے اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ انہوں نے اسلامی فقہ اور فلسفہ کا بہت سا ایسا حصہ الٹ پلٹ کر رکھ دیا جسے مقدس ومحترم خیال کیا جاتا تھا اور جسے نظر انداز کر کے وہ مسلمانوں کے اولین دور کی طرف واپسی چاہتے تھے۔ ان کی بغاوت نے اسٹیبلشمنٹ کو غضب ناک کر دیا جس کے نتیجے میں ابن تیمیہ کو جیل خانے میں موت آئی۔ کہتے ہیں کہ ان کی موت بڑی مایوسی کی حالت میں ہوئی کیونکہ جیلر نے انہیں کاغذ اور قلم بھی مہیا کرنے سے انکار کر دیا تھا مگر عام لوگ انہیں چاہتے تھے۔ ان کی قانونی اصلاحات کی نوعیت انقلابی تھی اور عام لوگ جانتے تھے کہ انہیں ہمارا مفاد عزیز ہے۔ ان کی میت کا جلوس عوام میں اس کی زبردست مقبولیت کا کھلا مظاہرہ تھا۔ اسلامی تاریخ میں ایسے کتنے ہی ریفارمر ہو گزرے ہیں اور ہمارے زمانے میں بھی بعض مسلمان بنیاد پرست تجدید اور اصلاح کی اسی روایت میں زندہ ہیں۔

مخفی تحریکوں میں شامل مسلمان نئے مذہبی تصورات اور ریاضتوں کی تلاش میں کامیاب ہو گئے مگر انہیں عام لوگوں سے پوشیدہ رکھا گیا تا کہ کسی غلط فہمی کا احتمال نہ رہے۔ انہیں اپنے مذہبی تصورات اور اکثریت کے تصورات میں کوئی تضاد نظر نہیں آیا۔ ان کا خیال تھا کہ ان کی تحریکیں قرآن کی تعلیم میں معاون ہیں اور مذہبی تعلیمات کو حالات کے ساتھ نئی مطابقت دے رہی ہیں۔ مخفی اسلام کی تین اہم شاخیں تصوف، فلسفیانہ ریشنلزم اور شیعی سیاسی تقویٰ ہیں جن کا ہم بعد میں جائزہ لیں گے مگر اسلام کی یہ مخفی شکلیں کتنی ہی جدت پسند نظر آئیں اور شرعی تقویٰ کے بڑے دھارے سے کٹتی ہوئی لگیں مگر ان کے اراکین سمجھتے تھے کہ وہ اسلام کی اولین صورت کی طرف لوٹ رہے ہیں۔ فلسفیوں نے یونانی فلسفے کے اصول قرآنی تصورات پر آزمائے۔ وہ وقت کی قید سے آزاد حقیقتوں اور ابتدائی مذاہب کی طرف لوٹنا چاہتے تھے جن کے متعلق انہیں یقین تھا کہ لاتعداد تاریخی مذاہب پر انہیں اولیت حاصل ہے۔ صوفیوں کو یقین تھا کہ ان کی صوفیانہ وجد آفرینی پیغمبر ﷺ کے اس روحانی تجربہ کو دہراتی ہے جو وحی نازل ہونے کے دوران انہیں حاصل ہوا تھا۔

اس طرح صوفی بھی اسی اولین حقیقت کی طرف واپسی چاہتے تھے۔شیعوں کا دعویٰ تھا کہ سماجی انصاف کا جذبہ صرف انہوں نے پیدا کیا ہے سماجی انصاف خدا کا حکم تھا مگر بددیانت مسلمان حکمرانوں نے نافرمانی کی۔ان میں سے کوئی بھی ان معنوں میں اوریجنل نہیں تھا جن معنوں میں ہم سمجھتے ہیں بلکہ اوریجنل سے ان کی مراد قدامت پسندانہ طریقے سے بنیادی اصولوں کی طرف لوٹ جانا تھا۔ان کے خیال میں انسانی تکمیل اور کمال کی بس یہی ایک صورت تھی۔

مسلمان ملکوں میں سے مصر اس وقت ہمارا موضوع ہے جو 1517 میں عثمانی سلطنت کا حصہ بنا۔ جب سلیم اول نے شام میں مہم کے دوران اسے فتح کیا۔شریعت کا غلبہ وہاں پہلے ہی تھا۔ قاہرہ میں الازہر یونیورسٹی فقہہ کی تعلیم کا نہایت اہم سنی مرکز تھا عثمانیوں کی حکمرانی کی ان صدیوں میں مصر استنبول سے پیچھے رہ گیا۔ جدید دور کے ابتدائی ایام میں اس کے متعلق بہت کم معلومات مہیا تھیں۔1250 سے اس علاقے پر مملوک حکمران تھے جو ان غلاموں پر مشتمل ایک فوج تھی جو گرفتاری کے بعد مسلمان ہوگئے تھے۔ جان نثاروں کے نام سے غلاموں پر مشتمل ایسی ہی فوج عثمانی سلطنت کی ریڑھ کی ہڈی تھی۔مملوک جب عروج پر تھے تو مصر اور شام میں ان کا معاشرہ جاندار اور متحرک تھا اور مصر اسلامی دنیا کے سب سے ترقی یافتہ ملکوں میں سے تھا۔مگر آخر کار مملوک سلطنت زرعی معاشرے کی فطری کمزوریوں کی وجہ سے دم توڑ گئی اور پندرھویں صدی کے آخری حصہ میں اس کا زوال ہوگیا۔مگر مملوک مصر میں ایسے نہیں ہارے تھے کہ سنبھالا ہی نہ لے سکیں۔عثمانی سلطان سلیم اوّل نے مملوک گورنر خیر بیگ کے ساتھ اتحاد کر کے ملک فتح کیا اور مصر سے رخصت ہوتے ہوئے خیر بیگ کو وائسرائے بنادیا گیا۔

شروع میں عثمانیوں نے مملوکوں پر قابو پائے رکھا اور ان کی دو بغاوتیں بھی کچل دیں لیکن سولھویں صدی کے آخر میں عثمانیوں کے اپنے وسائل ختم ہونے لگے۔شدید افراط زر کی وجہ سے معیشت کی حالت خراب ہوگئی اور مختلف بغاوتوں کے بعد مملوک مصر کے حقیقی حکمرانوں کی صورت میں ابھر آئے۔ اگرچہ سرکاری طور پر وہ استنبول کے اطاعت گزار تھے۔مملوک (جو اپنے نام کے ساتھ 'بے' لگاتے تھے) سرداروں نے ایک اعلیٰ درجے کا فوجی دستہ تیار کیا جو عثمانی فوج کے خلاف مملوک سپاہیوں کی بغاوت کرانے میں کامیاب ہوگیا۔عثمانی فوج کے اندر ترک گورنر کے خلاف مملوکوں کی یہ بغاوت کامیاب ہوگئی اور ترک گورنر کی بجائے انہوں نے اپنا گورنر مقرر کردیا۔

سلطان نے اس تقرری کی تصدیق کردی اور ملک پر مملوکوں کا قبضہ جاری رہا۔ سوائے اس مختصر عرصے کے جب ایک جان نثار نے حکومت پر قبضہ کرلیا۔ یہ واقعہ سترھویں صدی کے آخری دور میں ہوا۔ مملوک حکومت غیر مستحکم تھی۔ ان کے سردار دو حصوں میں تقسیم ہو گئے اور اندرونی جھگڑوں اور بے چینی نے مستقل صورت اختیار کرلی۔ اس ہنگامہ خیز دور کا مستقل نشانہ مصری عوام تھے۔ بغاوتوں اور فریقین کے جھگڑوں میں ان کی جائدادیں ضبط کرلی جاتیں، گھر لوٹ لئے جاتے اور ٹیکسوں کی بھرمار سے ان کی زندگی اجیرن ہوجاتی۔ حکمران ان کی حالت سے بیگانہ تھے وہ چونکہ غیر ملکی تھے اس لئے انہین مصری عوام سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ عوام نے علماء سے رجوع کیا۔ علماء مصری تھے۔ شریعت کے نمائندہ تھے وہ عوام کے صحیح رہنما ثابت ہوئے۔ اٹھارویں صدی میں حکمرانوں کی باہمی چپقلش اور بڑھ گئی تو مملوک لیڈروں کو خیال آیا کہ وہ علماء سے اپیل کریں کہ مصری عوام انہیں اپنے حکمران مان لیں۔ علماء مصری سوسائٹی کے ٹیچر، سکالر اور دانش ور تھے۔ ہر شہر میں ایک سے سات تک مدرسے (اسلامی قانون اور مذہبی تعلیم کے ادارے) تھے جو ملک کو استاد مہیا کرتے تھے۔ ذہنی وفکری سطح بلند نہیں تھی۔ سلیم اول نے جب مصر فتح کیا تو وہ بہت سے مشہور علماء اور قیمتی مسودے اپنے ساتھ استنبول لے گیا تو مصر عثمانی سلطنت کا سب سے پسماندہ صوبہ بن گیا۔ عثمانی عرب سکالروں کی حوصلہ افزائی نہیں کرتے تھے۔ عثمانیوں کے علاوہ باقی دنیا سے مصریوں کا کوئی رابطہ نہیں تھا۔ چنانچہ مصری فلسفہ اسٹرونومی، میڈیسن اور سائنس کو زوال آ گیا حالانکہ مملوک سلطنت کے دوران انہوں نے فروغ پایا تھا۔

علماء چونکہ حکمرانوں اور عوام کے درمیان رابطے کا سب سے بڑا ذریعہ تھے اس لئے وہ انتہائی طاقتور رہو گئے ان میں سے اکثر فلاحین یعنی کسانوں میں سے تھے۔ اس لئے دیہات میں ان کا بہت اثر ورسوخ تھا۔ اسکولوں اور مدرسوں میں انہیں تعلیمی نظام پر پورا کنٹرول حاصل تھا کیونکہ ملک میں شرعی عدالتوں کو مرکزی حیثیت حاصل تھی۔ قانونی سسٹم پر بھی علماء کا اجارہ تھا۔ اس کے علاوہ شاہی دربار میں وہ اعلیٰ سیاسی عہدوں پر فائز تھے شریعت کے محافظوں کی حیثیت سے وہ حکومت کے خلاف ایک بااصول اپوزیشن کی رہنمائی بھی کرسکتے تھے۔ مدرسہ الازہر، بازار سے قریب تھا۔ تاجروں کے ساتھ علماء کے اکثر خاندانی تعلقات تھے۔ اگر وہ حکومت کی پالیسی کے خلاف احتجاج کرنا چاہتے تو الازہر کے میناروں سے نوبت بجادی جاتی بازار بند ہوجاتے اور

عوام باہر سڑکوں پر نکل آتے۔ 1794 میں مثال کے طور پر شیخ الشرقوی الازہر کے ریکٹر نے ایک احتجاجی جلوس کی رہنمائی کی جو ایک نئے ٹیکس کے خلاف نکالا گیا تھا۔ جس کے متعلق انہوں نے اعلان کیا کہ نیا ٹیکس ظالمانہ اور خلاف اسلام ہے۔ تین روز بعد حکمران مجبور ہو گئے کہ ٹیکس واپس لے لیں مگر ایسا کوئی خطرہ نہیں تھا کہ علماء ایک اسلامی انقلاب کی رہنمائی کریں اور حکومت کی جگہ لے سکیں۔ حکمران علماء کی جائدادیں ضبط کر کے انہیں اپنے زیر اثر رکھتے تھے۔ عوامی احتجاج مملوک آرمی کے سامنے زیادہ دیر نہیں ٹھہر سکتا تھا پھر بھی علماء کی امتیازی حیثیت نے مصری سوسائٹی کو ایک واضح مذہبی کردار دیا۔ اسلام مصری عوام کا واحد حقیقی سہارا تھا۔

اٹھارویں صدی کے اندر مشرق وسطیٰ میں حالات خراب ہو گئے۔ عثمانی سلطنت اب خطرناک انتشار کا شکار تھی۔ سولھویں صدی کی شاندار حکمرانی اب اس کی نااہلی میں بدل چکی تھی۔ مغرب حیرت انگیز طور پر طاقت ور ہو رہا تھا۔ عثمانی جانتے تھے کہ وہ یورپی طاقتوں سے برابر کی جنگ نہیں لڑ سکتے تھے۔ مغرب کے چیلنج کا مقابلہ ان کے لئے مشکل تھا۔ محض اس لئے نہیں کہ وہ سیاسی طور پر کمزور تھے بلکہ اس لئے کہ یورپ میں جس نئی سوسائٹی کی تخلیق ہو رہی تھی، دنیا کی تاریخ میں اس کی کوئی مثال نہیں تھی۔ عثمانی سلاطین نے بھی اسے اختیار کرنا چاہا مگر ان کی کوششیں سطحی اور نیم دلانہ تھیں۔ سلطان سلیم سوئم (1807-1789) کی حکومت نے مثال کے طور پر مغربی خطرے کو فوجی معنوں میں لیا۔ 1730 کے عشرے میں فوج کو یورپی انداز سے منظّم کرنے کی ناکام کوششیں ہوتی رہی تھیں مگر جب سلیم 1789 میں تخت نشین ہوا تو اس نے کئی فوجی سکول کھولے جن میں فرانسیسی انسٹرکٹر تربیت دیتے تھے ان سکولوں میں ہی طالب علموں کی شناسائی یورپی زبانوں، ریاضی، جہاز رانی، جغرافیہ اور تاریخ کی مغربی کتابوں سے ہوئی مگر مغرب کے مقابلہ کے لئے یہ سب کچھ کافی نہیں تھا کیونکہ مغرب نے ایک بالکل نئی طرز فکر اور مختلف طرزِ حیات اختیار کی تھی تا کہ ایک نئے دور کا آغاز ہو۔ یورپ کو اس کے میدان میں شکست دینے کے لئے ناگزیر تھا کہ عثمانی اپنے ماضی کے ساتھ تمام رشتے توڑ دیں۔ سوسائٹی کی اسلامی ساخت اور کردار بدل دیں اور ریشنل کلچر مکمل طور پر اپنائیں۔ یہ ممکن تھا کہ مٹھی بھر اشرافیہ یعنی چیدہ لوگ تو یہ تبدیلیاں قبول کر لیں جنہیں بروئے کار لانے میں یورپ کے تقریباً تین سو سال لگے تھے مگر عوام کو کون سمجھاتا۔ ان کے دل و دماغ تو قدامت پسندانہ خیالات سے معمور تھے۔ یہ انقلابی تبدیلی وہ

کیوں کر قبول کرتے۔

عثمانی سلطنت کی سرحدوں پر اس کا زوال بری طرح محسوس کیا گیا۔ لوگوں میں بے چینی پیدا ہوئی۔ ان میں تبدیلی کی خواہش بھی پیدا ہوئی جیسے کہ پہلے مذہبی لحاظ سے پیدا ہوتی رہی تھی۔ جزیرہ نمائے عرب میں محمد بن عبدالوہاب نے عثمانی سلطنت سے رشتہ توڑ لیا۔ وسطیٰ عرب خلیج فارس کے علاقے میں اس نے اپنی حکومت بنالی۔ عبدالوہاب (92-1703) نے بحران کا حل قرآن اور سنت کی طرف لوٹ جانے میں بتایا۔ اس نے زمانہ وسطیٰ کا فقہ تصوف اور فلسفہ سبھی کچھ غلط قرار دیا کیونکہ اس کے خیال میں یہ اصلی مذہب سے روگردانی تھی۔ عبدالوہاب نے عثمانی سلاطین کو مرتد اور گردن زدنی قرار دیا اور یہ بھی کہا کہ وہ مسلمانوں کی اطاعت کے اہل نہیں ہیں اور ان کی شرعی ریاست غیر مستند ہے۔ اس نے کوشش کی کہ اپنی ایک الگ حکومت بنالے جس میں ساتویں صدی کے خالص مذہب پر عمل کرنے کی ترغیب دی جائے۔ اس کی تحریک پُرتشدد اور جارحانہ تھی۔ اس نے طاقت کے زور پر اپنے آپ کو لوگوں پر ٹھونسا تھا۔ اس کے مخصوص پُرتشدد وہابی، ہتھکنڈے بیسویں صدی میں بھی اسلام پسند بنیاد پرستوں کے بہت کام آئے۔ گو کہ یہ دور کہیں زیادہ اضطراب اور بے چینی سے عبارت تھا۔

مراکش کے صوفی مصلح احمد ابن ادریس (1836-1780) کی اپروچ مختلف تھی۔ ان کی تعلیمات کے مطابق عمل کرنے والے ہمارے زمانے میں بھی ہیں۔ عثمانی صوبوں میں انتشار اور شکست و ریخت روکنے کے لئے ضروری سمجھتے تھے کہ لوگوں میں تعلیم عام کی جائے اور وہ بہتر مسلمان بنیں۔ انہوں نے شمالی افریقہ اور یمن میں دور دراز سفر کئے اور لوگوں کو ان کی اپنی زبان میں سمجھاتے رہے کہ اجتماعی عبادات کی کیا اہمیت ہے اور غیر اخلاقی حرکتوں سے بچنا کیوں ضروری ہے۔ یہ ایک گراس روٹ تحریک تھی۔ ابن ادریس کے پاس وہابی طرز عمل کے لئے کوئی وقت نہیں تھا۔ ان کی نظر میں مسئلے کا صحیح حل تعلیم میں تھا۔ طاقت اور تشدد سے مسئلہ حل نہیں ہوسکتا تھا۔ مذہب کی آڑ میں لوگوں کو قتل کرنا سراسر غلط تھا۔ دوسرے ریفارمر بھی انہی خطوط پر کام کررہے تھے۔ الجزائر میں احمد التکفرانی (d. 1815) مدینہ میں محمد ابن عبدالکریم صمیم (d.1775) اور لبیا میں محمد ابن علی السنوسی (d.1832) نے براہ راست عوام سے رابطہ کیا اور انہیں دین کے اصول سمجھائے۔ انہوں نے علماء کو درمیان میں حائل نہ ہونے دیا۔ ان

اصلاحات کی جڑیں عوام میں تھیں۔ ان سب نے مذہبی اجارہ داروں پر سخت تنقید کی جنہیں مسلم عوام سے کوئی واسطہ نہ تھا۔ وہ سمجھتے تھے کہ فقہہ کی باریکیوں اور پیچیدگیوں میں الجھنے کی بجائے اگر مسلم عوام صاف ستھری زندگی بسر کریں اور دینی احکام باقاعدگی سے بجالائیں تو سوسائٹی کی خرابیاں یقیناً ختم ہوں گی۔

صدیوں سے صوفی اپنے شاگردوں کو سمجھا رہے تھے کہ اپنی زندگیوں کو رسول ﷺ کی زندگی کا نمونہ بنائیں وہ یہ بھی سمجھاتے رہے کہ تخلیقی اور صوفیانہ تخیل کے ذریعے ہی خدا تک پہنچنا ممکن ہے۔ لازم ہے کہ لوگ صوفیانہ غور وفکر اور عمل کی مدد سے اپنے وسائل آپ پیدا کریں۔ اٹھارویں صدی کے آخر اور انیسویں صدی کے آغاز میں یہ ریفارمر (جنہیں سکالر نئے صوفی کہتے تھے) ایک قدم اور آگے گئے۔ انہوں نے لوگوں کو بتایا کہ انہیں صرف اپنی سمجھ اور بصیرت پر بھروسہ کرنا چاہیے۔ انہیں سکالروں اور ملاؤں پر انحصار کرنا چھوڑ دینا چاہیے۔ ابن ادریس یہاں تک گیا کہ اس نے رسول ﷺ کے سوا تمام روحانی اور مذہبی رہنماؤں کی حیثیت تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ درحقیقت وہ مسلمانوں سے کہہ رہا تھا کہ وہ نئے رجحانات اور تصورات کی قدر کریں۔ صوفیانہ جستجو کا مقصد خدا کی ذات میں گم ہو جانے کی بجائے رسول ﷺ کی بشری حیثیت سے ہم آہنگ ہونا تھا۔ جسے انہوں نے مکمل طور پر خدا کے حضور میں پیش کر دیا تھا۔ واضح طور پر یہ جدید رویہ تھا۔ اگرچہ نئے صوفی بدستور رسول ﷺ کی شخصیت کے اس دور کی طرف لوٹنا چاہتے تھے جسے اولیت کا درجہ حاصل ہے۔ وہ اس کوشش میں بھی تھے کہ مذہب اسلام میں الوہیت کی بجائے بشریت کا عنصر غالب ہو۔ وہ اپنے شاگردوں کو سمجھا رہے تھے کہ جدید کا احترام بھی اتنا ہی کریں جتنا کہ قدیم کا کرتے ہیں۔ ابن ادریس کا مغرب کے ساتھ کوئی رابطہ نہیں تھا۔ اس نے اپنی تحریروں میں ایک بار بھی مغرب کا ذکر نہیں کیا نہ کبھی مغرب کے انداز فکر میں دلچسپی لی نہ مغرب سے اپنی واقفیت کا دعویٰ کیا۔ مگر سنی اسلام کی دیومالائی تربیت نے اسے یہ راہ دکھائی تھی کہ مغرب کی طرح روشن خیالی کو اپنی تعلیم کا اہم حصہ بنائے۔

ایران میں بھی یہی صورتحال تھی مگر اس عرصہ کی ایرانی تاریخ دستاویزی لحاظ سے مصری تاریخ سے زیادہ معتبر ہے۔ سولھویں صدی کے آغاز میں جب صفویوں نے ایران فتح کیا تو انہوں نے شیعہ ازم کو ایران کا سرکاری مذہب قرار دیا۔ شیعہ ایک فکری اور صوفیانہ مخفی تحریک ہے اور

شیعوں نے اصولی طور پر سیاست میں حصہ لینے سے گریز کیا۔ ایران میں ہمیشہ بعض اہم شیعہ سنٹر قائم ہوتے رہے ہیں مگر اکثر شیعہ ایرانی نہیں بلکہ عرب تھے۔ چنانچہ ایران میں صفویوں کا تجربہ ایک حیرت انگیز جدت تھی۔ شیعوں اور سینوں میں کوئی اصولی جھگڑا نہیں تھا بنیادی فرق احساس کا تھا۔ سنی مسلم تاریخ کے متعلق اُمید افزا نظریہ رکھتے تھے جبکہ شیعوں کا وژن المناک تھا۔ محمدﷺ کے اہلِ بیت کے ساتھ ظلم وستم کائناتی سطح پر نیکی بدی انصاف اور ظلم کے درمیان دائمی جدوجہد کی علامت بن گیا۔ جس میں ظالم کا پلہ بھاری نظر آتا تھا۔ اگر سنیوں نے رسولﷺ کی زندگی کو متھ بنادیا تھا تو شیعوں نے ان کے اہل بیت کی زندگیوں کو مائیتھالوجی کی شکل دے دی تھی۔ شیعہ مذہب سمجھنا ضروری ہے کیونکہ اس کے بغیر79-1978 کے ایرانی انقلاب جیسے واقعات سمجھ میں نہیں آسکتے اس لئے ہمیں مختصر طور پر شیعوں کے ارتقاء کا جائزہ لینا ہے۔

جب رسولﷺ اس دنیا سے رخصت ہوئے تو انہوں نے اپنی جانشینی کا مسئلہ طے نہیں کیا۔ ان کے دوست حضرت ابوبکر کو امہ نے اکثریت سے خلیفہ منتخب کرلیا۔ بعضوں کا خیال تھا کہ محمدﷺ چاہتے تھے کہ ان کے جانشین حضرت علی بن ابی طالب ہوں۔ جو ان کے کزن اور داماد تھے مگر حضرت علی 656 میں چوتھے خلیفہ بنے۔ شیعہ تین پہلے خلفاء کی حکومت تسلیم نہیں کرتے اور حضرت علی کو پہلا امام کہتے ہیں۔ حضرت علی کا تقویٰ شک وشبہ سے بالا تھا۔ وہ اپنے ماتحت افسروں کو زوردار تاکیدی خط لکھا کرتے تھے کہ حکومت کی بنیاد انصاف پر ہونی چاہیے۔ 661 میں وہ ایک مسلم انتہا پسند کے ہاتھوں شہید ہوئے۔ جس کا دکھ شیعہ اور سنی دونوں کو ہوا۔ ان کے مخالف معاویہ نے تخت خلافت پر قبضہ کرلیا اور اُمیہ خاندان کی حکومت کا سلسلہ شروع ہوا۔ حضرت علی کے بڑے بیٹے حسن نے (جنہیں شیعہ دوسرا امام کہتے ہیں) سیاست سے کنارہ کرلیا اور 669 میں مدینہ کے اندر ان کا انتقال ہوا مگر 680 میں جب خلیفہ معاویہ کا انتقال ہوا تو کوفہ میں حضرت علی کے دوسرے بیٹے امام حسین کے حق میں زبردست مظاہرے ہوئے۔ امویو کے انتقام سے بچنے کے لئے حسین نے مکہ میں پناہ لی مگر نئے اموی خلیفہ یزید نے مکہ کا تقدس نظرانداز کرتے ہوئے امام حسین کے قتل کے لئے اپنے آدمی وہاں بھیجے۔ امام حسین (تیسرے شیعی امام) نے فیصلہ کیا کہ انہیں ایک ناانصاف اور ناپاک حکمران کا مقابلہ کرنا چاہیے۔ وہ پچاس ساتھیوں کے مختصر دستے اور اپنے بیوی بچوں کے ساتھ کوفہ روانہ ہوئے۔ انہیں یقین تھا کہ ظلم کے خلاف رسولﷺ کے

خاندان کے احتجاج کا دل دوز منظر لوگوں کو صحیح اسلام کی طرف واپس لے آئے گا مگر دس محرم کو عاشورہ کے دن اموی فوجوں نے حسین کی مختصر سی فوج کا محاصرہ کر لیا۔ اس مقام کا نام کربلا ہے جہاں امام حسین کے تمام ساتھی اموی فوج نے شہید کر دیے۔ حسین سب سے آخر میں اپنے شیر خوار بچے کو بازوؤں میں لئے ہوئے شہید ہوئے۔

کربلا کا المیہ آپ اپنا مسلک بن گیا اور وقت کی قید سے آزاد اس واقعہ نے متھ کی صورت اختیار کر لی۔ یزید ظلم اور ناانصافی کی علامت بنا۔ شیعہ ہر سال عاشورہ کے دن ماتم کرتے ہوئے امام حسین کی شہادت کا دن مناتے ہیں اور مسلمانوں کی سیاسی زندگی کو بددیانتی سے پاک کرنے کا عہد کرتے ہیں۔ شاعر شہیدوں کے اعزاز میں مرثیے پڑھتے ہیں۔ چنانچہ احتجاج شیعوں کا مسلک بن گیا جس کا محور کربلا کی مائیتھوس ہیں۔ اس مسلک نے ان میں سماجی انصاف کے لئے لڑنے کی تڑپ زندہ رکھی۔ عاشورہ پر محرم کے اداس مگر پروقار جلوس کے ساتھ شیعوں کا چلنا ان کے اس عزم کا کھلا اعلان ہے کہ وہ امام حسین کی راہ پر چلتے ہوئے ظلم کے خلاف جدوجہد میں اپنی جان تک قربان کر دیں گے۔

متھ اور مسلک نے واضح صورت اختیار کرنے میں کچھ وقت لیا۔ واقعہ کربلا کے بعد امام حسین کے بیٹے علی (جو کربلا میں قتل ہونے سے بچ گئے تھے) اور ان کے بیٹے محمد (جو علی الترتیب چوتھے اور پانچویں امام کے طور پر جانے جاتے ہیں) مدینے واپس آ گئے اور سیاست سے کنارہ کر لیا۔ اس عرصے میں علی ان لوگوں کی نظر میں نیکی اور راستبازی کی علامت بن گئے جو اموی حکومت سے غیر مطمئن تھے۔ جب 750 میں عباسی امویوں کا تختہ الٹنے اور اپنی حکومت (750-1260) قائم کرنے میں کامیاب ہو گئے تو پہلے انہوں نے شیعان علی کا ہمدرد ہونے کا دعویٰ کیا۔ شیعوں کی قیاس آرائیاں بھی مبالغہ آمیز تھیں جنہیں اکثر مسلمان غلو پر محمول سمجھتے تھے عراق میں مسلمانوں کا تعلق زیادہ قدیم اور زیادہ پیچیدہ مذہبی دنیا سے ہوا۔ ان میں سے بعض تو یہودی، عیسائی اور زرتشتی مائیتھالوجی سے متاثر ہوئے۔ بعض شیعی حلقوں میں حضرت عیسیٰ کی طرح حضرت علی کو بھی خدا کی تجسیم سمجھا گیا۔ باغی اور انتہا پسند شیعوں کا خیال تھا کہ ان کے لیڈر پردہ کر گئے ہیں ایک دن وہ ضرور ظاہر ہوں گے اور اپنے ساتھیوں کو فتح سے ہمکنار کریں گے۔ مقدس روح کا انسانی جسم میں داخل ہونا اور اسے خدائی دانش عطا کرنے کا آئیڈیا بھی بعض کو

بہت دل کش لگا ان میں سے ہر متھ ذراتر میم کے ساتھ شیعوں کے مخفی وژن کے لئے اہم تھی۔

امام حسین سے عقیدت ومحبت نے ایک تاریخی المیہ کو متھ میں بدل دیا جو شیعہ مسلمانوں کے مذہبی وژن کا مرکز قرار پایا۔ اس نے نیکی اور بدی کے درمیان نہ ختم ہونے والی مگر نظر نہ آنے والی جدوجہد کو واضح سمت دے دی۔ اپنی یاد سے وابستہ تقریبات کے ذریعے امام حسین اپنے وقت کے مخصوص حالات سے آزاد ہوئے اور ہمیشہ حاضر وزندہ وجود کی حیثیت سے اعلیٰ سچائیوں کی علامت بن گئے۔ مگر شیعہ ازم کی دیومالا حقیقی زندگی سے دور تھی۔ اس وقت بھی جبکہ شیعی حکمران، عباسیوں نے حکومت پر قبضہ کرلیا تب بھی سیاسی زندگی کی سنگین حقیقتوں کی وجہ سے وہ اپنے بلند آئیڈیل کے شایانِ شان حکمرانی نہ کرسکے۔ دنیاوی لحاظ سے عباسی خلفاء بہت کامیاب رہے مگر ایک دفعہ جب وہ برسر اقتدار آگئے تو وہ شیعی سوچ سے دست بردار ہوکر عام سنیوں جیسے ہوگئے۔ ان کی حکومت امویوں کی حکمرانی سے بہتر نہیں رہی تھی مگر سچے شیعوں کے لئے بغاوت کا موقعہ بھی نہیں تھا کیونکہ ہر ایسی کوشش سختی سے کچل دی جاتی تھی۔ درحقیقت حسینی متھ اس بات کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ ظالم حکمران کے خلاف ہر کوشش ناکام ہوجاتی ہے۔ چاہے وہ کتنی ہی مخلصانہ اور سرفروشانہ ہو۔ چھٹے شیعی امام جعفر صادق (d.765) نے یہ بات محسوس کی اور وقتی طور پر مسلح جدوجہد کا ارادہ چھوڑ دیا۔ انہوں نے اعلان کیا کہ اگرچہ وہ رسول ﷺ کے اہل بیت ہیں اور صرف وہی امام برحق ہیں مگر ان کا اصلی کام بے نتیجہ تصادم میں الجھنا نہیں بلکہ قرآن اور اسلام کی صوفیانہ توجیہہ میں شیعوں کی رہنمائی کرنا ہے۔ انہوں نے بتایا کہ حضرت علی کے سلسلے کا ہر امام اپنے دور کا روحانی لیڈر ہے۔ ہر امام کی تقرری اس کا پیش رو کرتا ہے۔ جس کے ذریعے نیا امام حقیقت خداوندی سے متعلق مخفی علم سے فیض یاب ہوتا ہے۔ ہر امام معصوم اور مرشد کامل ہے۔ چنانچہ شیعوں نے سیاست ترک کی اور تصوف اختیار کیا۔ مراقبوں اور روحانی ریاضتوں کے ذریعے انہوں نے باطنی علم اور دانش حاصل کرنے کو کوشش کی جو قرآن کے ہر لفظ میں پوشیدہ ہے۔ شیعہ قرآن کے لفظی ترجمہ پر قانع نہیں تھے بلکہ متن کو نئی بصیرتوں کی بنیاد بناتے تھے۔

مگر یہ بات عام لوگوں کے ماننے کی نہیں تھی وہ نہ جانے اس کا کیا مطلب لیتے۔ اس لئے شیعہ اپنے روحانی اور سیاستی نظریوں کو اپنے تک ہی محدود رکھتے۔ امامت کی مائتھالوجی جیسے جعفر صادق نے آگے بڑھائی ہے اس کی رو سے ایک تخیلاتی وژن ہے۔ جو الہامی کتابوں اور تاریخ

کے لفظی معنوں سے آگے اس حقیقت کو دیکھتا ہے جو اولین ہے، ہمیشہ سے موجود مگر آنکھوں سے اوجھل ہے۔ جہاں جب نامحرم اور نا آشنا صرف ایک فرد کو دیکھتا ہے اس وقت ایک غور وفکر کرنے والا شیعہ جعفر صادق میں خدا کے نور کی جھلک دیکھ سکتا ہے۔

روزمرہ زندگی کے المناک حالات میں تجسیم خداوندی کی شدید مشکلات کو بھی امامت نے علامت بنادیا تھا۔ جعفر صادق نے بڑی کامیابی کے ساتھ دین کو سیاست سے الگ اور مذہب کو انسان کا ذاتی معاملہ بنادیا۔ انہوں نے مذہب کے تحفظ کے لئے یہ قدم اُٹھایا تاکہ ایک ایسی دنیا میں مذہب سلامت رہے جو بنیادی طور پر اس کے خلاف ہو چکی تھی۔ سیکولر پالیسی کے پیچھے اعلیٰ درجہ کی روحانیت کارفرما تھی۔ شیعہ جانتے تھے کہ سیاست کو مذہب سے ملانا خطرناک ہے۔ ایک صدی کے بعد یہ بات ثابت ہو کر رہی۔ جب 836 میں عثمانی خلیفہ نے دارالخلافہ سمرنا منتقل کیا، جو بغداد سے ساٹھ میل دور جنوب میں واقع تھا۔ اس وقت سے عباسی حکومت زوال پذیر ہونے لگی اور خلیفہ مسلم دنیا کا برائے نام حاکم رہ گیا۔ دوردراز علاقوں میں بھی اختیارات مقامی امراء اور سرداروں کے ہاتھوں میں چلے گئے خلفاء نے طے کیا کہ ان بدترین حالات میں ان کے لئے ممکن نہیں کہ وہ کسی امام کو آزاد رہنے دیں۔ 848 میں خلیفہ المتوکل نے دسویں امام علی الہادی کو مدینہ سے سمرنا بلایا اور گھر میں نظر بند کردیا۔ وہ اوران کے بیٹے گیارھویں امام حسن العسکری کسی وکیل یا نمائندے کے ذریعے بغداد کے تجارتی مرکز الکرخ میں رہنے والے شیعوں سے رابطہ نہ کرسکے جو عثمانی حکمرانوں کی توجہ ہٹانے کے لئے وہاں تجارت کرتے تھے۔

874 میں گیارھویں امام کا انتقال ہوگیا۔ غالباً خلیفہ کے اشارے پر انہیں زہر دیا گیا تھا۔ انہین اتنی سخت تنہائی میں رکھا گیا تھا کہ ان کے متعلق شیعوں کو مشکل ہی سے کچھ معلوم ہوسکا۔ انہیں یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ ان کا کوئی فرزند بھی تھا یا نہیں۔ اگر نہیں تو ان کا جانشین کون ہوگا۔ کہیں اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ شیعہ تصوف کی رہنمائی سے محروم ہوجائیں گے۔ غرضیکہ قیاس آرائیوں کا تانتا بندھ گیا مگر سب سے اہم تھیوری یہ تھی کہ حسن العسکری کا واقعی ایک بیٹا تھا۔ ان کا نام ابوالقاسم محمد تھا جو بارھویں امام تھے اور اپنی جان بچانے کے لئے روپوش ہوگئے تھے۔ اس خبر میں بڑی کشش تھی کیونکہ اس سے یہ تو پتہ چلتا تھا کہ کوئی بڑی تبدیلی نہیں آئی۔ آخری دوائمہ تک لوگوں کی رسائی تقریباً ناممکن رہی۔ اب مخفی امام نے اپنے وکیل عثمان الامری کے ذریعے لوگوں سے

رابطہ جاری رکھا۔ وہی روحانی مشورے دیتا، زکوٰۃ جمع کرتا اور الہامی کلام کی توجیہہ وتفسیر کرتا۔ قانونی فیصلے بھی وہی کرتا تھا مگر مسئلے کا یہ حل دیر پا نہیں تھا۔ وقت گزرنے کے ساتھ بارھویں امام کے زندہ ہونے کا امکان بڑھتا گیا تو شیعہ ایک بار پھر بے چین ہونے لگے تو موجودہ وکیل علی بن محمد السّمری شیعوں کے نام امام کا پیغام لایا کہ امام کا انتقال نہیں ہوا بلکہ معجزانہ طور پر خدا نے انہیں چھپالیا ہے۔ یوم الحساب سے پہلے ان کا ظہور ہوگا تاکہ دنیا پر انصاف کی حکمرانی ہو۔ وہ بدستور شیعوں کا معصوم امام اور اُمہ کے جائز حکمران ہیں مگر وہ اپنے وکیل کے ذریعے اب شیعوں سے رابطہ نہیں کریں گے نہ ان سے ان کا براہ راست کوئی تعلق نہ ہی ان کی فوری واپسی کی اُمید رکھی جائے وہ اسے اس وقت دیکھ سکیں گے جب ایک زمانہ گزر جائے گا اور دنیا میں ظلم ہی ظلم ہوگا۔

امام کے مخفی ہونے کی پراسرار متھ ریشنل انداز سے بیان نہیں ہوسکتی۔تصوف کی مدد سے وہ سمجھ میں آسکتی ہے۔ اگر ہم اسے لوگوں کے طور پر سمجھیں یعنی اس سے متعلق سیدھے سادے حقائق ریشنل انداز میں بیان کریں تو ہر قسم کے سوالات پیدا ہوتے ہیں۔ امام دنیا میں غائب ہو کر کہاں چلے گئے ہیں؟ وہ زمین پر ہیں یا زمین وآسمان کے درمیان کسی منطقے میں ہیں؟ وہ کس قسم کی زندگی بسر کرتے ہیں؟ کیا وہ دم بہ دم عمر رسیدہ ہورہے ہیں؟ وہ اپنے پیروؤں کی رہنمائی کیسے کرتے ہیں جبکہ وہ اسے سن سکتے ہیں نہ دیکھ سکتے ہیں؟ ان شیعوں پر یہ سوالات ناگوار گزریں گے جنہوں نے بڑی سخت محنت اور ضبط کے ذریعے باطن کا راستہ اختیار کیا ہے۔ جو مقدس کتابوں کے پوشیدہ معنی تلاش کرتے ہیں ایسے معنی جو ریزن (عقل) کو پیچھے چھوڑتے ہیں اور ذہن کی وجدانی قوتوں کا حاصل ہیں۔ شیعہ مذہبی اصولوں اور لٹریچر کی توجیہہ ان کے ظاہری معنوں کی روشنی میں نہیں کرتے اب ان کی تمام روحانی جستجو کا مرکز وہ ہے جو نظر نہیں آتا اور جو خارجی حقائق کی مسلسل تبدیلیوں تلے دبا ہو۔ شیعہ نظر نہ آنے والے پراسرار خدا کی عبادت کرتے، قرآن میں پوشیدہ معنوں کی تلاش کرتے انصاف کی خاطر کبھی ختم نہ ہوتے مگر ختم نہ آنے والی جنگ جاری رکھتے اور اسلام کے مخفی معنی متعین کرتے جو دنیا سے چھپائے جاتے تھے۔ شدید غور وفکر کی زندگی کا یہ پس منظر پراسراریت کو بامعنی بناتا تھا۔ مخفی امام متھ بن چکا تھا۔ نارمل تاریخ سے اس کے اخراج نے اسے زمان ومکان کی بندشوں سے آزاد کردیا تھا۔ صحیح یہ ہے کہ اس طرح شیعوں کی نظر میں امام کا حاضر وموجود ہوتا اور بھی واضح اور یقینی ہوگیا تھا۔ یہ بنسبت اس زمانے کے کہ جب ان سمیت تمام

امام مدینہ اور سمرنا میں نارمل زندگی گزارا کرتے تھے۔ پراسراریت ایک متھ ہے جو ہمارے جذبہ تقدس کا اظہار گریز اور کم آمیزی کے ذریعہ کرتی ہے دنیا میں موجود ہے مگر دنیا کی نہیں۔ الہامی دانش کو انسانیت سے جدا نہیں کیا جاسکتا۔ اس لئے کہ ہم جو دیکھتے ہیں صرف انسانی نقطۂ نظر سے دیکھتے ہیں مگر یہ ہمیں عام مردوں اور عورتوں کی بصیرتوں سے کہیں آگے لے جاتی ہے۔ ہر متھ کی طرح یہ متھ بھی اختلافی بحثوں کے ذریعے نہیں سمجھی جاسکتی۔ گویا کہ یا تو یہ ایک واضح اور کھلی حقیقت ہے یا یہ کہ اسے منطقی توضیح کا موضوع بنایا جاسکتا ہے مگر اس میں شک نہیں کہ انسان کی مذہبی واردات کے معاملہ میں اس نے ایک حقیقت بیان کی ہے۔

ہر مخفی روحانیت کی طرح شیعہ ازم بھی اس وقت چیدہ لوگوں کے لئے تھا۔ ان مسلمانوں میں بہت مقبول تھا جو فکری سطح پر نئی منزلیں طے کرنا چاہتے تھے جو صوفیانہ غور وفکر کی صلاحیت رکھتے تھے مگر شیعوں کا سیاسی نقطۂ نظر دوسرے مسلمانوں سے الگ تھا۔ سینوں کے مذہبی اور روحانی طور طریقے انہیں زندگی کو اسی طرح قبول کرنے پر آمادہ کرتے ہیں جیسی کہ وہ ہے۔ اسی طرح زندگی اور مذہب کے اولین اصولوں کو بھی نظر انداز نہیں کرتے جبکہ شیعہ تصوف، وجدانی اور روحانی لحاظ سے زندگی سے مطمئن نہیں۔ پراسراریت کی ڈاکٹرین کے اعلان سے کچھ عرصہ بعد کی روائتیں دسویں صدی میں شیعوں کی بے بسی اور مایوسی کی گواہ ہیں۔ اس صدی کو شیعوں کی صدی کہا گیا تھا کیونکہ اسلامی سلطنت کے اکثر طاقتور لوکل کمانڈر دل میں شیعوں کے لئے ہمدردی کے جذبات رکھتے تھے مگر اس سے کوئی خاص فرق تو نہیں پڑتا تھا کیونکہ قرآن کی واضح تعلیمات کے باوجود زیادہ تر لوگوں کی زندگی ناانصافی اور عدم مساوات پر مبنی تھی۔ یہ حقیقت ہے کہ شیعوں کے تمام امام ان حکمرانوں کے ظلم کا نشانہ بنے تھے جنہیں شیعہ بد دیانت اور ناجائز حکمران قرار دیتے تھے۔ امام حسین کے بعد شیعوں کے ہر امام کو اموی اور عباسی خلفاء نے زہر دے کر مار دیا۔ ایک انصاف پسند اور فلاحی معاشرہ قائم کرنے کی تمنا میں شیعوں نے جرم وسزا کا تصور اجاگر کیا جس کا محور آخری امام کا ظہور، بدی کی طاقتوں سے لڑنا اور انصاف وامن کا سنہری دور لانا تھا مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ شیعوں نے ماضی کو فراموش کر کے صرف مستقبل کی طرف دیکھنا شروع کر دیا تھا۔ انہیں قدیم اور اولیں آئیڈیل کا زبردست شعور حاصل تھا اسی لئے عامیانہ سادہ زندگی ان کے لئے وبال جان بن گئی۔ مخفی امام دنیا میں کوئی نئی چیز لے کر نہیں آئیں گے۔ وہ محض یہ کریں گے کہ انسانی تاریخ کو

صحیح سمت دے دیں تا کہ انسانی معاملات زندگی کے بنیادی اصولوں کے مطابق چلائے جائیں۔ اسی طرح امام کا ظہور بڑے اعلیٰ وارفع معنوں میں وہ حقیقت واضح کردے گا کہ جو ہمیشہ سے موجود ہے کیونکہ شیعوں کی زندگی میں مخفی امام ایک مسلسل حاضری وموجودگی ہے وہ اس ظالم اور سیاہ دنیا میں خدا کے نور کی گریز پا مگر زندہ علامت ہے جو اُمید کی واحد کرن بھی ہے۔

تصوّف کے رجحان نے شیعہ تاریخ کو مائیتھالوجی کا رنگ دینے کا عمل مکمل کردیا جو اس وقت شروع ہوا تھا جب ان کے چھٹے امام نے سیاست میں حصہ لینا ترک کیا اور مذہب کو سیاست سے الگ کردیا تھا۔ متھ سیاسی لائحہ عمل مہیا نہیں کرتی مگر ایسی بصیرت اور نظر پیدا کردیتی ہے جن کے ذریعے داخلی اور خارجی زندگی سمجھ میں آسکے۔ پراسراریت کی متھ نے شیعوں کو ہمیشہ کے لئے غیر سیاسی بنادیا۔ اس میں سمجھداری کی کوئی بات نہیں تھی کہ شیعہ خوامخواہ مختلف حکومتوں سے لڑ کر اپنے آپ کو خطرے میں ڈال دیں۔ ایک انصاف پسند سیاسی لیڈر کے طور پر امام کے امیج نے جو اس دنیا میں رہ نہیں سکتا تھا اور روپوش ہونے پر مجبور تھا شیعوں کو ان کے معاشرے سے الگ کردیا تھا۔ اس نئے نقطۂ نظر سے ہر حکومت ناجائز لگنے لگی تھی کیونکہ وہ امام زمانہ کے حقوق غصب کرلیتی تھی۔ دنیاوی حکمرانوں سے کوئی اُمید اگرچہ وابستہ نہ تھی مگر شیعوں کو زندہ رہنے کے لئے ان سے تعاون تو کرنا تھا۔ وہ زندگی روحانیت کے زور پر بسر کرتے تھے اس عدل وانصاف کی اُمید لگائے ہوئے جسے دنیا کے آخری دور میں بہرحال آنا تھا۔ نئے حالات میں وہ صرف شیعہ علماء کو اتھارٹی مانتے جنھوں نے امام کے وکلاء کی جگہ لے لی تھی۔ ان کے علم، ان کی روحانیت اور الہامی قانون میں ان کی مہارت نے انہیں خفیہ امام کے نائب کا درجہ دے دیا تھا مگر حکومتیں چونکہ سب کی سب ناجائز تھیں اس لئے علماء سرکاری عہدوں پر فائز نہیں ہو سکتے تھے۔ شیعوں نے سیاست کا سیکولر ہونا تو خاموشی سے نظرانداز کردیا مگر لگتا تھا کہ اس سے اسلام کے نظریہ توحید کی نفی ہوئی ہے کیونکہ اس نے ریاست سے مذہب کی علیحدگی کی اجازت نہیں دی مگر سیاست کو سیکولر بنانے کی مائیتھالوجی بھی مذہب ہی سے ابھری تھی۔ ان ائمہ کی لجنڈ نے جو تقریباً سب کے سب خلفاء کے ہاتھوں قتل، قید اور جلاوطن ہوئے سیاست اور مذہب کے بنیادی تضاد کو واضح کردیا تھا۔ سیاسی زندگی کا تعلق لوگوس سے ہے۔ اسے لازمی طور پر آگے دیکھنا ہے اسے عملی ہونا چاہیے اس میں سمجھوتے کرتے، منصوبہ سازی اور سوسائٹی کو ریشنل بنیادوں پر منظّم کرنے کی صلاحیت ہونی

چاہیے۔اسے مذہبی تقاضوں اور زندگی کی سنگین حقیقتوں کے مابین توازن قائم کرنا ہوتا ہے۔زرعی معاشرہ، بنیادی عدم مساوات پر قائم تھا۔اس کا انحصار کھیت مزدوروں کی محنت پر تھا جن پر تہذیب کی دی ہوئی سہولتیں اور آسائشیں حرام تھیں۔ایکیسئل دور کے تمام بڑے مذاہب اس بحران سے دوچار تھے اور اس سے عہدہ برآ ہونے کی کوشش بھی کرتے تھے۔ جہاں کہیں بھی وسائل کی کمی، ٹیکنالوجی اور کمیونی کیشن کا فقدان ہوتا تھا وہاں اختیارات کا استعمال مشکل ہوجاتا تھا۔عملی سیاست مزید سفاک اور جارحانہ ہوگئی تھی اس لئے کسی حکومت کے لئے بھی انتہائی مشکل تھا کہ وہ اسلامی آئیڈیل کے مطابق عمل کرے یا ایسے امام کا وجود برداشت کرے جو اس کی خامیاں بے نقاب کرتا ہے۔کھلی بدعنوانیوں کے خلاف مذہبی رہنما تنقید اور فہمائش کرسکتے تھے۔احتجاج بھی ہوسکتا تھا مگر حکومت کے لئے ضروری تھا کہ ان مقدس ہستیوں کو بے اثر بنائے یا ان کی سرگرمیاں محدود کردے۔جیسا کہ خلفاء نے سمرا کے عسکری فورٹریس میں ائمہ کو نظر بند کر کے کیا تھا مگر یہ ایک آئیڈیل کے ساتھ شیعوں کی والہانہ وابستگی تھی جسے زندہ اور متحرک رہنا چاہیے، چاہے وہ خفیہ ہو اور وقتی طور پر ظالم اور بے ایمان دنیا کے خلاف صف آرا نہ ہوسکے۔

اگرچہ شیعہ مذہب مائیتھالوجی کی صورت اختیار کرچکا تھا مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ ریشنل نہیں تھا سنیوں کی نسبت وہ زیادہ ریشنل اور زیادہ فکر انگیز تھا۔شیعوں نے دیکھا کہ وہ ذہنی طور پر ان سنی علماء (جنہیں معتزلہ کہا جاتا تھا) کے زیادہ قریب ہیں جو قرآن کی ڈاکٹرین کو ریشنل نقطۂ نظر سے دیکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ جواب میں معتزلہ نے بھی ان کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھایا مگر اس رجحان کی ریشنل ڈاکٹرین نے سنی علماء کی نسبت شیعہ علماء کو زیادہ آزادی دے رکھی تھی کہ وہ دنیا کے معاملات میں ریشنلزم کو بروئے کار لائیں۔

خفیہ امام کے نہ ہونے کی وجہ سے انہیں خود اپنی ذہنی اور فکری صلاحیتوں پر ہی بھروسہ کرنا تھا۔اس لئے سینوں کی طرح شیعوں کے ہاں کبھی یہ نہیں کہا گیا کہ اجتہاد کے دروازے بند ہوچکے ہیں۔یہ ٹھیک ہے کہ امام کے نہ ہونے سے شیعہ شروع میں پریشان ہوئے مگر تیرھویں صدی میں ممتاز شیعہ عالم نے مجتہد کی امتیازی حیثیت حاصل کرلی۔یعنی وہ شخص جو اجتہاد کے ریشنل پہلو متحرک کرسکتا تھا۔شیعہ ریشنلزم مغرب کے اس سیکولر ریشنل ازم سے بہرحال مختلف تھا۔شیعہ محتاط مفکرین تھے۔گیارھویں صدی کے سکالر محمد المفید اور محمد الطّوسی، مثال کے طور پر بعض احادیث کی

صحت کے متعلق فکر مند تھے۔ وہ یہ سمجھتے تھے کہ یہ کافی نہیں کہ بعض نا قابلِ یقین روایتوں کی بنیاد پر ان کی احادیث کا حوالہ دیا جائے بلکہ علماء کو چاہیے کہ وہ کمزور روایات کی بجائے ریزن اور منطق کا سہارا لیں۔ اس کے باوجود ان کے ریشنل دلائل جدید تشکیک پسندوں کو مطمئن نہ کر سکے مثال کے طور پر طوسی نے امامت کی ڈاکٹرین اس طرح کی کہ خدا نیکی ہے وہ ہمیں بچانا چاہتا ہے اس لئے یہ ماننا عقلی طور پر صحیح ہے کہ وہ ہمیں ایسا رہنما عطا کرے گا جو معصوم ہو۔ تمام لوگ بے شک سماجی انصاف کے لئے کوشاں ہوں مگر خدا کی مدد سے یہ انتہائی اہم کام اور بھی جلد طے پا جائے گا۔ طوسی بھی اس وقت بے بس ہو گیا جب اسے مافوق الفطرت اور تصوف کا ریشنل (منطقی جواز) تلاش کرنا پڑا۔ مگر شیعہ اس سے پریشان نہیں ہوئے مائیتھوس اور لوگوس، ریزن اور الہام آپس میں مخالف نہیں ہیں۔ وہ ایک دوسرے سے مختلف ہونے کے علاوہ ایک دوسرے کے معاون بھی ہیں۔ جدید مغرب میں مائیتھالوجی اور تصوف کو سچ جاننے کے ذرائع سے خارج کر دیا گیا تھا مگر طوسی جیسے مفکر نے سوچ کے دونوں طریقے جائز اور ضروری قرار دیئے۔ اس نے یہ بتانے کی کوشش کی کہ صوفیانہ ریاضت کے دوران جو ڈاکٹرین قطعی طور پر سمجھ میں آنے والی تھیں وہ اسلامی حوالے سے معقول (Reasonable) بھی تھیں۔ مشاہدہ نفس کی ریاضتوں سے وہ بصیرت حاصل ہوتی جو اپنے طور پر تو صحیح ہوتی مگر منطقی طور پر اسے ثابت نہیں کیا جا سکتا تھا۔

پندرھویں صدی کے اختتام تک ہم جانتے ہیں کہ زیادہ تر شیعہ عرب تھے اور شیعہ خصوصی طور پر عراق میں بہت طاقتور تھے۔ خاص طور پر کربلا اور نجف میں انہیں برا رسوخ حاصل تھا کیونکہ دونوں شہر حضرت علی اور امام حسین کی یادوں سے آباد تھے۔ بہت سے ایرانی، سنی تھے حالانکہ ایرانی شہر 'قم' ہمیشہ شیعوں کا مرکز تھا اور خراسان، کاشان وغیرہ میں بھی شیعوں کی کافی تعداد تھی۔ چنانچہ ایرانیوں نے انیس سالہ شاہ اسمعیل کا استقبال کیا۔ شاہ اسماعیل صوفیوں کے صفوی سلسلے کا رہنما تھا۔ اس نے 1501 میں تبریز فتح کیا۔ اگلے دس برسوں میں باقی ایران اس کے قبضے میں آ گیا۔ اس نے اعلان کیا کہ شیعہ ازم صفوی سلطنت کا سرکاری مذہب ہو گا۔ شاہ اسماعیل کا دعویٰ تھا کہ اس کا تعلق ساتویں امام سے ہے۔ اسے ان کی حمائت حاصل ہے جو اور کسی مسلمان حکمران کو حاصل نہیں ہے۔

مگر ظاہر ہے کہ ایسا ہونا شیعوں کی روایت کے خلاف تھا۔ اکثر شیعہ سمجھتے تھے کہ مخفی امام

کے نہ ہوتے ہوئے کوئی حکومت جائز نہیں ہوسکتی اس لئے شیعہ ٹیسٹ کا سوال پیدا ہی نہیں ہوتا تھا۔اسماعیل نے اس کی پرواہ نہیں کی۔صفوی بنیادی طور پر صوفی سلسلہ تھا(منگولوں کے حملے کے موقعہ پر اس کی ابتدا ہوئی تھی) جس نے پرانے شیعوں کے انتہا پسندانہ خیالات اپنے اندر جذب کر لئے تھے انہیں یقین تھا کہ شیعی مسیحا بہت جلدی واپس آئے گا اور سنہرے دور کا آغاز کرے گا۔ہوسکتا ہے کہ اس نے اپنے پیروؤں سے کہا ہو کہ وہی خفیہ امام ہے جو اپنی پناہ سے باہر آیا ہے۔صفوی سلسلہ عوام دوست اور انقلابی تھا۔شیعی باطنیت کے پیچیدہ حلقوں سے وہ دور اور الگ تھا۔اسماعیل کو شیعی ریاست قائم کرنے میں کوئی جلدی نہیں تھی بلکہ وہ تو اس فکر میں تھا کہ سنی اکثریت کے ساتھ نباہ کا کوئی مناسب طریقہ سمجھ میں آجائے۔جیسا کہ امام جعفر صادق کے زمانے سے ہوتا آیا تھا۔خود اسماعیل متعصب اور سنیوں کا سخت مخالف تھا۔عثمانی اور صفوی سلطنتوں میں نئی فرقہ ورانہ ذہنیت پیدا ہو چلی تھی۔جو اسی عرصے میں یورپ کے اندر کیتھولک اور پروٹیسٹنٹ عیسائیوں کی فرقہ دارانہ محاذ آرائی سے مختلف نہیں تھی۔گزشتہ چند صدیوں سے شیعوں اور سنیوں میں باہمی کشیدگی کے آثار معدوم ہو گئے تھے مگر سولھویں صدی کے ابتدائی دور میں عثمانی اس پر تلے ہوئے تھے کہ شیعوں کو بے جان اور کمزور کر دیں۔جب اسماعیل ایران میں برسر اقتدار آیا تو اس نے بھی ایران سے سنیوں کا نام ونشان مٹانے کا ارادہ کر لیا تھا۔صفیوں کو یہ جاننے میں زیادہ دیر نہیں لگی کہ مسیحائی کی انتہا پسند آئیڈیالوجی اپوزیشن میں ہوتے ہوئے تو ان کے خوب کام آئی تھی مگر اسٹیبلشمنٹ کی صورت اختیار کرنے کے بعد وہ ان کے لئے بے کار ہو چکی تھی۔شاہ عباس اول (1588-1629) نے فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ غلو پر مبنی قدیم دینیات ختم کر دے گا۔اس نے بیوروکریسی سے انتہا پسندوں کو نکال باہر کیا اور شیعی عرب علماء کو ملک میں بلا لیا تا کہ وہ اثنائے عشریہ کی آرتھوڈوکسی کو فروغ دیں۔شاہ عباس نے اصفہان اور ہلا میں ان کے لئے مدرسے قائم کئے اور ان کے ساتھ فیاضانہ سلوک کیا۔ابتداء میں علماء کی سرپرستی ضروری تھی کیونکہ وہ نو وارد تھے اور ان کا انحصار صرف حکمرانوں پر تھا مگر حکمرانوں پر انحصار کرنے سے شیعوں کی عادات بدل گئیں۔شیعہ سکالر ہمیشہ معدودے چند ہوا کرتے تھے۔ان کے اپنے کوئی مدرسے نہیں تھے۔وہ ایک دوسرے کے گھروں میں جا کر بحث وتمحیص کیا کرتے تھے مگر اب شیعہ اسٹیبلشمنٹ کا حصہ بن رہے تھے۔اصفہان شیعوں کے لئے مذہبی تعلیم کا مرکز بن گیا۔اصفہان شاہ عباس کا نیا

دارالحکومت بھی تھا۔ اس سے پہلے شیعہ ہمیشہ حکومت سے دور رہتے تھے مگر اب ان کے علماء نے ایران کا قانونی اور تعلیمی نظام سنبھال لیا اور گورنمنٹ کے مذہبی فرائض بھی اپنے ذمہ لے لئے۔ انتظامی بیوروکریسی ایرانیوں پر مشتمل تھی جو اب بھی سنیوں کے وفادار تھے اسی لئے انہیں ایسا کام دیا گیا جو نسبتاً زیادہ سیکولر تھا۔ ایرانی حکومت میں سیکولر اور مذہبی سطح پر دراڑ پڑ چکی تھی۔

علماء بہر حال صفوی حکومت سے خبردار رہے۔ وہ سرکاری عہدوں پر فائز ہونے سے بدستور انکار کرتے رہے۔ ان کا مطالبہ تھا کہ انہیں رعایا میں ہی شمار کیا جائے۔ اس طرح ان کی حیثیت عثمانی حکومت کے علماء سے مختلف مگر زیادہ مضبوط تھی۔ بادشاہوں کی سرپرستی اور فیاضی نے ایرانی علماء کو معاشی طور پر خودمختار بنا دیا تھا بلکہ عثمانی سلاطین اور ان کے جانشین ہمیشہ علماء کو فکر معاش دے کر کنٹرول کرتے۔ وہ انہیں ان کے وظیفے بند ہونے اور ان کی جائدادیں ضبط ہو جانے سے ڈراتے مگر ان طریقوں سے شیعی علماء کو نہیں ڈرایا جا سکتا تھا۔ ایرانی عوام میں شیعہ ازم پھیلنے سے بھی بادشاہوں کی بجائے علماء ہی مضبوط ہوتے کیونکہ وہی مخفی امام کے معتبر نمائندے سمجھے جاتے تھے۔ شروع میں صفویوں کے اندر اتنی طاقت تھی کہ علماء پر نظر رکھ سکیں اور علماء بھی اپنے ہونے کا مکمل ثبوت نہ دے سکے جب تک کہ ایرانی عوام نے اٹھارویں صدی میں مکمل طور پر شیعت اختیار کر لی۔

مگر طاقت کرپٹ کرتی ہے۔ جب صفوی سلطنت میں علماء عیش و آرام سے رہنے لگے تو ان کا رویہ بھی آمرانہ بلکہ متعصّبانہ ہو گیا۔ شیعوں کے بعض امتیازی اوصاف غرق آب ہو گئے۔ محمد باقر مجلسی (d.1700) نے نیا رستہ اختیار کیا۔ مجلسی سب سے طاقتور اور بااثر علماء میں سے تھا۔ صدیوں سے شیعہ الہامی کتابوں کے معاملے میں نئی اپروچ کی حوصلہ افزائی کر رہے تھے مگر مجلسی صوفی روحانیت اور فلسفیانہ فکر کے سخت خلاف تھا حالانکہ یہ دونوں ہی پرانے مخفی شیعوں کے بڑے معاون تھے۔ اس نے بڑی بے رحمی کے ساتھ ان صوفیوں کو تنگ کرنا شروع کر دیا جو ایران میں باقی رہ گئے تھے۔ اس نے بڑی سختی کے ساتھ اصفہان میں فلسفیانہ ریشنل ازم اور صوفی فلسفہ کا راستہ روکنے کی کوشش کی۔ چنانچہ اس نے تصوف اور فلسفے کے خلاف بدترین شکوک و شبہات پھیلائے جو آج بھی ایرانی شیعہ ازم کا حصہ ہیں۔ قرآن کے مخفی مطالعہ کی بجائے شیعہ علماء کو اسلامی فقہہ پر توجہ دینے کے لئے کہا گیا۔

امام حسین کی شہادت کی یاد میں نکلنے والے جلوسوں کے معنی بھی مجلسی نے بدل دیئے۔اب اونٹوں کو سبزی مائل کر کے ان پر روتی ہوئی عورتیں اور بچے سوار کرا دیئے جاتے جو امام حسین کے خاندان کے نمائندے خیال کئے جاتے۔ سپاہی ہوا میں فائر کرتے جنازے امام اور ان کے ساتھی شہیدوں کی نمائندگی کرتے جن کے پیچھے گورنر، امراء اور مرد جلوس کی صورت میں چلتے، روتے، سسکتے اور چاقوؤں سے اپنے جسم زخمی کرتے تھے۔ کربلا کا انتہائی جذباتی بیان، عراقی شیعی واعظ کا شفی(d.1504) کی تصنیف روضۃ الشہد اخصوصی مجلس میں سنائی جاتی جہاں لوگ زور زور سے گریہ کرتے تھے۔ یہ رسمیں ہمیشہ بھرپور انقلابی امکانات اپنے اندر رکھتی تھیں اور لوگوں کے اس عزم کی مظہر تھیں کہ ظلم کا مقابلہ زندگی کے آخری لمحوں تک کرنا ہے۔اب بجائے اس کے کہ لوگ حسین کو ظلم کے خلاف عزیمت کی ایک زندہ مثال سمجھیں اور اس سے ان میں حوصلہ پیدا ہو۔مجلسی اور اس کے حواریوں نے لوگوں کو سمجھایا کہ وہ حسین کو اپنا سرپرست خیال کریں جو ان کے لئے جنت کے دروازے کھلوادیں گے اگر وہ ان کا ماتم کرتے رہیں۔ اس ترمیم نے Status Quo کی تصدیق کر دی کہ حالات جیسے بھی ہیں بے شک ویسے ہی رہیں انہیں بدلنے کی ضرورت نہیں۔اس لئے لوگوں کو چاہیے کہ وہ اہل اقتدار کی خوشنودی حاصل کریں۔لوگوں کو صرف اپنے مفاد کا خیال رکھنا چاہیے ایسا کرنا حقیقی شیعہ آئیڈیل کی توہین اور اسے کمزور اور بے اثر بنانا تھا بجائے اس کے کہ لوگوں میں زندگی اور اس کے آداب کا شعور پیدا ہوا نہیں اہل اقتدار کے سامنے جھکنے کا سبق دیا گیا۔اس صورتحال سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ سیاسی طاقت ایک بالکل مختلف طریقے سے مذہب کے لئے کتنی تباہ کن ثابت ہوسکتی ہے۔

مجلسی کا سب سے برا نشانہ اصفہان میں واقع میر داماد(d.1631) کا صوفی فلسفے کا سکول اور اسکا شاگرد ملا صدرا(d.1640) تھا۔ملا صدرا ایسا مفکر تھا کہ آنے والی ایرانی نسلوں پر اس کا اثر بہت گہرا تھا۔میر داماد اور ملا صدرا دونوں بعض علماء کے اس نئے کٹرپن کے سخت خلاف تھے۔ نہ صرف شیعہ مذہب بلکہ تمام مذاہب کے لئے وہ اسے بدترین قسم کی بے راہ روی سمجھتے تھے۔ پرانے دنوں میں جب شیعہ الہامی کتابوں میں مخفی معنوں کی تلاش میں تھے تو انہوں نے واضح طور پر تسلیم کیا تھا کہ الہامی سچ لامحدود ہے۔اس میں نئے معنوں اور نئی بصیرتوں کے امکان ہمیشہ موجود ہوتے ہیں۔قرآن کی ایک ہی توجیہہ ناکافی ہے۔ میر داماد اور ملا صدرا کی نظر مین ذہنی اور فکری

سمجھوتوں سے سچا علم پیدا نہیں ہوتا۔ کوئی مذہبی یا روحانی رہنما چاہے وہ کتنا ہی ممتاز ہو سچ کی اجارہ داری کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔

دونوں نے بتایا کہ بھرپور انسانی زندگی کے لئے ریزن (عقل) اور مائیتھالوجی دونوں لازم ہیں۔ ایک کے بغیر دوسری زندہ نہیں رہ سکتی۔ میر داماد دینی عالم تو تھا مگر وہ پیدائشی سائنسدان بھی تھا۔ ملا صدرا نے علماء پر اس لئے تنقید کی کہ وہ صوفیوں کے وجدان کی بصیرتیں کم کر کے دیکھتے تھے اور صوفیوں پر یہ اعتراض تھا کہ وہ ریشنل اندازِ فکر کی مذمت کرتے ہیں۔ سچے فلسفیوں کے لئے اتنا ہی ریشنل ہونا ضروری تھا جتنا ریشنل ارسطو تھا مگر سچ کے تخیلاتی ادراک میں اس سے آگے جانا ضروری ہے۔ دونوں مفکرین نے لاشعور کے کردار پر زور دیا اور واضح کیا کہ لاشعور، دانش ورانہ تجریدیت اور شعور حسیات کے علاقوں میں موجود ہوتا ہے۔ اس سے پہلے صوفی فلسفیوں نے اس نفسیاتی حصہ کو عالم الامثال کہا تھا، یعنی خالص امیجز کی دنیا۔ یہ وژن کا میدان ہے جس کی ابتدا تحت الشعور سے ہوتی ہے جو خوابوں کے ذریعے شعور کی سطح پر آتا ہے، صوفیوں کی بعض وجدانی ریاضتوں کے ذریعہ بھی وہاں تک رسائی ممکن ہے۔ میر داماد اور ملا صدرا کا اصرار تھا کہ یہ وژن محض داخلی گمان نہیں بلکہ معروضی حقیقت ہے چاہے وہ منطقی تجزیہ سے متاثر نہ ہو۔ انہیں تخیلاتی کہنے اور اسی وجہ سے فرضی سمجھنے (جیسا کہ کوئی ماڈرن ریشنلسٹ کرے) کی بجائے ہمیں اپنی زندگی کے اس پہلو پر توجہ دینا ہے۔ شاید شعوری تشکیل کے لئے یہ بہت زیادہ گہرائی میں پہنچ سے دور ہو مگر ہمارے رویے اور فکر پر اس کا اثر بہت زیادہ ہے۔ ہمارے خواب حقیقی ہیں وہ ہمیں کچھ بتانے کے لئے آتے ہیں اس کیفیت کا تجربہ ہوتا ہے جسے تخیلاتی کہتے ہیں۔ مائیتھالوجی لاشعور کے ان تجربات کو امیجری میں منظم کرنے کی ایک کوشش ہے جو مردوں اور عورتوں کو اپنے وجود کے ان بنیادی علاقوں سے رشتہ جوڑنے کے قابل بناتی ہے۔

اس طرح ملا صدرا اور نئے شیعہ ازم کے بعض علماء کے درمیان تصادم ناگزیر ہو گیا۔ علماء نے ملا صدر کو اصفہان سے باہر نکال دیا۔ دس سال تک وہ جبراً قم سے قریب ایک چھوٹے سے گاؤں میں رہتا رہا۔ تنہائی کے اس عرصے میں اسے احساس ہوا کہ تصوف کے فلسفہ سے اس کی وابستگی کے باوجود اس کی مذہبی اپروچ زیادہ تر دماغ تک محدود تھی۔ فقہہ کا مطالعہ مذہب کے متعلق کچھ معلومات تو دے سکتا ہے مگر ہمارے اندر کوئی تبدیلی نہیں لا سکتا جو مذہب کا بنیادی

مقصد ہے۔ یہ صرف اس وقت ہوا جبکہ اس نے سنجیدگی کے ساتھ تصوف کا رستہ اختیار کیا اور صوفیوں کی ریاضتوں پر عمل پیرا ہوا۔ جب وہ اپنے اندر کے عالم لامثال کی گہرائیوں میں اتر گیا تو روشنی اس کے دل میں سما گئی ''عالم بالا کی روشنی مجھے راستہ دکھانے لگی اور وہ اسرار میری سمجھ میں آنے لگے جنہیں میں پہلے کبھی نہیں سمجھ سکا تھا۔'' اس نے اپنی مشہور تصنیف الاسفارالاربعہ ''روح کے سفر'' میں ایک کرشماتی سیاسی لیڈر کے صوفیانہ سفر کا حال لکھا ہے۔ پہلا خدا کی طرف انسان کا سفر ہے۔ دوسرا عالم بالا میں سفر کرنا۔ یہاں خدا کے اوصاف اور تخلیقات پر غور کرتا ہوا انسان وجدانی سطح پر ان سب کی ناقابل شکست وحدت کا شعور حاصل کرتا ہے۔ خدا کو جلوہ گر دیکھنے سے اس میں تغیر رونما ہوتے ہیں۔ اس پر نئی بصیرت طلوع ہوتی ہے جو توحید کا حاصل ہے اس کی بصیرت ائمہ کی بصیرت سے الگ نہیں۔ تیسرا انسانوں کی طرف واپسی کا سفر ہے۔ اسے محسوس ہوتا ہے کہ اس کا دنیا کو دیکھنے کا انداز بدل چکا ہے۔ چوتھا سفر دنیا میں خدا کا پیغام عام کرنا ہے۔ خدائی قانون کی تشکیل کے نئے طریقے سوچنا ہے اور خدا کی رضا کے مطابق سوسائٹی کو نئے انداز سے ترتیب دینا ہے۔

اس دنیا میں انصاف اور مساوات کا نفاذ مذہب اور تصوف کی مدد کے بغیر نہیں ہوسکتا تھا۔ ملا صدرا کے وژن نے سیاست اور مذہب کو ایک کر دیا تھا جو بارہ اماموں کی شیعت میں الگ ہو چکے تھے۔ یہ دیکھتے ہوئے کہ ریشنل جدوجہد سوسائٹی کے بدلنے کے لئے لازمی ہے۔ اور یہ کہ اسے تصوف اور مائیتھالوجی کے سیاق وسباق سے الگ نہیں کیا جاسکتا کہ وہی تو اسے معنی دیتے ہیں ملا صدرا نے شیعہ قیادت کا ایک نیا ماڈل تجویز کیا جس نے ایرانی سیاست پر بہت گہرا اثر کیا۔ ایرانی سیاست آج بھی اس کے زیر اثر ہے۔

ملا صدرا کے مجوزہ سیاسی رہنما کو صوفی ہونے کی بنا پر گہری بصیرت حاصل ہوگی مگر اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ اپنے خیالات اور مذہبی عمل اوروں پر جبراً مسلط کر سکے گا۔ اگر وہ ایسا کرے تو اس کا یہ عمل مذہب کی روح کے خلاف ہوگا۔ صدرا ملاؤں کی بڑھتی ہوئی طاقت کے سخت خلاف تھا اور خصوصی طور پر ان کے ایک نئے آئیڈیا سے پریشان تھا جو سترھویں صدی کے اندر ایران میں جڑ پکڑ رہا تھا۔ بعض علماء نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ اکثر مسلمان مذہبی اصول سمجھنے یا ان کی وضاحت کرنے کے اہل نہیں ہیں اس لئے صرف علماء ہی مخفی امام کے اصل نمائندے ہیں عام لوگوں کو

چاہیے کہ وہ مجتہد کا انتخاب کرلیں جو اجتہاد کی صلاحیت رکھتا ہے اور اس کے فیصلوں کے مطابق زندگی گزاریں۔ وہ اصولیوں (اس نقطۂ نظر کے حامی یہی کہلاتے تھے) کے ان دعووں سے سٹ پٹا گیا تھا۔ اس کی نظر میں ہر وہ مذہب طبعی طور پر ناپاک ہے جس کی بنیاد ایسی غلامانہ تقلید پر ہو۔ تمام شیعہ اس کے اہل تھے کہ وہ پیغمبروں اور ائمہ کی تعلیمات سمجھ سکیں اور ان میں سے اپنے مسائل کے حل تلاش کرسکیں جن کی بنیاد ریزن اور بصیرت پر ہو۔

سترھویں صدی کے گزرنے کے ساتھ ساتھ اصولیوں اور ان کے مخالفوں کے درمیان تلخی بڑھتی گئی۔ صفیوں کا زوال شروع ہو چکا تھا اور سوسائٹی میں دراڑیں پڑ رہی تھیں۔ لوگ علماء سے توقع رکھنے لگے کہ وہ نظم وضبط بحال کریں گے کیونکہ صرف وہی لوگ بااختیار تھے مگر وہ اختیارات کی نوعیت اور تقسیم پر آپس میں لڑنے لگے۔ اس موقعہ پر اکثر ایرانی اصولیوں کے خلاف ہوگئے۔ اور نام نہاد اخباریوں کے پیچھے چلنے لگے جو ماضی کی روائتوں پر ایمان رکھتے تھے۔ اخباریوں نے اجتہاد کا نام استعمال کرنے کی مذمت کی اور قرآن وحدیث کے مختصر سے لفظی ترجمہ پر زور دیا۔ ان کا کہنا تھا کہ تمام قانونی فیصلوں کی بنیاد قرآن پیغمبر اور ائمہ کے احکام پر ہونی چاہیے۔ اگر ایسے مقدمات پیش ہوں جن پر ان احکام کا اطلاق نہ ہو سکے تو مسلمان جج کو اپنے فیصلے پر انحصار نہیں کرنا ہے بلکہ سیکولر عدالت سے رجوع کرنا چاہیے۔ اصولی چاہتے تھے کہ لچکدار رویہ اختیار کیا جائے تاکہ جج اسلامی روایات اور قانونی اصولوں کی بنیاد پر اپنا صحیح فیصلہ صادر کرسکیں۔ ان کا خیال تھا کہ اخباری ماضی میں اس قدر الجھ جائیں گے کہ اسلامی فقہ نئی دنیا اور نئے چیلنج کا سامنا نہیں کرسکے گا۔ مخفی امام کی عدم موجودگی میں کسی جج کی رائے فیصلہ کن فقہ نئی دنیا اور نئے چیلنج کا سامنا نہیں کرسکے گا۔ مخفی امام کی عدم موجودگی میں کسی جج کی رائے فیصلہ کن نہیں ہے نہ کسی نظیر (کسی گزشتہ فیصلے کی مثال) کی پابندی لازمی ہے بلکہ وہ تو یہاں تک کہتے تھے کہ مسلمانوں کو ماضی کی کسی محترم اتھارٹی کی بجائے زندہ مجتہد کا فیصلہ ماننا چاہیے۔ دونوں فریق سماجی اور سیاسی استحکام کے موقع پر اپنے ماضی سے وفادار رہنا چاہتے تھے اور دونوں اصولی طور پر مذہبی قانون سے وابستہ تھے اصولی نہ اخباری باہمی ذہنی مطابقت کا تقاضہ کرتے تھے۔ صرف مذہبی فرائض اور عام رویہ لفظ بلفظ الہامی تعلیمات یا مجتہد کے احکام سے ہم آہنگ ہوتا تھا۔ کچھ بھی ہو دونوں فریق کچھ نہ کچھ گنوا بیٹھے تھے۔ اخباریوں نے ماضی کی تاریخی روایات کو اولین الہامی احکام کے ساتھ کنفیوز

کردیا تھا۔ وہ لکیر کے فقیر بن چکے تھے اور پرانے شیعوں کے علامتی مذہب سے بیگانہ ہو چکے تھے۔ ان کی نظر میں مذہب مختلف ہدایات کا مجموعہ تھا۔ اصولیوں کو ریزن پر زیادہ اعتماد تھا۔ جوان کے مذہب میں روح کی حیثیت رکھتی تھی مگر اپنے اس مطالبے کے ذریعے کہ مسلمان انہی کی رائے صحیح سمجھیں انہوں نے فرد کی آزادی کے سلسلہ میں ملاصدرا کے یقین کا احترام نہ کیا جو صدرا کا امتیاز تھا۔

سترھویں صدی کے آخر تک کوئی ایسی قانونی اتھارٹی کا قیام ناممکن ہو گیا تھا جو ریاست کی کمزوری کی تلافی کر سکے۔ تجارت کے زوال نے معاشی عدم تحفظ پیدا کر دیا تھا۔ آخر میں آنے والے بادشاہوں کی نااہلیت نے ریاست کو کمزور کر دیا تھا۔ جب 1722 میں افغان قبائل نے اصفہان پر حملہ کیا تو ایران کو ذلت آمیز شکست اٹھانی پڑی، ایران انتشار اور ابتری کے رو میں داخل ہو چکا تھا ایک وقت تو ایسا لگا کہ ایران کی آزاد اور ایک الگ حیثیت شاید قائم نہ رہ سکے۔ شمال کی طرف سے روسیوں نے حملہ کر دیا۔ عثمانی مغرب سے داخل ہوئے اور افغانوں نے جنوب اور مشرق میں اپنی پوزیشن مستحکم کر لی۔ سلطان حسین شاہ کے بیٹے طہماسپ دوئم نے بہرحال اصفہان کا محاصرہ توڑ دیا اور ایرانی افشار قبیلے کے سردار نادر خان کی مدد سے افغان حملہ آوروں کو بھاگنے پر مجبور کر دیا۔ 1736 میں نادر خان طہماسپ کو برطرف کر کے خود بادشاہ بن گیا۔ 1748 میں قتل ہونے تک نادر خان نے ظالمانہ مگر مؤثر طریقے سے حکومت کی۔ نادر خان کے بعد ایران میں انارکی کا دور دورہ ہوا یہاں تک کہ ترکمان قاچار قبیلے کے آقا محمد خان نے ایران میں اپنا اقتدار قائم کر لیا اور 1794 تک اپنی حکومت مستحکم کر لی۔ قاچار خاندان کی نئی حکومت بیسویں صدی کے اوائل تک قائم رہی۔

ان پُرآشوب برسوں میں دو اہم مذہبی رجحانات پیدا ہوئے۔ نادر خان نے ایران میں دوبارہ سنی ازم کو فروغ دینے کی کوشش کی جس کے نتیجے میں مقتدر علماء اصفہان چھوڑ گئے اور عثمانی سلطنت کے علاقوں نجف و کربلا میں پناہ لی۔ شروع میں تو یہ واقعہ ایک حادثہ لگا مگر آخر کار علماء کی کامیابی کا باعث بنا۔ کربلا اور نجف میں انہیں اور بھی زیادہ اختیارات مل گئے سیاسی طور پر وہ شاہوں کی دسترس سے دور نکل گئے تھے۔ معاشی لحاظ سے بھی خوشحال ہوئے اور رفتہ رفتہ متبادل اسٹبلشمنٹ بن کر دربار کو چیلنج کرنے کی پوزیشن میں آ گئے۔ اس دور کی دوسری اہم تبدیلی اصولیوں

کی فتح تھی جو ممتاز سکالر واحد بہبہانی (92-1705) کے پرتشدد ہتھکنڈوں کے ذریعے حاصل کی گئی تھی۔ جس نے تفصیل کے ساتھ اجتہاد کی وضاحت کی اور فقیہوں کے لئے اسے لازمی قرار دیا۔ اگر کوئی شیعہ اصولیوں کی پوزیشن صحیح ماننے سے انکار کرتا تو مرتد قرار دیا جاتا، ہر مخالفت سختی کے ساتھ دبا دی جاتی تھی۔ کربلا اور نجف میں دونوں فریقوں کے مابین لڑائیاں ہوئیں جن میں بعض اخباری مارے گئے۔ اصفہان کے صوفی فلسفے کو بھی خلاف قانون قرار دے دیا گیا اور صوفی ازم کو اتنی درندگی سے دبایا گیا کہ یہی بہبہانی کا بیٹا علی صوفیوں کے قاتل کے نام سے مشہور ہوا مگر جیسا کہ ہم نے دیکھا ہے کہ مذہبی معاملوں میں جور وستم کا الٹا اثر ہوتا ہے۔ صوفی ازم زیر زمین چلا گیا اور ان اختلاف کرنے والوں اور دانش وروں کی تربیت کرنے لگا جو Status quo کے خلاف تھے۔ بہبہانی کی فتح ایرانی علماء کی سیاسی فتح تھی۔ لوگوں میں اصولی مقبول تھے کیونکہ لاقانونیت اور بدامنی کے دنوں میں وہ ایسی کرشماتی اتھارٹی کا ذریعہ بنے تھے جس نے کسی حد تک تو نظم وضبط بحال کیا تھا۔ مجتہدوں نے سیاسی خلاء پر تو کیا مگر اس طرح کہ پھر انہیں کبھی زوال نہیں ہوا۔ مگر بہبہانی نے جو کامیابی تشدد کے ذریعے حاصل کی تھی وہ ایک طرح سے مذہبی شکست تھی کیونکہ ائمہ کے آئیڈیل اور سیرت سے اسے دور کا واسطہ بھی نہیں تھا۔

اٹھارویں صدی کے آخر تک عثمانی اور ایرانی سلطنتیں زوال کا شکار ہو چکی تھی۔ یہ زوال ناگزیر تھا کہ زرعی تہذیب کا یہی مقدر تھا۔ زرعی تہذیب میں زندگی کے آثار ختم ہو چکے تھے۔ ایکسَل دور سے ہی انسانوں نے اس تہذیب کو اس کی حدوں اور معذوریوں کے ساتھ قبول کر رکھا تھا بہرحال یہ ان کی ماضی پرستی کا کمال تھا۔ اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ قدامت پسند معاشرے جامد اور تقدیر پرست تھے کیونکہ ان کی بدولت اسلامی دنیا میں عظیم کلچر پیدا ہوئے تھے اور سیاسی کامیابیاں حاصل ہوئی تھیں۔ سترھویں صدی تک اسلام دنیا کی سب سے بڑی طاقت بن چکا تھا۔ مگر یہ سیاسی، فکری اور فن کارانہ کارنامے مائیتھالوجی سے وابستہ رہتے ہوئے انجام پائے تھے۔ یہ مائیتھالوجی اس نئے مغربی کلچر کے لئے اجنبی تھی جو مغرب میں فروغ پا رہا تھا۔ جدید یورپ کے کئی آئیڈیل مسلمانوں کے لئے پسندیدہ تھے۔ ہم نے دیکھ لیا ہے کہ مسلمانوں کا مذہب انہیں آزادی اظہار سماجی انصاف، فرد کی آزادی، مساوات، بشری روحانیت، سیکولر حکومت اور ریشنل انداز فکر کا سبق دیتا ہے۔ مگر نئی یورپی تہذیب کے بعض دوسرے پہلو ان لوگوں کے لئے

قابل قبول نہیں تھے جن کے اندران کا ماضی نسبتاً محفوظ تھا۔ اٹھارویں صدی کے اختتام تک مسلمان ذہنی اور فکری لحاظ سے مغرب سے پیچھے رہ گئے تھے۔اس وقت تک اسلامی سلطنتیں سیاسی طور پر کمزور ہو چکی تھیں۔ان کی کمزوری ان یورپی ملکوں کو جارحیت کی دعوت دے رہی تھی جو پہلے ہی دنیا پر غالب آنے کے لئے اپنے پر تول رہے تھے۔انگریزوں نے ہندوستان پر بالا دستی حاصل کر لی تھی۔فرانس بھی اپنی سلطنت قائم کرنے کا عزم کر چکا تھا۔19 مئی1798 کو نپولین بونا پارٹ اٹھارہ ہزار فوجیوں اور چار سو جہازوں کے ساتھ مشرق میں برطانوی برتری کو چیلنج کرنے روانہ ہو گیا۔نپولین نے یکم جولائی کو3800 فوجی اسکندریہ میں اتارے اور دوسرے دن ہی شہر پر قبضہ کر لیا۔چنانچہ اسے مصر مین ایک ٹھکانہ مل گیا۔نپولین اپنے ساتھ سائنسی لیبارٹری، سکالروں کی فوج، جدید مغربی لٹریچر اور عربی کا پرنٹنگ پریس لایا تھا۔مغرب کے نئے سائنسی سیکولر کلچر نے اسلامی دنیا میں اپنا راستہ بنا لیا تھا جس کے بعد اسلامی دنیا ویسی نہیں رہی جیسی کہ پہلے تھی۔

عیسائی۔نئی بہادر دنیا
(1492-1870)

اس وقت جب یہودی اسپین سے اپنے اخراج کے افسوناک نتائج کا سامنا کر رہے تھے اور مسلمان اپنی تین عظیم سلطنتیں قائم کر رہے تھے مغرب میں عیسائی اپنے راستے پر گامزن تھے۔ جو انہیں پرانی دنیا کے یقین اور تقدس سے دور لئے جارہا تھا۔ یہ دور ہنگامہ خیز تو تھا مگر پریشان کن بھی تھا۔ چودھویں اور پندرھویں صدی کے عرصہ میں طاعون کی وبا کالی موت نے عیسائی دنیا کی ایک تہائی آبادی کو ہلاک کر دیا تھا۔ اور یورپی ملکوں کو انگلستان اور فرانس کی نہ ختم ہونے والی سوسالہ جنگ اور اٹلی کی جنگوں نے غارت کر دیا تھا۔1459 میں یورپ پر عثمانیوں کی فتح کا صدمہ بھی سہنا پڑا تھا۔ اویونان کے پادریوں کے اسکینڈل اور چرچ کا بدترین تنازعہ بھی تھا کہ ایک ہی وقت میں تین پوپ، سینٹ پیٹر کے جانشین (پاپائے روم) ہونے کا دعویٰ کرنے لگے۔ عیسائی اندر ہی اندر محسوس کرنے لگے کہ پرانے طریقوں کے ساتھ مذہب سے وابستہ رہنا اب ممکن نہیں۔ اس کے باوجود وہ فکری آزادی اور طاقت حاصل کرنے کا دور تھا۔ ایک نئی دنیا دریافت ہو چکی تھی۔ علم نجوم کے ماہرین آسمانوں میں نئے راستے تلاش کر رہے تھے۔ نئی تکنیکی صلاحیت نے یورپ کو سارے ماحول پر ایسی برتری دلا دی تھی کہ جس کی مثال اس سے پہلے کہیں نہیں ملتی تھی جبکہ پرانے زمانوں کے شعور نے لوگوں کو واضح اور مقررہ حدود کے اندر رہنا سکھایا تھا۔ مغرب کی عیسائی دنیا نے جان لیا تھا کہ نامعلوم سے معلوم کا سفر وقت کا تقاضا ہے۔ جانی پہچانی دنیا کی حدود سے آگے جانا بھی ممکن ہے اس لئے نہیں کہ محض زندہ رہا جائے بلکہ اس لئے کہ اچھی زندگی بسر کی

جائے۔ اس نے بالآخر قدیم دیومالائی مذہب کو ناممکن بنادیا۔ جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مغربی جدیدیت طبعی طور پر مذہب کے خلاف تھی۔ پھر بھی مغربی سوسائٹی کے بدلنے کے ابتدائی دور میں صورتحال یہ نہیں تھی۔ اکثر سائنسدان اور مفکروں نے تغیر کے اس نازک موڑ پر محسوس کیا کہ وہ مذہبی ہونے کے نئے طریقوں کی تلاش میں ہیں۔ بجائے اس کے کہ مذہب بالکل ختم کردیا جائے۔ ہم اس معاملے میں ان کے طرزِ عمل کا جائزہ اسی باب میں لیں گے اور یہ بھی دیکھیں گے کہ ان کوششوں کے کیا اثرات مرتب ہوئے تھے مگر یہ بات صاف ہو جانی چاہیے کہ جولوگ جدید رجحانات اور جذبوں کے ترجمان بنے ہوئے تھے وہ ان کے خالق نہیں تھے۔ سولھویں صدی تک یورپ اور بعد میں امریکی نوآبادیوں کے اندر ایک پیچیدہ عمل شروع ہو چکا تھا جو دنیا کو سمجھنے اور برتنے کے متعلق لوگوں کے اندر بدل رہا تھا۔ تغیر کا عمل تدریجی اور اکثر خوشگوار تھا۔ جدتوں اور ایجادوں کو اس وقت نامکمل سمجھا جارہا تھا مگر جلد ہی وہ بیک وقت مختلف شعبوں میں ظاہر ہونے لگیں جن کا مجموعی تاثر فیصلہ کن تھا۔ یہ تمام انکشافات عملی اور سائنسی فکر کا نتیجہ تھے جس نے رفتہ رفتہ قدامت پرستانہ دیومالائی تصورات کی اہمیت کم کی اور لوگوں کی بڑھتی ہوئی تعداد، خدا، مذہب، ریاست، فرد اور سوسائٹی کے متعلق نئے خیالات سے متاثر ہونے لگی۔ امریکی نوآبادیوں کے لئے ضروری تھا کہ وہ ان تبدیلیوں کو مختلف سیاسی مصلحتوں کے تحت تسلیم کریں۔ دوررس سماجی تبدیلیوں کے کسی دور کی طرح یہ عہد بھی پُرتشدد تھا۔ جسے تباہ کن جنگوں، انقلابات، دیہات میں غارت گری اور بھیانک مذہبی فسادات کا سامنا تھا۔ تین سو سال کے عرصے میں نئے امریکیوں کو اپنی سوسائٹی جدید بنانے کے لئے سفاکانہ طریقے اختیار کرنا پڑے جن میں خون خرابہ، اذیت، قتل، احتساب، لوٹ مار، غلامی اور ظلم بھی شامل تھے۔ یہی صورت حال اب ترقی پذیر ملکوں میں ہے جو جدیدیت کے دردناک عمل سے گزر رہے ہیں۔

زراعت کو سیکولر خطوط پر چلانا اس عمل کا چھوٹا سا حصہ تھا۔ پیداوار میں اضافہ اور مویشیوں کی طاقت وصحت سے ہر شخص کی زندگی پر اثر پڑا۔ دوسرے خصوصی شعبوں میں بھی ترقی ہوئی لوگوں نے کمپاس، ٹیلی سکوپ میگنیفائنگ لینز بنانے شروع کردیے جو نئی دنیاؤں کا پتہ دیتے تھے۔ نقشے، چارٹ اور جہازوں کی نئی تکنیک اس کے علاوہ تھی۔ سترھویں صدی میں ولندیزی مائیکروسکوپک Antony van Leauwenhoek نے پہلے دفعہ بیکٹیریا اور دوسرے

مائیکروآرگن ازم کا مشاہدہ کیا۔ اس سے نہ صرف بیماریوں کو ختم کرنے میں عملی مدد ملی بلکہ زندگی وموت اوران کے دیو مالائی حوالوں سے بھی پردہ اٹھا۔ دواؤں کا شعبہ بہتر ہونے لگا اگرچہ علاج کا معاملہ ماروا اور بھاگو کے مصداق انیسویں صدی میں بھی تک بندی کے ذریعہ چلتا رہا۔ سترھویں صدی میں صفائی کا احساس بڑھتا گیا اور پہلی دفعہ بعض بیماریوں کی صحیح تشخیص ہوسکی۔ زمینی سائنس کی ترقی ہونا شروع ہوئی۔ زلزلوں اور آتش فشانوں پر بحث نے ان کے دیو مالائی حوالوں کو پیش منظر میں دھکیل دیا۔ مشینی ایجادات بہتر ہوئیں۔ گھڑیاں اور کلاک زیادہ معتبر ہوگئے۔ جس سے وقت سیکولر ہوگیا۔ ریاضی اور شماریات نے لوگوں کو مستقبل کا بالکل نیا شعور دیا۔ 1650 اور 1660 کے عشرے میں لفظ Probable (ممکن، اغلب) کے معنی بدلنے لگے۔ اس کے معنی یہ نہیں رہے کہ ''وہ چیز جو الوہی مدد سے ممکن ہے'' کہ پرانے زمانے میں تھے بلکہ یہ معنی ہوگئے کہ وہ چیز جو تمام مشاہدات کی رو سے ممکن ہے۔

اس آزادانہ رویہ اور مستقبل پر ایمان کی وجہ سے سائنس اور بیوروکریسی کو ریشنل بنانے کے لئے نیا ولولہ پیدا ہوگیا۔ برطانوی ماہر شماریات ولیم پیری اور جان گرانٹ انسانی عمر کے بارے میں خصوصی طور پر دلچسپی لے رہے تھے۔ اٹھارویں صدی کے شروع میں یورپ کے لوگوں نے اپنی زندگیاں انشورکرانی شروع کردی تھیں یہ سب کچھ قدامت پسندی کی خصوصیات کے خلاف تھا۔

ان میں سے کوئی بھی رجحان آخری اور قطعی نہیں تھا مگر ان کا مجموعی تاثر انقلابی تھا۔ 1600 تک یورپ میں ایجادات کا سلسلہ اس شدت سے جاری تھا کہ ترقی کا رکنا محال نظر آتا تھا۔ کسی ایک شعبے میں انکشاف اور کامیابی دوسرے شعبے میں معاون ثابت ہوتی تھی اس عمل کے لئے کبھی نہ رکنے والی رفتار چاہیے تھی۔ بجائے اس کے کہ دنیا کو بنیادی اور ناقابل تغیر قوانین کے تحت چلتا ہوا دیکھیں۔ یورپ کے لوگوں پر یہ انکشاف ہورہا تھا کہ وہ فطرت سے اپنی ضرورت اور اپنی مرضی کے مطابق کام لے سکتے ہیں۔ انہیں اپنے ماحول پر اختیار حاصل ہے۔ ان کی مادی ضروریات اس آسانی سے پوری ہوسکتی ہیں کہ اس سے پہلے ایسا کبھی نہیں ہوا تھا جب لوگ اپنی زندگیاں ریشنل انداز میں گزارنے کے عادی ہوئے تو لوگوں کو قدرتی طور پر فوقیت حاصل ہوگئی اور متھ نظرانداز کردی گئی۔ مستقبل پر لوگوں کا اعتماد اور زیادہ ہوگیا۔ نتائج کے خوف کے بغیر وہ تغیر کو

اپنی زندگی کا حصہ بنا رہے تھے۔ دولت مند مسلسل پیداوار اور ایجادات کی بنیاد پر بار بار سرمایہ کاری کر رہے تھے۔ انہیں یقین تھا کہ تجارت مسلسل ترقی کرتی رہے گی۔ سرمایہ درانہ معیشت نے مغرب کو اس قابل بنا دیا تھا کہ اس کے وسائل میں مسلسل اضافہ ہوتا رہے اور وہ قدیم زرعی معیشت کی طرح مجبوریوں میں نہ گھر جائے۔ جب تک کہ سوسائٹی کے ریشنل اور ٹیکنیکل ہونے کی بنا پر انیسویں صدی کا صنعتی انقلاب آئے مغرب کے لوگ اپنی مسلسل ترقی سے اتنے پر اعتماد ہو چکے تھے کہ انہوں نے ماضی کی طرف پلٹ کر بھی نہیں دیکھا اور نئی منزلوں کی طرف گامزن رہے۔ مگر سماجی تبدیلیوں کے بغیر یہ سفر ممکن نہ تھا۔ اس کے لئے لوگوں کی بڑھتی ہوئی تعداد اور ان کی صلاحیتوں کی ضرورت تھی تاکہ وہ جدیدیت کی اس دوڑ میں حصہ لے سکیں۔ عام لوگ پرنٹر، مکینک اور فیکٹری مزدور بن گئے مگران کے لئے بھی اہلیت کے نئے معیاروں پر پورا اترنا ضروری تھا۔ یہ بھی لازمی تھا کہ زیادہ سے زیادہ لوگ کسی حد تک تو تعلیم یافتہ ہوں۔ چنانچہ مزدوروں کی بڑھتی ہوئی تعداد پڑھنے لکھنے لگی۔ جب ایک دفعہ ایسا ہو گیا تو انہوں نے ناگزیر طور پر اپنی سوسائٹی کے مسائل اور فیصلوں میں زیادہ حصہ لینے پر اصرار کیا۔ حکومت کے لئے ضروری ہو گیا کہ وہ اور زیادہ جمہوری ہو۔ اگر ایک قوم اپنی پیداوار بڑھانے اور جدیدیت اختیار کرنے کے لئے اپنے تمام انسانی وسائل بروئے کار لانا چاہتی ہے تو ضروری ہے کہ وہ معاشرے سے الگ تھلگ اور کمزور لوگوں کو قومی کلچر کے عظیم دھارے میں شامل کرے۔ نئے نئے تعلیم یافتہ محنت کش طبقے پرانے نظام کو نہیں مانتے تھے۔ جمہوریت، رواداری اور عالمی انسانی حقوق کے آئیڈیل جدیدیت کے پیچیدہ عمل کا لازمی حصہ بن کر ابھرے اس لئے بھی کہ وہ مغربی سیکولر کلچر کی مقدس قدروں کا درجہ رکھتے تھے۔ وہ محض خوبصورت آئیڈیل نہیں تھے کہ جن کا خواب سیاست دان اور قومی رہنما دیکھا کرتے ہیں بلکہ ان کا وجود ماڈرن سٹیٹ کا بنیادی تقاضا تھا۔ جدید یورپ کے آغاز میں سماجی، سیاسی، معاشی اور فکری تبدیلیاں باہمی تعاون کا نتیجہ تھیں۔ ان مختلف شعبوں کا انحصار آپس میں ایک دوسرے پر تھا۔ جدید معاشرے کی تشکیل میں جمہوریت کا کردار بہت اہم اور نہایت نتیجہ خیز تھا۔ یہ حقیقت اس وقت اور بھی واضح ہو گئی جب مشرقی یورپ کے ملکوں نے جمہوری اصول اپنانے کی بجائے ظالمانہ طریقوں سے مختلف گروہوں کو اکٹھا کیا اور ترقی کی دوڑ میں پیچھے رہ گئے۔

یہ دور ہنگامہ خیز تھا مگر اہم سیاسی تبدیلیاں بھی اس کے ساتھ ساتھ تھیں ان تبدیلیوں کو لوگوں نے بڑی خوشی کے ساتھ قبول کیا۔ زمانہ وسطیٰ کے مذہبی تصورات اب تسکین کا سبب نہیں بن سکتے تھے کیونکہ وہ بدلے ہوئے حالات کے مطابق نہیں تھے۔ ان حالات میں مذہب کو بھی اپنا اثر ورسوخ بہتر کرتا تھا جیسا کہ سولھویں صدی کی کیتھولک اصلاحی مہم کے دوران ہوا تھا مگر جدید دور کی اصلاحات سے ظاہر ہوا تھا کہ یورپ کے لوگ بدستور قدامت پسندی کے مداح ہیں اگر چہ جدیدیت کا عمل جاری تھا۔ مسلمان ریفارمروں کی طرح پروٹیسٹنٹ ریفارمر بھی ماضی کی مدد سے نئے مسائل کے نئے حل تلاش کر رہے تھے۔ مارٹن لوتھر(1556-1482) جان کیل ون (64-1509) اور ہلڈرچ زونگلی(1531-1484) سبھی ماضی کی عیسائی روائتوں کی طرف رہنمائی کے لئے دیکھتے تھے جبکہ ابن تیمیہ نے ازمنہ وسطیٰ کی دینیات اور فقہہ کو رد کر دیا تھا تا کہ قرآن وسنت پر مبنی خالص اسلام کی سمت لوٹا جا سکے۔ اسی طرح لوتھر نے زمانہ وسطیٰ کے مذہبی علماء کی بجائے انجیل اور چرچ کے رہنماؤں کی خالص عیسائیت کی طرف واپس جانے کو کہا۔ قدامت پسند مسلمان مصلحین کی طرح عیسائی مصلحین بھی بیک وقت انقلابی اور رجعت پسند تھے۔ وہ آنے والی نئی دنیا کی بجائے پرانی دنیا سے وابستہ تھے۔ ہم اس کتاب میں ہر جگہ دیکھیں گے کہ جدیدیت کا عمل بڑی بے چینی پیدا کرتا ہے۔ جونہی ان کی دنیا بدلتی ہے لوگ اپنی سمت کھو دیتے ہیں وہ اس طرح نہیں دیکھ سکتے جس طرح ان کی سوسائٹی رخ کرتی ہے بلکہ اس کی سست رفتار تبدیلی غیر مربوط طریقوں سے دیکھتے ہیں۔ جب ان کی زندگیوں کو معنی دینے والی پرانی دیومالا تبدیلی کے اثر سے ٹوٹ کر گرتی ہے تو انہیں اپنی شناخت کے گم ہو جانے کا احساس ہوتا ہے۔ بے بسی اور ہلاکت کا خوف عام ہوتا ہے جو اور زیادہ برے حالات میں تشدد کی صورت اختیار کر لیتے ہیں لوتھر کا بھی کچھ ایسا ہی معاملہ ہے۔ اپنی ابتدائی زندگی میں وہ آسانی سے مایوسیوں کا نشانہ بن جاتا تھا زمانہ وسطیٰ کی تمام مذہبی رسوم اس شے کو چھو بھی نہیں سکتی تھیں جسے وہ غم کا نام دیتا تھا۔ اس کی وجہ سے موت کے خیال سے لرز اٹھا کیونکہ وہ اسے مکمل ہلاکت سمجھتا تھا۔ جب یہ خوف اس پر طاری ہو جاتا تو وہ مناجات نہیں پڑھ سکتا تھا۔ جس میں انسانی زندگی کے بے ثباتی بیان کی گئی ہے اور دکھایا گیا ہے کہ انسان خدا کے غیض وغضب کے شکار ہو رہے ہیں۔ زندگی بھر لوتھر نے موت کو خدا کے غضب کا ذریعہ جانا۔ وہ سمجھتا تھا کہ انسان نجات حاصل کرنے کے اہل نہیں ہیں اور اس

کے لئے صرف خدا کی بخشش کے محتاج ہیں اور یہ کہ انسانوں کی صرف ان کی کمزوری اور بے بسی کا احساس ہی بچا سکتا ہے۔ اپنی مایوسی سے بچنے کے لئے لوتھر مجنونانہ زور دشوار سے سرگرم عمل ہو جاتا اس عزم کے ساتھ کہ دنیا میں کوئی نیکی کرے مگر اس کی نفرت اسے ناکارہ بنا دیتی۔ پوپ، ترکوں، یہودیوں، عورتوں اور باغی کسانوں کے خلاف اس کی نفرت ہمارے زمانے کی ان مصلحتوں جیسی تھیں کہ جنہوں نے ایک ایسا مذہب بنایا ہے جس میں خدا سے محبت انسان کے ساتھ نفرت سے مربوط ہے۔

ذونگلی(Zowangli) اور کیلون(Calvin) نے بھی اپنی بے بسی محسوس کی اس سے پیشتر کہ وہ ایک نئے مذہبی وژن کا ادراک کر سکیں جس کے ذریعے انہوں نے نئی زندگی پائی انہیں بھی یقین ہو چلا تھا کہ وہ اپنی نجات کے لئے کچھ نہیں کر سکتے اور یہ کہ وہ انسانی زندگی کی آزمائشوں کے سامنے بے بس ہیں۔ دونوں جدید بنیاد پرستوں کی طرح خدا کی اعلیٰ حاکمیت پر زور دیتے تھے۔ لوتھر کی طرح، ژونگلی اور کیلون کو اپنی مذہبی دنیا ایک بار پھر بسانی پڑی۔ اس کے لئے بعض سخت قدم بھی اٹھانا پڑے بلکہ بعض وقت تو نوبت تشدد تک پہنچ جاتی تھی اس لئے کہ وہ چاہتے تھے کہ مذہب ایک ایسی دنیا کے مسائل میں حصہ لے جو دنیا انقلابی تبدیلیوں کے حق میں فیصلہ دے چکی تھی۔

اپنے دور کا شعور رکھتے ہوئے دنیا میں ہونے والی تبدیلیوں کا مصلحین کو پورا اندازہ تھا۔ کیتھولک چرچ کو الگ ہوئے انہوں نے جو اعلان آزادی کیا اسے مغرب کی تاریخ میں زبردست اہمیت حاصل ہے۔ نئی دنیا آزادی و خودمختاری چاہتی تھی۔ پروٹیسٹنٹ مصلحین بھی اس بدلی ہوئی دنیا کے عیسائیوں سے یہ حق مانگتے تھے تاکہ چرچ کے تعزیری حربے نظر انداز کرتے ہوئے وہ پوری آزادی کے ساتھ انجیل پڑھیں اور جیسے چاہیں اس کی تعبیر کریں۔ تینوں شخص کسی ایسے فرد کے خلاف متعصّبانہ رویہ اختیار کر سکتے تھے جو ان کی تعلیمات کے خلاف ہو۔ لوتھر کا کہنا تھا کہ کافرانہ کتابوں کو آگ لگا دینی چاہیے جبکہ کیلون اور ژونگلی اس پر تیار تھے کہ اختلاف کرنے والوں کو قتل کر دیا جائے۔ ان کا خیال تھا کہ اس ریشنل دور میں قدیم علامتوں کے زور پر مذہب کھڑا نہیں رہ سکتا۔ قدیم روحانیت میں علامت، الہامی حقیقت کا جز و تھی لوگوں کو زمینی چیزوں میں تقدس کا احساس ہوتا تھا اس لئے علامت اور تقدیس ناقابل تقسیم تھیں۔ زمانہ وسطیٰ کے

عیسائی، ولیوں کے تبرک میں خدا کا جلوہ دیکھتے تھے۔ مصلحین نے تبرک کو بت کہہ کر رَد کر دیا۔ وہ مذہب کی متھ کے متعلق اس طرح بات کرتے تھے گویا کہ وہ لوگوس ہے۔ جس ذوق وشوق سے لوگ مصلحین کی بات مان رہے تھے اس سے پتہ چلتا تھا کہ یورپ میں اکثر عیسائی دیو مالائی طرز احساس سے منہ موڑ رہے ہیں۔ یورپ میں زندگی آہستہ آہستہ سیکولرازم کی طرف بڑھ رہی تھی اور پروٹیسٹنٹ اصلاح پسندی اپنی مذہبی شدت کے باوجود سیکولر ہو رہی تھی۔ مصلحین دعویٰ کرتے تھے کہ وہ انجیل کی طرف لوٹ رہے ہیں مگر اس کا مطالعہ وہ نئے طریقے سے کر رہے تھے۔ ہر صالح عیسائی کو خدا کے سامنے انجیل پر بھروسہ کرتے ہوئے تنہا پیش ہونا تھا مگر یہ بھی ممکن نہ ہوتا اگر پرنٹنگ ایجاد نہ ہو چکی ہوتی اور ہر عیسائی کے ہاتھ میں اس کی اپنی انجیل نہ ہوتی یا خواندگی کی مہم نے اسے انجیل پڑھنے کے قابل نہ بنا دیا ہوتا۔ الہامی کتابوں کو لفظ بلفظ پڑھ کر ان سے معلومات حاصل کی جاتیں بالکل اسی طرح جیسے پروٹیسٹنٹ جدت پسند دوسرے ٹیکسٹ سے حاصل کرتے۔ خموشی اور تنہائی میں مطالعہ کرنے سے عیسائی کلام الٰہی کی توجیہہ کے روائیتی بندھنوں سے آزاد ہو گئے جو ماڈرن مغربی ذہنیت کی خصوصیت تھی مگر مذہب کی اہمیت پر زور دیتے ہوئے لوتھر نے بڑی شدت کے ساتھ ریزن کو رد کر دیا۔ شاید اسے خیال ہو گیا تھا کہ آنے والے دنوں مین ریزن کا کردار مذہب کے خلاف ہوگا۔ اس کی تصانیف میں ریزن کے ساتھ مائیتھالوجی کی مطابقت کا پرانا تصور بھی ختم ہو چکا تھا۔ لوتھر اپنے اشتعال انگیز لہجے میں ارسطو کے خلاف اپنی نفرت کا اظہار کرتا۔ اس سے بھی اسے سخت نفرت تھی جسے وہ کبھی ریزن کا نمائندہ سمجھتا تھا۔ اسے یقین تھا کہ ریزن لوگوں کو دہریہ بناتی ہے۔ لوتھر یورپ میں پہلا شخص تھا جس نے ریزن کو مذہب کے دائرے سے نکال کر سیکولر بنا دیا۔ لوتھر کے لئے خدا ایک راز ہے جو آنکھوں سے اوجھل ہے اور دنیا اس سے خالی ہے۔ لوتھر کا deus absonditus کہیں نہیں ہے۔ کسی انسانی ادارے میں نہ کسی مادی حقیقت میں۔ زمانہ وسطیٰ کے عیسائیوں نے اس مقدس ہستی کو چرچ میں پایا تھا مگر لوتھر نے اب اسے چرچ کا دشمن قرار دے دیا۔ یہ بھی اجازت نہیں تھی کہ کائنات کے حیرت انگیز نظام پر غور کرتے ہوئے خدا کی ہستی کا عرفان حاصل کیا جائے جیسا کہ تدریسی دینیات کے بعض استادوں جو (لوتھر کے غصے کا نشانہ تھے) نے کیا تھا۔ لوتھر کی تصانیف میں خدا نے مادی دنیا سے واپسی اختیار کر لی تھی کیونکہ اسے اب مذہبی اہمیت حاصل نہیں تھی۔ لوتھر نے سیاست کو بھی سیکولر

کردیا تھا کیونکہ دنیاوی حقائق، روحانیت کے سراسر مخالف تھے۔ اس کا کہنا تھا کہ چرچ اور ریاست کو ایک دوسرے کے دائرہ عمل کا احترام کرتے ہوئے آزادی کے ساتھ کام کرنا چاہیے۔ لوتھر کے مذہبی وژن نے اسے ریاست سے چرچ کی علیحدگی کا علمبردار بنادیا مگر ریاست کا سیکولر ہونا بھی ایک نئے طریقے سے مذہبی ہونے کے مترادف تھا۔ لوتھر مذہب سے سیاست کو الگ دیکھنا چاہتا تھا۔ اس لئے کہ اسے رومن کیتھولک چرچ کے جابرانہ طرزعمل سے نفرت تھی۔ چرچ اپنی فرسودہ خیالی اور من مانی مسلط کرنے کے لئے ریاست کو استعمال کرتا تھا۔ کیلون لوتھر کے اس وژن سے متفق نہیں تھا کہ خدا دنیا میں نہیں ہے۔ ژونگلی کی طرح اس کا خیال تھا کہ خانقاہوں میں رہنے کی بجائے عیسائیوں کو سماجی اور سیاسی زندگی میں حصہ لینا چاہیے۔ کیلوین نے محنت کشی کو مذہبی رنگ دے کر مقدس پیشہ قرار دے دیا تھا نہ کہ اسے ازمنہ وسطیٰ کے لوگوں کی طرح گناہوں کی سزا سمجھا جاتا تھا نہ کیلوین نے فطرت سے لوتھر کی بیزاری کو اہمیت دی۔ وہ سمجھتا تھا کہ خدا کو اس کی تخلیقات مین دیکھا جاسکتا ہے اور تلقین کرتا تھا کہ علم نجوم، جغرافیہ اور بیالوجی کا مطالعہ کیا جائے۔

جدید دور کی ابتدا میں اس کے کئی پیروا چھے سائنسدان ثابت ہوئے اسے وحی اور سائنس میں کوئی تضاد نظر نہیں آتا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ انجیل نے جغرافیہ اور کائنات کے متعلق لفظی باتیں نہیں کیں بلکہ ایسے پیرائے میں چند حقیقتیں بیان کی ہیں جو الفاظ سے ماورا ہیں اور چند لوگوں کی ہی سمجھ میں آسکتی ہیں انجیل کی زبان، بچوں کی باتوں جیسی ہے۔ سچائی کے بیان میں جان بوجھ کر سادگی اختیار کی گئی ہے کیونکہ سچائی اتنی پیچیدہ ہے کہ اسے بیان کرنے کا کوئی اور طریقہ نہیں ہے۔

ابتدائی جدید دور سے تعلق رکھنے والے بڑے بڑے سائنسدان بھی کیلوین کے خیالات سے متفق تھے وہ اپنی ریسرچ اور بحث وتمحیص بھی دیومالائی مذہبی فریم ورک میں کرتا علم نجوم میں پولینڈ کے ماہر نکولس کوپرنکس (Nicolaus Copernicus) (1474-1543) کا دعویٰ تھا کہ اس کی سائنس بشری سے زیادہ روحانی اور الہامی ہے مگر کائنات کے متعلق اس کی تھیوری قدیم دیومالائی شعور کے لئے تباہ کن تھی۔ اس کا دعویٰ اتنا انقلابی تھا کہ اس کے اپنے زمانے میں بہت کم لوگ اسے قبول کر سکے۔ اس کا کہنا تھا کہ کائنات کے مرکز میں واقع ہونے کی بجائے زمین اور دوسرے سیارے سورج کے گرد تیز چکر لگا رہے ہیں جب ہم آسمان کی سمت دیکھتے ہیں اور سمجھتے

ہیں کہ ہم نے فلکی اجسام کو متحرک دیکھا ہے حالانکہ یہ مخالف سمت میں زمین کے گردش کرنے کا عکس ہے۔ کوپرنکس کی تھیوری تو نامکمل رہی مگر جرمن ماہر طبیعیات (Johanas Kepler-1571-1690) نے اس کے حق میں ریاضی کی شہادت مہیا کی جبکہ (Galileo Galilei-1564-1642) نے اس کے دعوے کو ٹیلی سکوپ سے مشاہدہ کرکے پرکھا۔1612 میں جب اس نے اپنے مشاہدے کی تفصیل شائع کی تو تمام یورپ میں سنسنی کی لہر دوڑ گئی اور لوگ اپنے ٹیلی سکوپ لے کر آسمان کا مشاہدہ کرنے لگے۔

احتساب نے گلیلیو کو خاموش کر دیا اور اسے تائب ہونے پر مجبور کیا مگر گلیلیو کی سزایابی میں اس کی تیز مزاجی کا حصہ بھی تھا۔ جدیدیت کے شروع میں مذہبی لوگوں نے سائنس کو رد نہیں کیا تھا۔ جب کوپرنکس نے ویٹی کن میں پوپ کے سامنے اپنا خیال پیش کیا تو پوپ نے اسے درست مان لیا اور کیلوین کو بھی اپنی تھیوری کے معاملے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی خود سائنسدان اپنے کام کو بنیادی طور پر مذہبی سمجھتے کیپلر اپنے آپ کو سخت روحانی اضطراب میں مبتلا سمجھتا تھا جب اس نے دنیا کے سامنے وہ راز فاش کئے جنہیں جاننے کا اعزاز اس سے پہلے کسی انسان کو حاصل نہیں ہوا تھا اور گلیلیو کو یقین تھا کہ اس کے ریسرچ خدا کے کرم کا نتیجہ ہے۔ وہ سب بدستور یہ سمجھتے تھے کہ ان کا سائنسی ریشنلزم، مذہبی وژن سے مطابقت رکھتا ہے اور یہ کہ لوگوس مائیتھوس کا معاون ہے۔

کچھ بھی ہو کر پرنکس نے ایک انقلاب کا آغاز کر دیا تھا اب انسان اپنے آپ کو پہلے کی طرح کبھی نہیں پائیں گے اور نہ اپنی بصیرت پر بھروسہ کر سکیں گے لوگوں نے جان لیا کہ وہ اپنے محسوسات پر انحصار کر سکتے ہیں وہ کسی ان دیکھے خدا کی تلاش میں دنیا کے ظاہر پر نظر ڈال چکے تھے مگر انہیں یقین تھا کہ خارجی آثار کا حقیقت کے ساتھ گہرا تعلق ہے۔ انہوں نے متھ بنائی تھیں کہ زندگی کے بنیادی اصولوں کے متعلق اپنا وژن ان کے ذریعے بیان کر سکیں۔ انہیں کے ذریعے وہ حقیقت کو ایک تجربے کی صورت میں دیکھ سکے تھے۔ ایلوس(Eleusis) کے یونانی پرستاروں نے پرسیفان(Persephine) کی متھ (فصلوں کی کٹائی) کی تال سے Rhythms جوڑی تھی۔ کعبہ کا طواف کرتے ہوئے لوگوں نے اپنے طواف کو زمین کے گرد سیاروں کی گردش سے علامت کے طور پر ہم آہنگ کر کے زندگی کے بنیادی اصولوں کا اقرار کیا تھا مگر پرنکس کے بعد شبہ کا بیج

بودیا گیا۔ یہ ثابت ہو چکا تھا کہ زمین جو ساکت نظر آتی ہے دراصل تیزی کے ساتھ گھوم رہی ہے اور سیارے صرف اس لئے متحرک نظر آتے ہیں کیونکہ لوگ خود اپنا وژن ان پر عکس ریز کر رہے ہیں۔ جو بات خارجی سمجھی گئی تھی دراصل وہ سراسر داخلی ہے۔ ریزن اور متھ میں مطابقت نہیں رہی تھی۔ درحقیقت سائنسدانوں نے لوگوں کی اتنی وسیع سطح پر پذیرائی کی تھی کہ اس سے عام انسانوں کے نقطۂ نظر کی اہمیت کم ہوگئی اور انہیں عالمِ فاضل ماہرین پر انحصار کرنا پڑا۔ جہاں متھ نے یہ بتایا تھا کہ انسانی عمل زندگی کے بنیادی معنوں کے ساتھ منسلک ہے۔ نئی سائنس نے انسانوں کو کائنات کے کسی بے نشان کونے میں دھکیل دیا۔ اب وہ کسی چیز کسی مقام کا مرکز نہیں رہے تھے بلکہ کائنات کے کسی بے نام سیارے میں دبک گئے تھے جو ان کی ضروریات کے گرد گھومتا بھی نہیں تھا۔ یہ ایک المناک منظر تھا جس کے لئے متھ کا ہونا لازمی تھا تاکہ کائنات کا نیا تصور پیدا ہو جو روحانی طور پر اتنا ہی معنی خیز ہو جتنا کہ پرانا تصور تھا۔

مگر جدید سائنس نے مائیتھالوجی کو رد کرنا شروع کر دیا تھا۔ برطانوی سائنسدان نیوٹن (Sir Isaac Newton-1642-1727) نے اپنے پیش رووں کی ریسرچ اور معلومات کو سائنسی تجزیہ کے ذریعے سمجھا اور ان کے نتائج یکجا کئے۔ نیوٹن نے کشش ثقل (Gravity) کا آئیڈیا کائناتی قوت کے طور پر پیش کیا جس نے ساری کائنات کو آپس میں جوڑ رکھا تھا اور فلکی اجسام کو آپس میں ٹکرانے سے روکا ہوا تھا۔ اسے یقین تھا کہ خدا کے ہونے کا ثبوت موجود ہے اس لئے کہ کائنات کا پیچیدہ ڈیزائن اپنے آپ ہی نہیں بن گیا۔ دوسرے جدید سائنسدانوں کی طرح نیوٹن نے بھی انسانوں کو ان کی دنیا کے متعلق بالکل صحیح اور بالکل نئی معلومات مہیا کیں۔ اسے یقین تھا کہ اس کا سسٹم معروضی حقیقت کے عین مطابق ہے اور انسانی علم کو اس مقام سے آگے لے گیا ہے جہاں پر کہ وہ پہلے تھے مگر لوگوں کی دنیا میں کھو جانے سے نیوٹن کے لئے ناممکن ہو گیا کہ وہ ادراک کے زیادہ وجدانی طریقوں سے متاثر ہو۔ جن کے وسیلے سے انسان سچ کی ایک دوسری فارم کا سراغ پاتے ہیں۔ اس کے خیال میں پراسراریت اور مائیتھالوجی، سوچ کے بوسیدہ اور وحشیانہ طریقے ہیں مذہب کے معاملے میں بھی ان کا تعلق توہم پرستی سے ہے۔ پراسرار چیزوں کا شوق اور جستجو اس وجہ سے ہے کہ وہ بہت کم سمجھ میں آتی ہیں۔

نیوٹن پر عیسائیت کو دیومالائی ڈاکٹرین سے نجات دلانے کا خیال مسلط ہو گیا۔ اسے یقین

ہو گیا تھا کہ تثلیث اور تجسیم کے بے جان عقیدے فریب، سازش اور جعل سازی کی پیداوار ہیں۔
جب وہ اپنی تصنیف (The Philosophiae Naturals Proncipia-1687) پر کام کر رہا
تھا تو اس نے The Philosophical Origins of Gentile Theology کے عنوان سے
ایک مضمون لکھنا شروع کر دیا کہ حضرت نوح نے جس مذہب کی بنیاد رکھی وہ توہمات سے ریشنل
غور وفکر کے ذریعے جانا جاسکتا ہے۔ بعد میں آنے والی نسلوں نے ایک بالکل خالص مذہب کو
خالص نہیں رہنے دیا۔ چوتھی صدی میں بے ضمیر دینی علماء نے تثلیث اور تجسیم کی جعلی ڈاکٹرین کا
اضافہ کر دیا۔ درحقیقت تثلیث کی پیش گوئی کتاب مقدس میں ہو چکی تھی۔ یہ مغرب کا عجیب مذہب
تین ہمسر خداؤں کا مسلک تھا نیوٹن اپنے ایمان کا اظہار اپنی پچھلی نسلوں کی طرح نہیں کر سکا تھا۔
وہ نہیں مانتا تھا کہ یونان کے پرانے مذہبی عالموں نے چوتھی صدی میں مائیتھوس کے طور پر تثلیث
کا تصور دیا تھا۔ بعد میں یہودی کبالائیوں نے یہی کچھ کیا جیسا کہ گریگری آف نیسا (Gregory
of Nyssa) نے وضاحت کی تھی کہ باپ، بیٹا اور روح کے تین جوہر معروضی حقیقت نہیں ہیں
بلکہ ان کے ذریعے الوہیت اپنے آپ کو اس سطح پر لاتی ہے کہ ہم انسانوں کی سمجھ میں آسکے۔
دعا عبادت اور غور وفکر کے مسلکی سیاق وسباق سے کٹ کر اس کے کوئی معنی نہیں۔ مگر نیوٹن تثلیث
کو ریشنل اندازِ نظر سے دیکھ سکتا تھا۔ وہ متھ کے کردار سے بھی واقف نہیں تھا اس لئے اس نے اس
ڈاکٹرین سے ہی جان چھڑالی۔ مغرب کے اکثر عیسائی آج جو وقت تثلیث کی تھیالوجی کے
معاملے میں محسوس کرتے ہیں اس سے پتہ چلتا ہے کہ وہ بھی نیوٹن کی طرح ریزن (عقل) کے حق
میں جانبدارانہ بلکہ متعصّبانہ رائے رکھتے ہیں۔ نیوٹن کی پوزیشن قطعی طور پر قابلِ فہم ہے۔ وہ مغرب
میں پہلی صف کے ان لوگوں میں سے تھا جنھوں نے سائنسی ریشنلزم میں کمال حاصل کیا تھا۔ اس
کا کارنامہ بہت شاندار تھا اور کسی بھی مذہبی کارنامے کی طرح اس کے لئے پر کیف اور سرور آور تھا۔
وہ اپنے مطالعہ اور ریسرچ کے دوران چلا اٹھتا "O God, I think Thy thoughts after
Thee" اس کے پاس واقعی وجدانی صوفیانہ آگہی کے لئے کوئی وقت نہیں تھا جو ممکن ہے کہ اس کے
کام کی رفتار روک دیتی۔ انسانی تاریخ میں پہلے بار ریزن (عقل) اور متھ کے راستے الگ ہوئے
تھے جس کی وجہ مغرب کی حیرت انگیز کامیابی تھی۔

سترھویں صدی تک ترقی، یقین کے اس درجے پر پہنچ چکی تھی کہ یورپ کے لوگ ماضی

فراموش کر کے مستقبل کی طرف دیکھنے لگے۔ وہ جان چکے تھے کہ اگرانہیں آگے بڑھنا ہے تو آگے دیکھنا ہوگا۔ نئی سائنس اسی طرح اپنا مقصد حاصل کرسکتی تھی کہ وہ آگے بڑھتی رہے۔ ایک بارکوپرنکس کی تھیوری صحیح تسلیم کر لی گئی تو پھر قدم پیچھے ہٹانا ممکن نہیں رہا۔ بعد میں نیوٹن کا اپنا سسٹم نظرانداز ہوگیا۔ اگرچہ اس کے طریقہ کار کے ساتھ ایسا نہیں ہوا۔ یورپ کے لوگ سچ کے ایک نئے پہلو کی تلاش میں تھے۔ کوئی سچ آخری اور قطعی نہیں سمجھا رہا تھا۔ کیونکہ جلد ہی نیا انکشاف اس کی جگہ لے لیتا۔ جیسے معروضی طور پر ثابت کیا جاتا اور عملی دنیا پر اس کے اثرات سے اس کی اہمیت کا پتہ چلتا۔ اسے جدید سائنس کی طرف سے اتھارٹی حاصل تھی اور وہ دیومالائی دنیا سے زیادہ طاقت حاصل کر رہا تھا۔

فرانسس بیکن(1626-1561) کی تصنیف Advancement of Learning (1605) میں یہ بات پہلے ہی ظاہر ہو چکی تھی۔ بیکن کا کہنا تھا کہ ہر سچ کا تنقیدی اور سائنسی جائزہ لینا چاہیے۔ انتہائی مقدس مذہبی سچ بھی اس عمل سے مستثنیٰ نہیں۔ اگر وہ تسلیم شدہ حقائق کو رد کرے یا ہماری حسیات کی شہادت نہ مانے تو اسے نظرانداز کر دینا چاہیے۔ ماضی سے متعلق بڑی سے بڑی بصیرت اور دانش کو یہ اجازت نہیں دی جاسکتی کہ وہ انسان کے اس سنہرے مستقبل کو خاک میں ملا دے جس کی تخلیق ہم نے کی ہے بیکن کو یقین تھا کہ سائنس کی ایجادات انسانی دکھ اور مصائب ختم کر دیں گی اور اس زمین پر اس ہزار سالہ دور حکومت کا آغاز ہوگا جو عدل وانصاف پر مبنی ہوگا اور جس کا وعدہ پیغمبروں نے کیا ہے۔ ہم بیکن کی تصنیفات میں ایک نیا عہد کروٹیں لیتے ہوئے دیکھتے ہیں وہ اتنا پراعتماد تھا کہ اسے سائنس اور انجیل میں کوئی تصادم نظر نہیں آیا۔ گلیلیو کی مذمت سے برسوں پہلے اس نے سائنسدانوں کے لئے مکمل فکری آزادی کا مطالبہ کیا تھا کیونکہ بنی نوع انسان کے لئے سائنس دانوں کا کام سادہ دل ملاؤں کے کام سے بہت زیادہ اہم تھا۔ The Advancement of Learning سائنسی ریشنلزم کا اعلان آزادی تھا جو متھ سے چھٹکارا چاہتا تھا اور جس کا کہنا تھا کہ انسان کو سچ تک لے جانے کا ایک ہی ذریعہ ہے۔

جدید مغرب میں سائنس کا آغاز ایک تاریخی لمحہ تھا۔ سائنسی اور ریشنل دریافتیں ہمیشہ ایک قابل فہم مائیتھالوجی کے اندر رہ کر کی گئی تھیں جس نے ان انکشافات کے معنی واضح کئے تھے۔ مروجہ متھ کا ہر ریسرچ پر کنٹرول تھا اور وہ ان پر عمل قدامت پسند سوسائٹی کی ضروریات کے تحت

روک بھی سکتی تھی مگر سترھویں صدی تک مغربی سائنس دان اپنے آپ کو ان پرانی پابندیوں سے آزاد کرانے کی کوشش کر رہے تھے جن کی ضرورت باقی نہیں رہی تھی کیونکہ زرعی معاشروں کو پسماندہ بنانے والی وجوہات پر بتدریج قابو پایا جا رہا تھا۔ بیکن کا اصرار تھا کہ صرف سائنس ہی حق پر ہے۔ سائنس کے متعلق اس کی رائے ہماری رائے سے مختلف تھی۔ بیکن کی نظر میں سائنسی طریقہ کار یہ تھا کہ حقائق جمع کر لئے جائیں۔ وہ سائنسی ریسرچ میں مفروضوں اور قیاس آرائیوں کو اہمیت نہیین دیتا تھا مگر سچ کے بارے میں اس کی توضیح بالخصوص انگریزی بولنے والے ملکوں میں بہت مقبول تھی۔ اس کا کہنا تھا کہ ہم جن معلومات پر اعتبار کر سکتے ہیں وہ ہمیں صرف اپنی پانچ حسیات کے ذریعے ہی مل سکتی ہیں ان کے علاوہ سب وہم ہے۔ مابعد الطبعیات ، دینیات، آرٹ، تصوف اور مائیتھالوجی سب غیر متعلقہ قرار پا کر منسوخ ہو گئے اس لئے کہ سائنسی تجزیے سے ان کی تصدیق نہیں ہو سکتی تھی۔

جو لوگ اس ریشنل طرزِ زندگی سے متفق تھے اور مذہبی بھی رہنا چاہتے تھے انہیں خدا اور روحانیت کے متعلق سوچنے کی نئی راہیں تلاش کرنی تھیں۔ فرانسیسی سائنسدان ڈیکارٹ (1596-1650) کے فلسفہ میں ہمیں دیومالائی اپروچ کی موت نظر آتی ہے۔ وہ صرف ریشنل زبان میں بات کر سکتا تھا۔ اس کا وژن تنہا تھا۔ اس کے لئے کائنات ایک بے جان مشین، جسمانی دنیا بے حس و حرکت اور مردہ ہے۔ یہ ہمیں خدا کے متعلق کوئی خبر نہیں دے سکتی۔ کائنات میں واحد زندہ چیز انسانی دماغ ہے جو اپنے وسیلے سے ہی یقین سے ہمکنار ہو سکتا ہے۔ ہمیں پتہ نہیں لگ سکتا کہ ہمارے شکوک اور خیالات کے علاوہ بھی دنیا میں کوئی چیز موجود ہے۔ ڈیکارٹ سچا کیتھولک تھا۔ وہ اپنے آپ کو خدا کے ہونے کا یقین دلانا چاہتا تھا مگر اس تخیلاتی ماضی واپس جانے پر تیار نہیں تھا جو متھ اور مسلک سے وابستہ تھا۔ اسے پیغمبروں اور آیات کی بصیرت پر بھی بھروسہ نہیں تھا۔ نئے دور کے انسان کی حیثیت سے وہ ایسے آئیڈیا قبول نہیں کر سکتا تھا جو کہیں سے نازل ہوئے ہوں۔ سچائی تک پہنچنے کا ذریعہ ریاضی تھا یا کوئی کتبہ، جیسے 'ہونی انہونی نہیں ہو سکتی' جو نا قابل تردید حقیقت ہے۔ چونکہ واپسی کا راستہ بند تھا۔ دیکارٹ رفتہ رفتہ آگے بڑھتا رہا۔

ایک شام آتشدان کے پاس بیٹھے ہوئے اس نے ایک مقولہ وضع کیا ''میں سوچتا ہوں، اس لئے میں ہوں'' (I think, therefore I am) اس کا خیال تھا کہ اس کے معنی واضح ہیں۔ ایک

چیز جسے یقین کا درجہ حاصل ہے وہ ہمارے ذہن میں شک کا گزر ہے مگر اس سے انسانی ذہن کی محدودیت(Limitation) ظاہر ہوتی ہے۔ محدودیت کے بھی کوئی معنی نہیں اگر ہمارے ذہن میں پہلے ہی پرفیکشن کا تصور موجود نہ مگر جو پرفیکشن کہیں موجود نہیں وہ ایک تضاد ہے۔ آخری (Ultimate) پرفیکشن خدا، لازمی طور پر ایک حقیقت ہے مگر یہ نام نہاد ثبوت ایک جدید دہریئے کو قائل نہیں کرتا بلکہ ایسے حالات میں خالص ریزن (عقل) کی خامی ظاہر ہوتی ہے۔

دنیا میں ہماری کامیابی کے لئے ریشنل فکر ناگزیر ہے۔ اس وقت یہ درجہ کمال پر ہوتی ہے جب اس کا رخ ایک آدرش کی صورت میں ہوتا ہے یا ڈیکارٹ کی طرح عارضی اور دنیاوی باتوں سے ہم اس لئے پیچھے ہٹتے ہیں کہ کسی چیز پر معروضی نقطۂ نگاہ سے غور کرسکیں مگر جب ہم جاننا چاہتے ہیں کہ دنیا کیوں موجود ہے (اگر موجود ہے) یا یہ کہ زندگی کے کوئی معنی ہیں تو ریزن (عقل) مشکل ہی سے آگے بڑھتی ہے۔ ہماری سوچ کا محور خود ہمیں اجنبی لگنے لگتا ہے۔ ڈیکارٹ اپنے آتش دان کے قریب اپنی یخ بستہ اور تنہا دنیا میں اپنی بے یقینی کا اسیر ایک زبانی ثبوت مہیا کرتا ہے جو کسی ذہنی الجھن سے بھی زیادہ اور اس روحانی کرب کا مظہر ہے جس میں نئی دنیا مبتلا ہے۔

چنانچہ ایک ایسے وقت میں جب سائنس اور ریشنلزم تیزی سے آگے بڑھ رہے تھے زندگی ان کے لئے بے معنی ہورہی تھی جنہیں انسانی تاریخ میں پہلی بار دیومالا کے بغیر زندہ رہنا تھا۔ برطانوی فلسفی ہابس (Thomas Hobbes(1588-1676 کو یقین تھا کہ خدا ہے مگر اہم وجوہات کی بناء پر ممکن ہے کہ خدا موجود نہ ہو۔ لوتھر کی طرح ہابس نے بھی مادی دنیا کو خدا سے خالی پایا۔ ہابس کا کہنا تھا کہ انسانی تاریخ کے آغاز پر خدا ظاہر ہوا تھا اور اب اس کے انجام پر ظاہر ہوگا مگر اس وقت تک ہمیں اس کے بغیر رہنا ہوگا۔ تاریخ میں کھوئے ہوئے ہم اس کا انتظار کرتے رہیں گے۔ فرانسیسی ریاضی دان پاسکل (Blaise Pascal(1623-62 بہت مذہبی آدمی تھا۔ اس کی رائے میں لامحدود کائنات کی تنہائی اور خموشی (جو ماڈرن سائنس نے ظاہر کی ہے) دل مین شدید خوف پیدا کرتی ہے۔

''جب میں انسان کو اس بدترین حالت میں دیکھتا ہوں، دیکھتا ہوں کہ پوری کائنات موت کے عالم میں ہے اور انسان تنہا، روشنی کے بغیر اس میں بھٹک رہا ہے۔ گویا کائنات کے کسی کونے میں کھو گیا ہے۔ نہیں جانتا کہ اسے وہاں کون لایا ہے۔ اسے کیا کرنا ہے۔ جب مر جائے گا تو اس

پر کیا گزرے گی۔ کچھ نہ جانتے ہوئے میں خوف سے کانپ جاتا ہوں۔ اس انسان کی طرح جو صحرا کے کسی کونے میں محوِ خواب ہے۔ آنکھ کھلی ہے تو لگتا ہے کہیں کھو گیا ہے۔ مگر بھاگنے کا کوئی رستہ نہیں۔ تب میں حیران ہوتا ہوں کہ اس ذلت آمیز حالت میں بھی انسان مایوس نہیں ہے۔'' ریزن (عقل و دانش) اور لوگوس جدید دنیا میں لوگوں کی حالت بہتر بنا رہے تھے مگر وہ ان سوالات کا جواب نہیں دے سکتے تھے جنہیں پوچھنا انسانوں کی فطری مجبوری ہے اور جن کا سامنا کرنا مائیتھوس کا اعزاز ہے۔ جس کے نتیجے میں تنہائی اور مایوسی جدید زندگی کا ناگزیر حصہ بن گئی مگر وہ بھی تھے جو اس مایوسی کی لپیٹ میں نہیں آئے جان لاک (John Locke (1632-1704 ان لوگوں میں سے تھا جنہوں نے اٹھارویں صدی میں سب سے پہلے فلسفیانہ تعلیم کا آغاز کیا۔ وہ پاسکل کی وجودیت کے اثرات سے آزاد تھا۔ زندگی اور انسانی ریزن (عقل) پر اس کا ایمان بہت مضبوط تھا۔ اسے خدا کے ہونے میں کوئی شک نہیں تھا ہر چند کہ وہ جانتا تھا کہ ایسے معبود کا وجود، بیکن کے سائنسی ٹیسٹ کے مطابق ثابت کرنا ممکن نہیں جو ہماری آنکھوں سے اوجھل ہو۔ لاک کے مذہبی تصور کی بنیاد ریزن (عقل) تھی اور وہ بعض یہودی میرونز کے خدائی تصور سے مشابہ تھا۔ اسے پورا یقین تھا اس دنیا کا وجود، اس کے ہونے کا مکمل ثبوت ہے کہ اس کا کوئی خالق بھی ہے۔ اگر ریزن (عقل) کھل کر اپنا کردار ادا کر سکے تو ہر شخص پر اس صداقت کا انکشاف خود بخود ہو جائے گا۔ دنیا میں جھوٹے خیالات اور توہمات اس لئے پھیل گئے ہیں کہ پادریوں نے اپنی برتری تسلیم کروانے کے لئے ظالمانہ حربے آزمائے ہیں۔ ایک اچھے مذہب کی خاطر ریاست کو ہر قسم کے خیالات اور اعتقادات برداشت کرنے چاہئیں۔ ریاست کا منصب یہ ہے کہ لوگوں کی بھلائی کی خاطر اچھی حکومت قائم ہو اور اچھے کام کرے۔ چرچ اور ریاست کو لازمی طور پر الگ ہونا چاہیے اور ایک دوسرے کے معاملات میں مداخلت نہیں کرنی چاہیے۔ یہ دورِ دانش کا عہد (Age of Reason) کہلاتا ہے۔ لاک کو یقین تھا کہ انسانی تاریخ میں لوگ پہلی دفعہ اپنے فکر و عمل میں آزاد ہوں گے اس لئے پہلی دفعہ بہتر طور پر سچ کی پہچان کر سکیں گے۔

اس سازگار فضا نے روشن خیالی کے راستے متعین کر دیے اور ایک جدید سیکولر اور روادار ریاست کے آئیڈیل میں جان پڑ گئی۔ روشن خیالی (enlightenment) تحریک کے جرمن اور فرانسیسی فلسفی بھی عبودیت کے سلسلے میں ریشنل مذہب کی حمایت کرنے لگے اور قدیم دیومالائی اور

الہامی مذہب کو بوسیدہ اور ناکارہ قرار دیا۔ چونکہ اب سچ کا واحد معیار ریزن (عقل) کے سوا کچھ اور نہیں تھا۔ پرانے مذاہب جن کی بنیاد وحی اور الہام پر تھی انہیں بچگانہ کہہ کر رد کر دیا گیا۔ مذہب ریشنل ہونا چاہیے۔ برطانوی مذہبی مفکر Methew Tindel (1655-1733) اور آئرش رومن کیتھولک جان ٹولینڈ John Toland (1670-1722) نے کہا "سچ پانے کے لئے ہمارا واحد اور فطری ذریعہ ریزن (عقل) ہے۔ عیسائیت کو معجزوں، فوق الفطرت اور پراسرار چیزوں سے پاک ہونا چاہیے۔ وحی کی ضرورت ہی نہیں کہ ہر انسان کے لئے ممکن ہے کہ وہ اپنی استدلالی قوت کے ذریعے سچائی کو پالے۔ جیسا کہ نیوٹن نے کہا تھا کہ کائنات کے ڈیزائن پر غور کرنے سے کائنات کے خالق کا پتہ ملتا ہے۔ کائنات کی تشکیل اس کے ہونے کی ناقابلِ تردید شہادت ہے۔ جرمن مؤرخ ہرمن سیموئل رائمرس Hermann Samual Raimarus (1694-1768) نے کہا کہ حضرت عیسیٰ نے خدائی کا دعویٰ کبھی نہیں کیا اور یہ کہ ان کے مقاصد سیاسی تھے۔ ایک سادہ عملی اور غیر معمولی مذہب کے بانی حیثیت سے ان کا احترام کرنا چاہیے۔

مائیتھوس کی توجیہہ لوگوس کے حوالوں سے ہو رہی تھی جو ایک بالکل نیا رجحان تھا اور جسے بالآخر ناکام ہونا تھا کیونکہ اسی وقت جب کہ یہ دینی عالم، فلسفی اور مؤرخ ریزن (عقل) کی برتری کا اعلان کر رہے تھے جرمن ریشنلسٹ کانٹ Kant (1724-1804) نے روشن خیالی کی پوری فکر پر وار کیا۔ ایک طرف تو اس نے جدید دور کے آغاز کی آزادی کا ایک اور اعلان کیا کہ لوگوں میں یہ جرأت ہونی چاہیے کہ وہ ٹیچروں، کلیساؤں اور حکمرانوں کی محتاجی کا بوجھ اتار پھینکیں اور معلوم کریں کہ سچ کیا ہے؟ اس نے لکھا کہ روشن خیالی انسان کے لئے اس ذہنی غلامی سے نجات کا ذریعہ ہے جو اس نے اپنے اوپر خود مسلط کر رکھی ہے اور جس نے اسے ذہنی طور پر مفلوج کر دیا ہے کہ وہ اپنی سمجھ سے کام لینے کی بجائے اوروں کی ہدایات پر عمل کرے۔ دوسری طرف اس نے اپنی کتاب Critigue of Pure Reason میں بحث کی ہے کہ جو نظم اور ترتیب ہم فطرت میں دیکھتے ہیں اس کا خارجی حقائق کے مطابق ہونا ممکن نہیں۔ جو نظم ہم نے فطرت میں پایا ہے وہ ہمارے ذہن کی اختراع ہے۔ نیوٹن کے نام نہاد سائنسی اصول بھی غالباً ہمیں کائنات سے زیادہ انسانی نفسیات کی خبر دیتے ہیں۔ جب ذہن کو حسیات کے ذریعے اپنے سے باہر موجود مادی دنیا کے متعلق معلومات حاصل ہوتی ہیں تو اپنے داخلی نظام کے مطابق ان

حقائق کو نئی ترتیب میں لانا ہوتا ہے تاکہ ان کے معنی متعین ہو سکیں۔ کانٹ کو پورا یقین تھا کہ انسانی ذہن میں یہ صلاحیت ہے کہ وہ اپنے لئے زندہ اور متحرک ریشنل وژن وضع کر سکے مگر یہ ظاہر کرتے ہوئے کہ انسانوں کے لئے یہ ممکن نہیں کہ وہ اپنی نفسیات سے بچ سکیں۔ اس نے یہ بھی واضح کر دیا کہ قطعی سچ Absolute Truth نام کی کسی چیز کا کوئی وجود نہیں ہے۔ ہمارے تمام آئیڈیا بنیادی طور پر داخلی اور توجیہی ہوتے ہیں۔ ڈیکارٹ نے انسانی ذہن کو ایک مردہ کائنات کے ویران اور تنہا مسکن کے طور پر دیکھا مگر کانٹ نے تو انسانیت اور دنیا کا باہمی رشتہ ہی بالکل ختم کر دیا اور ہمیں ہمارے سروں کے اندر بند کر دیا۔ ایک طرف اگر اس نے بنی نوع انسان کو ذہنی غلامی سے آزاد کیا تو دوسری طرف اس نے انسانی ذہن کو ایک نئی جیل میں قید کر دیا۔ اکثر یہی ہوا کہ جدیدیت نے اگر ایک ہاتھ سے کچھ دیا تو دوسرے ہاتھ سے واپس لے لیا۔ ریزن (عقل) آزادی اور آگہی کا وسیلہ تھی مگر اس کی وجہ سے لوگ اس دنیا سے دور بھی ہو سکتے تھے جسے وہ کنٹرول کرنا سیکھ رہے تھے۔

اچھا اگر قطعی (Absolute) سچائی کا وجود کہیں نہیں ہے تو پھر خدا کا کیا ہے؟ کانٹ کو یقین تھا کہ خدا کا وجود ثابت کرنا ممکن نہیں ہے کیونکہ وہ حسیات (Senses) کی پہنچ سے باہر ہے اس لئے انسانی ذہن کا بھی وہاں گزر نہیں۔ بنیادی اور آخری حقیقت (Ultimate) کا سامنا کرتے ہوئے، تنہا ریزن کے پاس کہنے کے لئے کچھ نہیں۔ کانٹ نے یہ مہربانی کی کہ اتنا کہہ گیا کہ اگر خدا کے ہونے کا کوئی ثبوت نہیں تو خدا کے نہ ہونے کا بھی کوئی ثبوت نہیں۔ کانٹ سچا اور مخلص شخص تھا اور وہ اپنے کسی آئیڈیا کو مذہب کے خلاف نہیں سمجھتا تھا بلکہ اس کا کہنا تھا کہ اس کے خیالات مذہب کو ریزن (عقل) کا محتاج نہیں رہنے دیں گے۔ اس نے اپنی تصنیف (Critique of Practical Reason) کے آخر میں لکھا ہے کہ اسے ان اخلاقی قدروں پر پورا یقین ہے جو ہر انسان کے دل پر نقش ہیں اور جو جنت کی شان و شوکت کی طرح اس کے دل کو حیرانی اور احترام سے معمور کرتی ہیں مگر خدا کے ہونے کے متعلق جو ریشنل دلائل اس نے دیئے وہ خاصے مشکوک تھے کہ خدا اور حیات بعد الموت کے شعور کے بغیر لوگ اخلاقی ضابطہ حیات کی پابندی کیوں کریں۔ یہ کوئی ایسی دلیل یا ثبوت نہیں جو مطمئن کر سکے۔ کانٹ کا خدا، لڑائی کے بعد یاد آنے والا داؤ ہے اور اس کے ہونے نہ ہونے کا انحصار انسانی حالات پر ہے۔ موروثی ایمان نہ

ہوتو اسے ماننا ایک ریشنلسٹ کے لئے ممکن نہیں۔ کانٹ کو ریزن پر یقین تھا اور ایک Deist ہونے کے ناطے وہ خدا کے وجود کا اقرار تو کرتا تھا مگر وحی کو نہیں مانتا تھا۔ اس کے لئے ان روائتی علامتوں کی کوئی اہمیت نہیں تھی جن کی بنیاد پر ماضی میں لوگ ریزن (عقل) سے بے نیاز ہوکر خدا کو مانتے تھے۔ کانٹ خدائی قانون کے تصور کے سخت خلاف تھا جو اس کے خیال میں انسانی آزادی اور خودمختاری کا وحشیانہ انکار تھا۔ اسے مذہبی رسوم، عبادات اور تصوف سبھی بے معنی نظر آتے تھے مگر کسی مسلک کے بغیر خدا اور مذہب کا تصور کمزور، ناپائیدار اور بے معنی لگتا ہے۔

مغرب میں ریزن (عقل) کو سچ کا واحد معیار قرار دینے کا ایک اور مذہبی رجحان پیدا ہوا جو قطعی طور پر غیر ریشنل اور بے معنی تھا۔ سولھویں اور سترھویں صدی کے چڑیلوں کو پکڑنے کے پاگل پن نے نہ صرف کیتھولک اور پروٹسٹنٹ ملکوں میں سے اکثر کو اپنی لپیٹ میں لے لیا بلکہ امریکی نو آبادیوں میں بھی اس کے اثرات ظاہر ہوئے۔ جس سے یہ ثابت ہوا کہ سائنسی ریشنلزم ہمیشہ بلاؤں کو دفع نہیں کرتا۔ تصوف اور مائیتھالوجی نے دنیا کا لاشعور کے ساتھ برتنا سکھا دیا تھا۔ شاید یہ محض اتفاق نہ ہو کہ جب مذہب نے اس قسم کی روحانیت سے ہاتھ کھینچ لیا تو لاشعور بے مہار ہوگیا۔ چڑیلوں کی پکڑ دھکڑ ایک اجتماعی بے ہودگی تھی جس میں عیسائی دنیا ملوث ہوگئی۔ ان عورتوں کے متعلق یہ خیال تھا کہ وہ عبادت کی توہین کے طور پر خدا کی بجائے شیطان کو پوجتی ہیں۔ یہ گمراہی روائتی مذہب کے خلاف وسیع بغاوت کی نمائندہ سمجھی جاسکتی ہے۔ خدا دور اور تنہا نظر آنے لگا بلکہ بعض کا خیال تھا کہ عفریت کی شکل اختیار کررہا ہے۔ تحت الشعور میں جاگزیں خوف اور خواہشیں، شیطان کی تخیلاتی شخصیت پر عکس ریز تھیں۔ شیطان کو انسانیت کا جناتی ایڈیشن سمجھا جاتا تھا چڑیلوں کے خوف نے خود جل کر بھسم ہونے سے پہلے ہزاروں مردوں اور عورتوں کو اپنی بھینٹ چڑھادیا۔ نئے سائنسی ریشنلزم نے انسانی ذہن کی ان گہرائیوں کا خیال نہیں کیا تھا اس لئے وہ اس جنون اور ہسٹریا کو روکنے میں بے بس تھا جو وبا کی طرح پھوٹ پڑا تھا۔ ایک بہت ہی بڑا خوفناک تخریبی اور عقل دشمن رجحان انسانوں کے لئے نئے تجربے کا حصہ بن گیا تھا۔

بحر اوقیانوس کے دونوں طرف مغرب کے لوگ نازک صورتحال سے دوچار تھے ریفارمیشن نے یورپ کو دو شدید مخالف کیمپوں میں بانٹ دیا۔ انگلستان میں کیتھولک اور پروٹسٹنٹ ایک دوسرے کے خون کے پیاسے تھے۔ فرانس میں ان دونوں کی کشیدگی خانہ جنگی (1562-63) کی

صورت اختیار کر گئی۔1572میں پروٹسٹنٹوں کا ملک گیر قتل عام ہوا۔تیس برس(48-1618) کی جنگ یورپ کو تباہ برباد کر گئی۔ایک قوم کی جگہ دوسری قوم لیتی رہی۔ طاقت کی جنگ جاری رہی جس میں مذہبی رنگ بھی شامل تھا اور یورپ کے دوبارہ متحد ہونے کی اُمید خاک میں مل گئی تھی۔ سیاسی بے چینی بھی موجود تھی۔1642کے اندر انگلستان میں بھی خانہ جنگی شروع ہوگئی جس کے نتیجے میں چارلس اول(1649) کوموت کی سزا دی گئی اوراور کرامول کی سربراہی میں جمہوریت کا قیام عمل میں آیا۔1660میں جب بادشاہت بحال کی گئی تو پارلیمنٹ نے اس کے اختیارات کم کر دیئے۔ بڑی جاں سوزی اور جان نثاری کے ساتھ مغرب میں نئے جمہوری ادارے قائم ہونے لگے۔1789کے فرانسیسی انقلاب نے مزید تباہی اور انتشار عام کر دیا جس کی جگہ فوجی آمریت اور خوف دہشت کی حکمرانی نے لے لی۔ یہاں تک کہ نپولین نے صورت حال کو سنبھالا اور نظم وضبط قائم کیا۔ جدید دنیا کے لئے انقلاب فرانس کے ترکے کی علامت رومن دیوتا جینس تھا جس کے دو چہرے تھے۔انقلاب فرانس نے آزاد خیالی،مساوات،رواداری اور آزادی کے ہر آئیڈیل کو فروغ دیا تھا مگر ہلاکت خیز ریاستی تشدد کی مکروہ یادیں بھی اپنے پیچھے چھوڑی تھیں۔امریکی نوآبادیوں میں بھی امریکہ کے مشرقی ساحلی پر لاشوں کے ڈھیر لگ گئے جب برطانیہ اور فرانس اپنے شاہی مقبوضات کے لئے سات سال(63-1756) تک لڑتے رہے تو اس کے نتیجے میں جنگ آزادی(83-1775) براہ راست شروع ہوگئی اور نئی دنیا کی پہلی سیکولر جمہوریت قائم ہوئی۔ مغرب میں انصاف اور رواداری پر مبنی ایک سماجی نظام جنم لے رہا تھا۔مگر اس کے لئے مغرب کو تشدد کے دوسو سال دیکھنے پڑے تھے۔

کرب کے عالم میں لوگوں نے مذہب سے رجوع کیا مگر بعض کو احساس ہوا کہ بدلے ہوئے حالات میں مذہب کی پرانی شکل کام نہیں آئے گی۔ یہودیت میں شبیتائی بغاوت کی طرح Antitnomian(وحدت پر یقین رکھنا) دماغ اور مادہ کی تحریک نے ماضی سے رشتہ توڑنے کی کوشش کی اور بے ربطی کے عالم میں کسی نئی فکر تک پہنچنے کی کوشش کی۔سترھویں صدی کے انگلستان میں خانہ جنگی کے بعد Lawrence Clarkson اور Jacob Bauthumely نے دہریت کا پرچار شروع کیا اور کہا کہ الگ تھلگ بہت دور اور بے مہر خدا کی پرستش بت پرستی ہے، Bauthumely نے اپنی تصنیف "The Light and Dark Sides of God" میں کہا

'عیسٰی کے علاوہ بھی خدا ہر شخص میں جلوہ گر ہے۔ ہر چیز میں موجود ہے یہاں تک کہ گناہ میں بھی'۔'The Single Eye' میں Clarkson نے لکھا ہے کہ گناہ انسان کا وہم ہے اور بدی معبود کا الہام ہے۔ نئے انگلستان کی امریکی نوآبادیوں میں وہ لوگ بھی تھے جو خدا کے ہونے کا اقرار اور وحی کا انکار کرتے تھے(John Cotton (1585-1652 کا کہنا تھا کہ نیکی کے کام بے معنی ہیں اور بھلائی بے کار ہے۔ خدا ہمیں انسانوں کے بنائے ہوئے اُصولوں پر چلنے کے بغیر بھی معاف کرسکتا ہے۔ اس کی پیروکار (Anne Hutchinson (1590-1643 دعویٰ کرتی تھی کہ اس پر خدا کی طرف سے وحی اتری ہے۔ اب اسے انجیل پڑھنے یا نیک کام کرنے کی ضرورت نہیں رہی۔ یہ نئے نئے باغی احتجاج کررہے تھے کہ پرانی پابندیاں ایک نئی دنیا میں کسی کام کی نہیں جو بنیادی سطح پر تغیر پذیر ہو۔ زندگی کے دوسرے شعبوں میں مسلسل ایجادات کی وجہ سے یہ ناگزیر تھا کہ لوگ مذہبی اور اخلاقی میدانوں میں بھی نئے خیالات آزادی اور جدتوں پر اصرار کرتے۔

اور لوگ بھی تھے جنہوں نے نئے زمانے کے آئیڈیل مذہبی انداز میں بیان کئے۔ جارج فاکس نے جس روشن خیالی کی تلقین کی وہ کانٹ کی وضاحت سے مختلف نہیں تھی۔ اس نے کہا کہ خدا کے متلاشی اپنے دلوں میں اسے تلاش کریں۔ فاکس نے انہیں سکھایا کہ اوروں کی ہدایات پر عمل کرنے کی بجائے اپنی سمجھ بوجھ سے کام لینا چاہیے۔ سائنس کے اس دور میں مذہب کو بھی تجربے سے پرکھا جانا چاہیے اور اس کی صداقت کی تصدیق کسی آمرانہ ادارے سے نہیں بلکہ انسانی تجربے سے ہونی چاہیے اس کے پیروؤں نے اس نئے جمہوری آئیڈیل کی پرزور تائید کی کہ تمام انسان برابر ہیں۔ لوگوں کو کسی کے سامنے جھکنا نہیں چاہیے۔ بے پڑھے لکھوں کو ڈگری یافتہ ملاؤں سے گھبرانا نہیں چاہیے بلکہ کھل کر اپنے نقطۂ نظر کا اظہار کرنا چاہیے۔ اسی طرح John Wesley (1703-92) نے کوشش کی کہ روحانیت کو سائنسی طریقوں کے ذریعے سمجھا جائے اس کے پیروکاروں نے عبادت، روزہ، انجیل کی تلاوت اور انسان دوستی کی پابندی سختی کے ساتھ کی۔ کانٹ کی طرح دہزلی نے بھی ریزن سے مذہب کے چھٹکارے کا خیر مقدم کیا اور اعلان کیا کہ مذہب دماغ میں جاگزیں محض ایک ڈاکٹرین نہیں ہے بلکہ دل کی روشنی ہے۔ یہ بڑی بات ہے کہ عیسائیت کے بارے میں ریشنل اور تاریخی شہادتوں کا سلسلہ ان دنوں رک گیا ہے اس کی وجہ

سے لوگ آزاد فضا میں سانس لے سکیں گے اور اس پر مجبور ہوں گے کہ اپنے اندر جھانکیں اور اپنے دل کی روشنی کا نظارہ کریں۔

عیسائیت میں ٹوٹ پھوٹ کا عمل شروع ہو چکا تھا۔ بعض عیسائیوں نے تو تصوف چھوڑ کر مذہب کو ریشنل رنگ دیا جبکہ وہ بھی تھے کہ جنہوں نے عقل سے بالکل ہی چھٹکارا پالیا۔ امریکی نو آبادیوں میں یہ رجحان خصوصی طور پر موجود تھا۔ اس افسوناک ٹوٹ پھوٹ کا ایک نتیجہ یہ نکلا کہ انیسویں صدی کے آخر میں امریکہ کے اندر بنیاد پرستی نے سر اُٹھایا۔ ابتدائی برسوں میں نئے سخت گیر انگلستانیوں کے سوا نو آبادیوں کے اکثر لوگ مذہب سے بیگانہ رہے۔ سترھویں صدی کے آخر میں تو لگتا تھا گویا کہ تمام آبادیوں سیکولر ہوگئی ہیں مگر اٹھارویں صدی کے آغاز میں پروٹسٹنٹ فرقوں اور گروہوں میں پھر سے جان پڑ گئی اور نئی دنیا میں عیسائیوں کی زندگی پرانی دنیا سے زیادہ فارمل ہوگئی۔ کویکرز (Quakers) بیپٹسٹ (Baptists) اور پریسبائٹیرن (Presbyterians) جیسے اختلافی فرقے جنہوں نے چرچ کی بالادستی رد کر دی تھی اور اپنے راستی پر چلنے کا اصرار کیا تھا انہوں نے ہی فلاڈیلفیا میں اسمبلیاں قائم کر دیں جو مقامی گروہوں اور اداروں کی نگرانی کرتیں جہاں سے پادریوں کو ہدایات دی جاتیں تقریروں کی کاٹ چھاٹ ہوتی اور بدعت کو نکال باہر کیا جاتا۔ تینوں فرقوں نے خوب ترقی کی اور ان کے پیروؤں کی تعداد میں ڈرامائی طور پر اضافہ ہوا۔ انہی دنوں میری لینڈ کے مقام پر چرچ آف انگلینڈ قائم ہوا اور نیو یارک، بوسٹن اور چارلیسٹن (Charleston) میں نئے خوبصورت گرجے تعمیر ہوئے۔

ایک طرف تو اور زیادہ ظلم وضبط کی خواہش تھی جبکہ دوسری طرف اس ریشنل کنٹرول کے خلاف گراس روٹ ردعمل تھا۔ قدیم مذہب میں ریزن (عقل) اور مائیتھالوجی ساتھ ساتھ تھے۔ ایک کے بغیر دوسرا نامکمل تھا۔ مذہبی معاملات میں بھی یہی صورت حال تھی۔ جہاں ریزن (عقل) اضافی مگر اہم رول ادا کرتی تھی مگر بعض نئی پروٹیسٹنٹ تحریکوں میں عقل کو ایک طرف بلکہ بالکل نظر انداز کرنے کی نئی ذہنیت (جس کا سرا لوتھر سے ملتا تھا) پیدا ہوگئی جو ایک نئی نامعقولیت تھی۔ کویکرز کو اس لئے یہ نام دیا گیا تھا کہ ابتدائی ایام میں وہ اپنا مذہبی جذبہ اس شدت سے ظاہر کرتے کہ کانپنے لگتے۔ کبھی چیختے چلاتے اور واویلا کرتے۔ کیلوین کے پیرو جنہوں نے چرچ انگلینڈ کی پاپائیت کو رد کرتے ہوئے اپنی تحریک کا آغاز کیا تھا وہ بھی ایک ہنگامہ خیز روحانیت کے علمبردار بن

گئے۔عیسائیت میں یہ "نیا جنم لینے والے" اکثر ہیجان اور صدمہ میں مبتلا ہوتے۔کامیابی سے پہلے جرم کی اذیت، خوف اور مفلوج کر دینے والا شک ان کا معمول ہوتا بعد میں وہ خدا کی آغوش میں چلے جاتے۔عقیدے میں تبدیلی نے ان میں نیا جوش پیدا کر دیا، انہیں اس قابل بنا دیا کہ جدیدیت کے آغاز میں انہوں نے شاندار کارنامے سرانجام دیئے۔وہ اچھے سرمایہ دار اور اکثر اچھے سائنسدان بھی تھے مگر کبھی کبھی وہ اپنی پہلی حالت میں واپس آ جاتے ان پر گہری مایوسی کا غلبہ ہوتا۔چند لوگ ایسے بھی تھے جنہوں نے مایوسی کی حالت میں گھبرا کو خودکشی کر لی۔

پرانے مذہب میں یہ ہسٹریائی کیفیت نہیں تھی۔اس کی رسوم اور مسالک لوگوں کو حقیقت سے ہم آہنگ کرنے کے لئے تھیں۔رندی بدمستی اور کیف وسرور میں کھو جانا عام رجحان نہیں تھا بلکہ بہت کم لوگوں تک محدود تھا۔تصوف عوام کے لئے نہیں تھا۔شاگرد کا رابطہ براہِ راست اپنے استاد یا مرشد سے ہوتا تھا جس کے دوران مرشد اس بات کا خیال رکھتا تھا کہ اس کا مرید بیمار ذہنی کیفیت کا شکار نہ ہو جائے۔لاشعور میں اترنے کے لئے زبردست مہارت ذہانت اور ڈسپلن، لازمی خوبیاں تھیں۔جب مرشد کا حل میسر نہ ہوتو افسوسناک نتائج کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ازمنہ وسطیٰ کے عیسائی درویشوں کا مریضانہ اور مجنونانہ رویہ اکثر ان کی ناکافی تربیت کا ثبوت تھا۔ٹریسا آف اویلا اور جان آف کراس کی اصلاحات کا مقصد ہی ایسی بدعنوانیوں کو روکنا تھا۔جب اجتماعی طور پر صوفیانہ سفر اختیار کیا جاتا تو وہ اپنی سطح سے گر کر ہجوم کے ہسٹریا شبا تائیوں کے انتشار اور بعض سخت گیر لوگوں کے ذہنی عدم توازن میں بدل جاتا تھا۔

اٹھارویں صدی میں جذباتی عدم توازن امریکہ کی مذہبی زندگی کا حصہ بن گیا۔پہلی دفعہ وہ خصوصی طور پر عظیم بیداری(Great Awakening) کے دوران ظاہر ہوا جو 1734 میں نارتھمپٹن میں شروع ہوا اور جس کا حال، کیلوین کے نہایت قابل پیروپادری Jonathan Edwards (1703-58) نے لکھا۔وہ کہتا ہے کہ Awakening سے پہلے نارتھمپٹن والے کچھ ایسے مذہبی نہیں تھے مگر 1734 میں دو نوجوان اچانک مرگئے۔اس صدمے سے (جس کی پشت پر ایڈورڈز کی جذباتی تقریر بھی تھی) پورا شہر مذہبی جنون میں مبتلا ہو گیا۔حتیٰ کہ یہ جنون وباء کی طرح میساچوٹس اور لانگ آئی لینڈ تک پھیل گیا۔لوگوں نے کام کاج چھوڑ دیا اور تمام دن انجیل پڑھتے رہتے۔کبھی وہ آسمان کی بلندیوں کو چھوتے کبھی زمین کی گہرائیوں میں گرتے ان کے مزاج

کا کوئی ٹھکانہ نہیں تھا۔کبھی احساس جرم سے ان کا دل ڈوب جاتا کبھی اپنے جرم کو ناقابل معافی سمجھ کر وہ پھوٹ پھوٹ کر روتے کبھی ان کے چہروں پر بیک وقت آنسوؤں اور قہقہوں کے طوفان کا گزر ہوتا۔تجدید اپنی آگ میں جل کر بھسم ہونے والی تھی کہ برطانوی مبلغ جارج وائٹ فیلڈ (70-1714) نے نوآبادیوں کا دورہ کیا اور نئی آگ لگادی۔ اس کے وعظ میں لوگ روتے، چیختے، چلاتے۔کلیسا ان لوگوں کی مسرت بھری چیخوں سے گونج اٹھتے جن کا خیال تھا کہ وہ نجات پا گئے ہیں جبکہ ان لوگوں کی آہوں سے کلیساؤں کی فضا افسردہ ہوتی جو اپنے آپ کو ناقابل معافی اور راندہءِ درگاہ سمجھتے تھے۔صرف بے پڑھے اور سادہ دل لوگ ہی وائٹ فیلڈ کے دام میں نہیں آئے بلکہ ہاورڈ یونیورسٹی اور ییل Yale یونیورسٹی میں بھی اس کا شاندار استقبال ہوا۔1740 میں اپنا دورہ ختم کرنے سے پہلے اس نے بوسٹن میں30,000 کے مجمع سے خطاب کیا۔

ایڈورڈز نے اپنی تحریر میں اس قسم کے مذہبی جذبات میں پوشیدہ خطرات کی نشان دہی کی۔ جب نارتھمپٹن میں تجدید کا دور ختم ہوا تو اس سے ایک شخص پر اتنی مایوسی طاری ہوئی کہ اس نے خودکشی کر لی۔اسے پورا یقین تھا کہ پرکیف زندگی کا یہ دور ختم ہونے کا مطلب ہی یہ ہے کہ اسے جہنم کی آگ میں جلنا ہے۔ دوسرے شہروں میں بھی بڑی تعداد میں لوگ یہی کرنے کے لئے اُکساتے۔ان پرزور دیتے گویا کہ کسی نے ان سے کہا ہے کہ "اپنے گلے کاٹ دو" یہ اچھا موقعہ ہے۔ دو شخص عجیب وغریب خوش فہمیوں کی وجہ سے پاگل ہوگئے۔ایڈورڈز کا کہنا تھا کہ بیداری سے پہلے لوگ زیادہ مطمئن اور پُرسکون تھے۔اس کی معذرت سے اندازہ ہوتا ہے کہ مذہب کو محض دل کا معاملہ سمجھنا کتنا تباہ کن ہے۔اگر مذہب کو ریشنل انداز سے نہ دیکھا جائے اور قدیم روحانیت کی طرف سے عائد پابندیوں کو خاطر میں نہ لایا جائے تو لوگ ہر طرح کے مکروریا کا نشانہ بنتے ہیں۔ایک مسلک کی رسوم بڑی توجہ اور احتیاط سے اس لئے تشکیل دی جاتی ہیں تاکہ وہ لوگوں کو ایک شدید روحانی آزمائش میں سے بخیروخوبی نکال کر لے جائے۔لوریائی کبالہ کی رسموں سے بھی یہ بات واضح تھی کہ صوفی اپنے غم وغصے اور محرومی کا اظہار تو کرسکتا ہے مگر اس طرح کہ وہ اس عمل سے سرخرو اور خوش وخرم نکلے۔اسی طرح امام حسینؓ کی یاد میں نکلنے والے جلوس لوگوں کو اپنے شدید دکھ اور مایوسیوں کے اظہار کا موقعہ دیتے ہیں مگر یہ نہیں ہوتا کہ لوگ اپنے حواس کھو بیٹھیں اور دولتمندوں اور طاقتوروں پر اپنا غصہ نکالیں۔مگر نارتھمپٹن میں سرے سے کوئی ایسا مسلک تھا ہی

نہیں جو لوگوں کی رہنمائی کرتا۔ بدنظمی اور افراتفری کا عالم تھا جس نے چاہا وہ کیا یہاں تک کہ لوگوں کے جذبات اپنی انتہا کو پہنچ گئے اور بعضوں کے لئے تو مہلک ثابت ہوئے۔

کچھ بھی ہوا ایڈورڈز کو یقین تھا کہ بیداری خدائی عمل ہے۔ جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ امریکہ میں تاریخ کے ایک نئے دور کا آغاز ہوا ہے جو باقی دنیا میں بھی پھیل جائے گا اور تجدید و ترمیم کی انہی کوششوں سے عیسائی زمین پر خدا کی حکومت قائم کرلیں گے جو خدا کے انصاف کی عکاس ہوگی۔ تحریک بیداری میں سیاسی طور پر کوئی انقلابی عنصر نہیں تھا۔ ایڈورڈز اور وائیٹ فیلڈ نے کسی سے یہ نہیں کہا کہ وہ برطانوی حکومت کے خلاف اٹھ کھڑے ہوں، جمہوری حکومت کے لئے مہم چلائیں یا دولت کی مساویانہ تقسیم کا مطالبہ کریں مگر اس حیات آفریں تجربہ اور حالات نے امریکی انقلاب کا راستہ ہموار کردیا۔ اس تجربے نے ان کئی امریکیوں کے دلوں میں آزادی کی گہری یادیں چھوڑیں جو انقلابی لیڈروں کے آئیڈیل بیان نہیں کرسکتے تھے۔ لفظ آزادی زیادہ تر روزمرہ زندگی کے دکھ درد سے رہائی کے معنوں میں لیا جاتا تھا۔ وائٹ فیلڈ اور ایڈورڈز اپنے سامعین کی حوصلہ افزائی کرتے ہوئے انہیں کہتے تھے کہ وہ اپنے مذہب کو اشرافیہ کے مذہب سے بہتر سمجھیں ان کے مذہب نے کوئی نیا جنم نہیں لیا تھا اور ان کی ریشنل بصیرت مذہبی جنون کو رد کرتی تھی۔ ان میں سے ایسے اکثر لوگوں کا انسٹیٹیوشن کی قوت سے اعتبار اٹھ گیا تھا جنہیں پادریوں کے مبالغہ آمیز دعوے یاد تھے۔ یہی حال کیلوین کے اکثر مقلدوں کا تھا۔ تحریک بیداری امریکہ میں پہلی عوامی تحریک تھی جس کے ذریعے لوگوں کو موقعہ ملا کہ وہ دنیا ہلا دینے والے واقعات میں حصہ لیں جو آخر کار تاریخ کا رخ موڑ دیں گے۔

مگر تحریک بیداری سے بھی نو آبادیوں کے کیلوین فرقوں میں اختلافات پیدا ہوگئے۔ وہ لوگ جو Old Lights کے لقب سے جانے جاتے تھے جیسے بوسٹن کے پادری Jonathan Mayhew اور Charles Chauncy ان دونوں کا خیال تھا کہ عیسائیت ایک ریشنل اور روشن خیال مذہب ہونا چاہیے۔ وہ تجدید کے ہسٹریا اور فکر و دانش کے خلاف یاوہ گوئی سے سخت نالاں تھے۔ Old Lights کا تعلق سوسائٹی کے کھاتے پیتے گھرانوں سے تھا جبکہ نچلے طبقوں نے New Lights کے کلیساؤں کا رخ کیا۔ 1740 میں دوسو سے زیادہ تنظیموں نے مختلف فرقوں سے کٹ کر الگ اپنے چرچ قائم کئے۔ 1741 میں Presbyterian New Lights نے امریکہ کو پہلی

صف میں پایا۔اسی زمانے میں پوپ کا دن (5 نومبر) سالانہ چھٹی کا دن مقرر ہوا۔اس دن مشتعل ہجوم نے پوپ کے پتلوں کو آگ کی نذر کیا۔وہ زمانہ دہشت اور تشدد کا زمانہ تھا۔امریکی اب بھی منتظر تھے کہ قدیم مائیتھالوجی ان کی زندگی کی کوئی معنی دے اور انہیں سمجھائے کہ یہ عذاب ان پر کیوں نازل ہوئے۔مگر لگتا ہے کہ وہ بھی آنے والے دنوں کی آہٹ سن رہے تھے۔انہیں بھی یقین ہو چلا تھا کہ نئی تبدیلیاں ان کے دروازے پر دستک رے رہی ہیں۔جب انہوں نے ایسا محسوس کیا تو فرانس اور رومن کیتھولک چرچ کو شیطانی ادارے سمجھنے لگے جو نیک اور راست باز امریکہ کے دشمن تھے۔یہ خیالات جونہی ان کے ذہنوں میں جڑ پکڑتے رہے انہیں محسوس ہوا کہ نجات کا کوئی راستہ نہیں۔معافی بھی نہیں ہوگی نہ آزادی ملے گی اور ہزار سالہ امن کا تو سوال ہی نہیں پیدا ہوتا جب تک کہ پاپائیت سے چھٹکارا نہ حاصل کرلیا جائے۔اس نئی دنیا کو وجود میں لانے کے لئے آگ اور خون سے کھیلنا ہوگا۔امریکیوں کو نئی تبدیلیوں کا احساس تو تھا مگر ابھی تک وہ پرانی دنیا سے جڑے ہوئے تھے سات سالہ جنگ مے منفی اثرات ظاہر ہونے لگے برطانوی حکومت نے امریکی نوآبادیوں پر نئے ٹیکس عائد کردیئے جس سے بغاوت کی چنگاری بھڑک اٹھی اور پھیل کر امریکہ کی تحریک آزادی بن گئی۔1771 میں اس طویل جدوجہد کے دوران امریکیوں نے ماضی سے اپنا رشتہ توڑ لیا اور پادریوں کی تربیت کے لئے اپنے کالج قائم کر لئے جن میں پرنسٹن کے اندر Nassan Hall قابل ذکر ہے۔بعد میں تعلقات کچھ بحال ہوئے تو سہی مگر اس عرصے میں نیولائٹس نے ایک ادارے کی حیثیت سے اپنی ایک الگ شناخت بنالی۔جس نے انیسویں صدی کے آخر میں ابھرنے والی بنیاد پرست تحریک میں زبردست اہمیت اختیار کرلی۔تحریک بیداری نے سب کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔Old Lights موجودہ حالات کو دنیا کے خاتمے سے تعبیر کرتے تھے۔Jonathon Mayhew کو یقین تھا کہ بڑے بڑے انقلاب رونما ہونے والے ہیں۔نومبر 1755 میں زلزلوں کے ایک سلسلے نے دنیا کے کئی حصوں کو بیک وقت اپنی لپیٹ میں لے لیا تو اسے دنیا کو مذہبی اور سیاسی حالت میں اہم تبدیلیوں کے امکانات نظر آئے۔Mayhew نے پروٹیسٹنٹ انگلستان اور کیتھولک فرانس کے درمیان، امریکہ اور کینیڈا میں اپنی نوآبادیوں کے لئے ہونے والی سات سالہ جنگ کو جرم وسزا کے تصور سے منسلک پایا۔اس نے کہا ''اس طرح عیسیٰ کا دنیا میں دوبارہ نزول اور پوپ کا زوال اور جلدی ہوگا۔پوپ حضرت عیسیٰ کے

خلاف ہے اور آخرت کا جھوٹا دعوے دار ہے۔Mayhew نے کہا New Lights نے بھی بدی کے خلاف اس سات سالہ جنگ میں ماضی سے رشتہ توڑنا شروع کر دیا۔اس عمل میں ان کی مذہبی منافرت نے اہم کردار ادا کیا۔

انقلاب کے رہنماؤں جارج واشنگٹن، جون اور سموئیل ایڈمز، تھامس جیفرسن اور بنجمن فرینکلن کی نظر میں انقلاب ایک سیکولر واقعہ تھا۔ وہ سب ریشنلزم اور روشن خیالی پر یقین رکھتے تھے اور جان لاک کے جدید خیالات، سکاٹ لینڈ کے کامن سینس فلسفے اور انقلابی Whig آئیڈیالوجی سے متاثر تھے۔ وہ Diest ہونے کی حیثیت سے خدا کے وجود کے قائل تھے مگر وحی کو نہیں مانتے تھے۔اس لئے پرانے مسیحیوں کے ساتھ حضرت عیسی اور وحی سے متعلق ان کے خیالات سے متفق نہیں تھے۔انہوں نے بڑی جرأت اور ہوشمندی کے ساتھ ایک سامراجی طاقت کے خلاف جدوجہد کی تھی۔ انقلاب کی طرف قدم بڑھاتے ہوئے ان کا رویہ عملیت پسندانہ اورحقیقت پسندانہ تھا انہوں نے یہ دعوئ نہیں کیا کہ وہ حضرت عیسیٰ کے دشمنوں کے خلاف کائناتی سطح پر کوئی جنگ لڑ رہے ہیں۔ جب برطانیہ سے تعلق توڑنا لازمی ہو گیا تو بھی انہوں نے اپنے آپ کو جغرافیائی مقاصد تک محدود رکھا۔''متحدہ کالونیاں آزاد اور خودمختار ہیں۔اور یہ ان کا حق ہے کہ آزاد و خودمختار ہوں'' اعلان آزادی جیفرسن، جان ایڈمنز اور فرینکلن نے ڈرافت کیا اور 4 جولائی 1776 کو نوآبادیاتی کانگریس نے اس کی تصدیق کی۔ اعلان آزادی، روشن خیالی اور انسانی حقوق کے احترام کے لحاظ سے ایک قابل قدر دستاویز تھی۔ اس میں زندگی، آزادی، خودمختاری اور مساوات کی روح کارفرما تھی۔اس کے باوجود اعلان آزادی سیاسی لحاظ سے انقلابی نہیں تھا۔اس میں دولت کی مساویانہ تقسیم کے بلند بانگ دعوے نہیں تھے نہ ہی ہزار سالہ خدائی دورحکومت کی بات تھی اس کا پروگرام دوررس اور قابل عمل تھا۔

امریکی جمہوریت کے رہنما، امراء میں سے تھے۔امریکیوں کی غالب اکثریت کیلوین کے مقلدوں پر مشتمل تھی۔ وہ ریشنل تصورات کے حامی نہیں تھے بلکہ ان میں سے اکثر تو deism کو شیطانی نظریہ سمجھتے تھے۔شروع میں اپنے رہنماؤں کی طرح اکثر لوگ بھی انگلستان سے تعلقات ختم کرنے کے سلسلے میں تذبذب میں تھے۔سب نے انقلابی جدوجہد میں حصہ بھی نہیں لیا تھا تقریباً تیس ہزار آدمیوں نے برطانیہ کا ساتھ دیا تھا۔اور جنگ کے بعد تقریباً اسی سے نوے ہزار

افراد نے نئی ریاستیں چھوڑ کر کینڈا، ویسٹ انڈیز اور برطانیہ کا رخ کیا اور وہیں کے ہو رہے۔ جنہوں نے جنگ آزادی میں حصہ لیا تھا وہ عیسائیت کی ہر قدیم متھ سے بھی اتنے ہی متاثر تھے جتنے کہ نئے رہنماؤں کے سیکولر خیالات سے متاثر تھے۔ دراصل مذہب کو سیاست سے الگ کرنا مشکل ہو گیا تھا۔ مذہبی اور سیکولر نظریات، اتنے تخلیقی اور متوازن انداز میں ایک ہو گئے تھے کہ انہوں نے لوگوں میں برطانیہ کی سامراجی قوت کے خلاف لڑنے کی ہمت پیدا کر دی تھی۔ مذہبی اور سیکولر نظریات کے اتحاد کی ایک ایسی ہی مثال اسلامی جمہوریہ ایران (79-1978) ہے کہ اس کا وجود بھی سامراجی طاقتون کے خلاف اعلان آزادی ہے۔

انقلابی جدوجہد کی پہلی دہائی میں لوگ ماضی کے ساتھ رشتہ توڑنے پر آمادہ نہیں تھے۔ یہ تو سوچا بھی نہیں جاسکتا تھا کہ برطانیہ کے ساتھ تعلقات ختم ہو جائیں۔ بعض اس خوش فہمی میں تھے کہ برطانوی حکومت شاید اب بھی اپنی پالیسی بدل دے۔ کوئی شخص جوش و خروش کے ساتھ آگے مستقبل کی طرف بڑھنے کی کوشش نہیں کر رہا تھا۔ نہ کوئی نئی دنیا کے خواب دیکھتا تھا۔ اکثر امریکی اب بھی بحران کا سامنا وجدانی طور پر پرانے، جدید دور سے پہلے کے طریقوں سے کر رہے تھے۔ وہ زمین پر قدم جمانے کے لئے اپنے شاندار ماضی کی طرف دیکھتے اور اس سے تقویت حاصل کرتے تھے۔ جن انقلابی لیڈروں نے زیادہ سیکولر اور انقلابی رویہ اختیار کیا انہوں نے 1066 میں حملہ آور نارمن کے خلاف سیکسن کی جدوجہد یاد رکھی اور اسی سے انسپائر ہوئے یا برطانیہ میں خانہ جنگی کے دوران پارلیمنٹ کے پیورٹن ممبروں کی جدوجہد کی مثال سامنے رکھی۔ نئے انگلستان میں کیلوین اپنے سنہری دور کو واپس لانے کے خواب دیکھ رہے تھے۔ انہیں پیورٹیز کی وہ جدوجہد یاد تھی۔ جو انہوں نے پرانے انگلستان کے ظالم و جابر کلیسائی اسٹیبلشمنٹ کے خلاف کی تھی۔ وہ امریکہ کے ویرانوں میں خدا پرست معاشرہ قائم کرنا چاہتے تھے تاکہ نئی دنیا کے جبر سے نجات ملے اور آزادی و خودمختار کا دور دورہ ہو۔ ان دنوں (73-1763) وعظوں اور انقلابی تقریروں کا تمام زور ماضی کے کارنامے محفوظ کرنے پر تھا۔ کسی بڑی انقلابی تبدیلی کے خیال ہی سے زوال اور تباہی کا خوف ڈرانے لگتا تھا۔ کیلوین قدیم روایت کے مطابق اپنے ورثے کو محفوظ کر رہے تھے۔ ماضی کو دلکش بنا کر پیش کیا جاتا تھا جبکہ مستقبل لازمی طور پر بھیانک ظاہر کیا جاتا تھا۔ انقلاب کے لیڈروں نے بتایا کہ وہ اپنے فیصلوں اور پالیسیوں کے ذریعے اس انتشار اور

بدامنی کو دور کرنا چاہتے ہیں جو روایت کے ساتھ رشتہ توڑنے کا لازمی نتیجہ ہوگا۔ وہ برطانوی پالیسی کے امکانی نتائج کا ذکر بڑے خوف اور پریشانی کے ساتھ کیا کرتے تھے۔ مگر یہ صورتحال بدل کر رہی کیونکہ انگریز بڑی رعونت کے ساتھ اپنی سامراجی پالیسیوں سے چمٹے رہے۔ نوآبادیوں والوں نے ان کی کشتیوں کو آگ لگادی۔ بوسٹن ٹی پارٹی(1773)اورLexingtonاور Concord کی لڑائیوں(1775) کے بعد واپسی کا راستہ بند ہوگیا۔ اعلان آزادی کے ذریعے پرانے نظام سے کٹ جانے اور بے مثال مستقبل کی طرف بڑھنے کے ناقابل شکست عزم کا اظہار کیا گیا تھا۔ اس لحاظ سے اعلان آزادی ایک ایسی دستاویز تھی جس کا رخ جدیدیت کی طرف تھا۔ جس کے اندر سیاسی الفاظ میں اس فکری آزادی کا ذکر کیا گیا تھا جو یورپ کے سائنسی انقلاب کی خصوصیت تھی مگر لوگوں کی اکثریت جان لاک کی بجائے عیسائیوں کی پیش گوئیوں کی متھ سے متاثر تھی۔ جدید سیاسی خودمختاری کی طرف بڑھنے کے لئے انہیں مائیتھالوجی کے پیکج کی ضرورت تھی کیونکہ مائیتھالوجی سے ان کی شناسائی تھی اور وہ ان کی زندگی کی گہرائیوں میں موجود تھی۔ اسی نے انہیں انقلاب کے دشوار مرحلہ سے گزرنے کا حوصلہ دیا تھا اور یہ بات تو ہمارے مشاہدے میں آتی رہے گی کہ مذہب بھی بعض اوقات جدیدیت کے سفر میں رفیق سفر ہوتا ہے۔

چنانچہ پادری اہم کلیساؤں میں عوامی رہنماؤں کے خیالات کو عیسائیت کا رنگ دیتے رہے۔ اس کی ایک مثالSam Adams ہے۔ جب وہ اپنی تقریروں کے دوران سرکاری کاموں میں نیکی اور ذمہ داری پرزور دیتے تو برطانوی عہدے داروں کی کرپشن کے خلاف مہم کی پرزور مذمت کی تائید ہوجاتی۔ تحریک بیداری نے پہلے ہی کالونیوں کو اسٹیبلشمنٹ سے ہوشیار کردیا تھا۔ انہیں یہ بھی یقین ہوگیا تھا کہ وہ تبدیلیوں کے دائرے وسیع کرسکتے ہیں۔ جب انقلابی رہنما آزادی کی بات کرتے تو وہ ایسی تراکیب استعمال کرتے جو پہلے سے ہی مذہب کے ساتھ جڑی ہوئی تھیں۔ مثلاً یہ کہ خدا کے کلام اور اس کے بچوں کی آزادی خدا کی حکومت جس میں جبر اور ظلم کا خاتمہ ہوگیا اور وہ برگزیدہ لوگ جو دنیا کو بدلنے میں خدا کے نمائندوں کا کردار ادا کریں گے۔ ٹموتھی ڈوائٹYale-1652-1617یونیورسٹی کے پریذیڈنٹ نے انقلاب کا ذکر بڑے خوش وخروش سے کیا کہ انقلاب ایسی سرزمین میں واقع ہوا ہے جو خدا کی ملکیت ہے اور یہ کہ خدا کی نئی حکومت میں امریکہ کو مرکزی حیثیت حاصل ہوگی اور اس کا نظام خدا رسیدہ لوگوں کے ہاتھوں میں ہوگا۔

1775 میں پادری ایبنز بالڈون نے کہا کہ جنگ کی آفات خدا کی طرف سے ایک نئی دنیا تعمیر کرنے کے منصوبے کا حصہ ہیں۔عیسیٰ اپنی سنہری حکومت امریکہ میں قائم کریں گے۔علم، آزادی اور مذہب کو یورپ سے نکال باہر کیا گیا ہے۔انہوں نے اب مغرب کی سمت بحراوقیانوس کے اس پار کا عزم کیا ہے۔موجودہ بحران پرانے بددیانت نظام کو ختم کرنے کے لئے راستہ ہموار کر رہا ہے۔فلاڈیلفیا کے ولیم متھ کی نظر میں نوآبادیاں آزادی، آرٹس اور آسمانی علم کے لئے خدا کی منتخب سرزمینیں تھیں۔

اگر چرچ کے مبلغ سیاست کو برا کہہ رہے تھے تو سیکولر لیڈر خدا کی بادشاہت کا ذکر زور وشور سے کرتے تھے۔جان ایڈمز امریکی آبادیوں کو تمام دنیا میں روشن خیالی پھیلانے کا خدائی منصوبہ کہتا تھا۔ٹامس پین کو یقین تھا کہ ہم میں اتنی طاقت ہے کہ دنیا نئے سرے سے شروع کریں نوحؑ کے زمانے سے آج تک ایسے حالات پیدا نہیں ہوئے تھے نئی دنیا جنم لینے والی ہے'' لیڈروں کی ریشنل واقعیت پسندی کی وجہ سے لوگ ایک نامعلوم مستقبل کا ارادہ نہیں کر سکتے تھے۔ان کے جوش وخروش، امیجری اور جرم وسزا کے کرسچین تصوّر نے انقلابی جدوجہد میں معنی پیدا کئے اور روائت سے فیصلہ کن طور پر تعلق توڑنے میں کالوینی اور سیکولر رہنماؤں دونوں کی یکساں مدد کی۔

اس طرح سات سالہ جنگ کے دوران ابھرنے والی نفرت کی دینیات نے بھی معاونت کی تقریباً ایسے ہی جیسے ایرانیوں نے اسلامی انقلاب کے دوران امریکہ کو بہت بڑا شیطان کہا۔انقلابی بحران کے زمانے میں انگریز افسروں کو شیطان کا حلیف کہاجاتا تھا۔ بدنام سٹیمپ ایکٹ 1765 کے پاس ہونے کے بعد قومی نظموں اور گیتوں میں اس کے بنانے والوں لارڈ بیوٹ لارڈ گرین ول اور لارڈ نارتھ کو شیطان کے چیلوں کا نام دیا گیا جو امریکیوں کو شیطان کے حوالے کرنے کی سازش کر رہے تھے۔سٹیمپ کو درندے کا نشان کہا گیا جو انجیل کے مطابق جہنمیوں کی پیشانیوں پر کندہ ہوگا۔شیطان کی تصویر سیاسی جلوسوں میں انگریزوں کے پتلوں کے ساتھ نکالی جاتی اور تمام نوآبادیوں میں ان درختوں کے ساتھ لٹکا دی جاتی جن کا نام لبرٹی رکھا گیا تھا۔کنگ جارج سوئم بھی حضرت عیسیٰ کے دشمنوں میں شمار ہونے لگا جب اس نے کینیڈا کے ان علاقوں کے فرانسیسی کیتھولک عیسائیوں کو مذہب کی آزادی دے دی جو سات سالہ جنگ میں انگلستان نے فتح کئے تھے۔کنگ جارج سوئم کی تصویر بھی لبرٹی درختوں پر شیطان کی تصویر کے ساتھ آویزاں کر دی گئی۔حتیٰ کہ اعلیٰ

تعلیم یافتہ بھی کائناتی سازش کے خوف میں مبتلا ہو گئے۔ ہارورڈ اور ییل دونوں یونیورسٹیوں کے پریزیڈنٹ سمجھتے تھے کہ کالونیوں میں بسنے والے شیطانی طاقتوں کے خلاف جنگ لڑ رہے ہیں اور یہ کہ پاپائیت کا زوال دور نہیں کیونکہ وہ آمروں کی آلۂ کار ہے۔ جنگ آزادی مسیح دشمن پاپائیت کی تباہی کا خدائی منصوبہ بن چکی تھی۔ جس سے لازمی طور پر امریکہ میں خدا کی بادشاہت کا قیام جلدی اور لازمی ہو گیا تھا۔ یہ مریضانہ ذہنیت کہ ہر بات میں عالمی سازش اور معمولی سیاسی مسائل کو پوری کائنات میں حق و باطل کے مابین جنگ قرار دینا بد قسمتی سے اس قوم کا شیوہ رہا ہے جو نئی دنیا کی دہلیز پر قدم رکھتے ہوئے انقلابی تبدیلیوں سے دوچار ہو۔ اس شیطانی دیو مالا نے امریکیوں کو پرانی دنیا سے بالکل الگ کر دیا جس کے ساتھ انہیں اب بھی گہرا لگاؤ تھا۔ انگلستان کی حیثیت کم کرتے ہوئے اسے ایک متضاد اور مخالف طاقت کی شکل دے دی گئی یعنی امریکہ کا مخالف قطب جس سے نوآبادیوں کو آسانی ہوگئی کہ وہ اپنی ایک الگ اور واضح شناخت بنالیں اور اس نئے نظام کی وضاحت کریں کہ جسے وجود میں لانے کے لئے وہ لڑ رہے تھے۔

چنانچہ پہلی جدید سیکولرری پبلک قائم کرنے میں مذہب نے اہم کردار ادا کیا مگر جب نئی آزاد ریاستوں نے اپنا آئین بنایا تو اس میں خدا کا ذکر برائے نام تھا۔ 1786 میں تھامس جیفرسن نے ورجینیا میں Anglican چرچ بند کر دیا۔ چونکہ وہ چرچ آف انگلینڈ کا رکن تھا۔ جیفرسن نے اپنے بل میں کہا کہ مذہبی معاملات میں جبر سے کام لینا ظلم اور گناہ ہے۔ اگر لوگ آزادی کے ساتھ سوچ سکیں تو وہ سچائی کا ساتھ دیں گے اور یہ کہ مذہب اور سیاست کے درمیان ایک دیوار حائل ہونی چاہیے جو انہیں ایک دوسرے سے الگ رکھے۔ اس بل کو Methodists, Baptists اور جینیا کے چرچ آف سکاٹ لینڈ کی حمایت حاصل تھی۔ اس لئے بھی کہ وہ اپنی ریاست میں چرچ آف انگلینڈ کی خصوصی حیثیت کے شاکی تھے۔ اس کے بعد دوسری ریاستوں کے کلیساؤں نے ورجینیا کی تقلید کرتے ہوئے اپنے گرجے بند کر دئے۔ 1787 میں جب فلاڈیلفیا میں وفاقی آئین بنایا گیا تو اس میں خدا کا ذکر کہیں نہیں تھا۔ آئین میں پہلی ترمیم بل برائے حقوق 1789 کے ذریعے سیاست کو مذہب سے الگ کر دیا گیا۔ چنانچہ متحدہ ریاستوں میں مذہب رضا کارانہ اور ذاتی معاملہ بن گیا۔ یہ ایک انقلابی قدم تھا جو اس دور کا سب سے بڑا کارنامہ سمجھا گیا جس دور کا نام ایج آف ریزن ہے۔ اس عمل کا محرک رواداری کا جذبہ تھا جسے روشن خیالی

کی تحریک نے عام کیا مگر اس کے بانیوں کی نظر میں اور مسائل بھی تھے۔ وہ جانتے تھے کہ ریاستوں کو متحد رکھنے کے لئے وفاقی آئین انتہائی ضروری ہے انہیں یہ بھی معلوم تھا کہ اگر آئین میں کسی ایک پروٹیسٹنٹ فرقے کو اہمیت دی گئی اور اس کے مذہب کو متحدہ ریاستوں کا سرکاری مذہب قرار دیا گیا تو آئین منظور نہیں ہو سکے گا۔ مثال کے طور پر, Congregationalist, Massachusettes آئین کی تائید ہرگز نہ کرتے اگر اس میں Anglican چرچ کو اہمیت دی جاتی۔ آئین کے آرٹیکل چھ سیکشن 3 کے تحت وفاقی حکومت میں ملازمت کے لئے مذہبی امتحان منسوخ کرنے کی بڑی وجہ بھی یہی تھی۔ رہنماؤں کا خواب تو یہی تھا کہ مذہب کو الگ کر کے سیاست کو سیکولر بنائیں مگر نئی قوم کسی ایک فرقے کو اپنی شناخت نہیں بنا سکتی تھی کہ اس طرح دوسرے افراد کی حمایت برقرار نہیں رہ سکتی تھی۔ رواداری جدید ریاست کا تقاضا تھا اس لئے ریاست کا سیکولر ہونا لازمی تھا۔ مگر انیسویں صدی کے وسط تک سیکولر متحدہ ریاستیں ایک عیسائی قوم کی صورت میں بدل چکی تھی۔ 1780 میں اور اس سے بھی زیادہ 1790 کے عشرے میں کلیساؤں کو نئی زندگی مل گئی تھی۔ انہوں نے روشن خیالی کے نظریے کو جھٹلانا شروع کر دیا۔ امریکہ کی آزادی اور نئی ری پبلک کو خدائی کارنامہ کہہ کر انہیں ان کی اصلی حیثیت سے گرادیا۔ اس سے پہلے قدیم اسرائیل کی تاریخ میں خدا کی طرف سے پہلی بار براہِ راست مداخلت ہوئی تھی۔ آئین میں خدا کا ذکر بے شک موجود نہ ہو ٹموتھی ڈوائیٹ (Temothy Dwight) اپنے طالب علموں سے کہتا ”مگر تم اپنے ملک کی تاریخ دیکھو خدا نے تمہاری سلامتی اور نجات کے لئے جو کچھ کیا وہ اس مدد سے شاید ہی کم ہو جو اس نے اسرائیلیوں کو مصر میں دی۔ پادری بڑے یقین سے کہتے کہ امریکی اور زیادہ نیکی اور پرہیزگاری کا رستہ اختیار کریں گے۔ انہوں نے سرحدوں کی توسیع میں خدائی بادشاہت کے قیام کا منظر دیکھ لیا تھا، جسے اب جلدی قائم ہونا تھا۔ جمہوریت نے افراد کو خودمختار بنا دیا ہے اس لئے انہیں اور زیادہ خدا پرست ہونا چاہیے اگر نئی ریاستوں کو ان خطرات سے بچنا ہے جو جمہوری حکومت میں طبعی طور پر موجود ہوتے ہیں امریکیوں کو اپنے سیاسی لیڈروں کے دین دشمن "Deism" سے الگ رہنا ہے۔ پادریوں نے "Deism" کو شیطان کا روپ دے دیا اور اسے ایک نئی ناپختہ قوم کی کھلی غلطیوں اور کوتاہیوں کا ذمہ دار ٹھہرایا۔ وہ بضد تھے کہ Deism سے مادیت اور دہریت پھیلے گی۔ Deism حضرت عیسیٰ کی بجائے فطرت اور ریزن (عقل) کا پرستار

ہے۔1800 میں جب تھامس جیفرسن نے صدارتی انتخاب میں حصہ لیا تو اسے ایک ایسی Deism مخالف مہم کا سامنا کرنا پڑا جس نے جیفرسن کا تعلق انقلاب فرانس کے مفکرین خدا 'جیکو بن Jacobin' دہریوں کے ساتھ ثابت کرنے کی کوشش کی تھی۔

نئی ریاستوں کا اتحاد کمزور تھا۔امریکیوں کو نئی قوم سے بہت مختلف اُمیدیں تھیں چاہے وہ پروٹیسٹنٹ ہوں یا سیکولر ہوں۔ دونوں نے ہی ایک جیسی برداشت کا ثبوت دیا تھا۔امریکی اب بھی اپنے آئین کا احترام کرتے تھے کہ امریکہ کو 'خدا کی اپنی قوم' سمجھیں۔ایسے پروٹیسٹنٹ بھی تھے جو''سیکولر انسان دوستی'' کو شیطانیت کے لگ بھگ کوئی چیز سمجھتے تھے۔انقلاب کے بعد امریکی مختلف حصوں میں بٹ گئے۔انہیں یہ خیال ستانے لگا کہ ان کا کلچر کیا ہوگا۔انیسویں صدی کے آغاز میں یہ سچ ہے کہ انہوں نے ایک اور انقلاب دیکھا تھا۔ بڑی جرأت اور بڑی مشکل سے انہوں نے ماضی سے تعلق توڑا تھا۔انہوں نے ایک عہد ساز آئین بنایا تھا اور ایک نئی قوم کو جنم دیا تھا مگر یہ سب کچھ آسانی سے نہیں ہوا۔ اس کے لئے انہیں بڑے ہیجان، تضاد اور کھچاؤ کو برداشت کرنا پڑا تھا۔اس کے باوجود اب تک یہ فیصلہ نہیں کر سکے تھے کہ نئی دنیا میں قدم رکھنے کے لئے انہیں کیا کرنا ہے۔جنہیں زندگی میں بہت کم سہولتیں ملی تھیں وہ اس پر تلے ہوئے تھے کہ امرا کی کلچر قیادت کو چیلنج کریں۔انگریزوں پر فتح پالینے کے بعد عام امریکی کے سامنے یہ سوال تھا کہ اس کے لئے انقلاب کی کیا اہمیت ہے کیا معنی ہیں۔کیا انہیں بانی رہنماؤں کے متین، شائستہ اور مہذب ریشنلزم پر چلنا ہے یا پروٹیسٹنٹ ازم کے خارزار کا انتخاب کرنا ہے۔

ایک جدید سیکولر جمہوری ریاست کی تخلیق میں کلیساؤں اور انقلاب کے رہنماؤں نے ایک دوسرے کا ساتھ دیا تھا مگر کئی اہم پہلوؤں کے پیشِ نظر وہ دونوں اب بھی پرانی رجعت پسند دنیا سے تعلق رکھتے تھے۔ وہ امراء اور رؤسا میں سے تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ سیاستدانوں اور قوم کی رہنمائی انہی کا منصب ہے چاہے ان کی جڑیں عوام میں نہ ہوں۔وہ سوچ ہی نہیں سکتے تھے کہ عام لوگوں کے ذریعے بھی کوئی اہم تبدیلی آسکتی ہے۔ وہ اب بھی یہی سمجھتے تھے کہ بڑی تاریخی تبدیلیاں لانا اور تاریخ بنانا بڑی شخصیتوں کا کام ہے۔انہوں نے اب تک نہیں جانا تھا کہ سماج کو آگے بڑھانے میں معاشی اور سماجی طاقتوں کا دخل ہوتا ہے جو کسی بھی جابر اور کرشماتی شخصیت کے منصوبوں پر بآسانی پانی پھیر سکتی ہیں۔1780 اور 1790 میں جمہوریت کے متعلق بہت بحثیں

ہوئیں کہ لوگوں کے پاس کتنی طاقت ہونی چاہیے۔ ریاست متحدہ کا دوسرا صدر جان ایڈمز کسی ایسے طرز حکومت کو شک کی نظر سے دیکھتا تھا جس کا حاصل ہجوم کی حکومت اور امراء کی بے بسی ہو مگر جیفرسن کے انقلابی ساتھی یہ برداشت نہیں کر سکتے تھے کہ مٹھی بھر امراء کو لوگوں کی اکثریت پر برتری حاصل ہو۔ انہوں نے ایڈمز کی ظالمانہ حکومت کے خلاف سخت احتجاج کیا کہ لوگوں کی آواز ان کی رائے کا احترام ہونا چاہیے۔ انقلاب نے امریکیوں میں طاقت کا احساس پیدا کر دیا تھا۔ انہوں نے جان لیا تھا کہ ایک طاقتور حکومت بھی گرائی جا سکتی ہے اور وہ کسی طرح بھی ناقابلِ شکست نہیں ہے۔ جن بوتل سے باہر آ گیا تھا۔ اسے بوتل میں واپس بند کرنا ممکن نہیں تھا۔ جیفرسن کے ساتھی مصر تھے کہ عام لوگوں کو بھی آزادی اور خودمختاری کا حق حاصل ہونا چاہیے۔ اخبارات میں ڈاکٹروں، وکیلوں، پادریوں اور دیگر ماہرین کا مذاق اڑایا جاتا کہ کسی کو بھی ان نام نہاد ماہرین کی پرواہ نہیں کرنی چاہیے اور قانون، علاج اور مذہب کا تعلق کامن سینس سے ہونا چاہیے اور ان تک سب کو رسائی حاصل ہو۔ یہ جذبہ سرحدی علاقوں میں خصوصی طور پر عام تھا۔ جہاں کی آبادی کوری پننکن گورنمنٹ اہمیت نہیں دیتی تھی۔ وہ حکمران طبقے سے بیزار تھے کیونکہ اس کے مسائل میں ان کی مدد نہیں کی جاتی تھی بلکہ انگریزوں کی طرح ان پر بھاری ٹیکس لگا دیے گئے تھے۔ ان کے علاقوں میں سرمایہ کاری کے لئے زمینیں خرید لی گئی تھیں جبکہ ان پر آباد ہونے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ نہ وہ مشرقی ساحلی علاقوں کی آرام دہ زندگی چھوڑ سکتے تھے۔ وہ ایک نئی قسم کے مبلغوں کی بات سننے پر تیار تھے جن کا تعلق دوسری بیداری سے تھا اور جو سیاسی لحاظ سے پہلے سے کہیں زیادہ انقلابی تھی۔ وہ صرف روحوں کی نجات نہیں چاہتے تھے بلکہ سوسائٹی اور مذہب کو ایک ایسی شکل دینے پر تلے ہوئے تھے جسے انقلاب کے بانیوں نے سوچا بھی نہیں تھا۔

نئے تجدید پسند جارج وائٹ فیلڈ اور جوناتھن ایڈوڈز کی طرح سکالر نہیں تھے نہ ان کی طرح انہوں نے ییل Yale اور آکسفورڈ میں تعلیم پائی تھی۔ وہ درس وتدریس سے نفرت کرتے تھے۔ انہیں اصرار تھا کہ تمام عیسائیوں کو یہ حق ہے کہ وہ انجیل کی توجیہہ خود کریں اور مذہبی ماہرین دور رہیں۔ یہ پیغمبر سلجھے ہوئے لوگ نہیں تھے۔ وہ اپنی تقریروں میں عامیانہ انداز اختیار کرتے۔ ان کے وعظوں میں اشارے کنایئے، ہنسی، مذاق اور بازاری الفاظ کی کثرت ہوتی۔ ان کے مذہبی اجتماع بھی شور وغل اور جذباتی ہنگاموں سے خالی نہ ہوتے۔ بزعم خود وہ عیسائیت کو مقبول عام

بنا رہے تھے۔ وہ مشعل بردار جلوس نکالتے اور بڑے بڑے جلسے کرتے اور شہر کے باہر بڑے بڑے خیمے نصب کرتے تاکہ ان کی سرگرمیوں کی وسعت کا اندازہ ہو۔ نئے مذہبی گیت سن کر سامعین اس قدر وارفتہ ہوتے کہ روتے چلاتے، جھومتے اور کبھی خوش ہوتے۔ اپنے مذہب کو ریشنل بنانے کی بجائے وہ خوابوں اور توہمات کا سہارا لیتے۔ جنہیں روشن خیالی کے فلسفیوں اور سائنس دانوں نے رَد کر دیا تھا۔ اس کے باوجود جیفرسن کے ساتھیوں کی طرح وہ ماضی کو دانش کا خزانہ نہیں سمجھتے تھے۔ وہ ماڈرن تھے۔ ان کا خیال تھا کہ ضروری نہیں کہ لوگ علم وفضل کی زنجیروں میں جکڑے رہیں۔ وہ خدا کے بچے ہیں کامن سینس کام میں لاتے ہوئے انہیں انجیل کا مطالعہ خود کرنا چاہیے اور سیدھے سادے حقائق تک پہنچنا چاہیے۔ یہ نئے مبلغ، امراء، اسٹیبلشمنٹ اور پادریوں کے خلاف تھے۔ وہ انجیل کے ان پہلوؤں کو اُجاگر کرتے تھے جن کا تعلق انسانی حقوق اور مساوات سے تھا جن کہا گیا تھا کہ مسیحی دولت مشترکہ مین پہلا آخری اور آخری پہلے کی جگہ ہونا چاہیے۔ خدا نے اپنی بصیرت بے پڑھے لکھوں اور غریبوں میں بانٹی ہے۔ مسیح اور ان کے ساتھیوں نے کالج کی ڈگریاں نہیں حاصل کر رکھی تھیں۔

مذہب اور سیاست ایک ہی وژن کے دو حصے ہیں۔ اپنے لہراتے ہوئے بالوں اور چمکتی آنکھوں کے ساتھ Lorenzo Dow نئے دور کا John the Baptis لگتا تھا۔ اس کی نظر میں آندھی آنا براہِ راست خدا کا کام ہے۔ وہ بصیرت حاصل کرنے کے لئے خوابوں اور وژن کا سہارا لیتا۔ موسم میں تبدیلی کے یہ معنی لئے جاتے کہ دنیا اپنے انجام کی طرف بڑھ رہی ہے۔ اسے دعویٰ تھا کہ وہ آنے والے زمانہ کا حال بتا سکتا ہے۔ ایک طرح وہ جدیدیت کے نئے دور کی زندہ تردید لگتا تھا۔ پھر بھی وہ اپنا وعظ جیفرسن اور تھامس پین کے اقوال سے شروع کرتا تھا اور ایک سچے جدیدیت پسند کی طرح وہ لوگوں کو جہالت اور وہم پرستی کی زنجیریں توڑ دینے کو کہتا تھا۔ 'علماء کی غلامی چھوڑو اور اپنے دماغ سے کام لینا سیکھو' لگتا تھا کہ نئی متحدہ ریاستوں میں مذہب اور سیاست ایک ہی تصویر کے دو رخ تھے۔ چنانچہ Elis Smith نے جیفرسن کی الیکشن مہم کے دوران اپنے سیاسی خیالات پہلی بار بدلے۔ جب وہ انسانوں کے مساوی حقوق کا حامی بنا مگر پھر اس نے ایک نئے اور زیادہ جمہوری چرچ کی بنیاد رکھی۔ اسی طرح Jams O'Kelley انقلاب کے دوران انگریزوں کے خلاف لڑتا رہا اور ان کے ہاتھوں گرفتار ہوا۔ وہ مکمل طور پر سیاست اختیار

کر چکا تھا اور چاہتا تھا کہ اور زیادہ مساوات پر مبنی چرچ قائم ہو۔ وہ عیسائیت کے بڑے دھارے سے الگ ہو گیا۔ اس نے Republican Methodist قائم کی۔ جب وہ بوسٹن سٹون اور پریس بائیٹیرین سے علیحدہ ہوتو اس نے اپنی علیحدگی کو اعلان آزادی کا نام دیا۔ جوزف سمتھ (1805-44) اور بھی زیادہ انقلابی تھا۔ اس نے انجیل پڑھنے پر قناعت نہیں کی بلکہ دعویٰ کیا کہ اس نے ایک نئی انجیل دریافت کی ہے۔ انیسویں صدی میں The Book of Mormon علماء، امراء اور زور آوروں کے خلاف سب سے شدید احتجاج تھا۔ سمتھ اور اس کا خاندان برسوں فاقہ کشی کی زندگی گزارتے رہے تو انہیں احساس ہوا کہ اس بہادر نئی ری پبلک میں ان کے لئے کوئی جگہ نہیں۔ پہلے مورمن بھی اتنے ہی غریب، کمزور اور مایوس تھے اور سمتھ کی پیروی میں متحدہ ریاستوں سے ہجرت کے لئے تیار تھے۔ مورمن نے اس کے بعد اپنی دو آزاد بادشاہتیں پہلے الیانوائے اور اس کے بعد یوٹا Uttah میں قائم کیں۔

اسٹیبلشمنٹ، ڈو، سٹون اور جوزف سمتھ کو حقارت کی نظر سے دیکھتی تھی اور انہیں خالی الذہن اور اشتعال پسند سمجھتی تھی۔ جن کے دامن جدید دنیا کے لئے خالی تھے۔ یہ مبلغ گئے گزرے قدیم زمانوں کی بوسیدہ اور بے مصرف یادگاریں لگنے لگیں بڑے بڑے پادری اور امریکی امراء ان کے متعلق وہی رائے رکھتے تھے جو رائے آج بنیاد پرستوں کے بارے میں سیکولر اور آزاد خیال لوگوں کی ہے مگر وہ انہیں نظرانداز کرنے میں غلطی کر رہے تھے۔ ڈو اور جوزف سمتھ جیئس سمجھے جاتے تھے۔ ان میں یہ اہلیت تھی کہ وہ جمہوریت، مساوات، آزادئ اظہار اور خودمختاری کے انقلابی اور جدید آئیڈیل عام لوگوں کے سامنے لا سکیں اور انہیں ایسی زبان میں بیان کریں جسے غیر تعلیم یافتہ افراد بھی سمجھ سکیں اور اپنا سکیں۔ یہ نئے تصورات اس نئی دنیا کے لئے انتہائی ضروری تھے جو امریکہ میں جنم لے رہی تھی۔ ان تصورات کو دیومالائی سیاق وسباق کے ساتھ اس اکثریت کے سامنے پیش کیا گیا جسے زندگی میں بہت کم سہولتیں حاصل تھیں۔ دیومالا نے بے چینی اور انقلاب کے اس دور میں ان تصورات کو معنی اور تسلسل دیا۔ یہ نئے پیغمبر چاہتے تھے کہ انہیں جانا اور مانا جائے اور گو کہ اونچے طبقے انہیں برا کہتے تھے مگر عام لوگوں میں ان کے لئے گرمجوشی سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ وقت کا تقاضا پورا کر رہے تھے۔ وہ پہلی بیداری کے رہنماؤں کی طرح انفرادی سطح پر تبدیلی کے خواہشمند نہیں تھے۔ وہ اجتماع سطح پر دوررس تبدیلی چاہتے تھے۔ وہ کمیونی کیشن کے نئے ذرائع اور

موسیقی سے ملک گیر عوامی تحریک کے لئے لوگ جمع کر سکتے تھے۔ انہوں نے بانی رہنماؤں کی طرح لوگوں پر تصورات مسلط کرنے کی بجائے ریشنل اسٹیبلشمنٹ کے خلاف گراس روٹ بغاوت منظّم کی تھی۔ اپنی جدوجہد میں وہ بہت کامیاب تھے، مثال کے طور پر الیس سمتھ، او، کیلی، کیمبل اور سٹون کے فرقوں نے مل کر Disciples of christ کے نام سے نیا فرقہ بنالیا 1860 تک اس کے اراکین کی تعداد دولاکھ تک پہنچ گئی اور وہ متحدہ ریاستوں کا پانچواں بڑا پروٹیسٹنٹ فرقہ بن گیا۔ Mormons کی طرح Disciples نے عام بے چینی سے اس طرح فائدہ اٹھایا کہ اسٹیبلشمنٹ نے اسے نظرانداز کرنے کی ہمت نہیں کی۔ تحریک بیداری کے سائنسی ریشنلزم کے خلاف اس بغاوت کا اور بھی گہرا اثر ہوا۔ دوسری بیداری نے کئی امریکنوں کو انقلابی رہنماؤں کے کلاسیکل ری پبلکن ازم سے ہٹا کر ایک بھدی عامیانہ جمہوریت اور ناشائستہ انفرادیت کی طرف دھکیل دیا۔ جو آج بھی امریکی کلچر کی خصوصیت ہے۔ انہوں نے حکمران طبقوں کے ساتھ تصادم میں فتح حاصل کر لی تھی۔ امریکی مزاج میں کوئی بات ہے جو ایج آف ریزن کے روح پرور تصورات کی نسبت ان پیغمبروں کے فکر دشمن رویہ سے زیادہ قریب ہے۔ دوسری عظیم بیداری Great Awakening کی نمائشی اور ہنگامہ خیز تجدید نے متحدہ ریاستوں کے سیاسی سٹائل پر اپنا دائمی اثر چھوڑا۔ اس کے جلسہ جلوس کی مکروہ جذباتیت اور ظاہری آن بان سے اکثر یورپین سٹ پٹا گئے۔ آج کی کئی بنیادی پرست تحریکوں کی طرح دوسری بیداری کے ان پیغمبروں نے ان لوگوں کو موقع فراہم کیا کہ وہ مراعات یافتہ اشرافیہ تک اپنی بات پہنچائیں جو سمجھتے تھے کہ نئی ریاستوں میں انہیں رائے دہی کے حق سے محروم کیا گیا ہے اور ان سے ناجائز فائدہ اٹھایا گیا ہے۔ آج کے بنیادی پرست گروپوں کی طرح ان کی تحریکوں نے مارٹن لوتھر کنگ کے لفظوں "A sense of somebodiness" یعنی لوگوں کو کچھ ہونے کا شعور دیا تھا۔ بنیاد پرست تحریکوں کی طرح تمام نئے فرقے واپس ماضی کی طرف دیکھتے تھے، اوریجنل مذہب کی تجدید اور ترویج ان کا مقصد تھا مگر سب کا انداز آمرانہ تھا۔ آغاز انیسویں صدی کے امریکہ اور بیسویں صدی کے آخر کی بنیاد پرست تحریکوں کا تضاد یہ تھا کہ آزادی، خودمختاری اور مساوات کی آرزو لاتعداد افراد کو جھوٹے مذہبی لیڈروں کی مکمل اطاعت کے رستے پر ڈال دیتی ہے۔ حق رائے دہی کے بلند بانگ دعوؤں کے باوجود جوزف سمتھ نے مذہبی فسطائیت کو جنم دیا اور الیگزنڈر کیمبل معاشی مساوات کے گن گانے

کے باوجود، مغربی ورجینیا میں سب سے دولت مند آدمی تھا۔

جدیدیت کے صبر آزما عمل میں مسائل کے جوحل لوگوں کے لئے کشش رکھتے تھے دوسری بیداری ان کی نشان دہی کرتی تھی۔ آج کے بنیاد پرستوں کی طرح دوسری بیداری کے پیغمبروں نے پڑھے لکھے حکمران طبقوں کے ریشنلزم کی پرزور مخالفت شروع کردی اور مذہبی تشخیص کی اہمیت پر اور زیادہ زور دیا۔ ساتھ ہی انہوں نے جدید تصورات ان لوگوں تک پہنچائے جنہیں ڈیکارٹ نیوٹن یالاک کے مطالعے کا موقع نہیں ملا تھا۔ متحدہ ریاستوں میں ان کی بغاوت بڑی کامیاب اور دیرپا ثابت ہوئی اس کے معنی یہ ہوئے کہ ہم مختلف معاشروں کی نئی بنیاد پرست تحریکوں کو وقتی اور عارضی پاگل پن نہ سمجھیں۔ نئے امریکی فرقے اسٹیبلشمنٹ کی نظر میں بے شک نرالی مخلوق ہوں مگر وہ جدید اور نئی دنیا کا لازمی حصہ ہیں۔ یہ بات یقینی طور پر ولیم ملر(1782-1849) کی ہزار سالہ تحریک کے متعلق بھی سچ ہے۔ ملر نے انجیل کی پیش گوئیوں کا بغور جائزہ لیا اور 1831 مین ایک پمفلٹ شائع کیا جس میں بڑے محتاط اندازے سے اس نے ثابت کیا کہ مسیح دوسری بار 1843 میں آئیں گے۔ ملر، انجیل نئے انداز سے پڑھ رہا تھا۔ اسے دائمی حقیقتوں کا دیومالائی اور علامتی بیان سمجھنے کی بجائے آنے والے واقعات کی صحیح پیش گوئی سمجھتا تھا جسے سائنس اور ریاضی کی مدد سے مزید واضح کیا جاسکتا تھا۔ اب لوگ انجیل معلومات حاصل کرنے کے لئے پڑھتے ہیں۔ سچ میں اتنی جان ہونی ضروری ہے کہ اسے منطقی اور سائنسی طور پر سچ ثابت کیا جاسکے۔ ملر انجیل کی مائیتھوس کو اس طرح کام میں لا رہا تھا گویا کہ وہ لوگوس ہے۔ وہ اور اس کا نائب جوشوا، ملر کی ریسرچ کے سائنسی پہلوؤں پر مسلسل زور دیتے تھے۔ یہ تحریک جمہوری بھی تھی اس سے تعلق رکھنے والے ہر شخص کو اختیار حاصل تھا کہ وہ انجیل کے معنی جو چاہے جو سمجھے۔ ملر اپنے ساتھیوں کی حوصلہ افزائی کرتا کہ وہ چاہیں تو اس کے اندازے اور پیش گوئیاں چیلنج کریں اور خود اپنی تھیوری بھی سامنے لائیں۔ بظاہر تو اس کی تحریک انوکھی اور بعید از قیاس لگتی تھی مگر ملرازم فوراً متاثر کرتا تھا۔ پچاس ہزار امیریکی تو باقاعدہ ملررائٹ (ملر کے پیرو) بن گئے جبکہ ہزاروں افراد اس کی تحریک مین شامل ہوئے بغیر اس کے ہمدرد اور معاون بنے۔ مگر انجیل کی مائیتھوس کی لفظی تشریح کے ضمن میں ملرازم کو واقعی سبق مل گیا۔ ان کے وعدے کے مطابق مسیح 1843 میں واپس نہیں آئے جس سے ملر کے پیروؤں کی کمر ٹوٹ گئی ہو مگر اس ناکامی سے ہزار سالہ خدائی بادشاہت کا تصور ختم نہیں

ہوا بلکہ متحدہ ریاستوں کا بہت بڑا جذبہ ان کا بہت بڑا خواب بن گیا۔1843 کی عظیم مایوسی نے نئے فرقوں کو جنم دیا جیسے Seventh Day Adventists (ولادت مسیح سے قبل زمانہ بشارت کے ماننے والے) آئے۔ انہوں نے پیش گوئیوں کو الگ رکھتے ہوئے موت اور جرم وسزا کا ٹائم ٹیبل مرتب کیا اور امریکہ کی نئی نسلوں کو تاریخ کے فوری خاتمے کے انتظار پر لگا دیا۔ شروع میں تو یہ نئی کٹھن اور جمہوریت پسند عیسائیت غریبوں اور غیر تعلیم یافتہ طبقوں تک محدود رہی۔ مگر 1840 کی دہائی میں چارلس فنی (1875-1792) اسے درمیانے طبقوں میں لے آیا۔ اسے امریکہ کی مذہبی دنیا میں مرکزی کردار کی حیثیت حاصل تھی۔ چنانچہ اس طرح اس نے مسیح کو واحد ذریعہ نجات سمجھنے والی عیسائیت کی مدد ایک سیکولر قوم کو مسیح کی طرف موڑنے سے کی۔ انیسویں صدی کے وسط تک یہی مذہب متحدہ ریاستوں میں مقبول ترین مذہب تھا۔ فنی نے ویسے تو 'پرانے پیغمبروں' کے بھدے اور وحشیانہ حربوں سے کام لیا مگر اس کے مخاطب وکیل ڈاکٹر اور تاجر تھے وہ انہیں تلقین کرتا تھا کہ مذہبی اسٹیبلشمنٹ کو درمیان میں لائے بغیر براہ راست مسیح سے رابطہ کریں اپنے دماغ سے کام لیں اور علماء کی اجارہ دارانہ قیادت کے خلاف بغاوت کر دیں۔

انقلاب کے بعد ریاست نے مذہب سے اپنی آزادی کا اعلان کر دیا۔ ہر مکتب خیال کے عیسائی بھی حکومت سے دور ہو گئے وہ انقلاب سے بددل تھے کیونکہ انقلاب خدا کی ہزار سالہ بادشاہت کا دور نہیں لا سکا تھا۔ پروٹیسٹنٹ اس کوشش میں لگ گئے کہ وہ Deist ری پبلکن حکومت سے اپنا مذہب الگ رکھیں۔ وہ سمجھتے تھے کہ ان کے فرقہ کو خدا کی براہ راست حمایت حاصل ہے اور وہ خدا کی جماعت ہے اس لئے اسٹیبلشمنٹ کے ساتھ اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ پروٹیسٹنٹ اب بھی سمجھتے تھے کہ امریکہ کو مذہب کا پابند ہونا چاہیے اور یہ کہ خدمت خلق ایک غیر سیاسی عمل ہے اور بہتر ہے کہ اقتدار سے دور رہ کر لوگوں کی بھلائی کے کاموں میں حصہ لیا جائے۔ اس مقصد کے لئے کئی گرجے اسکول اور رفاہی ادارے موجود تھے جو 1820 کے عشرے میں قائم ہوئے اور ایک بہتر دنیا کے لئے کام کر رہے تھے۔ وہ غلامی، شراب نوشی اور کمزوروں پر ظلم کے خلاف احتجاج کرتے تھے۔ ملر کے اکثر پیرو شراب نوشی کے خلاف تھے اور حامی نسواں تنظیموں سے منسلک تھے۔ ان تمام سرگرمیوں میں سماجی ڈسپلن یقیناً موجود تھا۔ نیکی کے پروٹیسٹنٹ اصولوں مثلاً کفایت شعاری، متانت اور صاف ستھری زندگی پر زور دینے میں مقامی مصلحت بھی تھی۔ ریاست ہائے

متحدہ امریکہ میں کیتھولک عیسائیوں کا سیلاب آنے سے پروٹیسٹنٹ بہت پریشان تھے۔ انقلاب کے دنوں میں امریکہ پروٹیسٹنٹ ملک تھا جبکہ کیتھولک امریکہ میں عیسائیوں کا سب سے بڑا فرقہ تھا۔ یہ بات ایک ایسی قوم کے لئے خطرناک تھی جو برسوں سے پوپ کو دجال سمجھتی تھی۔ بعض اوینجلائی اصلاحات، کیتھولک عیسائیوں کا اثر زائل کرنے کی کھلی کوشش تھی۔ مثلاً ضبط نفس کے ذریعے پول، آئرش اور اطالوی امریکیوں کو شراب نوشی سے روکنے کی کوشش کی گئی تھی۔

یہ اوینجلائی اصلاحی تحریکیں مثبت اور جدیدیت پسند تھیں۔ ہر فرد کی اہمیت اور احترام پر زور دیا جاتا وہ ایسی مساوات زور وشور سے پھیلاتیں جو شمال میں غلامی کا خاتمہ کرنے میں مدد دیتیں مگر جنوب میں اسے ویسا ہی رہنے دیتیں۔ جنوب کو دوسری بیداری نے بھی نہیں چھیڑا تھا اس لئے اس نے اپنا جدیدیت سے پہلے کا سماجی ڈھانچہ، خانہ جنگی کے بہت بعد تک قائم رکھا۔ اصلاحی تحریکوں کے ذریعے لوگوں نے انسانی حقوق کے جدید تصور کو عیسائی پیکیج میں شامل کر دیا۔ کم از کم شمال میں تو یہی ہوا۔ نسوانی، تعزیری اور تعلیمی اصلاحات کی تحریکیں بھی ترقی پسند تھیں اور ان کی رہنمائی اوینجلائی مسیحی کر رہے تھے۔ اصلاحی گروپ لوگوں کو جدید تصورات اپنانے کی ترغیب دیتے۔ ان کے اراکین رضا کارانہ طور پر کسی ایسوسی ایشن میں شامل ہوتے۔ تنظیم اور منصوبہ بندی کی تربیت حاصل کرتے اور اپنے اہم مقاصد حاصل کرنے میں ریشنل طور طریقے بروئے کار لاتے۔ آخر کار اوینجلائی عیسائی ہی Whig Party کی ریڑھ کی ہڈی ثابت ہوئے (جس کی جانشین ریپبلکن پارٹی تھی) جبکہ ان کے مخالف (اولڈ لائٹ اور کیتھولک) ریپبلکن پارٹی کے حامی بن گئے، امریکہ میں نیک اور راست باز حکومت قائم کرنا چاہتے تھے۔ جس کی بنیاد روشن خیالی کے اصولوں کی بجائے خدائی اصولوں پر ہو۔

انیسویں صدی کے وسط تک اوینجلائی کمزور نہیں ہوئے اور نہ رائے دہی کے حق سے محروم تھے۔ انہوں نے سیکولر اسٹیبلشمنٹ کو چیلنج کیا تھا اور سب تک اپنی آواز پہنچانے میں کامیاب رہے تھے۔ اب وہ ایک بار پھر عیسائی معاشرہ تسخیر کرنے کے منصوبے بنا رہے تھے۔ چاہتے تھے کہ اسے پھر پروٹیسٹنٹ طرز فکر سے ہم آہنگ کر دیں وہ اپنی کامیابی سے بہت خوش تھے انہوں نے امریکی کلچر پر اَن مٹ نقوش چھوڑے تھے۔ متحدہ ریاستوں کا کلچر، آئین کے سیکولر ہونے کے باوجود، عیسائیت سے اتنا متاثر پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔

1780 اور 1860 کے دوران عیسائیوں کے مذہبی اجتماعات میں حیرت انگیز اضافہ ہوا۔ یہاں تک کہ انہوں نے آبادی میں اضافے کی قومی شرح کو پیچھے چھوڑ دیا۔ 1780 میں تقریبا 2,500 اجتماعات منعقد ہوئے۔ 1820 میں بڑھ کر گیارہ ہزار ہو گئے اور 1860 میں تو حد ہو گئی یعنی 52,000 اجتماعات منعقد ہوئے۔ جس کا مطلب ہے کہ تقریباً 21 گنا تعداد بڑھ گئی۔ اس کے مقابلے میں متحد ریاستون کی آبادی 1780 میں تقریباً 4 ملین سے 1820 تک 10 ملین 1860 میں 31 ملین یعنی 8 گنا سے کچھ کم شرح سے بڑھی۔ یورپ میں مذہب نے تیزی کے ساتھ اسٹیبلشمنٹ کے خلاف لوگوں کا ساتھ دیا۔ یہ سلسلہ اب تک جاری ہے اس لئے بھی امریکہ میں کوئی ایسی مقبول تحریک ڈھونڈنی مشکل ہے جو کسی نہ کسی عنوان مذہب سے وابستہ نہ ہو۔ 1850 تک امریکہ میں عیسائیت زبردست طاقت بن چکی تھی جسے ابھی مزید کامیابیاں حاصل کرنی تھیں۔

یورپ میں صورتحال کچھ اور تھی وہاں جن نظریات کے سہارے لوگ نئی دنیا میں پہنچے وہ نظریات مذہبی نہیں تھے، وہ سیکولر نظریات تھے اور لوگوں کی زیادہ تر توجہ دوسری دنیا کی طرف ہونے کی بجائے اس دنیا پر لگی ہوئی تھی جس دنیا میں وہ رہ رہے تھے۔ یہ بات George Wilhelm Friedrich Hegel کی تحریروں میں صاف واضح تھی۔ ہیگل بلند و برتر خدا کو زمین پر لے آیا اور اسے آدمی بنا دیا۔ کمال فوق الفطرت ہونے میں نہیں بلکہ فطرت سے ہم آہنگ ہونے میں ہے۔ معمول کی عام زندگی میں اسے تلاش کرنا ہے۔ جسے روحانیت سے کوئی واسطہ نہ ہو ہیگل کی تصنیف "The Phenomenology of Mind (1807)" میں ہے کہ روح کائنات اس وقت پوری طرح اپنے وجود میں آئے گی جب وہ زمان و مکان کے محدود حالات میں شامل ہوگی۔ انسانی ذہن میں اس کا پورا احساس موجود ہے۔ اس لئے بھی انسانوں کو بلند و برتر خدا کا پرانا تصور چھوڑ دینا چاہیے تا کہ ان کی سمجھ میں آ سکے کہ وہ خود خدا ہیں۔ یہ متھ جو تجسیم کے مسیحی تصور کا نیا زاویہ ہے ان ماڈرن لوگوں کی علیحدگی اور تنہائی کا مداوا بھی تھی اور ایک ایسی دنیا کو آباد کرنے کی کوشش بھی تھی جو خدا سے خالی ہو چکی تھی۔ اس کا مقصد انسانی وژن کا فروغ بھی تھا جس کی طاقت کانٹ اور ڈیکارٹ کے فلسفوں نے محدود کر دی تھی مگر اس سے بھی بڑی بات یہ ہے کہ ہیگل کی متھ جدیدیت کے آگے بڑھتے ہوئے عمل کی عکاس ہے۔ اس میں کہیں پیچھے پلٹ کر دیکھنا

نہیں ہے نہ سنہرے دور کی آرزو ہے۔ ہیگل کی دنیا بار بار نئے جنم لیتی ہے اس پرانے خیال کی تائید کی بجائے کہ ہر بات پہلے ہی کہی جا چکی ہے۔ ہیگل نے اس جدلیاتی عمل پر غور کیا جس کے تحت انسان ہمیشہ پرانے بتوں کو توڑتے رہے ہیں ماضی کے وہ تصورات رَد کرتے رہے ہیں جو مقدس اور ناقابل تردید سمجھے جاتے تھے۔ ان جدلیات میں ہر چیز اپنا مخالف ناگزیر طور پر سامنے لاتی ہے دونوں مخالف قوتیں آپس میں ٹکراتی ہیں۔ پھر ایک ہوتی ہیں جن سے ایک زیادہ جدید اکائی جنم لیتی ہے۔ یہ عمل اسی طرح جاری رہتا ہے۔ اس میں پرانی اور بنیادی چیزوں کی طرف واپسی کہیں نہیں ہے۔ مسلسل ایک نئی دنیا کی طرف آگے بڑھنا ہے جس دنیا کی پہلے کوئی مثال موجود نہیں۔

ہیگل کا فلسفہ نئی دنیا کی زبردست رجائیت کا مظہر تھا جس نے پرانی دنیا قطعی طور پر پیچھے چھوڑ دی تھی۔ مگر بعض لوگوں کی سمجھ میں یہ بات نہیں آئی ہیگل نے خدا کو اہمیت ہی کیوں دی۔ یورپ کے لوگوں کا خیال تھا کہ مذہب اور مائیتھالوجی صرف بوسیدہ ہی نہیں بلکہ خطرناک بھی ہیں۔ انہوں نے ہماری بیگانگی اور تنہائی کا احساس ختم کرنے کی بجائے اسے اور بڑھا دیا ہے خدا کو انسانیت کا تضاد قرار دیتے ہوئے ہیگل کے شاگرد Ludwing Feuerbach نے کہا مذہب انسان کو اس کے اپنے آپ سے الگ کر رہا ہے۔ خدا مکمل ہے انسان نامکمل ہے۔ خدا دائمی ہے انسان عارضی ہے۔ خدا طاقتور ہے انسان کمزور ہے۔ کارل مارکس (1818-1883) کے لئے مذہب ایک بیمار معاشرے کی علامت ہے، افیم ہے جس نے بیمار سماجی سسٹم کو قابل برداشت بنا رکھا ہے اور انسانوں کی توجہ اس دنیا سے دوسری دنیا کی طرف لگا کر یہ بیمار سماجی نظام ناقابل اصلاح بنا دیا ہے۔

دہریے اعلیٰ اخلاقی قدروں کے اہل بن گئے چارلس ڈارون (1809-82) کی تصنیف The origin of species by means of natural slection (1859) کی اشاعت کے نتیجہ میں یہ بات اور بھی واضح ہوگئی۔ اس سے جدید سائنس کا ایک اور پہلو سامنے آیا۔ بیکن کے کہنے کے مطابق حقائق جمع کرنے کی بجائے ڈارون نے یہ خیال ظاہر کیا کہ جانور پورے اور انسان اپنی مکمل شکل میں پیدا نہیں ہوئے (جیسا کہ انجیل میں آیا ہے) بلکہ ماحول کے مطابق طویل اور بتدریج ارتقائی عمل کا حصہ ہیں 1871 "The Descent of Man" میں ڈارون

نے بتایا کہ نسل انسانی نے بندر کی اسی ابتدائی نسل سے نشو ونما پائی ہے جو اورنگٹن گوریلا اور چیمپینزی کا مورث اعلیٰ تھا۔ بنیاد پرست حلقوں میں ڈارون دہریت کی سب سے بڑی مثال ہے مگر اس کی تصنیف اوریجن کا مقصد مذہب پر حملہ آور ہونا نہیں بلکہ وہ تو ایک سائنسی نظریہ کی محتاط اور سنجیدہ وضاحت ہے۔ ڈارون خود سمجھتا تھا کہ خدا کا ثابت کرنا ممکن نہیں مگر ہمیشہ مذہب کا احترام کرتا تھا۔ پھر بھی 'اوریجن' ایک حد فاضل تھی۔ اشاعت کے روز ہی اس کی 1400 جلدیں فروخت ہوئیں۔ یقینی طور پر 'اوریجن' اور ڈارون کی دوسری تصانیف نے انسان کی خود فریبی اور خود پرستی پر گہرا گھاؤ لگایا۔ کوپرنکس نے انسان کو کون ومکان کے مرکز سے ہٹا دیا تھا۔ ڈیکارٹ اور کانٹ نے اسے مادی دنیا سے ہٹا کر تنہا کر دیا تھا اور اب ڈارون نے بتایا کہ وہ تو محض جانور ہیں۔ خدا نے انسانوں کو خصوصی طور پر نہیں بنایا بلکہ انسانوں نے بھی عام چیزوں کی طرح نشو ونما پائی ہے۔ تخلیقی عمل اور دنیا میں خدا کے لئے کوئی جگہ نہیں۔ خونخوار دانتوں اور پنجوں کے ساتھ مشیت ایزدی شامل نہیں ہے۔

اوریجن کی اشاعت کے چند سال بعد مذہبی حلقوں میں کوئی ردعمل نہیں ہوا مگر جب سات اوینجلائی پادریوں نے اس پر اپنے مضامین اور تبصرے شائع کئے تو بہت ہنگامہ ہوا۔ اس کے ذریعے انجیل کے حوالے سے نئی تنقید عام لوگوں کے سامنے آئی تھی۔ اٹھارویں صدی کے آخر جرمن سکالرز نے ادبی تجزیئے آثار قدیمہ اور زبان دانی کے مطالعہ سے متعلق انجیل کا جائزہ نئی تکنیک سے لیا جس کا مقصد سائنسی مشاہدے اور تجربے پر مبنی طریقوں سے کام لینا تھا۔ ان کا کہنا تھا کہ انجیل کے پہلے پانچ باب جو حضرت موسیٰ سے منسوب ہیں دراصل ان سے بہت عرصے بعد مختلف مصنفوں نے لکھے تھے۔ باب Isaiah کے دو مختلف ذرائع ہیں اور غالباً داؤد نے زبور نہیں لکھی تھی۔ انجیل کے اکثر معجزے محض ادبی موشگافیاں ہیں۔ اس لئے انہیں لفظی معنوں میں نہیں سمجھا جا سکتا۔ انجیل کے اکثر سچے واقعات تاریخی نہیں ہیں۔ ''مضامین اور تبصرے'' میں برطانوی پادریوں نے اس پر زور دیا کہ انجیل کے ساتھ کوئی خصوصی اور رعائتی سلوک کی ضرورت نہیں ہے بلکہ اور کتابوں کی طرح اس پر بھی بھرپور تنقید ہونی چاہیے۔ نئی کتاب Higher Criticism 'برتر تنقید' میں لوگوس کی ریشنل وضاحت سے متھ پر اس کی برتری ثابت کی گئی۔ ریشنل سائنس کے ذریعے انجیل کی کہانیوں کا تجزیہ کیا گیا تو پتہ چلا کہ اس کے بعض دعوے صحیح نہیں انجیل کی کہانیاں محض متھ ہیں۔ جنہیں اب عام زبان میں سچ نہیں کہا جاتا۔ مسیحی بنیاد پرستوں کے لئے برتر تنقید

خطرے کا باعث بن گئی کیونکہ اسے مذہب پر حملہ کرنے کے مترادف سمجھا گیا۔ یہ بھی اس لئے ہوا کہ مغرب کے لوگ مائیتھالوجی کے حقیقی شعور سے محروم ہو گئے تھے اور سمجھتے تھے کہ انجیل کی کہانیاں اور ان کے تصورات کا تعلق لوگوس سے ہے۔ ایسی کہانیاں کہ جو واقعاتی لحاظ سے درست سمجھی جا سکتی ہیں اور جن کے مظاہر کی سائنسی تحقیق بھی ممکن ہے۔ ڈارون کے مفروضے اور انجیل کے پہلے باب میں اختلاف کو مدِنظر رکھتے ہوئے ڈارون کے امریکی دوست اور سائنسدان As Gray (1880-88) آسا گرے نے کوشش کی کہ وہ دوارون کے مفروضے قدرتی انتخاب اور کتاب پیدائش کے لفظی معنوں میں مطابقت پیدا کرے۔ اس کے بعد تخلیقی سائنس کے نام سے ایک پروجیکٹ اس سے بھی آگے گیا تا کہ کتاب پیدائش کو سائنسی نقطۂ نظر سے معتبر بنا سکے مگر ایک کمی رہ گئی کہ متھ کے طور پر انجیل کی پیدائش کہانی، زندگی کی اصلیت کا تاریخی جائزہ نہیں بلکہ خود زندگی کی معنویت کا روحانی عکس ہے جس کے متعلق سائنسی لوگوس کے پاس کہنے کے لئے کچھ نہیں۔

ہر چند کہ ڈارون کا یہ مقصد نہیں تھا مگر اوریجن کی اشاعت سے مذہب اور سائنس کے مابین کشیدگی پیدا ہوگئی مگر پہلا وار مذہبی حلقوں کی طرف سے نہیں ہوا بلکہ سیکولرازم کے حامیوں نے پہل کی۔ انگلستان میں ٹامس ایچ ہکسلے (1825-95)، کارل ووگی (1817-95)، جیکب مولسکاٹ (1822-93) لڈوگ بشنر (1824-99)، ارنیسٹ ہیکل (1834-1919) نے ڈارون کی تھیوری کی تشہیر کی۔ انہوں نے مختلف مقامات کے دورے کئے بڑے بڑے اجتماعات میں تقریریں کیں، یہ ثابت کرنے کے لئے سائنس اور مذہب کا آپس میں کوئی رشتہ نہیں۔ درحقیقت ان کا مقصد مذہب کے خلاف صلیبی جنگ لڑنا تھا۔

ہکسلے واضح طور پر جانتا تھا کہ اسے اب اس صورتحال سے لڑنا ہے۔ ریزن (عقل) لازمی طور پر سچائی کا واحد معیار ہونا چاہیے۔ لوگوں کو مائیتھالوجی اور ریشنل سائنس مین سے ایک کا انتخاب کرنا ہے۔ سمجھوتے کی کوئی صورت نہیں۔ نامعلوم مدت کی جدوجہد کے بعد بس ایک کو باقی رہنا ہے۔ ہکسلے کی رائے میں سائنسی ریشنلزم ایک نیا سیکولر مذہب ہے۔ اسے اختیار کرنا ہے اور پوری ذمہ داری کے ساتھ اس کا وفادار رہنا ہے ''ذہن کے معاملے میں اپنے استدلال کے ساتھ وہاں تک چلو جہاں تک وہ تمہیں لے جائے اس کے علاوہ کسی بات کی پرواہ نہ کرو۔'' اس کے منفی پہلو کا ذکر کرتے ہوئے ہکسلے نے کہا کہ ''ذہن کے معاملات مین وہ نتائج صحیح نہ سمجھو جو پایۂ ثبوت

کونہیں پہنچے یا ثبوت کے قابل نہیں،، ہکسلے کوتمام جدیداور ترقی پسند کلچر کی حمایت حاصل تھی۔اسے اتنی شاندار کامیابی حاصل ہو چکی تھی کہ اس نے بڑے جارحانہ انداز مین دعویٰ کیا کہ سچائی کے متعلق ثالثی کا اختیار صرف اسے حاصل ہے۔مگر''سچ'' ثابت ہونے اور ثبوت کے قابل ہونے کی تکرار میں محدود ہو کر رہ گیا اور مذہب کی بات تو خیرا لگ رہی۔آرٹ اور موسیقی کے ذریعے معلوم ہونے والا سچ بھی اس بحث سے خارج ہو گیا۔ہکسلے کے پاس کوئی اور ممکن راستہ نہیں تھا۔وہ صرف عقل ہی کو سچ سمجھتا تھا اور مذہب کی دیومالاؤں کو سچ کا درجہ نہیں دیتا تھا۔اس کا رویہ قدیم دیومالائی پابندیوں کے خلاف اعلان آزادی تھا۔اس کے خیال میں عقل کسی اونچی عدالت کے سامنے جواب دہ نہیں۔نہ اخلاقیات کی پابند ہے۔اسی موضوع پر Buchner کی تصنیف "Force and Matter" شائع ہوئی۔ایک غیر شائستہ کتاب جسے ہکسلے خود بھی ناپسند کرتا تھا۔اس میں کہا گیا تھا کہ کائنات کا کوئی مقصد نہیں اور ایک احمق ہی خدا کو مان سکتا ہے۔جس طرح یہ کتاب مقبول ہوئی اور لاتعداد لوگوں نے Buchner کی تقریروں میں دلچسپی لی اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یورپ میں لوگ یہ سننا چاہتا تھے کہ سائنس نے مذہب کو ہمیشہ کے لئے رد کر دیا ہے ایسا اس لئے ہوا کہ فلسفیوں نقادوں اور جدید سائنس دانوں نے مذہبی حقائق لوگوں کے طور پر پیش کئے اور اس طرح انہیں قابل یقین بنادیا۔1882 میں نیٹشے(1844-1900) نے اعلان کیا کہ خدامر گیا ہے۔The Gay Sciece میں اس نے ایک کہانی سنائی ہے کہ ایک پاگل صبح سویرے بازار میں دوڑتا ہوا چیخ رہا تھا کہ مجھے خدا کی تلاش ہے۔لوگوں نے اس سے پوچھا کہ کیا تم سمجھتے ہو کہ خدا کہیں بھاگ گیا ہے؟ بھاگا کہاں ہے۔پاگل نے گھورتے ہوئے کہا''تم نے اور میں نے اسے مار ڈالا ہے۔ہم سب اس کے قاتل ہیں۔''نیٹشے ایک لحاظ سے ٹھیک ہی کہہ رہا تھا۔متھ، مسلک، رسوم اور عبادات کے بغیر خدا کا تصور ختم ہو جاتا ہے۔خدا کو ایک بالکل خیالی صداقت بنانے اور محض ذہن کے زور پر اسے پانے کی کوشش میں نئے لوگوں نے اسے گنوا دیا وہ ان کے لئے مر گیا ہے۔مستقبل سے وابستہ ان کے کلچر نے خدا کے ادراک کو نفسیاتی طور پر ناممکن بنادیا۔یہودی Marronos کی طرح (کہ جنہوں نے مختلف وجوہات کی بناء پر اپنے آپ کو مذہبی برزخ مین دھکیل دیا تھا) ماڈرن لوگوں کو مذہبی حقائق، کمزور، آمرانہ اور ناقابل فہم لگتے تھے۔

نیٹشے کے پاگل کو یقین تھا کہ خدا کی موت نے بنی نوع انسان کی جڑیں کاٹ دی ہیں۔

زمین اپنے مقام سے ہٹ گئی ہے اور بے بسی کے عالم میں ایک ایسی کائنات میں جا پہنچی ہے جس میں کوئی راستہ نہیں۔ ہر وہ چیز ختم ہو چکی ہے جو کبھی انسانوں کو سمت کا شعور دیتی تھی۔ ''کیا اب بھی کوئی بلند و پست کا امتیاز ہے؟'' وہ پوچھا کرتا ''کیا ہم ایسے عدم میں بھٹک نہیں رہے کہ جس عدم کی کوئی حد نہیں جو لامتناہی ہے بے پناہ خوف زندگی کے بے معنی ہونے کا احساس اور اپنے مٹ جانے کا ڈرنئی دنیا کے تجربے کا حاصل ہے۔'' نیٹشے اس وقت یہ لکھ رہا تھا جب جدیدیت کا دلکش عمل زوروں پر تو تھا مگر ایک بے نام خوف کا سبب بھی بن رہا تھا۔ اس صورتحال سے صرف عیسائی ہی متاثر نہیں ہوئے بلکہ جدیدیت کے عمل میں شامل یہودی اور مسلمان بھی اس کے اثر سے محفوظ نہ رہ سکے۔ انہوں نے بھی اسے عیسائیوں کی طرح ہی پیچیدہ پایا۔

یہودی اور مسلم جدیدیت
1700-1870

اگر جدیدیت یورپ اور امریکہ کے عیسائیوں کے لئے مشکل تھی تو یہودیوں اور مسلمانوں کے لئے تو اور بھی بڑا مسئلہ بن گئی تھی۔ مسلمان تو جدیدیت کو اجنبی اور جارحانہ طاقت سمجھتے تھے جس کا تعلق غلامی اور نوآبادیت سے تھا۔ انہیں ایک ایسی تہذیب سے ہم آہنگ ہونا تھا جس کا اسم اعظم لفظ آزادی تھا جبکہ وہ خود غلامی کے بوجھ تلے سسک رہے تھے۔ جدید تصورات نمایاں طور پر یہودیت کے خلاف تھے۔ رواداری کے دعووں کے باوجود روشن خیالی کے مفکر یہودیوں کو حقارت سے دیکھتے تھے۔ والٹیر (1694-1778) نے اپنی تصنیف Dictionnaire Philosophique 1756 میں انہیں بالکل ہی جاہل قوم لکھا ہے۔ ''اپنی قابل نفرت ذلت اور وہم پرستی کے ساتھ وہ ان قوموں سے شدید نفرت کرتے ہیں جنہوں نے انہیں برداشت کیا تھا۔'' Boron d'Holbach(1723-89) یورپ کے مانے ہوئے پہلے دہریوں میں سے ایک تھا۔ اس نے یہودیوں کو بنی نوع انسان کے دشمن کہا۔ کانٹ اور ہیگل کی نظر میں یہودیت غلامانہ گرا ہوا مذہب اور ریشنلزم کے بالکل خلاف ہے جبکہ کارل مارکس (جو خود یہودی نسل سے تھا) نے سرمایہ داری کے لئے یہودی کو ذمہ دار ٹھہرایا۔ مارکس کے خیال میں دنیا کے اندر تمام برائیوں کی جڑ سرمایہ داری ہے۔ چنانچہ یہودیوں کو بڑی نفرت کے ماحول میں جدیدیت اختیار کرنا پڑی۔

امریکہ میں اٹھارویں اور انیسویں صدی کے واقعات نے پروٹیسٹنٹ عیسائیوں کو دو مخالف

کیمپوں میں تقسیم کر دیا۔ انہی دنوں اسی قسم کی باہمی مخالف مشرقی یورپ کے یہودی علاقوں میں موجود تھی۔ پولینڈ، گلیشیا، بیلوریا اور لتھونیا کے یہودی مخالف پارٹیوں میں بٹ چکے تھے ان مخالف فریقوں نے یہودی بنیاد پرستی کی تشکیل میں اہم کردار ادا کیا۔ Hasidim ہیزیڈم جو New Lights سے مختلف نہیں تھے انہوں نے اپنے آپ کو ٹھیک اس وقت ظاہر کیا جب امریکی کالونی پہلی عظیم بیداری کے دور سے گزر رہے تھے۔ 1735 میں ایک شراب خانے کے مالک اسرائیل بن الیزر نے اعلان کیا کہ اسے الہام ہوا ہے۔ جس نے اسے ماسٹر آف دی نیم یعنی بال شیم بنا دیا ہے۔ (بال شیم Hasidim کا بانی) گلی کوچوں اور پولینڈ کے دیہات میں گھوم کر لوگوں کا علاج کرنے اور بدروحوں کا اثر زایل کرنے والوں میں سے تھا مگر اسرائیل نے خصوصی حیثیت اور شہرت حاصل کر لی کیونکہ وہ غریبوں کے روحانی علاج کے علاوہ ان کی مادی ضروریات کا خیال بھی رکھتا تھا۔ اس لئے وہ بیپٹسٹ کہلانے لگا یعنی (خصوصی حیثیت کا مالک) پولینڈ کی یہودی بستیوں پر یہ وقت بہت بھاری تھا۔ لوگ ابھی شبیتائی سکینڈل سے ہی سنبھل نہ پائے تھے۔ یہودی جو 1648 کے قتل عام کے بعد مسلسل معاشی بحران میں مبتلا تھے اب روحانی مشکلات کی زد پر تھے۔ اپنا دامن بچانے کی کوشش میں مالدار یہودی ٹیکس ایمانداری سے ادا نہیں کرتے تھے غریبوں اور مالداروں کے درمیان سماجی تفریق اور بڑھ گئی۔ مالدار اور زورآور طبقوں نے اقتدار سنبھال لیا اور غریبوں کا جینا حرام ہو گیا۔ مزید خرابی یہ ہوئی کہ یہودی پادری ظالموں کے ساتھ مل گئے۔ غریبوں کی حالت پر توجہ دینے کی بجائے فضول بحث و تکرار اور مناظروں میں وقت ضائع کرتے رہتے۔ غریب بے سہارا ہو گئے توہمات کا زور تھا۔ اخلاقی زوال اور روحانی انتشار کی کیفیت تھی۔ ایسے میں ہیزیڈم کے مشہور اور مقبول مبلغوں نے غریبوں کی حمایت کا فیصلہ کیا ان کی تعلیم تربیت پر توجہ دینے لگے اور یہودیوں کی مذہبی اسٹیبلشمنٹ کی سخت مذمت کی کہ وہ اپنا فرض ادا کرنے میں ناکام ثابت ہوئی ہے۔ ہیزیڈم کے رہنما اکثر الگ سیل اور عبادت گزاروں کے گروپ بناتے جو سینی گاگ سے بالکل الگ اور آزاد ہوتے تھے۔ 1735 میں ان ہیزیڈی حلقوں کے سامنے اس نے اپنے آپ کو پیش کیا، بال شیم ہونے کا دعویٰ کیا اور ان کا رہنما بن گیا۔ بشیت نے ہیزیڈم کو بالکل بدل کر رکھ دیا۔ ہیزیڈم کے صوفیوں اور مبلغوں نے بددیانت ملاؤں سے اختیار لے لیا اور لوگوں کے روحانی مسائل پر توجہ دینے لگے۔ 1750 تک ہیزیڈم کے سیل، پولینڈ، گلیشیا اور

یوکرین کے شہروں میں پھیل گئے۔ ایک ذریعے کے مطابق بشیت کے مقلدوں کی تعداد چالیس ہزار تک پہنچ چکی تھی جو اپنی الگ عبادت گاہوں میں عبادت کرتے تھے۔ انیسویں صدی کے آغاز تک پولینڈ، یوکرین اور مشرق گلیشیا کے اکثر یہودی فرقوں پر ہیزیڈم ازم کا اثر غالب آچکا تھا۔ سفید روس اور رومانیہ کے اکثر شہروں میں بھی پھیل چکا تھا اور لتھونیا میں ابھی پھیلنا شروع ہوا تھا۔

پروٹیسٹنٹ ازم کی نیولائٹ کی طرح ہیزیڈم بھی مذہبی اسٹیبلشمنٹ کے خلاف عوامی تحریک بن گئی ہیزیڈم نے بھی نیولائٹ کی طرح اپنی الگ عبادت گاہیں بنائیں۔ عام لوگوں میں دونوں تحریکیں بہت مقبول تھیں جس طرح پروٹیسٹنٹ چیدہ افراد کی علمی اور دینی مہارت رَد کرتے تھے اسی طرح ہیزیڈینی نے بھی تورات کے متعلق یہودی علماء کی بنجر اور بے ثمر علمیت پر لعنت بھیجی بشیت نے اعلان کیا کہ تورات کی تلاوت پر عبادت کو فضیلت حاصل ہے۔ یہ ایک انقلابی قدم تھا۔ اس لئے کہ صدیوں سے یہودی اپنے علماء کی برتری پر اس لئے ایمان لاتے رہے کہ انہیں تورات میں بصیرت حاصل ہے مگر اب انہوں نے محسوس کیا کہ وہ فوری سماجی مسائل سے بھاگ کر کتاب مقدس کی آڑ لے رہے تھے۔ ہیزیڈم نے ان کی اس منافقت کی بھرپور مذمت کی اگرچہ وہ خود کتاب مقدس کا مطالعہ مختلف طریقے سے کیا کرتے تھے۔

نیولائٹ پروٹیسٹنٹ ازم جدیدیت پسند روحانیت تھی۔ جبکہ ہیزیڈم قدامت پسند اصلاحی تحریک تھی اس کی روحانیت دیومالائی تھی۔ جس کی بنیاد خدائی تجلیات کی لوریائی علامت پر تھی مگر بشیت نے اس فرسودہ وژن کو خدا کے ہر جگہ حاضر و ناظر ہونے کی مثبت حقیقت میں بدل دیا۔ خدا ہر چیز میں جلوہ گر ہے۔ کوئی جگہ ایسی نہیں جہاں خدا موجود نہ ہو۔ ہیزیڈم کو خدا کے ساتھ ہمیشہ وابستہ رہنے اور گہرے غور وفکر کے نتیجے میں اس مخفی حقیقت سے آگاہی ہوئی۔ کوئی عمل دنیاوی ہو کہ نفسانی، بے دینی کے زمرے میں نہیں آتا۔ خدا ہر جگہ موجود ہے وہ حاضر و ناظر ہے کھانے پینے محبت کرنے یا دیگر دنیاوی فرائض انجام دیتے ہوئے اسے محسوس کیا جاسکتا ہے۔ خدا کی موجودگی سے آگاہی کا ثبوت ہیزیڈم کو اپنے عمل سے کرنا چاہیے۔ بالکل ابتداء سے ہی ان کی عبادت پرشور اور پرکیف تھی۔ مکمل سپردگی کی کوشش میں وہ عبادت کے دوران عجیب وغریب حرکات کرتے۔ تالی بجاتے، جھومتے ہوئے اپنا سر آگے کبھی پیچھے لے جاتے ہاتھوں سے دیواروں کو زور زور سے پیٹتے اور جسم کو لہراتے ہوئے دائیں بائیں آگے پیچھے لے جاتے۔ اس عمل

کے ذریعے وہ اپنے ذہن کی گہری سطح پر اتر کر سیکھنا چاہتے تھے کہ ان کا پورا وجود آس پاس کی قدرتی طاقتوں سے اس طرح اثر قبول کرے جیسے چراغ کی لو ہوا کے ہر جھونکے کے ساتھ ٹمٹماتی ہے۔ان میں بعض افراد تو اپنی انا زیر کرنے کے لئے سینا گوگ میں قلابازیاں لگاتے کہ خدا کے سامنے ان کی سپردگی کا عمل مکمل ہو۔

ہیز یڈم ازم کی اصلاحات کی جڑیں ماضی میں تھیں۔جنہیں اس طرح پیش کیا گیا گویا کھوئی ہوئی چیز ہاتھ لگ گئی ہو۔بشیت نے دعویٰ کیا کہ اس نے خدائی اسرار آہچہ آف شلوہ سے سیکھے ہیں جو پیغمبر ایلیاہ کے استاد تھے اور یہ کہ اب اس میں بھی ایلیاہ کی روح کارفرما ہے بشیت اور اس کے پیرو اب بھی آسمانی صحیفہ کو پرانے دیومالائی انداز میں پڑھتے تھے۔انجیل کو تنقیدی نظر سے دیکھنے یا معلومات حاصل کرنے کی بجائے ہیز یڈم نے تورات کا مطالعہ ایک روحانی ڈسپلن بنالیا۔''میں تمہیں تورات پڑھانے کا بہترین طریقہ سکھاؤں گا۔'' بشیت اپنے ماننے والوں سے کہا کرتا ''اپنے آپ کو بالکل بھلا دینا ہے سننے والے اس کان کی طرح ہیں جو سنتا ہے مگر بولتا نہیں۔'' ہیز یڈم کو اپنی انا سے پیچھا چھڑا کر خدائی کلام میں ڈوب جانا ہے۔اپنی ذات سے اوپر اٹھنے کا عمل مذہبی طاقتوں میں ڈسپلن کا تقاضہ کرتا ہے جو امریکی ترمیم پسندوں کے مجنونانہ وجد سے بالکل مختلف ہے۔بشیت کو لفظی معنوں میں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔وہ لفظوں سے آگے دیکھنے کی تلقین کرتا تھا جیسا کہ اس نے اپنے پیروؤں سے کہہ رکھا تھا کہ وہ دنیا کے ظاہر کی بجائے اس کے باطن پر نظر رکھیں۔کہتے ہیں کہ ایک روز ایک بہت پڑھا لکھا کبالائی Dov Ber (1710-72) (جو ہیز یڈم تحریک کے رہنما، بشیت کے جانشین کے طور پر بنا) بشیت سے ملنے آیا۔دونوں نے فرشتوں کے متعلق لوریائی نقطۂ نظر پر بحث کی۔بشیت نے جانا کہ اس Dov کی لفظی تفسیر صحیح تو ہے مگر تشنہ ہے۔بشیت نے اس سے فرشتوں کے احترام میں کھڑا ہو جانے کو کہا۔جونہی وہ کھڑا ہوا تمام کمرے میں روشنی ہی ہوگئی۔ہر طرف آگ سی روشن ہوگئی۔ان دونوں نے محسوس کیا کہ جن فرشتوں کا وہ ذکر کر رہے تھے وہ آموجود ہوئے ہیں۔جیسا کہ تم کہتے ہو مطالعہ لفظی ہے بشیت نے ڈو سے کہا مگر تمہارے پڑھنے کا انداز بے روح ہے۔عبادت کی رسوم وآداب اور مسلمہ طریقوں کے بغیر بالکل ریشنل طرز کا مطالعہ ہیز ڈ کو اس ان دیکھی حقیقت سے ہم کنار نہیں کرسکتا جس کی طرف کتاب مقدس میں اشارہ کیا گیا ہے۔

کئی لحاظ سے ہیزیڈم ازم یورپی روشن خیالی کا تضاد تھا جو مشرقی یورپ پہنچنا شروع ہی ہوا تھا۔ یہ بشیت کی زندگی کا آخری دور تھا۔ فلسفی اور سائنس دان سمجھتے تھے کہ صرف عقل ہی سچ کو پانے کا ذریعہ ہے مگر بشیت نے ریشنل ازم کے پہلو بہ پہلو صوفیانہ وجدان کو بھی فروغ دیا۔ ہیزیڈم جدیدیت اور مذہب کو سیاست سے اور مقدس کو دنیاوی آلائشوں سے الگ کرنے کے خلاف تھا۔ اس نے تقدیس کا ایسا وژن دیا جس کے ذریعے تقدیس ہر جگہ نظر آسکتی تھی۔ جدید سائنس نے کائنات خدا سے خالی پائی جبکہ ہیزیڈم نے کائنات میں دائمی اور خلقی تقدس کا وجود محسوس کیا۔ اگرچہ وہ لوگوں کی تحریک تھی مگر جمہوریت سے اسے واسطہ نہ تھا۔ بشیت کو یقین تھا کہ عام ہیزڈ خدا کا قرب براہ راست حاصل نہیں کرسکتا۔ اسے خدا صرف ہیزیڈک یعنی کسی پاکباز شخص کی صورت میں ملے گا۔ جس نے اپنی مسلسل ریاضت سے آگہی کے صوفیانہ مدارج طے کر لئے ہوں مگر ایسا کرنا ہر شخص کے بس کی بات نہیں۔ چنانچہ ہیزد کا تمام انحصار اپنے ہیزیڈک رویہ پر تھا۔ ایک ایسا رویہ جسے کانٹ نے بے ہودہ کہہ کر رَد کردیا۔ ہیزیڈم بنیادی طور پر روشن خیالی کے خلاف تھا اس لئے اکثر ہیزیڈم اسے ان دنوں رَد کردیتے جب وہ تحریک مشرقی یورپ میں پھیلنی شروع ہوئی۔

جب تک بشیت زندہ رہا یہودی ملاؤں نے اسے اہمیت نہ دی مگر نئے لیڈر مانے ہوئے عالم ڈوبر کی بات الگ تھی۔ تحریک نے اس کی قیادت میں خوب ترقی کی جب تحریک لتھونیا تک پھیل گئی تو ایک نہایت بااثر شخصیت ایلیاہ بن سلمان زلمن(1720-97) نے اس کی طرف توجہ کی۔ ایلیاہ دلنا اکیڈمی کا سربراہ(Gaon) تھا۔ وہ ہیزیڈک تحریک کے طور اطوار دیکھ ششدر رہ گیا۔ خاص طور پر تورات کے مطالعے میں جو طریقے انہوں نے اختیار کئے تھے وہ ان سے بہت ملول ہوا کیونکہ تورات کا مطالعہ اس کا سب سے بڑا شوق تھا۔ اس کا علم بہرحال بددیانت پولش علماء کے مغالطہ انگیز علم سے بالکل مختلف تھا۔ اس کے علم پر تصوف کی گہری چھاپ تھی۔ اس کے بیٹوں نے بتایا کہ وہ رات بھر مطالعہ کرتے ہوئے اپنے پاؤں برف کے پانی میں ڈبوئے رکھتا تا کہ اسے نیند نہ آئے۔ ہیزیڈم کا مطالعہ تورات کی نسبت گاؤن کا مطالعہ تورات زیادہ زور دار عمل تھا۔ جسے گاؤن خصوصی کوشش کا نام دیتا تھا۔ ایسا لگتا ہے کہ اپنی اس کوشش کے زور پر ہی وہ آگہی کی نئی منزلوں پر جا پہنچا۔ اگر کبھی اس کی آنکھ لگ جاتی تو اس کے خوابوں میں بھی تورات

آ موجود ہوتی اور اسے خدا کا صوفیانہ قرب حاصل ہوتا۔ چنانچہ اس کے لئے تورات کا مطالعہ خدا کا سامنا کرنے کے مترادف تھا جیسا کہ اس کے پیر Hayyim Vriozhiner (جس سے ہماری ملاقات پھر کسی وقت ہوگی)(1821-1749) نے واضح کیا کہ تورات کی تلاوت کرنے سے خدا کا قرب حاصل ہوتا ہے کیونکہ خدا اور تورات ایک ہیں۔ گوؤن نے جدید علوم کے لئے بھی وقت نکال لیا۔ اسے نجوم، اناٹومی، ریاضی اور غیر ملکی زبانوں سے خاصی واقفیت تھی۔ ہیزیڈم کو وہ ناقابل فہم اور کافر سمجھتا تھا۔ اختلاف اور بڑھتے گئے۔ گوؤن کے حامیوں کو ہیزیڈم مخالفین کہتے تھے۔ اگر ان کی جماعت کا کوئی رکن ہیزڈ بن جاتا تو اس کے لئے مغفرت کی دعائیں کی جاتیں گویا کہ وہ مر گیا ہے۔ ہیزیڈم انہیں سرے سے یہودی ہی نہیں سمجھتے تھے۔ آخر کار 1772 میں گوؤن نے ہیزیڈم کو ولنا اور بروڈی سے نکال باہر کیا۔ کہا جاتا ہے کہ اس بائیکاٹ کے صدمے سے ہی Dov Ber کی موت واقع ہوئی۔

گوؤن کی زندگی کے آخری دنوں میں یوکرین کے ایک ہیزیڈک لیڈر پادری زلمن (1813-1745) نے صلح کی کوشش کی مگر گوؤن نے اس کے ساتھ بات کرنے سے انکار کر دیا۔ دراصل زلمن کی تصنیف تانیا (1791) ایک نئے بائیکاٹ کا سبب بنی۔ زلمن ہبد کے نام سے نئی قسم کا ہیزیڈم تشکیل دے رہا تھا۔ جو مخالفین کی روحانیت سے بہت قریب تھا اس لئے کہ اس نے روحانی سفر اور جستجو کے لئے ریشنل فکر شرط اول قرار دی تھی۔ زلمن روشن خیالی کے بعض تصورات سے بھی رجوع کرنے کے لئے تیار تھا۔ جنہیں وہ تصوف کے حوالے سے ایک مخصوص مقام دینے کی کوشش میں تھا۔ اسے یقین تھا کہ محض ریشنل صلاحیتیں ہمیں خدا کی تلاش میں مدد نہیں دے سکتیں۔ اگر ہم اپنی حسیات پر بھروسہ کریں جیسا کہ ہمیں سائنس دانوں اور فلسفیوں نے بتایا تو دنیا خدا سے خالی دکھائی دے گی مگر صوفی اپنی وجدانی قوت کے ذریعے ادراک کا ایسا طریقہ اختیار کر سکتا ہے جس کے ذریعے اسے ہر چیز میں خدا جلوہ گر نظر آئے۔ زلمن عقل کا مخالف نہیں تھا بلکہ اس قدیم تصور کو صحیح ثابت کرنا چاہتا تھا کہ صرف ریشنل فکر ہی ادراک کا واحد ذریعہ نہیں۔ عقل اور دیومالائی وجدان کو دوش بدوش چلنا ہے۔ جب یہودیوں نے ریشنل طرز فکر اور جدید سیکولرازم کو سمجھنے کی کوشش کی تو انہیں اپنے ذہنی عجز کا احساس ہوا اس لئے اپنے ذہنوں سے اوپر اٹھنے کے لئے انہوں نے وجدانی عبادت کا سہارا لیا۔ زلمن ہبڈ ہیزیڈم کو تلقین کرتا کہ وہ بشیت کی بتائی ہوئی

کٹھن ریاضتوں کے ذریعے اپنے ذہنوں سے اوپر اٹھنے کا شعور پیدا کریں زلمن خود بھی زمین پر لوٹتا رہتا یہاں تک کہ اس پر وجدانی کیفیت طاری ہوجاتی اور وہ عام لوگوں کی طرح رقص کرنے لگتا مگر اس کے وجد کی جڑیں اس کے علم اور ارتکاز میں تھیں۔ ہیڈ ہیزیڈم کو سکھایا جاتا تھا کہ وہ اپنا لاشعور ذہن کی گہرائیوں میں اتاریں یہاں تک کہ صوفیوں کی عظیم روایات کی طرح ان کے وجود میں کوئی شمع روشن ہو۔

ہیزیڈم اور مخالفین میں اختلاف بڑھتا گیا۔ زلمن چند سال سینٹ پٹیر برگ میں قید رہا کیونکہ مخالفین نے اسے شر پسند قرار دے کو روسیوں کے حوالے کر دیا تھا مگر انیسویں صدی کے آغاز میں اشتعال انگیزی کم ہونے لگی۔ فریقین کو احساس ہونے لگا کہ ایک دوسرے سے ڈرنے کی بجائے ان لوگوں سے محتاط رہا جائے جو دونوں کے لئے خطرہ کا باعث بن سکتے ہیں اس لئے ان کا مقابلہ متحد ہو کر کرنا چاہیے۔ ان میں سب سے خطرناک روشن خیالی کی یہودی تحریک ہسکالاح تھی جو مشرقی یورپ کی یہودی بستیوں میں حال ہی میں پھیلنی شروع ہوئی تھی اور جو ہیزیڈم اور مخالفین دونوں کی نظر میں کافرانہ تھی۔

ہسکالا (Moses Mendelssohn (1729-86 کی تخلیق تھی جو جرمنی کے ایک غریب عالم دین کا ذہین بیٹا تھا اور چودہ برس کی عمر میں اپنے محبوب استاد کے لئے برلن چلا گیا تھا۔ وہاں اس کے دل میں جدید ریشنل تعلیم حاصل کرنے کا شوق پیدا ہوگیا۔ حیرت انگیز رفتار سے اس نے جرمن، فرانسیسی، انگریزی، لاطینی، ریاضی اور فلسفہ میں کمال حاصل کیا۔ جرمنی کی روشن خیالی کی تحریک میں بھی اس کا حصہ لینے کو بہت جی چاہا وہ کانٹ کا ذاتی دوست بن گیا اور اپنا فالتو وقت پڑھنے لکھنے میں صرف کرنے لگا۔ اس کی پہلی تصنیف (1767) 'Phachedon' میں ریشنل سطح پر روح کا غیر اخلاقی ہونا ثابت کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔

یہودیت کا اس کتاب میں کوئی ذکر نہیں تھا مگر اسے اپنی مرضی کے خلاف یہودیت کا دفاع اس وقت کرنا پڑا جب روشن خیالوں کی طرف سے یہودیت پر اعتراض کئے گئے۔1769 میں سوئٹزرلینڈ کے ایک پادری john Casper Larvater نے مینڈیلسن کو چیلنج کیا کہ وہ پبلک میں یہودیت کا دفاع کرے اور اگر وہ عیسائیت کے حق میں ریشنل ثبوت رد نہ کر سکے تو عیسائیت اختیار کر لے۔ اس چیلنج کے علاوہ وہ ایک پمفلٹ کی وجہ سے بھی پریشان تھا جو Van

Dahnn نے یہودیوں کے خلاف لکھا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ نئی دنیا مین بھرپور حصہ لینے کے لئے ضروری ہے کہ ایک قوم اپنے زیادہ سے زیادہ اہل افراد کی صلاحیتیں بروئے کار لائے، اس لئے لازم ہے کہ یہودیوں کی حیثیت بحال کر کے انہیں معاشرے میں مناسب مقام دیا جائے، چاہے انہیں شہریت نہ دی جائے اور نہ سرکاری ملازمتوں میں لیا جائے اس لئے کہ یہودی ناقابل اعتماد اوران کا مذہب وحشیانہ ہے۔

بالآخر منڈیلسن نے محسوس کیا کہ اسے جواب دینے سے مفر نہیں 1783 میں اس نے اپنی تصنیف 'یروشلم اور یہودیت' شائع کی۔ جرمن روشن خیالی کا رویہ مذہب کی طرف مثبت تھا۔ منڈیلسن بھی لاک کی طرح Deist مدرسۂ فکر سے متعلق تھا۔ حالانکہ اسے یہودیت کا درجہ دینا مشکل ہے۔ منڈیلسن سمجھتا تھا کہ خدا کے وجود کا اقرار کرنا تو بالکل قدرتی بات ہے مگر عقل کو مذہب پر سبقت حاصل ہے۔ انجیل کی صداقت تسلیم کرنے کے لئے لازم ہے کہ وہ عقلی (ریشنل) سطح پر صحیح ثابت ہو مگر اس طرح تو روایتی قدیم مذہب کی تمام ترجیحات ہی الٹ گئیں حالانکہ پہلے سے ہی یقین کیا جاتا تھا کہ انجیل کی دیو مالاؤں کی حقیقت ثابت کرنا عقل کے بس کی بات نہیں۔ منڈیلسن مذہب کو کلیسا سے الگ کرنے کا حامی بھی تھا مذہب کو ذاتی معاملہ سمجھتا تھا۔ مسئلہ کا یہ حل یہودیوں کے لئے پرکشش تھا جو ایک زمانے سے گیٹو کی پابندیوں سے نجات حاصل کرنا چاہتے تھے اور یورپی کلچر کے بڑے دھارے میں شامل ہونا چاہتے تھے۔ مذہب کو خالص ذاتی معاملہ سمجھتے ہوئے، وہ اچھے یورپین بھی رہ سکتے تھے اور یہودی بھی۔ منڈیلسن کا مؤقف تھا کہ یہودیت ریشنل مذہب ہے وقت کے مزاج کے مطابق ہے اوراس کے اصولوں (ڈاکٹرین) کی بنیاد عقل پر ہے۔ کوہ طور پر جب خدا حضرت موسیٰ سے ہم کلام ہوا تھا تو یہودیوں کے لئے محض چند اُصول نہیں بلکہ قانون لایا گیا تھا۔ اس لئے یہودیت کا تعلق صرف اخلاقیات اور انسانی رویے سے ہے۔ اس نے یہودیوں کے ذہن آزاد کر دیئے۔ منڈیلسن کو یہودیت کے دیو مالائی اور صوفیانہ پہلوؤں کی شاید ہی کچھ سمجھ ہو۔ اس ضمن میں کی گئی کوششوں میں سے اس کی پہلی کوشش یہ تھی کہ یہودیت کو ریشنلزم میں دھکیل کر اسے جدید دنیا کے لئے قابل قبول بنا دیا جائے حالانکہ ریشنلزم دوسرے کئی مذاہب کی طرح یہودیت کے لئے بھی اجنبی تھا۔

منڈیلسن کے خیالات مشرقی یورپ کے ہیزیڈم اور مخالفین کے لئے قابل نفرت تھے جیسے

کہ وہ مغربی دنیا کے قدامت پسند یہودیوں کے لئے تھے اسے نیا سپینوزا کہہ کر اس کی مذمت کی گئی، ایک کافر اپنا مذہب ترک کر کے غیر یہودیوں میں جا ملا تھا۔ منڈیلسن کو ضرور اس سے دکھ ہوا ہوگا اگر چہ وہ روایتی یہودیت کا بہت سا حصہ اجنبی اور غیر معتبر سمجھتا تھا مگر وہ اپنے یہودی خدا اور اپنی یہودی شناخت سے دستبردار نہیں ہونا چاہتا تھا۔ اس کے بہت سے پیروکار تھے۔ شبتائی زیوی کے واقعہ کی وجہ سے اکثر یہودی چاہتے تھے کہ وہ روائتی یہودیت کی پابندیوں سے نجات پائیں جن کی وجہ سے وہ گھٹن محسوس کر رہے تھے۔ وہ منڈیلسن کی مثال سے خوش تھے۔ چاہتے تھے کہ وہ بھی منڈیلسن کی طرح غیر یہودی سوسائٹی میں گھل مل جائیں، نئے علوم پڑھیں اور اپنا مذہب اپنی ذات تک محدود رہنے دیں۔ منڈیلسن ان پہلے اشخاص میں سے تھا جنہوں نے یہودیوں کو گیٹو سے نکال کر ان پر جدید یورپ کے دروازے کھول دیئے۔ جدید یورپ نے انہیں کبھی مجبور نہیں کیا کہ وہ اپنے لوگوں اور اپنے کلچری ورثہ سے رشتہ توڑ لیں۔

روشن خیالی کی فکری زندگی میں قدم رکھنے کے علاوہ ان روشن خیال یہودیوں نے اپنا ورثہ اور زیادہ سیکولر نقطۂ نظر سے دیکھنا شروع کیا۔ بعض نے تو یہودیوں کی تاریخ کا سائنسی اور جدید جائزہ لینے کا فیصلہ کیا جب کہ دوسروں نے عبرانی میں پڑھنا لکھنا شروع کر دیا۔ یعنی وہ مقدس زبان کہ جسے پرانے یہودیوں نے دعا و مناجات کے لئے مخصوص کر رکھا تھا۔ اب روشن خیالی نے اس زبان کو سیکولر بنا کر نیا عبرانی ادب تخلیق کرنا شروع کر دیا۔ وہ جدید طریقے سے یہودی ہونا چاہتے تھے۔ وہ ماضی کے توہمات سے رہائی پا کر یہودیت کو اس قابل بنانا چاہتے تھے کہ نئی روشن خیال دنیا کے لئے قابل قبول ہو۔ مگر خارجی پابندیوں کی وجہ سے زندگی کے بڑے کلچری دھارے میں ان کی شمولیت کے امکانات محدود تھے۔ ان کی قانونی حیثیت مملکت کی طرف سے تسلیم نہیں کی جاتی تھی۔ سیاسی سرگرمیوں میں بھی حصہ نہیں لے سکتے تھے۔ وہ ایک الگ تھلگ قوم تھی مگر مسکی لم نے روشن خیالی سے بڑی اُمیدیں وابستہ کر رکھی تھیں۔ وہ جانتے تھے کہ امریکی انقلاب کے بعد سیکولر حکومت نے یہودیوں کو شہری حقوق دے دیے ہیں۔ جب نپولین بونا پارٹ نے فرانس میں اقتدار سنبھالا اور ایک بہت بڑی سلطنت قائم کرنا شروع کی تو ایک لمحہ کے لئے لگتا تھا کہ صدیوں کی خواری کے بعد آخر کار یہودیوں کو یورپ میں شاید باعزت مقام مل جائے۔

انقلاب فرانس کا نعرہ جنگ آزادی تھا اور آزادی ہی فرانس میں نپولین کی حکومت کی روح

رواں تھی۔ نپولین نے اعلان کیا کہ فرانس کے یہودی اس ری پبلک کے باقاعدہ شہری ہیں۔ 29 جولائی 1806 کو یہودی تاجر بینکر اور عالم پیرس کے ہوٹل ڈی ولا میں بلائے گئے جہاں ان سے ریاست کے ساتھ وفاداری کا حلف لیا گیا۔ چند ہفتوں کے بعد نپولین نے یہودی معززین بلائے اوران کی تنظیم کو Great Sanhedrin کا نام دیا۔سین ہڈرین یہودیوں کی انتظامی کونسل کا نام تھا جس کا کوئی اجلاس یروشلم میں یہودی عبادت گھر کی تباہی (70 قبل مسیح) کے بعد نہیں ہوا تھا۔اسی تنظیم کا کام گزشتہ اسمبلی کی قراردادوں کی مذہبی تائید مہیا کرنا تھا۔ یہودی خوشی سے ناچنے لگے۔ان کے ربیوں نے اعلان کیا کہ انقلاب فرانس کوہ طور سے آنے والا دوسرا قانون ہے۔مسیحائی دور آ گیا ہے۔جس کے ساتھ ایسی سوسائٹی بھی آئی ہے جس کی بنیاد آزادی، مساوات اور رواداری پر ہے۔ نپولین کی فوجیں یورپ میں جہاں سے بھی گزری مفتوحہ ملکوں میں یہ اصول نافذ کرتی رہیں۔ ہالینڈ، اٹلی، سپین، پرتگال اور پروسیا، ایک کے بعد دوسرے ملک کو یہودیوں کی مدد پر بزور آمادہ کیا گیا۔مگر 1806 میں پہلی اسمبلی کے موقع پر ہی یہودیوں کے خلاف جذبات کا اظہار اس وقت شروع ہوا جب نپولن کے کمشنر لوئی کاؤنٹ مول نے اسمبلی سے اپنے خطاب میں الزام عائد کیا کہ یہودی ساہوکار فوجی بھرتی سے بچنے کی کوشش کرتے ہیں اور لوگوں میں بے چینی پھیلاتے ہیں انہیں ورغلاتے ہیں کہ وہ روپوش ہو جائیں تا کہ بھرتی سے بچ سکیں۔اسمبلی کے یہودی اراکین کے لئے ضروری ہو گیا کہ اپنے اندر وہ اخلاقی شعور بیدار کریں جسے وہ صدیوں کے زوال کی وجہ سے کھو بیٹھے تھے۔17 مارچ 1808 کو نپولین نے یہودیوں پر معاشی پابندیاں لگادیں جنہیں بدنام احکام (Infamous Decrees) کا نام دیا گیا۔ان پابندیوں کی وجہ سے ہزاروں یہودی خاندان تباہ ہو گئے۔جیسا کہ امریکی مؤرخ نارمن کینٹر نے لکھا ہے کہ نپولین نے یہودیوں کے ساتھ ڈاکٹر فاؤسٹ جیسی سودے بازی کی تھی کہ آزادی کے بدلے میں اپنی مخصوص انوکھی ذہنیت بدل دیں۔آزادی کے متعلق اپنے پر جوش دعوؤں کے باوجود ایک جدید مرکزیت پسند ریاست گیٹو جیسے خودمختار ادارے برداشت نہ کر سکی۔اس آزاد خیال حکومت کی نظر میں کلچر اور آئینی وحدت ناگزیر تھی جبکہ یہودی ایک مسئلہ بن کر اس وحدت سے باہر کھڑے تھے۔اس مسئلے کا ریشنل حل یہی تھا کہ وہ اپنی فرانسیسی شناخت میں مکمل طور پر جذب ہو کر اپنے علیحدہ طرز زندگی سے دستبردار ہو جائیں اپنا مذہب صرف اپنی ذات تک محدود رکھیں اور یہودی بن کر زندہ رہنے کا

خیال دل سے نکال دیں۔

یہودی مسئلے کا فرانسیسی حل یورپ کے باقی حصوں میں بھی یہودیوں کی آزادی کا پیٹرن بن گیا۔ یہ نئی رواداری صدیوں پرانی علیحدگی سے بہتر تھی مگر یہ روشن خیالی کے نیک ارادوں کا نتیجہ نہیں تھی بلکہ جدید ریاست کا تقاضہ تھا۔ ایسی ہی حقیقت پسندی کی وجہ سے امریکہ میں اجتماعیت کو آئینی حیثیت حاصل ہوئی۔ اگر حکومتوں کو جدید دنیا کے چیلنج کا مؤثر جواب دینا تھا اور خوشحال معاشرہ کی تشکیل کرنی تھی تو ہر انسانی وسیلہ حکومت کے بس میں تھا۔ ریاست کا سرکاری مذہب کچھ بھی ہو، یہودی، پروٹیسٹنٹ، کیتھولک اور سیکولرسٹ سب کو نئے اقتصادی اور صنعتی پروگرام میں حصہ لینا تھا۔ تجارت میں یہودیوں کی افسانوی مہارت خصوصی طور پر قابل تعریف تھی اور یہ ضروری تھا کہ ریاست کے مفاد کے لئے ان کی صلاحیتوں سے فائدہ اُٹھایا جائے۔

مگر پرانی بدگمانیاں اپنی جگہ موجود رہیں۔ فرانس اور ہالینڈ کے علاوہ واٹرلو(1815) میں نپولین کی شکست اور اس کی سلطنت ختم ہونے کے بعد یہودیوں سے ان کی مراعات اور حقوق واپس لے لئے گئے اور یہودیوں کو مویشیوں کی طرح ان کے گیٹوز میں ہانک دیا گیا۔ پرانی پابندیاں واپس آ گئیں مگر جدید ریاست کے تقاضوں نے ایک کے بعد دوسری حکومت کو مجبور کر دیا کہ وہ یہودیوں کو مکمل شہریت دے۔ بشرطیکہ وہ فاؤسٹین شرائط قبول کریں جن ملکوں مثلاً برطانیہ، فرانس، ہالینڈ، آسٹریا اور جرمنی نے یہودیوں کو شہریت دی اور ان سے برابری کا سلوک کیا وہ خوشحال ہوئے۔ مشرقی یورپ کی وہ ریاستیں جنہوں نے جمہوریت رائج نہیں کی بلکہ جدیدیت کے فیض کو چیدہ افراد تک محدود رکھا وہ پیچھے رہ گئیں۔ 1870 تک مغربی یورپ میں یہودی آزاد ہو گئے مگر مشرقی یورپ اور روس میں جہاں یہودیوں کی علیحدگی پسندی، جبر اور زور سے ختم کرنے کو کوشش کی گئی وہاں لاکھوں یہودی جدید ریاست سے کٹ گئے اور احتجاجی انداز میں ہیز یڈک اور ربیوں کی روایات سے چمٹے رہے۔ نپولین کے دیے ہوئے حقوق سے محرومی کے بعد ابتدائی برسوں میں نوجوان یہودیوں نے محسوس کیا کہ ان سے دھوکہ ہوا ہے۔ انہوں نے اچھی سیکولر تعلیم حاصل کی تھی اور وہ جدید معاشرے میں حصہ لینے کے لئے تیار تھے مگر اب ایسا کرنے سے روک دیئے گئے۔ مینڈیلسن نے انہیں گیٹو سے باہر نکلنے کا راستہ دکھا دیا تھا۔ نپولین نے آزادی کا وعدہ کیا تھا۔ اب وہ روائتی زندگی کی طرف لوٹ نہیں سکتے تھے۔ مایوسی کے عالم میں کئی جرمن یہودی

عیسائی ہوگئے تاکہ کلچر کے بڑے دھارے میں جذب ہوسکیں۔ اوروں کو یقین ہوگیا تھا کہ اگر یہودیت زندہ رہنی ہے تو عیسائیت کا سیلاب روکنے کے لئے سخت قدم اٹھانا ہوگا۔ ان دونوں تحریکوں نے جرمنی میں نشوونما پائی تھی مگر دونوں کی جڑیں یہودی روشن خیالی میں تھیں۔ مسکیلم کا خیال تھا کہ یہودی نئی دنیا اور گیٹو کے درمیان پل بن سکتے ہیں۔ وہ اچھی جرمن بول سکتے تھے۔ ان کے دوست ایسے بھی تھے جو یہودی نہیں تھے وہ یورپ کے طرز زندگی سے پوری طرح واقف تھے ان مین سے بعض نے فیصلہ کیا کہ یہودی مذہب میں ہی ایسی تبدیلیاں کریں کہ وہ آسانی کے ساتھ نئی دنیا میں قدم رکھ سکیں۔

یہ اصلاحی یہودیت ایک حقیقت پسند تحریک تھی اس لئے لوگوں کے اصولوں کی پیرو تھی۔ اصل میں اس کا مقصد یہودیت کی مائیتھوس کا خاتمہ تھا۔ اسرائیل جیکوبس (1828-1768) کا خیال تھا کہ اگر یہودیت، جرمنوں کو زیادہ اجنبی نہ لگی تو آزادی کے امکانات بڑھ جائیں گے۔ ایک عام آدمی جسے ملائیت سے واسطہ نہ تھا اس نے سی سین میں گاز پہاڑوں کے قریب ایک سکول قائم کیا جہاں طلباء یہودیت کے علاوہ سیکولر تعلیم بھی حاصل کرتے۔ اس نے ایک سائنیگوگ بھی قائم کیا جو یہودیت سے زیادہ پروٹیسٹنٹ ازم سے قریب لگتا تھا۔ تمام عبادت عبرانی کی بجائے مقامی زبان میں کی جاتی تھی۔ آپس میں مل جل کر جرمنی میں گیت گاتے تھے اور جرمن زبان ہی میں وعظ ہوتے تھے۔ روائتی اور قدیم رسموں میں شدت کے ساتھ کمی کردی گئی تھی۔ جیکوبسن اور اس کے رفیق کار یہ ماڈرن عبادت برلن لے آئے جہاں انہوں نے پرائیویٹ عبادت گاہوں کے نام سے ادارے قائم کئے تاکہ وہ واضح طور پر سینے گوگ سے مختلف نظر آئیں۔ 1817 میں ایڈورڈ کلی نے ہمبرگ میں ایک نئی عبادت گاہ بنائی جو اور زیادہ انقلابی تھی۔ مسیح کی واپسی کا ذکر چھوڑ کر انسانی بھائی چارے کی دعائیں مانگی گئیں۔ یہودی، فلسطین میں مسیحائی دور کی بحالی کی دعا کیوں کر مانگ سکتے تھے جبکہ انہیں جرمن شہری بننا تھا۔ 1822 تک پروٹیسٹنٹ طرز پر لڑکوں اور لڑکیوں کی عبادتیں ہوتی رہیں مگر عورتوں اور مردوں کی علیحدہ نشستوں کا دستور ختم کردیا گیا۔ ہیمبرگ کے ربیوں نے اس اصلاحی تحریک کی سخت مذمت کی بلکہ حکومت سے شکایت کر کے یہ ادارے ہی برلن میں بند کروادیئے۔ چنانچہ آنے والے دنوں میں وہ نوجوان یہودی جوان اصلاحات سے خوش تھے انہوں نے مایوس ہوکر عیسائیت کا دامن تھام لیا۔ مگر ہیمبرگ کی

عبادت گاہ کھلی رہی اور ایسی ہی مزید عبادت گاہیں لیپسزگ و یانااور ڈنمارک میں بنائی گئیں۔امریکہ میں ڈرامہ نویس آئزک ہاربی نے چارلسٹن میں ایک اصلاحی عبادت گاہ قائم کی۔ امریکی یہودیوں میں اصلاحات بہت مقبول ہوئیں اور1870 تک امریکہ کے کئی سینے گوگ ان اصلاحات سے فیض یاب ہوئے۔

یہودیت کی یہ اصلاح صورت نئی دنیا کا کمال تھا جو ریشنل اور حقیقت پسند ہونے کے علاوہ مذہب کو انسان کا ذاتی معاملہ سمجھتی تھی۔ ریفارمر خلوص دل سے چاہتے تھے کہ ماضی کے ساتھ قطع تعلق کریں، روائتی اصول اور وفاداریاں غرق آب کریں۔ وہ جلاوطنی کا عذاب سہنے کی بجائے دیا سپورہ میں مزے سے رہ رہے تھے، سبھی کو اصرار تھا کہ یہودیت میں جدیدیت کی تمام خوبیاں موجود ہیں وہ آزاد خیال، ریشنل اور انسان دوست ہے اس پر تیار ہے کہ اپنی فرسودہ انفرادیت ترک کرکے عالمی مذہب بن جائے۔ مصلحین کے پاس غیر عقلی،صوفیانہ یا پراسرار باتوں کے لئے وقت نہیں تھا۔ جو پرانی قدریں اور عقیدے یہودیوں کو جدید دنیا میں اپنا کردار ادا کرنے سے روک رہے تھے انہیں دفع کردینا چاہیے۔ابتداء میں تو ان کا نقطۂ نظر عملی تھا مگر1840 کے عشرے میں اصلاحی تحریک کی طرف علماء اور ربی رخ کرنے لگے اور یہودیوں کی تاریخ تنقیدی نظر سے دیکھنی شروع کی۔ لیوپولڈزنز1886-1704 ذکریا فرینکل75-1801 نچمن کروچمل 1840-1785 اور ابراہام گیگر74-1810 نے سائنسی انداز میں یہودیت کا جائزہ لینا شروع کیا۔ انہوں نے ایک سکول قائم کیا جو یہودیت اور سائنس کے نام سے جانا جاتا تھا۔بعض تبدیلیاں تو ضروری تھیں مگر ریفارمر عبادت میں جذبات کی اہمیت سے ناواقف تھے۔زنز اور فرنکل مذہب کے دیومالائی حصوں سے باخبر تھے اور عقل کو ہی سچ تک پہنچنے کا واحد راستہ سمجھنے کے حق میں نہیں تھے۔گیگر زبردست ریشنلسٹ تھا اور وسیع پیمانے پر اصلاحات چاہتا تھا۔ایک عرصہ کے بعد اصلاح پسند یہودی زنزاور فرینکل کی بصیرت اندازہ کرسکے اور بعض روایات بحال کردیں۔ وہ جان گئے تھے کہ جذبات اور تصوف کے بغیر مذہب اور عبادت دونوں بے کیف اور بے روح ہیں۔

یہودیت کی سائنس کے سکالراور ریفارمر دونوں ایک ایسی دنیا میں اپنا مذہب بچانے میں مصروف تھے۔ جو یہودیت پر مہربان تو تھی مگر اسے مٹانے پر بھی تلی ہوئی تھی۔ جب وہ اپنے ہم

مذہب یہودیوں کو جوق درجوق عیسائی ہوتے ہوئے دیکھتے تو انہیں یہودیت کے مستقبل کی فکر لگ جاتی وہ ایسے سب طریقوں کی تلاش میں رہتے جو یہودیت کی بقا کا سبب بن سکتے تھے۔ہم دیکھیں گے کہ جدید دنیا میں اکثر مذہبی لوگ اسی بے چینی میں مبتلا ہیں۔ تینوں توحید پرست مذاہب ہلاکت خیز خطرے سے دوچار ہیں۔ ہرانسانی خوف کی نسبت مذہب کے مٹ جانے کا خوف زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔جدید دور کی اکثر مذہبی تحریکیں اسی مٹ جانے کے خوف سے ابھری ہین جب سیکولرازم کا دور آیا اور جب ریشنلزم کی وجہ سے مذہب کے خلاف اشتعال بڑھ گیا تو مذہبی لوگ شدید مدافعت پر اتر آئے اور ان کی روحانیت ایک آزمائشی اور کٹھن دور میں داخل ہوگئی۔انیسویں صدی کے آغاز تک روائتی یہودی خوف و ہراس کی حالت میں تھے۔آزادی کے بعد بھی وہ سمجھتے تھے کہ گیٹو کی دیواریں، ہنوز اپنی جگہ موجود ہیں۔انہوں نے اپنی تمام توجہ تورات اور تلمود کے مطالعے پر مرکوز کردی۔ جدیدیت سے دور رہنے پر زور دیا۔ غیر یہودیوں کی تعلیم کا یہودیت سے کوئی تعلق نہیں ان کا ایک ممتاز نمائندہ ربی موسس سوفر (پریس برگ 1763-1839) تھا۔ وہ ہر تبدیلی اور جدیدیت کے سخت خلاف تھا،'بہت کچھ بدلا ہوگا مگر خدا تو نہیں بدلا'۔ اس نے اپنے بچوں کو منڈیلسن کی کتابیں پڑھنے سے روک دیا۔ سیکولر تعلیم کی اجازت دینے سے انکار کردیا اور کسی عنوان جدید سوسائیٹی میں حصہ لینے سے روک دیا۔ وہ پیچھے ہٹنے میں بھلائی سمجھتا تھا مگر دیگر روایت پسند یہودی ریشنلزم اور سیکولرازم کا سامنا زوردار تخلیقی عمل سے کرنا چاہتے تھے۔

1803 میں گائن آف دلنا کے ایک پیرو ربی ہیم نے ایک فیصلہ کن قدم اٹھایا جس نے قدیم یہودی روحانیت کو بدل کر رکھ دیا۔اس نے لتھو نیا اور دولوزن میں ییھم Yeshiva قائم کئے اسی صدی کے دوران مشرقی یورپ کے مختلف حصوں میں دوسرے نئے Yeshiva قائم کئے گئے۔ ماضی میں یشیور (ایک عبرانی لفظ جس کا مطلب بیٹھنا ہے) سے مراد سینے گوگ کے پیچھے چھوٹے کمروں کا ایک سلسلہ تھا۔ جہاں طلباء تورات اور تلمود کا مطالعہ کرتے تھے۔اس کا انتظار کسی مقامی ادارے کے ذمہ ہوتا تھا۔Volozhin بہرحال ایک مختلف قسم کا ادارہ تھا جہاں یورپ بھر سے سینکڑوں ذہین طلباء بین الاقوامی شہرت کے استادوں سے تعلیم حاصل کرتے۔ نصاب مشکل، اوقات کار طویل اور یشیوا کا نظام ناقص تھا۔ ربی ہیم اسی طریقہ سے تلمود پڑھایا کرتا جس طریقے

سے اس نے گوؤن سے پڑھی تھی۔ وہ تلمود کے مختلف حصوں کے تجزیہ کے علاوہ منطقی یکسانیت پر زور دیتا مگر اس طرح کہ درس وتدریس کا یہ عمل روحانی واردات بن جاتا تھا۔ صرف تلمود پڑھنے تک محدود نہیں تھی بلکہ اسے یاد کرنا اور مختلف موضوعات پر بحث کرنا بھی اتنا ہی اہم تھا جتنا کہ کلاس میں کسی آخری نتیجے پر پہنچنا ضروری تھا اس لئے کہ وہ عبادت کی ایک صورت تھی ایک ایسی رسم جو طالب علموں میں تقدس کا احساس بیدا کرتی تھی۔ یہ کٹھن مگر بھرپور زندگی تھی۔ نوجوانوں کو چھوٹے گروپوں میں بانٹ دیا جاتا۔ ان کی ذہنی زندگی اور روحانی زندگی صرف Yeshiva کے ذریعے تشکیل پاتی۔ وہ اپنے گھر والوں سے دور اپنے دوستوں سے الگ مکمل طور پر یہودیت کے علوم میں کھوئے رہتے بعض طلباء اجازت لے کر تھوڑا سا وقت فلسفے یا ریاضی کو بھی دیتے مگر ان سیکولر مضامین کی حیثیت ثانوی تھی۔ انہیں دیا جانے والا وقت تورات کے وقت پر ڈاکہ ڈالنے کے مترادف سمجھا جاتا تھا۔ نئی یاشیوٹ کا مقصد ہیزیڈم کے خطرے سے نمٹنا تھا۔ یاشیوٹ واضح طور پر ہیزیڈم کے مخالفین کا ادارہ تھا جس کا مقصد تورات کے باریک بین مطالعے کو بحال کرنا تھا مگر وقت گزرنے کے ساتھ یہودی روشن خیالی خطرہ بن کر سامنے آنے لگی۔ ہیزیڈم اور مخالفین دونوں مسکیلم کے خلاف متحدہ ہوگئے جنہیں وہ دشمن سمجھتے تھے ایسے دشمن جو سیکولر کلچر کی تمام برائیاں سمیٹ کر یہودیت کی سرحدوں کے اندر لے آئے تھے۔ آہستہ آہستہ نئی یاشیوٹ فرسودگی کی دفاعی فصیل بن گئی جس کا کام نئے خیالات کو پوشیدہ خطرات سمجھ کر انہیں دور رکھنا تھا کیونکہ صرف تورات پر عمل کرنے سے سچی یہودیت فنا ہوجانے سے بچ سکتی تھی۔

یشیوا اس فرسودہ بنیاد پرستی کا تشریحی ادارہ بن گیا جسے بیسویں صدی میں فروغ پانا تھا۔ یہ ہنگامی نوعیت کی مذہبیت اپنی اولین مثالوں میں سے ایک مثال تھی۔ ہم اس سے یہ مفید سبق سیکھ سکتے ہیں کہ بنیاد پرستی یہودیوں میں ہو، عیسائیوں یا مسلمانوں میں ہو، شاید ہی وہ کبھی خارجی دشمنوں کے ساتھ تصادم کی صورت میں پیدا ہوتی ہے۔ وہ لوذہن کی نظر میں غیر یہودی مغربی کلچر خارجی دشمن تھا۔ عام طور پر بنیاد پرستی داخلی تصادم کے نتیجے میں شروع ہوتی ہے۔ جب روایت پسند اپنے ہم مذہبوں کے ساتھ اس لئے لڑتے ہیں کہ ان کا رخ سیکولر دنیا کی طرف ہوتا ہے۔ بنیاد پرست جدیدیت کا راستہ روکنے کے لئے یشیوا کی طرح خالص دین کا حصار بناتے ہیں اور اس کی آڑ لیتے ہیں۔ خدا سے خالی دنیا سے نکل کر بیرونی تبدیلیوں کی مزاحمت میں اہل ایمان زندگی

کا نقشہ بدلنے کی کوشش کرتے ہیں۔ بنیادی طور پر یہ مدافعتی حربہ ہے مگر اس پسپائی میں اتنی جان ہے کہ جوابی حملہ کر سکے۔ ایسے یشیوا کے طالب علم خصوصی تربیت اور نظریاتی یکسانیت کے ساتھ اپنے اپنے حلقوں میں ایک گروپ یا کیڈر کی صورت اختیار لیتے ہیں۔ اس طرح بڑے قومی دھارے سے کٹ کر ایک الگ تھلگ اور کلچر دشمن کلچر کی بنیاد بنتی ہے جسے جدید معاشرے کا بدل سمجھا جاتا ہے۔ یشیوا کا سربراہ اپنے طلباء پر بے حد اثر انداز ہوتا تھا وہ انہیں مکمل اطاعت کا حکم دیتا اس لئے ان کی فکری اور تخلیقی صلاحیتیں دب کر رہ جاتی تھیں چنانچہ یشیوا نے ایک ایسی صورت حال پیدا کر دی جو جدیدیت اور خود مختاری پر اس کے اصرار کی کھلی تردید تھی۔

Volozhin اور یشیوا کا اصل مقصد یورپ کے سیکولر کلچر کے خلاف لڑنا نہیں تھا بلکہ نوجوانوں میں قدیم کلچر سے وابستگی پیدا کر کے انہیں سیکولر کلچر کے خطرات سے بچانا تھا مگر یہاں ایک تضاد کا سامنا تھا۔ جو بنیاد پرستی کی تاریخ میں بار بار آتا رہے گا۔ قدامت پرستی کے باوجود وولوذہن اور یشیوا جدید اور جدیدیت پسند ادارے تھے۔ وہ تلمود کی تعلیمات عقلی معیار پر لانے اور ان کی مرکزیت اُجاگر کرنے پر تلے ہوئے تھے ان کے کام میں پسند ناپسند کی گنجائش بھی تھی۔ گیٹو میں تو زندگی کے بندھے ٹکے روائتی سانچے تھے جو بدل نہیں سکتے تھے ان رسموں اور قدروں سے اختلاف نہیں ہوسکتا تھا۔ کوئی اور طرزِ زندگی یہودیوں کے لئے ممکن بھی نہیں مگر اب ایک یہودی روایت پسند ہونے کے ساتھ ساتھ وولوزن جیسے ادارے میں داخل بھی ہوسکتا تھا۔ ایک ایسی دنیا میں جس نے مذہب کو ذاتی معاملہ بنا دیا تھا۔ وہ لوزن بذات خود ایک رضا کارانہ ادارہ تھا۔ اب بھی جبکہ بنیاد پرست جدیدیت کو ناپسندیدگی سے دیکھتے ہیں۔ ان کا مذہب کسی حد تک ماڈرن تھا۔

دوسرے یہودیوں نے درمیانہ رستہ اختیار کیا۔ 1851 میں فرینکفرٹ کے گیارہ روایت پسندوں نے میونسپلٹی سے اپنی الگ مذہبی ایسوسی ایشن بنانے کی اجازت چاہی۔ انہوں نے سیموئیل ریفل (88-1808) کو دعوت دی کہ وہ ان کا ربی بنے۔ فوراً ہرش نے پرائمری اور سیکنڈری وہ سکول قائم کئے جن میں سیکولر اور مذہبی تعلیم دی جاتی تھی۔ ان کے لئے مالی مدد روتھس چائلڈ فیملی سے ملتی تھی۔ جیسا کہ ہرش نے بتایا کہ صرف گیٹو میں ہی یہودی، فلسفے، طب اور ریاضی کی تعلیم نظرانداز کرتے تھے۔ ماضی میں یہودی مفکر بعض اوقات معاشرے کی فکری زندگی میں

نمایاں کردار کرتے رہے تھے۔ بالخصوص اسلامی ملکوں میں۔ گیٹو میں چونکہ یہودیوں کو فطرت سے جدا کر دیا گیا اس لئے انہوں نے نیچرل سائنس کی طرف توجہ نہ دی۔ ہرش کو یقین تھا کہ دوسرے معاشرے کے ساتھ رابطہ میں یہودیت کے لئے کوئی برائی نہیں۔ یہودیوں کو زیادہ سے زیادہ جدید رجحانات سے واقف ہونا چاہیے مگر مصلحین کی طرح ان رجحانات کو برا نہیں کہنا ہے۔ جوانی میں ہرش نے بن اوزئیل (1866) کے انیس خط کے عنوان سے ایک مجموعہ شائع کیا تھا جس میں روایت پسندی کی پرزور حمایت کی گئی تھی مگر ان متعصب روایت پسندوں کی مذمت کی گئی تھی جو جدیدیت سے گریز کرتے ہوئے عیسائیت کے لئے راستہ ہموار کر دیتے تھے اور یہودی وسیع پیمانے پر اسے اختیار کر لیتے تھے۔ وہ بنیاد پرستوں کے اس رویے کو بھی ناپسند کرتے تھا کہ وہ یہودیت کے لفظی اور ظاہری معنوں پر زور دیتے ہیں وہ چاہتا تھا کہ ریسرچ کے ذریعے خدائی احکام کے مخفی اور گہرے معانی تک پہنچا جائے۔ جن احکامات میں ریشنل معنی نہیں ہوتے وہ صرف یاددہانی کا ذریعہ بن سکتے ہیں مثال کے طور پر ختنے کے ذریعے جسم پاک صاف رکھنا ہے دودھ اور گوشت اکٹھا نہ کھانے سے تخلیق میں خدائی احکام کی حکمت سمجھ میں آتی ہے۔ تمام احکام کی تعمیل ہونی چاہیے کیونکہ ان کی تعمیل سے یہودیوں کے کردار وسیرت کی تعمیر ہوتی ہے جس سے وہ دنیا میں اپنے اخلاقی مقاصد پورے کر سکتے ہیں۔ ہرش کا درمیانی راستہ 'نئی روایت پسندی' کے نام سے جانا گیا۔ اس کی زندگی سے نئی دنیا میں مذہبی روایت پسندی کی رضا کارانہ نوعیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ کبھی روایت معمول کی بات تھی مگر اب یہودیوں کو روایت پسند ہونے کے لئے بحث وتکرار اور لڑنے جھگڑنے کی ضرورت پڑی تھی۔

مصر وایران میں مسلمانوں کو مغربی جدیدیت پسندی کا بالکل ہی مختلف تجربہ ہوا۔ 1798 میں جب نپولین نے مصر پر حملہ کیا تو مشرق ومغرب کے تعلقات میں اس نے ایک نئی ابتدا کی۔ وہ سویز میں اپنا اڈہ بنانا چاہتا تھا جہاں سے وہ ہندوستان کی طرف برطانیہ کے سمندری راستے کے لئے خطرہ بن سکے اور شاید اس لئے بھی کہ شام کی طرف سے سلطنت عثمانیہ پر حملہ آور ہو سکے۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ فرانس اور انگلستان کے درمیان عالمی برتری کی جنگ میں مصر اور فلسطین میدان بن گئے یہ طاقت کا یورپی کھیل تھا مگر نپولین مصریوں کے سامنے آزاد خیالی اور ترقی کا علمبردار بن کر آیا۔ 21 جولائی 1798 کو اہرام کی جنگ میں مملوک کو شکست دینے کے بعد اس نے ایک اعلان کے

ذریعے وعدہ کیا کہ وہ مصر کو بیرونی غلامی سے آزادی کروائے گا۔ صدیوں سے جارجیا اور سرکیشیا کے مملوک مصری عوام کو لوٹ رہے تھے مگر اب یہ ظلم ختم ہونے کو تھا۔ 'میں کوئی صلیبی مجاہد نہیں ہوں' اس نے علماء کو یقین دلایا۔ جنہیں وہ مصریوں کے نمائندے سمجھتا تھا۔ 'ہر شخص جسے خیال ہو کہ میں ان کا مذہب تباہ کرنے آیا ہوں جان لے کہ میں تمہارے حقوق بحال کرنے آیا ہوں جو غاصبوں نے تم سے چھین لئے ہیں۔ میں مملوکوں سے زیادہ خدا کو مانتا ہوں اور میں محمد ﷺ اور قرآن کریم کا احترام کرتا ہوں اور انہیں بتادو کہ خدا کے سامنے سب انسان برابر ہیں اور یہ کہ ذہانت، نیکی اور سائنس ان کے امتیازی اوصاف ہیں مگر یہ آزادی اور سائنس فوج کے ہمراہ آئے تھے۔ اس جدید فوج کی تباہ کن کارروائیاں مصری اپنی آنکھوں سے دیکھ چکے تھے۔ مملوکوں کے ساتھ جنگ میں صرف دس فرانسیسی ہلاک ہوئے تھے اور تیس زخمی ہوئے جب کہ مملوکوں کے دو ہزار سپاہی مارے گئے۔ ان کے چار سوا ونٹ اور پچاس بندوقیں فرانسیسیوں کے قبضے میں آئیں اور ایک انتہائی عبرتناک شکست کا داغ الگ سہنا پڑا مگر ان کی اس آزادی کے پیچھے فرانسیسیوں کے کچھ جارحانہ عزائم بھی تھے۔ ان میں سے ایک تو ماڈرن سائنس کی وہ انسٹیٹیوٹ تھی جو مصر میں قائم کی گئی۔ اس علاقے کی تاریخ کے بارے میں اس کی گہری ریسرچ کی بدولت نپولین اس قابل ہوا کہ اپنے احکام عربی میں جاری کرے اور اسلامی تصورات سے واقف ہو سکے چنانچہ علم اور سائنس مشرق وسطیٰ کے لوگوں کی غلامی اور یورپی مفادات کے فروغ کا ذریعہ بن گئے۔

مگر علماء نپولین کی پالیسی سے متاثر نہ ہوئے۔ یہ سب عیاری اور دھوکہ بازی ہے تاکہ ہمیں ورغلایا جائے۔ علماء کہتے: 'بوناپارٹ عیسائی ہے اور عیسائی کا بیٹا ہے اور اس کے علاوہ کچھ نہیں ہے'۔ اور کافروں کی حکومت کے خیال سے پریشان تھے۔ قرآن نے انہیں سکھایا تھا کہ جب تک لوگ اپنے معاشرے خدا کی رضا کے مطابق بنائیں گے، انہیں ناکامی نہیں ہوگی۔ مگر اب انہوں نے دیکھا کہ اسلامی افواج ایک اجنبی طاقت کے ہاتھوں بری طرح ہار چکی ہیں۔ جامعہ الازہر کے شیخ الجبرتی نے اس جارحیت کے جلو میں آنے والے واقعات کا اس طرح ذکر کیا: ''بڑی بڑی جنگیں، عظیم واقعات، آفات کا نزول، خوفناک انتشار، برائیوں میں اضافہ اور زندگی کا درہم برہم ہونا'' وہ ایک ایسی دنیا کی بات کر رہے تھے جو جدیدیت کی آمد پر اُلٹ پلٹ جاتی ہے۔ اس لفاظی کے باوجود الجبرتی کی مایوسی بالکل ہی بے سبب نہیں تھی۔ نپولین کا حملہ مشرق وسطیٰ پر مغربی تسلط کا پیشِ خیمہ تھا۔ اس شکست کی وجہ

سے وہاں کے لوگوں کو اپنے بنیادی عقائد اور اندازوں میں ترمیم کرنا پڑی۔

نپولین نے علماء کو پہلے سے کہیں زیادہ اختیارات دیئے۔ وہ انہیں ترکوں اور مملوکوں کے خلاف اپنا حامی بنانا چاہتا تھا اس لئے انہیں اپنی حکومت میں بڑے بڑے عہدوں پر فائز کیا مگر علماء اس کی خواہشات پوری نہ کر سکے۔ مصری اتنے عرصے سے ترکوں اور مملوکوں کے زیر حکومت رہے تھے کہ وہ براہ راست اپنی حکومت کا خیال ہی بھول گئے تھے بعض نے تو کوئی عہدے لینے سے اس لئے انکار کر دیا کہ وہ اپنے لئے مشیر بننا پسند کرتے تھے اور مشاورت ہی ان کا منصب رہی تھی۔ انہیں دفاع یا قانون کی عملداری کا کچھ پتہ نہیں تھا۔ اس لئے انہوں نے مذہبی، قانونی اور اسلامی معاملات کی ذمہ داری کو ترجیح دی کہ یہ کام تو وہ خوب جانتے تھے۔ بعض علماء نے نپولین کا ساتھ بھی دیا شاید یہ سوچ کر کہ گریز کا امکان کم ہے انہوں نے اس خلاء میں قدم رکھا اور امن وامان کی حالت بہتر بنانے میں مدد دی انہوں نے حکومت اور عوام کے درمیان پل کا کردار ادا کیا جو ہمیشہ وہ کرتے آئے تھے۔ فرانسیسیوں کے خلاف اکتوبر 1798 اور مارچ 1800 میں چند بغاوتیں ہوئیں جنہیں جلد ہی دبا دیا گیا۔ فرانسیسیوں کے انہیں حیران کئے رکھا۔ وہ نپولین کا آزادی وخودمختاری کا نظریہ نہیں سمجھ سکے تھے۔ کچھ بھی ہو مصریوں اور یورپ کے لوگوں کے درمیان اختلافات کی ایک دنیا حائل ہوگئی۔ جب جبرتی سائنس انسٹیٹیوٹ میں گیا تو اس نے فرانسیسی سائنس دانوں کے جوش ولولے اور ان کے علم وفضل کی خوب داد دی مگر اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ ان کے تجربات کس مصرف میں لائے۔ ان کا کیا کرے۔ وہ گرم ہوا کو دیکھ کر بہت محفوظ ہوا مگر اس کی ذہنی کائنات میں کسی ایسی چیز کے لئے کوئی جگہ نہیں تھی۔ وہ اسے ایک یورپین کی نظر سے دیکھ ہی نہیں سکتا تھا۔ اس لئے کہ یورپ کے پیچھے تو تجرباتی سائنس کے دو سو سال تھے۔

1801 میں انگریزوں نے فرانسیسیوں کو مصر سے نکال دیا۔ اس موقع پر مصر ترکوں کو واپس کر دیا اور مصر مین اپنی حکومت بنانے کی کوشش نہیں کی مگر انتقال اقتدار پر امن نہیں تھا۔ مملوکوں نے استنبول کے نئے ترک گورنر کو ماننے سے انکار کر دیا اور دو برس تک عثمانیوں کی طرف سے بھیجے جانے والے البانوی اور مملوک آپس میں لڑتے رہے اور آبادی کو دہشت زدہ کرتے رہے۔ اس افراتفری میں ایک نوجوان البانوی افسر محمد علی (1849-1769) نے اختیارات سنبھال لئے۔ مملوکوں کی نااہلیت سے تنگ آ کر اور مایوس ہو کر علماء نے اس کی حمایت کر دی۔ ایک مشہور عالم عمر

مکرم کی سرکردگی میں علماء نے ترکوں کے خلاف بغاوت کی اور استنبول سے مطالبہ کیا کہ محمد علی کو پاشا یا مصر کا گورنر بنادیا جائے۔ سلطان نے بات مان لی جس کی وجہ سے قاہرہ میں زبردست جوش وخروش کا مظاہرہ کیا گیا۔ ایک فرانسیسی نے لکھا کہ لوگوں کا جوش دیکھ کر اسے فرانسیسی انقلاب یاد آ گیا۔ علماء کے لئے یہ سنہری موقع تھا۔ محمد علی نے ان کی حمایت حاصل کرنے کے لئے ان سے یہ وعدہ کرلیا تھا کہ وہ ان کے مشورے کے بغیر مصر میں کوئی تبدیلی نہیں کرے گا۔ اس لئے ہر ایک نے فرض کرلیا کہ حالات جیسے ہیں ویسے ہی رہیں گے اور گزشتہ چند برسوں کی بے چینی کے بعد اب حالات معمول پر آجائیں گے۔ مگر محمد علی کے ارادے کچھ اور تھے۔ وہ مصر میں فرانسیسیوں سے لڑ چکا تھا اور ان کی نہایت اعلیٰ جدید افواج سے بہت متاثر تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ ایسی ہی اعلیٰ درجے کی جدید فوج اس کی اپنی کمان میں ہو۔ اس نے یہ بھی طے کرلیا تھا کہ وہ مصر میں جدید ریاست قائم کرے گا جس کا کوئی تعلق استنبول سے نہیں ہوگا۔ اسے مغرب کے فکری انقلاب میں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ کسی کسان گھرانے سے تعلق رکھنے والا غیر تعلیم یافتہ شخص تھا جس نے چالیس برس کی عمر میں پڑھنا سیکھا تھا۔ کتابوں سے اس کا اتنا ہی واسطہ تھا کہ ان کے ذریعے وہ حکومت کرنا سیکھے اور فوجی معاملات سمجھ سکے۔ کئی دوسرے مصلحین کی طرح وہ بھی جدیدیت کے ذریعے صرف فوجی طاقت اور ٹیکنالوجی حاصل کرنا چاہتا تھا اور یہ امکان بالکل نظرانداز کردینا چاہتا تھا کہ ملک کی کلچری اور روحانی زندگی پر ان تبدیلیوں کا کیا اثر ہوگا۔ پھر بھی محمد علی ایک غیر معمولی انسان تھا اور اس کی کامیابیاں قابل داد تھیں۔ 1849 میں وہ اپنی موت سے پہلے سلطنت عثمانیہ کے ایک الگ تھلگ اور پسماندہ صوبے مصر کو تن تنہا نئی دنیا میں کھینچ لایا تھا۔

ہمیں یہ یاد رکھنا چاہیے کہ مغرب خود اپنے زور پر آہستہ آہستہ جدیدیت کی طرف بڑھا تھا۔ دنیا پر برتری اور سبقت حاصل کرنے کے لئے ٹیکنالوجی اور فنی مہارت سیکھنے میں یورپ اور امریکہ کو تین سو سال لگ گئے تھے۔ یہ ایک اذیت ناک عمل تھا جس میں خون خرابے اور روحانی کرب بھی شامل تھا۔ محمد علی تبدیلی کے اس انتہائی پیچیدہ عمل سے صرف چالیس برس میں گزرنا چاہتا تھا۔ اپنے مقاصد حاصل کرنے کے لئے محمد علی نے سوچا کہ اسے گویا صرف مصریوں کے خلاف ایک جنگ لڑنی پڑے گی۔ مصر قابل رحم حالت میں تھا۔ لوٹ مار نے اس کا حلیہ بگاڑ دیا تھا۔ فلاحین (کسان) زمینیں چھوڑ کر شام بھاگ گئے تھے۔ مملوک اقتدار پر پھر قابض ہونے کی دھمکیاں

دے رہے تھے۔ یہ کیسے ممکن تھا کہ یہ تباہ حال ملک ایک مضبوط مرکزیت پسند ریاست بن جائے۔ جس کے پاس جدید ترین انتظامیہ اور فوج ہو۔ مغرب بہت آگے جا چکا تھا۔ مصر کیسے اس کا ہمسر ہو سکتا تھا۔ مغرب کو اس کے اپنے ہی کھیل میں کیسے ہرا سکتا تھا اور یہ کیوں کر ممکن تھا کہ مغرب کی طرف سے مزید حملے اور مداخلت نہ ہو۔

محمد علی نے اپنی سلطنت کا کام ملوک رہنماؤں کو مٹانے سے شروع کیا۔ 1805 میں اس نے سرکردہ مملوک رہنما دھوکے سے قاہرہ بلائے اور انہیں گولیوں سے اڑا دیا۔ ان میں سے تین رہنما زندہ بچے جنہیں اس کے بیٹے ابراہیم نے ایک دوسال میں قتل کر دیا۔ جبکہ خود محمد علی انگریزوں کے ساتھ جنگ میں مصروف تھا جو اس کی اعلیٰ قیادت سے خطرہ محسوس کرتے تھے۔ آخر عثمانی سلطان کے زور دینے پر اس نے وہابیوں کے خلاف اپنی فوج عرب بھیجی جنہوں نے عثمانیوں کے خلاف بغاوت کی تھی۔ اس نے اپنی فوج کی کمانڈ اپنے بیٹے نسان کے سپرد کی جس نے یہ اعزاز قاہرہ کی ایک شاندار تقریب میں حاصل کیا۔ یہ فوج جلوس کی صورت میں جب شہر کے گلی کوچوں سے گزری تو آخری مملوک سردار بھی ان کے ہاتھوں مارے گئے۔ فوجیوں کو کھلی چھٹی دے دی گئی کہ مملوکوں کے گھر لوٹیں اور ان کی عورتیں بے آبرو کریں۔ اس روز ایک ہزار مملوک قتل ہوئے اور اس طرح مصر میں مملوک نسل کا خاتمہ ہو گیا اور جدیدیت کا آغاز ایک بار پھر نسل کشی کے عمل سے ہوا۔

ایسا لگتا ہے کہ ایک قوم کو نئی دنیا میں لانے کے لئے ضروری ہے کہ اس کا رہنما خون میں تیر کر گزرنے کے لئے تیار رہے۔ پائیدار جمہوری اداروں کے بغیر تشدد ہی شاید مضبوط حکومت بنانے کا واحد ذریعہ تھا۔ محمد علی اقتصادیات کے معاملے میں بھی اتنا ہی سفاک تھا۔ وہ اتنا زیرک ضرور تھا کہ جان سکے کہ مغربی طاقت کی اصل بنیاد پیداوار کے سائنسی طریقے ہیں۔ 1805 سے 1814 کی مدت میں وہ بڑی ہوشیاری سے ملک کی زمین کا ہر ایکڑ اپنی ذاتی ملکیت میں لے آیا۔ مملوکوں کی جاگیروں پر وہ پہلے ہی قابض ہو چکا تھا۔ اس کے بعد وہ ان زمینوں کو تصرف میں لے آیا جن پر ٹیکس دینے والے کسان قابض تھے اور بڑی مدت سے ان کا نظام بددیانتی سے چلا رہے تھے۔ آخر کار اس نے اوقاف کی زمینوں اور جائیدادوں پر بھی قبضہ کر لیا جن کی حالت ایک عرصہ سے خراب ہو رہی تھی اور ان کے فرائض اور واجبات ذاتی طور پر اپنے ذمے لے لئے۔ انہی آمرانہ طریقوں سے اس نے ملک کی تمام اراضی اور صنعت پر اپنی اجارہ داری قائم کر لی۔ اس

طرح دس سال سے کچھ زیادہ عرصہ میں وہ مصر کا واحد جاگیردار، تاجر اور صنعت کار بن گیا۔ مصری یہ صورت حال اس لئے برداشت کرتے رہے کہ اس میں ان کا فائدہ تھا۔ برسوں کے انتشار اور بدنظمی کے بعد ملک مین امن قائم ہوا تھا۔ قانون اور انصاف کی حکمرانی تھی اور ہر ایک کو حق حاصل تھا کہ وہ محمد علی تک براہ راست اپنی شکایت پہنچائے۔ وہ اس طرح حاصل ہونے والی دولت سے اپنی جیبیں نہیں بھر رہا تھا بلکہ اسے مصر کی ترقی پر خرچ کر رہا تھا۔ اس کا سب سے بڑا کارنامہ کپاس کی کاشت تھی جو برآمد اور آمدنی کا اہم ذریعہ بن گئی اور جس کے وسیلے ملک کو غیر ملکی زرمبادلہ حاصل ہوا جو یورپ سے اسلحہ اور مشینری وغیرہ خریدنے کے لئے ضروری تھا۔

مگر اس طرح بھی یورپ پر اس کا انحصار ایک واضح حقیقت تھی۔ یورپ میں جدیدیت کی تمام کوششیں، خودمختاری کی خواہش نے تیز کردی تھیں اور ذہنی، معاشی، مذہبی اور سیاسی میدانوں میں آزادی کے عمل نے اسے اور تقویت دی تھی۔ چنانچہ اس نے شوگر ملیں، اسلحہ ساز فیکٹری، تانبے کی کانیں، گلاس فیکٹریاں، کاٹن ملیں، فولاد کے کارخانے، پرنٹنگ اور ڈائینگ کے ادارے قائم کئے مگر صنعتی بنیاد بنانا آسان اور فوری عمل نہیں۔ یورپ نے جان لیا تھا کہ ان کے مختلف اداروں میں کام کرنے کے لئے ضروری تھا کہ تمام کارکن، پیشہ وروں جیسی مہارت حاصل کریں مگر اس میں وقت لگا۔ فلاحین جو محمد علی کی فیکٹریوں میں کام کر رہے تھے انہیں فنی تربیت حاصل نہیں تھی نہ ہی کام کرنے کا تجربہ تھا۔ وہ اپنے کھیتوں سے دور کی زندگی نہ اپنا سکے۔ ملکی پیداوار میں انہیں تعلیم کی ضرورت تھی اور یہ بات ہی سماجی زندگی میں تلاطم لانے کے لئے کافی تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ محمد علی کے اکثر صنعتی منصوبے ناکام ہو گئے۔

دراصل جدیدیت کا سفر بہت مشکل تھا۔ ایجاد کا تصور یورپ کی روح میں رچا ہوا تھا مگر مصر کے اکثر لوگ قدامت کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے تھے اس لئے مصر کو جدید ریاست بنانے کے لئے محمد علی کے پاس یہی طریقہ تھا کہ وہ جدت و ایجاد کا خیال ترک کرے اور مغرب کی تقلید کا راستہ اختیار کرے۔ وہ پہلے ہی اپنے انتظامی، فنی، تکنیکی اور تعلیمی امور میں مغرب کی تقلید پر کاربند تھا۔ آزادی اور تخلیقی تڑپ کے بغیر مصر جیسا ملک جدید ریاست کیونکر بن سکتا تھا۔

مگر محمد علی کے سامنے کوئی راستہ نہیں تھا اس نے زیادہ تر ترک اور یورپی افسروں پر مشتمل اسٹیبلشمنٹ بنائی جس نے مصری معاشرے میں ایک نئے طبقے کی صورت اختیار کرلی۔ ہونہار

نوجوان اعلیٰ تعلیم کے لئے فرانس اور انگلستان بھیجے گئے۔ایک ہزار طلباء کے لئے ملٹری کالج بنائے گئے جن میں یورپ سے آنے والے استاد یا اعلیٰ تعلیم یافتہ مصری پڑھاتے تھے۔لڑکے کالج میں داخلہ لیتے ہی پاشا کی ذاتی ملکیت بن جاتے۔کالج میں وہ مغربی زبانیں، ریاضی اور جنگ کے مغربی طریقے سیکھتے۔ان کالجوں سے ملک کے لئے اعلیٰ تعلیم یافتہ طبقہ پیدا ہوا۔مگر فلاحین کے لئے ابتدائی تعلیم بھی میسر نہیں تھی۔وہ کھیتوں میں کام کرتے ہوئے مصر کے لئے زیادہ مفید تھے کیونکہ اس طرح وہ ملک کو زرعی بنیاد مہیا کرتے تھے مگر اس کے بھی بڑے دوررس نتائج نکلے۔مصر جیسے ایک غیر مغربی اور ترقی پذیر ملک میں سے صرف فوجی افسروں کا رابطہ ہی یورپ کی تہذیب کے ساتھ ہوسکا۔ملک کی غالب اکثریت اس عمل سے باہر رہتی تھی۔جس کے باعث فوجی افسر ہی اکثر لیڈر اور مصر کے حکمران بنے اور جدیدیت بھی فوجی افسروں کی راہ دیکھتی رہی۔یہ صورتحال بھی مغرب سے مختلف تھی۔فوج ہی محمد علی کا سب سے بڑا مسئلہ تھی۔اپنے مقاصد پورے کرنے کے لئے اس کی سخت ضرورت تھی زندگی بھر اسے انگریزوں اور عثمانیوں کی مخالفت کا سامنا کرنا پڑا۔محمد علی کی نیم خودمختار ریاست عثمانی ترک اس لئے برداشت کرتے تھے کہ اس کی اعلیٰ فوجی طاقت کو عرب میں وہابیوں کی بغاوت کے خلاف کام میں لائیں یا اسے یونانیوں کی بغاوت 1825-28 ختم کرنے میں استعمال کریں مگر 1832 میں اس کے بیٹے ابراہیم پاشا نے عثمانی سلطنت کے صوبوں شام اور فلسطین پر حملہ کردیا اور ترک فوج کو زبردست شکست دی۔مصری فوج یقیناً فرانسیسی فوج کے ماڈل پر بنائی گئی تھی۔محمد علی نے نپولین کی فوج کا ڈسپلن اور اہلیت نقل کرنے کی کوشش کی تھی۔اور اس نے بے شک ایسی فوج بنالی جو اپنے سے بڑی فوج کو آسانی کے ساتھ شکست دے سکتی تھی مگر اس کارنامہ کی بنیاد بھی اپنی رعایا کے ساتھ ظلم پر تھی۔ابتداء میں اس نے سوڈان سے بیس ہزار آدمی جبراً فوج میں بھرتی کرلئے جنہیں اس نے اسوان کی بڑی بڑی بیرکوں میں ٹھہرالیا مگر سوڈانی یہ فن نہ سیکھ سکے تو اکثر کے منہ دیوار کی طرف کرکے انہیں گولیوں سے اڑادیا گیا۔ہرچند کہ محمد علی کے اپنے سکولوں کے تعلیم یافتہ ڈاکٹروں نے اسے بہت منع کیا۔اب پاشا نے فلاحین کی طرف توجہ دی۔فوج میں جبری بھرتی کے لئے انہیں ان کے کھیتوں اور گھروں سے باہر گھسیٹ کرلایا گیا۔وہ عام طور پر غریبی میں زندگی گزارتے تھے۔ان کے خاندانوں کو اکثر فاقوں کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔عورتیں عصمت فروشی پر مجبور ہوتیں۔فوج میں جبراً بھرتی کے خیال

سے فلاحین اتنے ڈر گئے کہ اکثر نے اپنے آپ کو آگ لگا کر خودکشی کر لی، اپنی انگلیاں کاٹ دی، دانت نکال دیئے، یہاں تک کہ اپنے آپ کو اندھا کر لیا۔ انسانوں پر لرزہ خیز ظلم کے ذریعے ایک شاندار جنگی قوت وجود میں آئی۔ جبری بھرتی کی وجہ سے صرف فلاحین ہی تباہ نہیں ہوئے بلکہ زراعت بھی اجڑی کہ کھیتوں سے ان کے کھیت مزدور چھین لئے گئے تھے۔

ہر اصلاحی عمل کا ایک کمزور پہلو بھی ہوتا ہے۔ محمد علی کی اقتصادی پالیسی سے یہ تو ہوا کہ یورپ کا مال مصر میں آنے لگا مگر اس سے مقامی صنعتوں کو نقصان پہنچا۔ مصر میں سب سے بڑا اجارہ دار ہونے کی حیثیت سے پاشا نے مقامی تاجر طبقہ تقریباً تباہ کر دیا۔ اس نے بہت سا سرمایہ آب پاشی اور پانی کی تقسیم کے نظام میں لگا دیا جو واقعی سخت ضروری تھا مگر مزدوروں کی حالت ابتر تھی جس کی وجہ سے تیئس ہزار مزدور موت کے منہ میں چلے گئے۔ پرانا سماجی نظام بے دردی سے توڑا جا رہا تھا مگر جدیدیت سے پہلے کا طرزِ زندگی اور قدیم اصول نہیں بدلے تھے۔ جدید مصر میں دو مختلف معاشرے بالکل مختلف اصولوں پر چلتے ہوئے ابھر رہے تھے جن میں ایک معاشرہ فوجی اور انتظامی افراد پر مشتمل اور جدید تھا جبکہ دوسرا جدید نہیں تھا۔

علماء کی نظر میں جدیدیت ایک تخریبی قوت تھی۔ جب محمد علی گورنر بنا اس وقت علماء بہت طاقت ور تھے۔ محمد علی نے ان سے دوستی کی، ان سے وعدے کئے۔ پاشا اور مولویوں کے درمیان یہ ہنی مون تین برس تک جاری رہا۔ 1809 میں علماء سے ٹیکس نہ ادا کرنے کی روایتی رعائت واپس لے لی گئی۔ عمر مکرم نے اکسایا کہ محمد علی کی مخالف کریں اور اسے مجبور کریں کہ رعائت بحال کر دے مگر علماء کہاں متفق ہوتے ہیں۔ محمد علی نے ان کو پھوٹ سے فائدہ اٹھایا اور علماء کی معقول تعداد بہلا پھسلا کر اپنی حامی بنالی۔ مکرم جلاوطن ہو گیا اور اس کے ساتھ ہی علماء کی طرف سے محمد علی کی مخالفت کا آخری موقع بھی گیا۔ مکرم کی جلاوطنی، ایک طبقے کی حیثیت سے محمد علی مدرسوں کا خیال رکھتا اور علماء کی دلجوئی بھی کرتا مگر بتدریج انہیں کمزور کرتا اور طاقت کے ہر شائبہ سے محروم کرتا رہا جو شیوخ اس کی مخالفت کرتے انہیں برطرف کر دیا جاتا۔ جس کے نتیجے میں اکثر علماء اس کی پالیسیوں سے متنفر ہو گئے وہ انہیں معاشی طور پر بھی بدحال رکھتا تھا۔ وقف جائیدادوں کی آمدنی پر قابض ہو کر اس نے علماء سے ان کی آمدنی کا اہم بلکہ سب سے بڑا ذریعہ چھین لیا تھا۔ 1815 میں لاتعداد دینی مدرسوں کی حالت خراب ہوگئی۔ ساٹھ برس بعد تمام دینی ادارے تنگ دستی کی حالت میں تھے۔ استادوں کی

معاشی حالت خراب تھی۔ کم وبیش ہر جگہ مسجدوں کی انتظامیہ اس حالت میں نہیں تھی کہ خطیبوں، مؤذنوں، قاریوں اور دیکھ بھال کرنے والوں کے اخراجات برداشت کر سکے۔ مملوکوں کی بڑی بڑی عمارتیں ٹوٹ رہی تھیں یہاں تک کہ الازہر کی حالت بھی خراب تھی۔

اس حملے سے مصر کے علماء خوفزدہ اور رجعت پسند ہو گئے تھے۔ حکومت میں ان کا مشاورتی کردار غیر ملکی ماہرین نے سنبھال لیا جنہیں مصری روایات کا بہت کم لحاظ تھا۔ ترقی کے عمل میں علماء پیچھے رہ گئے اور پاشا نے انہیں ان کی کتابوں اور مسودوں کے ساتھ تنہا چھوڑ دیا۔ مخالف کی کوئی صورت نہیں تھی بے بس ہو کر علماء نے تبدیلیوں کے اس عمل کی طرف دیکھنا چھوڑ دیا اور اپنے روایتی کاموں میں لگ گئے اور آئندہ بھی انہوں نے اپنا یہ رویہ جاری رکھا۔ جدیدیت کا عمل ان کے لئے فکری چیلنج نہیں تھا بلکہ انوکھی اور بے معنی پریڈ کا بے سود سلسلہ تھا جس کے ذریعے ان کی طاقت، دولت اور اثر ورسوخ پر ڈاکہ ڈالا گیا چنانچہ مصر کے مسلمانوں کا رابطہ جب نئے مغربی تصورات کے ساتھ ہوا تو علماء میں سے انہیں راہ دکھانے والا کوئی نہیں تھا اس لئے انہیں کسی اور سمت دیکھنا پڑا۔ صدیوں سے علماء اور حکمران طبقہ مصر میں مل کر حکومت چلاتے تھے۔ محمد علی نے یہ رشتہ توڑ دیا اور اچانک ایک نئے سیکولرازم کی ابتداء کر دی جس کی کوئی نظریاتی اساس نہیں تھی بلکہ سیاسی مقاصد حاصل کرنے کے لئے مسلط کیا گیا تھا۔ مغرب میں ریاست اور کلیسا بتدریج الگ ہوئے تھے اس لئے وہاں لوگوں کو اسے ذہنی طور پر قبول کرنے کے لئے وقت مل گیا تھا بلکہ انہوں نے تو دنیاوی قسم کی روحانیت بھی ایجاد کر لی تھی مگر مصریوں کے لئے یہ سیکولرازم اجنبی اور نا قابل فہم تھا۔

سلطنت عثمانیہ میں بھی جدید اصلاحات کا یہ عمل جاری تھا مگر استنبول میں اس کے محرکات کا بہتر شعور تھا۔ عثمانی، یورپ میں سفیر بن کر آتے اور سلطان کے دربار میں بھی یورپ کے سفیروں سے اس کی ملاقات رہتی تھی۔ اس طرح 1820 اور 1830 کی دہائی میں ایک نسل نمودار ہوئی جو نئی دنیا سے اچھی طرح سے واقف تھی جو سلطنت میں اصلاحات کا ارادہ بھی رکھتی تھی۔ احمد توفیق پاشا (جو وزیر اعظم بھی بنا) کا والد پیرس کے ترکی سفارت خانے میں ملازم تھا۔ احمد نے گبن، ہیوم، آدم سمتھ، شکیسپیئر اور ڈکنز کو پڑھا تھا۔ مصطفیٰ رشید پاشا کی تربیت بھی پیرس میں ہوئی اور وہاں اس نے سیاست اور ادب کا مطالعہ کیا۔ اسے یقین ہو گیا کہ عثمانی سلطنت نئی دنیا میں قائم نہیں رہ سکے گی اگر اس میں نئی فوج نہ ہو، نیا قانونی اور انتظامی سسٹم نہ ہو جس میں تمام شہری برابر سمجھے

جائیں۔ یہودی اور عیسائی، ذمی نہ ہوں بلکہ ان کی حیثیت مسلمان شہریوں کے برابر ہو۔ 1826 میں ان مغربی تصورات کے ہوتے ہوئے سلطان محمود دوئم کے لئے قوانین کی تشکیل آسان ہوگئی۔ ان کے ذریعے جانثاری کو ختم کردیا گیا، فوج جدید ہوگئی۔ فنی اور تکنیکی میدان میں ترقی ممکن ہوئی۔ پہلے تو سلطان نے سلطنت کا زوال روکنے کے لئے یہ اقدامات کافی سمجھے مگر مغربی طاقتوں کی سفاکانہ پیش قدمی اور اسلامی دنیا پر ان کے سیاسی اور اقتصادی اثرات نے سلطان کو احساس دلایا کہ مزید بنیادی تبدیلیاں ناگزیر ہیں۔

1839 میں سلطان عبدالحمید نے رشید پاشا کی ترغیب پر دربار خلافت سے حکم جاری کیا جس سے اسلامی قانون تو بظاہر برقرار رہا مگر سلطان کی بادشاہت اپنی رعایا کے ساتھ معاہدہ پر منحصر ہوگئی۔ اس سے بادشاہت میں بہ حیثیت ایک ادارہ کے بنیادی تبدیلی آگئی اور بہتر نظام حکومت اور اہلیت کی اُمید پیدا ہوگئی۔ آنے والے تین عشروں میں مقامی اور مرکزی حکومتوں کی ازسرنو تنظیم ہوئی۔ کریمنل اور سول قوانین مرتب ہوئے اور عدالتیں قائم کی گئیں۔ 1856 میں مذہبی اقلیتوں کو مکمل شہری حقوق دے دیئے گئے مگر اس سے علماء کے ساتھ تصادم کی صورت پیدا ہوگئی کہ وہ ان تبدیلیوں کو شریعت کی اہمیت میں کمی سے تعبیر کرتے تھے مگر اصلاح کے پرزور حامی شدت کے ساتھ اپنے مؤقف پر قائم رہے۔ ان کا خیال تھا کہ پرانی روایات سے چھٹکارا پائے بغیر مسلمان نئی دنیا کا حصہ کیونکر بن سکتے تھے۔ جیسے عیسائیت آزاد خیالی اور جدیدیت کے زیر اثر بدلی تھی اور بدل رہی تھی ایسے ہی اسلام بھی آنے والے زمانوں میں بھی ضرور بدلے گا۔

مگر گزرتے ہوئے وقت کے پیشِ نظر یہ مسئلہ فوری طور پر حل ہونا تھا کیونکہ وقت گزرنے کے ساتھ مغرب کے مقابلے میں مسلم دنیا کی خامیاں اور کمزوریاں کچھ اور ظاہر ہورہی تھیں۔ محمد علی، سلطان کا مقابلہ تو کرتا رہا مگر 1840 میں مغربی طاقتوں نے اسے مجبور کرکے اس سے شام، عرب اور یونان کے کئی علاقے خالی کروالئے۔ اس شدید صدمہ سے وہ جانبر نہ ہوسکا۔ اس کا پوتا عباس (54-1813) (جو مصر کے پاشا کی حیثیت سے اس کا جانشین بنا) مغرب اور ہر مغربی چیز سے نفرت کرتا تھا۔ وہ ایک سپاہی تھا اور عثمانی مصلحین کے برعکس اس سے لبرل تعلیم بھی نہیں پائی تھی۔ اس کے لئے مغرب بے معنی لوٹ کھسوٹ اور ذلت کے سوا کچھ نہ تھا۔ وہ ان مراعات کے سخت خلاف تھا جو مغرب کے تاجروں اور افسروں نے مصر میں اپنے لئے حاصل کی تھیں۔ وہ ان

ناممکن پروجیکٹس پر بھی بہت خفا تھا جوانہوں نے اپنے معاشی مفاد کے لئے اس کے دادا محمد علی سے شروع کروائے تھے۔اس نے محمد علی کے جنگی جہازوں کا بیڑہ ختم کر دیا،فوج کی تعداد میں کمی کی اور نئے سکول بند کر دیئے۔مگر عباس مصریوں میں بھی غیر مقبول تھا اسے 1854 میں قتل کر دیا گیا۔اس کی جگہ محمد علی کے چوتھے بیٹے محمد سعید پاشا(63-1822) نے لی۔محمد سعید پاشا، عباس سے بہت مختلف تھا۔اس نے مغربی طرز زندگی اختیار کیا۔غیر ملکیوں کی صحبت میں رہنے لگا اور فوج کو بحال کیا مگر اپنی حکومت کے آخری دور میں سعید بھی یورپ کی کمپنیوں،اداروں کے مشتبہ منصوبوں کی وجہ سے سخت مایوس ہوا۔

ان یورپین منصوبوں میں سے سویز کینال کی تعمیر سب سے بڑا کارنامہ تھا۔محمد علی نے بحیرہ احمر کو بحیرہ روم سے ملانے کی مسلسل مخالفت کی تھی۔اس خوف سے کہ اس طرح مغربی طاقتوں کی نظریں ایک بار پھر مصر پر لگ جائیں گی اور حملوں کا نیا سلسلہ شروع ہو جائے گا۔اس بارے میں اس نے اپنے ایک فرانسیسی دوست سے مشورہ کیا۔اپنے اس دوست فرانسیسی کونسل فرڈیننڈ ڈی لیسپس(94-1805) کو اس نے بے شمار مراعات دینے کا وعدہ کیا۔ڈی لیسپس نے اسے سمجھایا کہ نہر سویز مصر کو اس قابل بنا دے گی کہ وہ برطانیہ کا مقابلہ کر سکے گا اور اس پر مصر کو کچھ خرچ بھی نہیں کرنا پڑے گا کیونکہ اسے فرانسیسی وسائل سے تعمیر کیا جائے گا۔سعید ناسمجھ تھا۔جن مراعات کا معاہدہ 30 نومبر 1854 کو ہوا وہ رعایات مصر کے لئے تباہ کن ثابت ہوئیں۔اس معاہدے کی مخالفت سلطان اور انگلینڈ کے لارڈ پامرسن نے بھی کی مگر ڈی لیسپس نے اپنی کوششیں جاری رکھیں۔اس نے اپنی کمپنی بنالی اور اس کے حصے خریدنے کی دعوت امریکہ، برطانیہ، روس، آسٹریا اور سلطنت عثمانیہ کو دی۔جب حصے فروخت نہ ہوئے تو پاشا نے منصوبہ میں سرمایہ کاری کرنے کے علاوہ ان کی ضمانت بھی دی۔اپریل 1859 میں نہر پر کام شروع ہوا۔

اس سلسلے میں مصر نے اپنی دوسو مربع میل زمین کسی معاوضے کے بغیر منصوبے کی نذر کی اور مکمل سرمایہ کاری کے علاوہ مزدور اور میٹریل بھی مہیا کئے۔1863 میں سعید کا انتقال ہو گیا تو اس کا بھتیجا اسماعیل(95-1830) جانشین ہوا۔اسماعیل بھی اس منصوبے کے حق میں تھا مگر اس نے مراعات کا مسئلہ فرانس کے شاہ نپولین سوئم کے سامنے ثالثی کے لئے پیش کیا۔اس اُمید پر کہ شاید بہتر شرائط طے ہو سکیں۔1864 میں کمپنی کو مفت مزدور اور کاریگر مہیا کرنے کا سلسلہ بند ہوا اور مصر

کی زمین کا کچھ حصہ بھی واپس ملا مگر اس کے عوض تیس لاکھ پونڈ مصری حکومت سے وصول کیے گئے۔ اسماعیل کے لئے اسے قبول کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ اس طرح نہر پر دوبارہ کام شروع ہوا۔ نہر کا افتتاح ایک عظیم الشان تقریب تھی۔ حکومت نے اپنے خرچ پر مہمان بلائے جن کے لئے اہرام تک نئی سڑک بنائی گئی۔ اس دھوم دھام کا مقصد مصر کی خوشحالی ثابت کرنا اور مزید سرمایہ اکٹھا کرنا تھا مگر حقیقت یہ ہے کہ مصر کی معیشت تباہی کے قریب پہنچ چکی تھی۔ مصر کی کمزور معیشت تباہ کرنے میں نہر نے ایک کردار ادا کیا مگر وہ مکمل طور پر اس کی ذمہ دار نہیں۔ پھر بھی اسماعیل کی اس مثال سے ایک غیر مغربی ملک میں جدیدیت رائج کرنے کے لئے بھاری قیمت ادا کرنے کا اندازہ تو ہوتا ہے۔ اسماعیل مصر کے لئے آزادی چاہتا تھا۔ اس کا مقصد یہ بھی تھا کہ عثمانی بالادستی سے مصر کی نجات ہو وہ خود مختاری کے نئے تصور سے واقف تھا مگر اس سارے کھیل میں اسے حاصل کیا ہوا؟ ایک مغربی طاقت کی محتاجی اور بالآخر اس کی غلامی! محمد علی ایک سپاہی تھا جو لڑتا ہوا آزادی کی منزل پر پہنچا۔ اسماعیل نے آزادی خریدنا چاہی۔ اس نے سلطان سے اپنے لئے خدیو یعنی عظیم بادشاہ کا خطاب حاصل کیا تاکہ دوسرے عثمانی بادشاہوں سے الگ پہچانا جائے۔ اس اعزاز کے لئے وہ ساڑھے تین لاکھ پونڈ سالانہ فالتو خراج سلطان کو ادا کرنا۔ اسے نہر کے اخراجات بھی برداشت کرنا پڑے۔ کپاس کی قیمتیں گر جانے سے ہونے والا نقصان بھی پورا کرنا پڑا اور جدیدیت کے تقاضے پورے کرنے کی غرض سے اپنے منصوبوں کے لئے اور فنڈ مہیا کرنے پڑے جن میں نوسو میل لمبی ریلوے لائن چار سو تیس پل اور ایک سو بارہ نہریں شامل تھین جن سے تقریباً 137300 ایکڑ زمین کاشت ہوئی تھی۔ خدیو کی سربراہی میں مصر نے کسی بھی پہلے حکمران کی نسبت تیزی سے ترقی کی۔ اس نے لڑکے لڑکیوں کی تعلیم سائنسی اور جغرافیائی تحقیق کے منصوبے بھی بنا رکھے تھے۔ تفریحی باغات، ٹھنڈی سایہ دار سڑکوں اور نئی عمارتوں کی بدولت قاہرہ ماڈرن شہر بن گیا۔ بدقسمتی سے اسماعیل نے روپیہ حاصل کرنے کے لئے آسان قرضوں کی سکیم شروع کی اور بڑی بڑی رقمیں حاصل کیں جن میں سے زیادہ تو یورپ کے دلالوں، بنک والوں اور مختلف اداروں کے کام آئیں جو اسے نت نئے اخراجات پر مجبور کرتے تھے۔ خدیو، ساہوکاروں اور سود خوروں کے چنگل میں پھنس گیا۔ جب 1875 میں لندن اسٹاک ایکسچینج پر مندا ہوا اور اس کے ساتھ ہی مصری سرمایہ بھی ڈوب گیا تو یہ اونٹ کی پشت پر آخری تنکا تھا۔

نہر سویز سے مصر کو جنگی حکمت عملی کے لحاظ سے بالکل نئی اہمیت مل گئی تھی۔ اس لئے مغربی طاقتیں اس کی مکمل تباہی کے حق میں نہیں تھیں۔ اپنے مفادات کے تحفظ کے لئے برطانیہ اور فرانس نے خدیو پر معاشی پابندیاں عائد کر دیں جو آگے چل کر سیاسی پابندیاں ثابت ہوئیں۔ محمد علی کا خیال ٹھیک تھا کہ نہر سویز مصر کی آزادی ختم کر دے گی۔ مصری حکومت میں اقتصادی معاملات کے لئے مغربی وزراء شامل کئے گئے۔ جب اسماعیل نے 1879 میں انہیں نوکریوں سے برطرف کیا تو یورپ کی بڑی طاقتیں فرانس، برطانیہ، جرمنی اور آسٹریا سب اس کے خلاف متحد ہو گئیں اور خدیو کو برطرف کر دینے کے لئے سلطان پر دباؤ ڈالا۔ اسماعیل کی جگہ اس کے بیٹے توفیق (92-1852) نے لی۔ توفیق نیک دل نوجوان تھا مگر یہ بات تو ظاہر تھی کہ وہ مغربی طاقتوں کا کھلونا تھا اس لئے وہ فوج اور عوام دونوں میں غیر مقبول تھا۔ جب نوجوان مصری افسر احمد بے عروبی نے 1881 میں انقلاب برپا کیا فوج وحکومت میں مصریوں کو اعلیٰ عہدوں پر فائز کرنے کا مطالبہ کیا اور ملک کا انتظام سنبھال لیا مگر اسی عرصے میں برطانیہ نے آ کر اپنا فوجی قبضہ مسلط کر دیا۔ مصر کو یورپ کا ایک حصہ بنا دینے کا خواب دیکھنے والے اسماعیل سے بس اتنا ہو سکا کہ اس نے مصر کو یورپ کی نو آبادی بنا دیا۔

محمد علی ظالم اور سفاک تھا جبکہ اس کے جانشین ناسمجھ اور لالچی تھے مگر سچ یہ ہے کہ وہ اپنے سے بڑی طاقتوں کے ساتھ دست وگریبان تھے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ جس تہذیب کی وہ ہمسری کرنا چاہتے تھے وہ بالکل ایک نئی چیز تھی۔ یہ حیرت کی بات نہیں کہ یورپ کا ناکافی اور محدود تجربہ رکھنے والے ان لوگوں نے یہ حقیقت سمجھنے میں دیر کر دی کہ نئی قوم بننے کے لئے چند تکنیکی اور فوجی اصلاحات کافی نہیں ہوتیں بلکہ اس کے لئے لازمی ہے کہ پوری سوسائٹی نئے سرے سے منظم کی جائے اور آزاد صنعتی معیشت مضبوط بنیادوں پر قائم ہو اور روایتی قدامت پسندی کی جگہ نئی طرز فکر لے۔ ناکامی کی بہت زیادہ قیمت ادا کرنا پڑی کیونکہ اس وقت تک یورپ بہت طاقتور ہو چکا تھا۔ وہ مصر کو مجبور کر سکتا تھا کہ اپنے سرمایہ سے نہر سویز بنوائے اور اس کے باوجود اسے ایک شیئر دینے سے بھی انکار کر سکتا تھا۔ نام نہاد مشرقی بحران (78-1875) سے یہ پہلے ہی ظاہر ہو چکا تھا کہ یورپ کی بڑی طاقتوں میں ایک طاقت (روس) عثمانی سلطنت کے قلب تک پہنچ سکتی تھی اور صرف یورپ کی طاقتوں کے روکنے سے رک سکتی تھی۔ ترکی اس معاملے میں بے بس تھا۔

عظیم سلطنت عثمانیہ اپنے صوبوں پر بھی کنٹرول قائم نہ رکھ سکتی تھی۔ یہ افسوسناک حقیقت اس وقت سامنے آئی جب فرانس نے 1881 میں تیونس پر اور برطانیہ نے 1882 میں مصر پر قبضہ کر لیا۔ یورپ اسلامی دنیا پر تابڑ توڑ حملے کر کے اسے درہم برہم کر رہا تھا۔

مصری حکمرانوں کی تباہ کن غلطیوں کے بغیر بھی یہ کمزور اسلامی ممالک، امریکہ اور مغربی ملکوں کی طرح ماڈرن نہیں بن سکتے تھے۔ کیونکہ ان غیر مغربی سرزمینوں میں جدیدیت کا عمل بنیادی طور پر مختلف تھا۔1843 میں فرانسیسی مصنف جیرڈ ڈی نروال قاہرہ گیا اور دیکھا کہ فرانسیسی بورژوا قدریں اسلامی شہر پر مسلط کی جا رہی تھیں۔ محمد علی کے نئے محل بیرکوں کی طرح بنائے گئے تھے جن میں مہاگنی کی آرام کرسیاں رکھی گئی تھیں۔ کمرے محمد علی کے فوجی وردی میں ملبوس بیٹوں کی تصویروں سے سجائے گئے تھے۔ نروال کے تخیل کا مغربی طرز زندگی کا پیرو مشرقی قاہرہ خاک میں مل گیا تھا۔ جدیدیت اور اس کے سائے قاہرہ پر موت کی طرح منڈلا رہے تھے۔ یورپی طرز کے راستے اڑتی ہوئی خاک کی طرح تھے مگر فرانسیسی اور برطانوی قیام گاہیں روشن تھیں۔

جدید قاہرہ کی عمارتیں جو محمد علی اور اسماعیل نے بنائی تھیں وہ غلامانہ طرز تعمیر کی نمائندہ تھیں۔ یہ حقیقت اس وقت اور بھی واضح ہوگئی جب برطانوی اقتدار کے دوران مشرق وسطٰی کے اس شہر میں مختلف سٹائل کی عمارتیں بنکوں، سفارخانوں، یادگاروں اور بنگلوں کی صورت میں ظاہر ہوئیں۔ ان کا ایسا ہی کوئی مجموعہ یورپ میں ہوتا تو اسے بے ربط اور بے ہنگم قرار دیا جاتا۔ بشریات کے برطانوی عالم مائکل گلسنین کا مشاہدہ تھا کہ قاہرہ ترقی کے ان مرحلوں سے نہیں گزر رہا تھا جن میں سے یورپ سرمایہ داری کی سمت جاتے ہوئے پہلے ہی گزر چکا تھا۔ قاہرہ ایک صنعتی مرکز نہیں بن رہا تھا۔ نہ ہی کسی خصوصی مقصد کے تحت قدامت سے جدیدیت کا رخ کئے ہوئے تھا۔ نہ کسی نئی شہری یگانگت کی تلاش میں تھا بلکہ قاہرہ ایک وسیع و عریض شہر بنایا جا رہا تھا جس کے ذریعے پورے ملک اور تمام معاشرے پر غلبہ اور اختیار حاصل ہو۔ اس کی یہ شکل ایسے رشتے سے ابھری جس کی بنیاد جبر اور عالمی اقتصادی نظام پر تھی۔ قاہرہ کے معاملے میں برطانیہ نے یہ اہم کردار ادا کیا۔ مشرق وسطٰی میں جدیدیت کا تمام تجربہ ہی انتہائی مختلف تھا۔ یہاں وہ یورپ کی طرح خودمختاری اور طاقت کا ذریعہ تو نہیں بنی مگر محرومی محتاجی اور بھونڈی نقالی کا سبب بن گئی۔

بہت لوگ جو جدیدیت کے عمل میں شامل نہیں تھے ان کے لئے جدیدیت تنہائی اور زندگی

سے کٹ جانے کا نام تھا۔محمد علی کے قاہرہ کی طرح جدید شہران اصولوں سے بالکل مختلف بنیادوں پر تعمیر ہوئے تھے جس اصولوں پر محمد علی نے قاہرہ تعمیر کیا تھا جیسا کہ گلسینن نے کہا کہ مشرقی شہر سیاحوں، مسافروں اور اکثر اہل اقتدار کی نظر میں الجھا دینے والے بلکہ ڈراؤنے ہیں۔ان کی سڑکوں اور گلیوں کے نام یا نمبر نہیں ہوتے تھے۔پیچیدہ راستے کسی منصوبے اور نظم کے بغیر بنائے جاتے ہیں۔جس کی وجہ سے یورپ کے لوگ راستہ بھول جاتے ہیں کیونکہ انہیں اپنے آس پاس کی سمجھ ہی نہیں آتی۔اسی طرح مشرق وسطیٰ اور شمالی افریقہ کے رہنے والوں کو اپنے نئے مغربی طرز کے شہروں کی سمجھ نہیں آتی نہ وہ ان کے اس تصور کے مطابق ہیں جسے وہ شہر کہتے ہیں اس لئے وہ خود اپنے ہی شہر میں کھو جاتے ہیں۔مغربی طرز کے شہروں نے اکثر پرانے شہروں کے گرد گھیرا ڈال لیا ہے جو ان کی نسبت تاریک، ڈراؤنے اور ریشنل نظم و ترتیب سے بیگانہ لگتے ہیں۔چنانچہ مصری بیک وقت دو دنیاؤں میں رہنے پر مجبور تھے۔ایک دنیا ماڈرن تھی دوسری روائتی دنیا تھی۔ایسی دہری زندگی بسر کرنے سے شناخت کا بحران پیدا ہوتا ہے اور جدیدیت کے بعض تجربات کی بناء پر کہہ سکتے ہیں کہ بعض مذہبی معاملات حیرت انگیز طور سے سامنے آجاتے ہیں۔

ایران نے ابھی جدیدیت کے عمل کا آغاز نہیں کیا تھا حالانکہ مشرق وسطیٰ میں نپولین کی آمد سے یورپ کے غلبے کا احساس اس ملک میں بھی پیدا ہو چکا تھا۔نپولین، روسی شہنشاہ کی مدد سے ہندوستان پر حملہ کرنا چاہتا تھا۔اس وجہ سے یورپ کی طاقتوں کی نظر میں ایران کو نئی جنگی اہمیت حاصل ہوگئی۔برطانیہ نے فتح علی قاچار شاہ دوم (1834-1798) کے ساتھ معاہدہ کیا کہ ایران کی مدد کے عوض برطانیہ ایران کو فوجی سامان اور ٹیکنالوجی مہیا کرے گا۔طاقت کے اس کھیل میں ایران کھلونا بن گیا تھا۔یہ کھیل نپولین کے زوال کے بہت عرصہ بعد تک جاری رہا۔

برطانیہ خلیج فارس اور ایران کے جنوب مین ایشیائی علاقوں پر اقتدار حاصل کرنا چاہتا تھا کہ ہندوستان کی حفاظت ہو سکے جب کہ روس نے جنوب میں اپنا اڈہ قائم کرنے کی کوشش کی۔دونوں میں سے ایک بھی ایران پر حکومت نہیں کرنا چاہتا تھا بلکہ دونوں ہی اس کی آزادی کی حفاظت کرتے تھے مگر عملی طور پر شاہ دوسرے کی مدد کے بغیر ایک کو بھی خفا کرنے کو جرأت نہیں کرتے تھے۔یورپ کے لوگ اپنے آپ کو ترقی اور تہذیب کے علمبرداروں کی حیثیت سے ایرانیوں پر مسلط کرتے تھے مگر درحقیقت روس اور برطانیہ دونوں ہی ترقی کے صرف ان منصوبوں کی حوصلہ

افزائی کرتے جن کے ساتھ ان کا اپنا مفاد وابستہ ہوتا تھا اور ریلوے جیسے اہم ترقیاتی منصوبے اور ایسے ہی اور منصوبوں کا راستہ روک دیتے جن سے ایرانی عوام کی حالت بہتر ہو سکتی تھی۔ اس خیال سے کہ ان کے اپنے مفاد پر زد نہ پڑے۔

انیسویں صدی کے آغاز میں آذربائیجان کے گورنر جنرل ولی عہد شہزادہ نے جدید فوج کی ضرورت محسوس کی اور اس سلسلے میں اعلیٰ تربیت حاصل کرنے کے لئے اپنے نوجوان یورپ بھیجے مگر وہ تخت نشینی سے پہلے ہی 1833 میں فوت ہو گیا۔ اس کے بعد قاچار شاہوں نے جدیدیت کے لئے کوششیں کیں مگر شاہ کمزور تھے انہیں برطانیہ اور روس سے اتنا تحفظ حاصل تھا کہ انہوں نے اپنی فوج کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی کہ کسی بھی ہنگامی صورتحال میں یورپ نے ہمیشہ ان کی حفاظت کی۔

ان میں خطرہ محسوس کر لینے کی صلاحیت نہیں تھی جو محمد علی کی ایک بڑی خوبی تھی۔ ایمانداری کی بات ہے کہ جدیدیت کے مرحلے سے گزرنا مصر کی نسبت ایران کے لئے بہت مشکل تھا۔ ایران کے دشوار گزار راستے دور دراز فاصلے اور خانہ بدوش قبائل کی خودمختاری کے ہوتے ہوئے وہاں مرکزیت نافذ کرنا ممکن نہ تھا جب تک کہ بیسویں صدی کے اعلیٰ طریق کار اور ٹیکنالوجی کی حمایت حاصل نہ ہو۔

ایران سب سے زیادہ خسارے میں رہا۔ وہاں کمر توڑ محتاجی تو تھی مگر نو آبادیت اور سرمایہ کاری سے کوئی فائدہ حاصل نہیں ہوا تھا۔ انیسویں صدی کے پہلے نصف میں برطانیہ اور روس نے خصوصی مراعات کا شوشہ چھوڑا جس سے عثمانی سلاطین کی حاکمیت پر مزید حرف آیا۔ خصوصی مراعات کے ذریعے روسی اور برطانوی تاجروں کو ٹیکس میں خصوصی رعایت دی گئی اور ایران کی سرزمین پر انہیں ایرانی قانون سے مستثنیٰ قرار دیا گیا۔ اس پالیسی کے خلاف بڑی نفرت پیدا ہوئی کیونکہ اس کے ذریعے یورپ کے تاجروں اور پیشہ وروں نے ایرانی سرزمین پر دھاوا بول دیا۔ اگر عدالتوں نے ان کی بدعنوانیوں کی وجہ سے ان پر گرفت کی تو مجرموں کو سزا دیئے بغیر انہیں رہا کرنا پڑا۔ خصوصی مراعات سے مقامی صنعت پر بھی برا اثر پڑا۔ کم قیمت مغربی سامان کی وجہ سے ایرانی صنعت کے لئے بحران پیدا ہو گیا۔ مغرب کے ساتھ تجارت سے کچھ فائدے بھی حاصل ہوئے جب کپاس، افیم اور قالین برآمد کئے گئے۔ مگر ریشم کی صنعت تباہ اس وقت ہو گئی جب ایک مغربی ادارے نے یورپ سے ریشم کے بیمار کیڑے درآمد کر لئے۔

چاندی کی قیمت بین الاقوامی مارکیٹ میں ڈرامائی طور سے گر گئی تو اس سے بھی ایران کو بھاری نقصان ہوا کہ اس کی تمام کرنسی چاندی میں تھی۔1850 میں ایران پر یورپ کا اقتصادی دباؤ مزید بڑھ گیا جب ان طاقتوں نے اپنی مخصوص سرگرمیوں کے لئے رعایات کا مطالبہ شروع کیا۔ برطانیہ اور ہندوستان میں رابطہ کی سہولتیں بہتر بنانے کے لئے انگریزوں نے ٹیلیگراف کی تمام لائنوں میں ایران سے رعایت حاصل کی۔1847 میں ایک برطانوی شہری بیرن جولیس ریوٹر(99-1861) نے ایران میں ریلوے کی تعمیر نئی آبپاشی سکیم، ایک نیشنل بنک اور کئی صنعتی منصوبوں کے خصوصی حقوق حاصل کئے۔تمام رعایات وزیراعظم مرزا حسین خان کی ایماء پر دی گئیں جو اصلاحات کے حق میں تھا مگر شاید اس کا خیال تھا کہ شاہ نااہل ہیں اس لئے یہی بہتر ہے کہ انگریز ہی یہ ملک جدید بنائیں مگر اس کا اندازہ غلط تھا۔متعلقہ افسروں کے ایک گروہ اور علماء نے شاہ بیگم کی قیادت میں ریوٹر کی مراعات کے خلاف زبردست احتجاج کیا اور مرزا حسین کو مستعفی ہونے پر مجبور کیا۔ پھر بھی انیسویں صدی کے آخر تک روس اور برطانیہ نے ایران میں زبردست اقتصادی مفادات حاصل کئے بلکہ بعض علاقوں میں تو یہ معاشی کنٹرول سیاسی کنٹرول میں بدل جاتا تھا۔تاجر جدیدیت کے فوائد جانتے تھے مگر ڈرتے تھے کہ غیر ملکی اثرات کی کثرت حکومت دشمن مہم کی جواز بن جاتی ہے۔

انہیں علماء کی حمایت حاصل ہوگئی جو مصری علماء کی نسبت بہت طاقتور تھے۔اٹھارویں صدی میں اصولیوں کی فتح نے مجتہدین کو ایک طاقت ور ہتھیار مہیا کر دیا تھا کیونکہ شاہ اصولی طور پر ان کے فیصلوں کا پابند تھا۔قاچار انہیں ڈرا سکتے تھے نہ کمزور کر سکتے تھے۔انہیں خود علماء کی مدد چاہیے تھی۔علماء کی معاشی حیثیت مضبوط تھی اور وہ عثمانیوں کے زیر حکومت عراق میں نجف اور کربلا جیسے مقدس شہروں میں جمع تھے۔ جہاں وہ قاچاروں کے شر سے محفوظ تھے۔ایران میں شاہی دارالحکومت تہران شیعوں کے مقدس شہر قم سے بہت مختلف تھا۔جس سے اندازہ ہوسکتا تھا کہ دین اور سیاست دونوں واضح طور پر الگ ہیں۔محمد علی کے برعکس قاچار شاہوں کے پاس جدید فوج نہیں تھی نہ ایسی کوئی بیوروکریسی تھی جو تعلیم، قانون اور اوقاف کے معاملات میں علماء پر اپنی مرضی مسلط کر سکے۔انیسویں صدی کے آغاز میں جو علماء شیعی روائت کے وفادار تھے وہ سیاست سے الگ رہے۔شیخ مرتضیٰ انصاری پہلا مجتہد تھا جسے واحد مرجع تقلید اور مخفی امام کے نائب کی حیثیت ملی۔اسے ایک دوسرے

اُمیدوار پر ترجیح دی گئی جسے علم وفضل میں برتری حاصل تھی اس لئے کہ اس نے خود اعتراف کیا تھا کہ وہ لوگوں کے مسائل میں دلچسپی لیتا ہے۔ تاجروں اور زائرین کے کاروباری اور ذاتی معاملات میں ان کا مشیر ہے۔ مطلب یہ کہ اہل ایمان کا قائد عالم ہونا چاہیے نہ کہ دنیادار۔

یورپ کے لوگوں نے ایران میں مزید معاشی طاقت حاصل کر لی۔ تاجروں اور کاریگروں نے پریشان ہو کر علماء سے رجوع کیا۔ تاجر اور کاریگر آپس میں متحد تھے کیونکہ اکثر وہ ایک ہی طبقے سے تعلق رکھتے تھے اور ان کے مذہبی خیالات بھی ایک جیسے تھے۔ انیسویں صدی کے دوسرے نصف میں علماء نے غیر ملکی مفادات کے خلاف احتجاج کرنے میں تاجروں کو اخلاقی اور نظریاتی مدد دی۔ ان کی دلیل تھی کہ شاہ اگر اسی طرح کفار کی حوصلہ افزائی کرتے رہے اور انہیں طاقتور بناتے رہے تو ایران کی اسلامی حیثیت ختم ہو جائے گی۔

شاہوں نے ان کے اعتراض کا جواب اس طرح دیا کہ عوام کے مذہبی تصورات سے قریب ہونے لگے اور امام حسین کے ماتمی جلوسوں اور تقریبات پر خصوصی توجہ دی۔ ان کے اپنے مرثیہ خوان تھے جو ہر روز کربلا رزمیہ کے حالات سنایا کرتے۔ امام حسین کی یاد میں تعزیہ نکالنے کا شاہی سطح پر اہتمام کیا جاتا۔ محرم کی پانچ راتوں میں مسلسل ان کی شہادت کا ذکر کیا جاتا۔ یزید سے ان کی لڑائی ڈرامہ کی شکل میں دکھائی جاتی ان کی شہادت اور ان کے بیٹوں کی شہادت کے منظر پیش کئے جاتے۔ عاشور کی رات کربلا کی یاد میں بہت بڑے جلوس نکالے جاتے۔ جن میں شہدا کے قدآدم مجسمے بھی شامل کئے جاتے شہر کی گلیوں مین سے گزرتے ہوئے جلوس کے پیچھے عام لوگ سینہ کوبی کرتے۔ تمام محرم میں ہر مسجد کے میناروں پر سیاہ کپڑا چڑھا دیا جاتا تھا اور مختلف پبلک مقامات پر مرثیہ خوانی کے مرکز قائم کئے جاتے جہاں مرثیہ خواں بلند آواز میں مرثیے پڑھتے اور اس فن میں ایک دوسرے پر سبقت حاصل کرنے کو کوشش کرتے۔

قاچار دور میں ان ماتمی تقریبات نے ایک مستقل ایرانی ادارے کی صورت اختیار کر لی بادشاہت کا رشتہ امام حسین اور کربلا سے جوڑنے کے علاوہ اس کے ذریعے قاچار بادشاہوں کی حکمرانی بھی جائز قرار دینے کی کوشش کی جاتی۔ ان تقریبات کے ذریعے ہی عوام اپنی بے چینی اور مایوسی کا اظہار کر لیتے جس سے ان کے دل کی بھڑاس نکل جاتی۔ تقریبات کے دوران لوگ خاموش تماشائی نہیں بنتے تھے بلکہ اپنے غم والم کا بھرپور اظہار کرتے تھے جیسا کہ ایک فرانسیسی

سیاح نے لکھا ہے کہ تمام سامعین مرثیہ کے دوران زار وقطار روتے اور آہیں بھرتے تھے۔ جنگ کے مناظر کے دوران ناظرین چھاتی پیٹتے ہوئے سسکیاں لیتے اور آنسو لگا تاران کے رخساروں پر بہتے تھے۔ ایک ہی وقت میں سبھی موجود ہوتے جہاں وہ اپنے دکھوں اور غموں کا ماتم کرتے۔ امریکی سکالر ولیم ہیمین کا کہنا ہے کہ سامعین کو سکھایا جاتا تھا کہ وہ اپنے گناہوں پر روئیں، اپنی مصیبتوں پر روئیں اور حسین کے مصائب یاد کریں جن کے سامنے ان کے اپنے مصائب کی کوئی حقیقت نہیں اس طرح وہ اپنا رشتہ کربلا سے جوڑ لیتے اور ڈرامائی رسموں کے ذریعے سے اپنے حال پر وارد کر لیتے تو اس طرح ایک تاریخی المیہ، وقت سے آزاد متھ کا بے زماں مقصد حاصل کر لیتا تھا۔ کوڑوں کی مار سہنے والے، کوفہ کے ان لوگوں کے نمائندہ تھے جنہوں نے حسین سے غداری کی اور اب پچھتا کر اپنے آپ کو سزا دے رہے تھے مگر وہ ان مسلمانوں کی نمائندگی بھی کرتے تھے جو انصاف پسند معاشرہ قائم کرنے میں امام حسین اور ان کے جانشینوں کا ساتھ نہ دے سکے۔ شیعہ امام حسین کے لئے روتے تھے اور ان کا جنازہ بھی علامت کے طور پر نکالتے تھے کیونکہ ان کی زندگی میں ایسا نہ ہو سکا اور نہ ہی ان کی تعلیمات پر عمل کیا گیا۔ آج بھی ایرانیوں کا کہنا ہے کہ وہ محرم میں اپنے دوستوں اور عزیزوں کے دکھ بھی یاد کرتے ہیں۔ وہ اپنی ذاتی یادوں اور تجربات کے حوالے سے بدی کا کردار سمجھنا چاہتے ہیں۔ ایسا کیوں ہے کہ نیکی ہار جاتی ہے اور بدی کامیاب ہوتی دکھائی دیتی ہے۔ روتے چلاتے اور ماتم کرتے ہوئے وہ اس انصاف کی آرزو کرتے ہیں جو شیعہ تصورات کی جان ہے۔ مرثیے اور ڈرامے ہر سال دنیا میں بدی کے موجود ہونے اور آخر کار نیکی کی فتح میں ان کا یقین مستحکم کرتے ہیں۔

مذہب کا یہ مقبول اور عوامی تصور شیعہ ازم کے اس عقلی اور قانونی تصور سے بالکل مختلف تھا جس کی تلقین مجتہد کرتے تھے۔ اس مقبول عام تصور میں انقلابی امکانات بھی تھے جو بڑی آسانی کے ساتھ معاشرے میں برائیوں کی نشاندہی کر سکتے تھے اور کرتے بھی تھے۔ ناپسندیدہ حکمرانوں اور یزید کے درمیان مماثلت تلاش کر لینے میں بھی معاون تھے۔ مگر صفویوں اور قاچاروں کے دور میں یہ انقلابی تصور ابھرنے نہیں دیا گیا اور امام حسین کے مصائب کا ذکر کرنے پر زور دیا گیا۔ امام حسین کی قربانیاں لوگوں کے گناہوں کا کفارہ سمجھی جاتی تھیں۔ انیسویں صدی میں لوگ تعزیہ کے ذریعے باغیانہ جذبات کا اظہار نہیں کرتے تھے بلکہ وہ مقبول عام اصلاحی تحریکوں کے وسیلے سے

اپنی بے چینی ظاہر کرتے تھے۔

ان میں سے پہلی تحریک کا قائد محمد کریم خان کرمانی(71-1810) تھا جو ایک قاچار شہزادہ اور فتح علی کا کزن اور سوتیلا بیٹا تھا جس کا باپ ایک شوریدہ سر صوبے مکران کا گورنر تھا۔ کریم خان تصوف کی ایک انقلابی تحریک شیخی میں شامل ہوگیا تھا اس تحریک کا بانی کربلا کا شیخ احمد الاحسائی (1826-1753) تھا جو ملا صدرا کے تصوف اور اصفہان کے مدرسہ فکر سے بہت متاثر تھا جسے اصولی ملاؤں نے دبانے کی بہت کوشش کی تھی۔ احسائی اور اس کے شاگرد کاظم راشدی (1843-1759) نے بتایا کہ ہر پیغمبر اور ہر امام منشائے ایزدی کا پرتو ہے۔ ان کی زندگی اور ان کی مثال تمام انسانیت کے لئے تکمیل اور سرخروی کا راستہ ہے۔ مخفی امام اس دنیا میں مخفی نہیں ہے۔ وہ عالم امثال میں ہے۔ اپنے ان ارضی نمائندوں کے ذریعے کہ جنہیں تصوف کے حلقے میں داخل ہونا آتا ہے وہ انسانوں کی رہنمائی اس منزل تک کرتا ہے جہاں پہنچ کر وہ شرعی قوانین سے بے نیاز ہوجاتے ہیں۔ منشائے ایزدی ان کے باطن میں گھر کر لیتی ہے اور وہ اس کا ادراک براہ راست کرسکتے ہیں، بجائے اس کے کہ خارجی قوانین پر عمل کریں۔ مجتہد یقیناً اس سے بیزار تھے۔ احسائی نے بتایا کہ ہمیشہ دنیا میں ایک مکمل شیعہ موجود ہوتا ہے۔ لغزش سے پاک، کم یاب لوگوں کا گروہ، جس کا رابطہ مخفی امام سے وجدانی ریاضتوں کے ذریعے ہوتا ہے۔ مطلب یہ کہ مجتہدین کا مذہب نامکمل، سطحی اور قوانین کا غلام ہے۔ جو احسائی اور اس کے مقلدین کی صوفیانہ بصیرت کے مقابلے میں ہیچ ہے۔

شیخی سکول عراق اور آذربائیجان میں بہت مقبول تھا۔ ایک سیاسی پروگرام کی بجائے وہ محض ایک فلسفہ اور آئیڈیا تھا۔ راشدی کی موت کے بعد کریم خان شیخی لیڈر بنا جس نے اسے مجتہدین کے خلاف بغاوت کی شکل دے دی۔ وہ کھلم کھلا ان کی تنگ نظری اور لکیر کے فقیر ہونے کی مذمت کرتا اور کہتا کہ انہیں نئے خیالات سے دلچسپی نہیں۔ مسلمانوں کو یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ ان کا واحد مقصد تقلید ہے۔ ہر مسلمان قرآن کی تفسیر کا اہل ہے۔ مجتہدین پرانے زمانے کی باتیں کرتے ہیں جبکہ دنیا نئے تصورات کی تلاش میں ہے۔ بنی نوع انسان مسلسل تغیر وارتقاء کے عالم میں ہے اسی لئے ہر پیغمبر کو اپنے پیشرو پر فضیلت حاصل ہے۔ ہر دور میں کوئی مخلص شیعہ قرآن وشریعت کے مخفی معنی بیان کرتا اور ان کی گہرائیوں تک پہنچنے کی کوشش کرتا رہا ہے۔ اہل ایمان پر لازم ہے کہ وہ ان

صوفی رہنماؤں کی بات سنیں جن کا تقرر امام نے کیا ہے اور جن کے اختیارات پر مجتہدین نے ڈاکہ ڈالا ہے۔ کریم خان کو یقین تھا کہ یہ ترقی پسندانہ رجحان کامیاب ہو کر رہے گا۔ انسان جلد ہی اپنی منزل پالے گا۔ اس طرح وہ دراصل ان نئی تبدیلیوں اور نئے تصورات کی نشان دہی کر رہا تھا جو یورپ سے ایران آئے تھے۔

کریم خان جمہوریت پسند نہیں تھا۔ جدیدیت سے پہلے دور کے تمام فلسفیوں کی طرح وہ بھی ممتاز اور نمایاں افراد کی برتری کا قائل تھا۔ مجتہدین کے باہمی اختلاف سے بھی پریشان تھا۔ وہ لوگوں پر اپنے نظریات مسلط کرنا چاہتا تھا مگر اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ ایران کے ان علماء میں سے تھا جنھوں نے سب سے پہلے یورپ کے نئے تصورات سمجھنے کی کوشش کی تھی۔ جبکہ پرانے علماء روس اور برطانیہ کی طرف سے ایران میں مداخلت کی محض مخالفت کرتے رہے۔ کریم خان مغرب کی نئی سائنس اور سیکولرازم میں بہت دلچسپی لیتا تھا۔ فرصت کے اوقات میں وہ کیمسٹری، علم النجوم وغیرہ کا مطالعہ کرتا تھا۔ اسے اپنے سائنسی علم پر فخر بھی بہت تھا۔ 1850 اور 1860 کے عرصے میں جبکہ بہت کم ایرانی یورپ کے متعلق معلومات رکھتے تھے کریم خان نے پہلے ہی محسوس کر لیا تھا کہ مغربی کلچر ایرانی تہذیب کے لئے خطرہ ہے۔ یہ دور عبوری تھا اس نے اندازہ کر لیا تھا کہ ایران کو ایک ایسے چیلنج کا سامنا کرنا ہے جس کی پہلے کوئی مثال نہیں۔ اس کے لئے مذہب کا ایسا تصور ضروری ہے جس کے اندر نئے انقلابی تصورات جذب کرنے کی تاب ہو۔

شیخی تحریک کی جڑیں، بہرحال ماضی میں پیوست تھی۔ اس کے تصور علم میں چند نمایاں افراد کو فوقیت حاصل تھی۔ صنعتی لحاظ سے ترقی یافتہ مغرب کے مقابلے میں اسے اپنی بے مائیگی کا احساس بھی تھا۔ کریم خان نئے دارالفنون کے نام سے قائم تہران کے پہلے ہائی سکول کے سخت خلاف تھا جہاں مفت تعلیم دی جاتی تھی۔ اسے وزیر اصلاحات عام کبیر نے قائم کیا تھا۔ اس کا اسٹاف اکثر یورپین استادوں پر مشتمل تھا۔ اس میں مترجموں کی مدد سے ریاضی غیر ملکی زبانوں، آرٹ اور جدید جنگی فنون کی تعلیم دی جاتی تھی۔ کریم خان کے خیال میں اس سکول کا مقصد مغربی اثرات کا فروغ تھا۔ اسلام کے خلاف ایک کھلی سازش تھی جس سے جلد ہی علماء کی زبانیں بند کر دی جائیں گی۔ مسلمان بچے عیسائی سکولوں میں پڑھیں گے اور ایرانی، نقلی یورپین بن جائیں گے۔ وہ آنے والے دور میں تنہائی اور علیحدگی کے خطرات پوشیدہ دیکھ رہا تھا۔ یورپ کے بڑھتے

ہوئے اثر اور مداخلت کے پیش نظر، کریم خان نے اس سے دوری اور اس کی مذمت کا راستہ اختیار کیا۔ اس کے دیومالائی نظریات کا مقصد ایرانیوں پر ایک نئی دنیا کے دروازے کھولنا تھا مگر کوئی چاہے یا نہ چاہے ایران پر مغربی اثر ایک مسلمہ حقیقت تھی۔ کوئی اصلاحی تحریک مغربی اثرات کو نظرانداز کر کے کامیاب نہیں ہوسکتی تھی۔ کریم خان کے خلاف یہ افواہ بھی عام ہوئی کہ وہ اپنی مذہبی حکومت قائم کرنا چاہتا ہے جس کی بناء پر اسے دربار میں طلب کیا گیا اور ڈیڑھ سال تک زیرنگرانی رکھا گیا۔ 60-1850 کے عشرے میں اس نے تمام سرگرمیوں سے علیحدگی اختیار کر لی۔ اپنی خیالات اپنے تک محدود رکھے اور اس دنیا سے شکست خوردہ اور دل برداشتہ رخصت ہوا۔

اس دور کی دوسری اصلاحی تحریک بھی گو کہ قدامت پسند تھی مگر اپنے اندر نئی مغربی قدریں سمو لینے کی صلاحیت رکھتی تھی۔ اس کا بانی سید علی محمد (50-1879) کربلا اور نجف میں شیخی تحریک سے وابستہ رہا تھا مگر 1844 میں اس نے اعلان کیا کہ میں خدا تک پہنچنے کا وہ (باب) دروازہ ہوں جس کے بند ہونے کا اعلان علماء نے بارھویں امام کے مخفی ہونے پر کیا تھا۔ اصفہان، تہران اور خراسان کے مالدار تاجر، ممتاز افراد اور علماء اس کی تحریک میں شامل ہوئے۔ کربلا میں اس کی خاتون پیرو قراۃ العین (52-1814) نے بے شمار لوگوں کو متاثر کیا۔ ملا صادق المعروف مقدس اور مرزا علی برفروشی (جسے قدوس کا خطاب دیا گیا) نے اس تقریباً نئے مذہب کی خوب تبلیغ کی۔ باب کا نام اذانوں میں لیا جانے لگا۔ شیراز میں تلقین کی گئی کہ نماز میں منہ کا رخ باب کے گھر کی طرف کیا جائے۔ اس سال باب حج کرنے گیا تو کعبہ کے سامنے کھڑے ہو کر اس نے اعلان کیا کہ وہ مخفی امام کی تجسیم ہے۔ اس کے پندرہ ماہ بعد جوزف سمتھ کی طرح باب نے نئے ولولے کے ساتھ 'بیان' کے نام سے الہامی کتاب پیش کی۔ تمام پرانی مقدس کتابیں منسوخ کر دی گئیں۔ اس نے دعویٰ کیا کہ وہ رہبر دوراں ہے اور اس کی شخصیت میں ماضی کے تمام بڑے پیغمبر جلوہ گر ہیں۔ بنی نوع انسان ان تکمیل کے مراحل میں ہے پرانے مذاہب اب کسی کام کے نہیں ہیں۔ عیسائی 'مورمون' کی طرح 'بیان' نے بھی سماجی انصاف پر زور دیا اور جدیدیت کی اقدار کی حمایت کی۔ اس نے آزاد تجارت، پیداوار میں اضافہ، ٹیکسوں میں کمی، ذاتی ملکیت کی ضمانت اور عورتوں کی حالت بہتر بنانے پر زور دیا مگر ان سب سے اہم بات یہ ہے کہ باب نے انیسویں صدی کا یہ تصور قبول کر لیا کہ اس دنیا کے سوا ہماری کوئی اور دنیا نہیں۔ روائتی لحاظ سے شیعہ ماضی کے المیوں اور

مستقبل کی بشارتوں میں زندہ تھے جبکہ باب قصہ زمیں برسرِ زمیں کے مصداق، اب اور یہاں، پرزور دیتا تھا۔ وہ کہتا: ''کوئی یوم آخرت نہیں ہے نہ کوئی حیات بعدالموت ہے۔ جنت اسی دنیا میں ملے گی۔ مجہولوں کی طرح نجات کے منتظر رہنے کی بجائے،ہمیں زمین پر اچھا معاشرہ تخلیق کرنا ہے اور اپنی زندگیوں کے اندر ہی نجات تلاش کرنی ہے۔''

بابی تحریک کے کئی پہلو ایسے ہیں جو شبتائی زیوی کی یاد دلاتے ہیں۔ شبتائی کی طرح ہی باب نے بھی لوگوں کو اپنا دیوانہ بنائے رکھا۔ جب اسے حکمرانوں نے قید کیا اور جب اسے ایک جیل سے دوسری جیل منتقل کیا جاتا تو لوگ ہجوم در ہجوم اسے ملنے آتے اور لاء اینڈ آرڈر کا مسئلہ پیدا ہوجاتا۔ اس کے قید خانے زائرین کے لئے زیارتیں بن گئیں۔ جب وہ جیل میں بیٹھ کر غاصب قاچار محمد شاہ کے نام غضبناک خط لکھتا تو اس کے پیرو بڑی تعداد مین اس سے ملنے آتے اور اسے ان سے ملنے کی اجازت دینی پڑتی۔ جب اسے دور دراز عرومیہ سے باہر قلعہ چہ رگ میں منتقل کیا گیا تو اس کے مداح پھر بھی اتنی بڑی تعداد میں اس سے ملنے آتے کہ ہال میں سمانہیں سکتے تھے چنانچہ انہیں بزور باہر سڑک پر کھڑا کر دیا جاتا۔

1848 کے موسم گرما میں جب آخر کار تبریز میں اس کے خلاف مقدمہ شروع ہوا تو لوگوں میں زبردست جوش وخروش تھا۔ ان کا ایک سیلاب اسے دیکھنے آیا تو وہ کمرہ عدالت میں فاتحانہ شان کے ساتھ داخل ہوا۔ مقدمہ کے دوران بہت بڑا ہجوم یہ اُمید لئے باہر منتظر کھڑا رہا کہ باب اپنے دشمنوں کو شکست فاش دے گا اور امن وانصاف کے ایک نئے دور کا آغاز کرے گا مگر انہیں مایوسی ہوئی کیونکہ باب اپنے معترضین کا سامنا نہیں کرسکا اور اس کی کارکردگی مایوس کن رہی۔ اس پر جرح کرنے والوں نے عربی، دینیات اور فلسفہ میں اس کا علم ناقص بتایا۔ اسے نئی سائنس کا کوئی علم نہیں یہ شخص امام کیونکر ہوسکتا ہے۔ عدالت نے باب کو واپس جیل بھیج دیا۔ عدالت اس خطرے کا صحیح اندازہ کرنے میں ناکام رہی جو باب کی طرف سے حکومت کو ہوسکتا تھا اس لئے کہ اس وقت تک بابی تحریک محض مذہبی اور اخلاقی اصلاح کی حد تک محدود نہیں رہی تھی بلکہ ایک نئے سماجی اور سیاسی نظام کا پرزور مطالبہ بن گئی تھی۔

جس طرح شبتائی ازم نے تمام سماجی طبقے متاثر کئے تھے۔ باب نے اپنی مسیحائی اور تصوف سے عوام مسحور کر لئے۔ سیکولر ذہن کے انقلابیوں کے لئے اس کی سماجی ڈاکٹرین ہی کافی تھی۔ جیسا

کہ یہودی تحریک کے آغاز میں یہ خیال عام تھا کہ پرانی دنیا تیزی سے ختم ہو رہی ہے اور روائتوں کا احترام کوئی معنی نہیں رکھتا۔ جون 1848 میں بابی لیڈروں نے بدشت (خراسان) میں ایک جلسہ منعقد کیا رسمی طور پر قرآن کی تنسیخ ہوئی۔ شریعت باب کے تسلیم ہونے تک باقی رہنے دی گئی۔ فی الحال لوگ اپنے ضمیر سے رہنمائی حاصل کریں اور علماء پر انحصار کی بجائے خود نیک و بد میں تمیز کرنا سیکھیں۔ انہیں اگر وہ چاہیں تو شرعی قوانین رد کر دینے کی آزادی ہے۔ کرشماتی خاتون قرۃ العین نے عورتوں کی غلامی اور قدیم اسلامی دور کے خاتمہ کی علامت کے طور پر پردہ کرنا ترک کر دیا۔ جو ناپاک تھا وہ پاک قرار پایا۔ سچائی ایسا اصول نہیں جو ایک ہی لمحے میں ظاہر ہو۔ خدائی احکام، منتخب ہستیوں کے توسط سے عوام پر بتدریج منکشف ہوتے ہیں۔ شیتائی کی طرح، باب نے ایک نئی مذہبی کثرت پسندی کا تصور دیا کہ نئے نظام میں پچھلے تمام الہامی مذاہب ایک ہو جائیں گے۔

بدشت کے اس جلسہ میں شامل ہونے والے کئی بابی ان تبدیلیوں کا حال سن کر سکتہ میں آ گئے اور خوف کے عالم میں بھاگ نکلے نیک اور مخلص مسلمانوں نے ان کافروں پر حملہ کر دیا تو جلسہ بدامنی کی حالت میں منتشر ہو گیا مگر قائدین کا کام شروع ہوا تھا۔ وہ خفیہ طور پر مازندران واپس آئے جہاں بابی رہنما ملا حسین بشروئی (1850) نے دو سو افراد جمع کئے اور ان سے کہا کہ بابیوں پر لازم ہے کہ وہ اپنے دنیاوی اثاثے قربان کر دیں اور امام حسین کو اپنا ماڈل بنائیں۔ صرف قربانی اور شہادت کے وسیلے سے نئی دنیا اس وقت پیدا ہو سکتی ہے جب باب کمزوروں اور غریبوں کی حالت بدلے گا۔ ایک سال میں باب دنیا فتح کر لے گا اور تمام مذاہب ایک ہو جائیں گے۔ بشروئی شاندار سپہ سالار ثابت ہوا اس کی مختصر سی فوج نے شاہی افواج کو میدان سے بھاگنے پر مجبور کر دیا۔ جیسا کہ دربار کی تاریخ میں ہے کہ وہ 'بھیڑوں کی طرح ڈر کر بھاگے جیسے بھیڑیئے ان کا پیچھا کر رہے ہیں۔' بابیوں نے حملے کئے، لوٹا مارا اور بہت کچھ آگ کی نذر کر دیا۔ ان کے ہم خیال سمجھتے تھے کہ بابیوں کی بغاوت کربلا سے بھی برا اور اہم واقعہ ہے جبکہ غریب اپنی دنیاوی وجوہات کی وجہ سے انہیں اپنے زبردست حامی سمجھتے تھے۔

حکومت نے آخر کار بغاوت کچل دی مگر 1850 میں یزد، نا ریز، تہران اور زنجان میں نئی بغاوتیں رونما ہوئیں۔ بابیوں نے خوف اور دہشت کا ماحول پیدا کر دیا۔ مقامی طلباء کی طرح سیاسی مخالف بھی بغاوتوں میں شامل ہو گئے یہاں تک کہ مردانہ لباس میں ملبوس عورتیں بھی بڑی بے

جگری سے لڑیں۔ اس تحریک نے حکومت دشمن عناصر ایک پلیٹ فارم پر جمع کر لئے۔ ملا جو مجتہدین سے بیزار تھے، تاجر جو ایرانی وسائل غیر ملکیوں کے ہاتھ فرخت کرنے کے خلاف تھے۔ کاریگر، زمیندار اور غریب کسان بھی بابیوں کے ساتھ شامل ہو گئے۔ ایک زمانے سے شیعہ ازم، ایرانیوں میں سماجی انصاف کا جذبہ پیدا کر رہا تھا۔ جب انہیں صحیح قیادت صحیح نظریہ اور صحیح وقت میسر ہوا تو انہوں نے دیر نہیں کی اور ہر قسم کے غیر مطمئن اور بے چین عناصر لڑنے کے لئے مذہبی پرچم تلے جمع ہو گئے۔

اس بار حکومت بغاوت کی آگ بجھانے میں کامیاب ہو گئی۔ 9 جولائی 1850 میں باب کو سزائے موت دی گئی۔ دوسرے رہنماؤں کو بھی موت کی سزا ملی۔ تمام مشتبہ لوگ قتل کر دیئے گئے۔ بعض بابی عراق بھاگ گئے۔ وہاں 1863 میں تحریک کے اندر پھوٹ پڑ گئی۔ جو افراد مرزا یحییٰ نوری صبح ازل (1913-1830) کے پیرو تھے وہ بغاوت کے سیاسی مقاصد کے ساتھ وفادار رہے۔ بعد میں ان ازلیوں میں سے بعض افراد نے سیکولرازم کا رستہ اختیار کیا، پرانا بابی تصوف ترک کیا اور قوم پرست بن گئے۔ شبیتائی تحریک کی طرح سماجی بت توڑنے، پرانے قوانین نظر انداز کرنے اور بغاوت کے شوق نے انہیں مذہب سے بالکل بیگانہ کر دیا پھر بھی ایک اور تحریک نجات نے سیکولرازم کے لئے پل مہیا کر دیا۔ باقی بابیوں میں سے اکثر نے صبح ازل کے بھائی مرزا حسین علی نوری بہاء اللہ (92-1817) کی پیروی کی اس نے سیاست ترک کر دی تھی اور نئے بہائی مذہب کی بنیاد رکھی تھی۔ جس نے مساوات کثرت پسندی رواداری اور سیاست سے مذہب کی علیحدگی کے مغربی نظریات کی حمایت کی تھی۔

بابی بغاوت جدیدیت کے بڑے انقلابات میں سے ایک تھی۔ اس نے ایران میں ایک مثال قائم کر دی۔ بیسویں صدی میں ایسے کئی مواقع آئے جب عام لوگ اور علماء صوفی اور سیکولرسٹ خدا کو ماننے والے اور اس کا انکار کرنے والے سب نے مل کر ظالم ایرانی حکومت کا مقابلہ کیا۔ انصاف کی جنگ شیعوں کے لئے ایک مقدس قدر بن چکی تھی۔ اس نے ایرانیوں کی آئندہ نسلوں کو یہ حوصلہ دیا کہ وہ بہتر زندگی کے لئے شاہ کی افواج کے خلاف صف آرا ہو جائیں کم ازکم دو موقعوں پر شیعہ آئیڈیالوجی کی بنیاد پر ایرانیوں نے اپنے ملک میں جدید سیاسی ادارے بنائے۔ بابی انقلاب سے ظاہر ہو چکا تھا کہ جدید دور کے آئیڈیل حاصل کرنے میں مذہب مدد

دے سکتا ہے اگر انہیں غیر ملکی زبان سے الگ روحانیت، دیو مالا اور ایسی زبان میں بیان کیا جائے جسے لوگ سمجھ سکیں اور اپنا سکیں۔ اگر جدیدیت مغرب کے عیسائیوں کے لئے مشکل تھی تو یہودیوں اور مسلمانوں کے لئے مشکل تر تھی۔ اس کے لئے جدوجہد یعنی اسلامی معنوں میں جہاد کی ضرورت تھی جو بعض اوقات مقدس جنگ کی صورت اختیار کر سکتا ہے۔

دوسرا حصہ

بنیاد پرستی

صف بندی
(1870-1900)

انیسویں صدی کے اختتام تک یہ حقیقت واضح ہوچکی تھی کہ نئی سوسائٹی جو مغرب میں اپنے عروج پر تھی، ساری دنیا کے دکھوں کا مداوا نہیں۔ وہ زبردست رجائیت جو ہیگل کے فلسفہ کا سبب بنی تھی، شک اور بے چینی کی زَد پر تھی۔ یورپ ہر لحہ طاقتور ہورہا تھا۔ صنعتی انقلاب کی وجہ سے جو اعتماد دولت اور طاقت اسے حاصل ہوئی تھی پہلے اس کا تصور کرنا بھی ممکن نہیں تھا مگر ان کے کردار کی امتیازی خصوصیات تنہائی، افسردگی اور علیحدگی تھی جس کا اظہار بودیلیئر نے اپنی کتاب Les Fleurs du mal(1857) میں کیا۔ ان کے شک اور بے یقینی کو ٹینی سن نے 1850 میں In Memoriam اپنا موضوع بنایا اور فلابیئر کی مادام بواری، جو بدترین اکتاہٹ، بے چینی اور سراسر اضطراب کی عکاسی ہے یہ سب ملائیں تو اس دور کے یورپ کی ایک نمائندہ تصویر بنتی ہے۔ لوگ کسی انجانے خوف میں مبتلا تھے۔ وہ نئی سوسائٹی کے کارناموں پر خوش تو ہوتے تھے مگر اپنے کھوکھلے پن کا احساس انہیں پریشان بھی کرتا تھا۔ ایک خلاء تھا جس نے ان کی زندگیاں بے معنی بنادیں تھیں۔ ان میں سے بعض تو نئی زندگی کی پیچیدگی، الجھن اور حیرانی میں اپنے لئے یقین تلاش کیا کرتے کچھ ایسے بھی تھے جن کے خوف کی وجہ فرضی دشمن یا کوئی عالمی سازش تھی۔

ہم یہ تمام خصوصیات ان بنیاد پرست تحریکوں میں پائیں گے جو تینوں توحید پرست معاشروں میں پیدا ہوئیں اور جنہوں نے جدید کلچر کے دوش بدوش نشوونما پائی ہے۔ اس شعور کے بغیر زندہ رہنا ممکن نہیں کہ زندگی کے بہرحال کچھ معنی ہیں اور وہ ایک بے مثال قدر ہے۔ شواہد چاہے اس کے

برعکس ہوں۔ پرانے زمانے میں رسوم و دیومالا کی مدد سے انسانوں میں زندگی کی معنویت اور تقدس کا شعور پیدا ہوتا تھا جس کی وجہ سے زندگی میں خلاء نہیں تھا۔ جیسے کسی بڑے فن پارے میں سے خلاء کا احساس مٹ جاتا ہے مگر مغرب کی طاقت اور کامیابی کے بڑے ذریعے سائنسی ریشنلزم نے متھ رد کر دی اور یہ تاثر دیا کہ صرف وہی زندہ حقیقت ہے۔ مگر ریزن (عقل) کے پاس بھی اتنے بڑے سوال کا کوئی جواب نہیں اور لوگوس کا تو خیر یہ میدان ہی نہیں۔ اس کے نتیجے میں روایتی مذہب پر عمل کرنا مغربی مردوں اور عورتوں کی بڑھتی ہوئی تعداد کے لئے ممکن نہ رہا۔

آسٹریا کے ماہر نفسیات سگمنڈ فرائیڈ (1939-1856) نے انکشاف کیا کہ انسان موت کی خواہش سے بھی اسی شدت سے متحرک ہوتا ہے جس شدت سے وہ افزائش نسل کی خواہش سے ہوتا ہے۔ مٹ جانے کی بے جا خواہش (یا خوف) جدید کلچر سے پیدا ہوئی۔ لوگ اسی تہذیب سے گریز کرنے لگے جسے انہوں نے تخلیق کیا تھا اور جس سے انہوں نے بلاشبہ بہت فائدے حاصل کئے تھے۔ جدید سائنس کا شکریہ کہ مغرب میں اکثر لوگ صحت مند اور طویل زندگیاں بسر کر رہے تھے۔ ان کے جمہوری اداروں کی بدولت دنیا کے کئی حصوں میں لوگ انصاف اور امن کی زندگی گزارتے تھے۔ امریکی اور یورپی بجا طور سے اپنے کارناموں پر نازاں تھے مگر عالمگیر بھائی چارے کا خواب ادھورا رہ گیا تھا۔ فرانس پروشیا جنگ (1870) نے جدید اسلحہ کے بھیانک اثرات ظاہر کر دیے تھے اور یہ احساس پیدا ہو چلا تھا کہ سائنس کے کچھ مہلک اور جان لیوا پہلو بھی ہیں۔ انٹی کلائمکس کی کیفیت تھی۔ انیسویں صدی کے ابتدائی برسوں کے انقلابی دور میں محسوس ہوتا تھا کہ ایک نئی اور بہتر دنیا کی تخلیق انسان کے بس میں ہے مگر یہ خواب کبھی پورا نہ ہوا بلکہ صنعتی انقلاب نئے مسائل ناانصافیاں اور استحصال لے کر آیا۔ چارلس ڈاکنز نے ناول Hard Times میں صنعتی شہر جہنم کی صورت میں پیش کیا اور دکھایا ہے کہ جدید ریشنلزم، اخلاق اور انفرادیت کے لئے تباہ کن بھی ہوسکتا ہے۔ بڑے بڑے شہر، بڑے مسائل پیدا کرتے ہیں۔ رومانی شعراء نے تاریک شیطانی ملوں پر لعنت بھیجی اور شہروں سے دیہات منتقل ہوئے کہ غیر آلودہ اور تازہ فضا میں سانس لے سکیں۔ برطانوی نقاد جارج سٹینز نے محسوس کیا کہ 40-1830 میں ابھرنے والا پینٹنگ کا رجحان، جدیدیت کے خوابوں کی تردید تھا۔ ماڈرن شہر لندن، پیرس اور برلن نئی تہذیب کے کارناموں کی علامت تھے مگر پینٹنگز میں انہیں کسی انجانی

آفت کے ہاتھوں تباہ و برباد دکھایا گیا تھا۔ لوگوں نے تہذیب کی بربادی کے خواب دیکھنے شروع کر دیے تھے۔ عملی طور پر بھی اس کے لئے جو ہوسکتا تھا، ہو رہا تھا۔

فرانس پروشیا جنگ کے بعد یورپ کی قومیں اسلحہ کی مجنونانہ دوڑ میں شامل ہوگئیں۔ پہلی عالمی جنگ اسی کا نتیجہ تھی۔ لگتا تھا کہ وہ جنگ کو ڈارون کے اس نظریئے کی روشنی میں دیکھتے ہیں کہ صرف طاقت ور ہی زندہ رہ سکتا ہے۔ ایک ماڈرن قوم کے لئے ضروری ہے کہ اس کے پاس بہت بری بلکہ سب سے بڑی فوج اور ہلاکت خیز جدید سائنسی ہتھیاروں کا بہت بڑا ذخیرہ ہو۔ یورپ کے لوگ ایک ایسی جنگ کے خواب دیکھتے تھے جس سے ان کی روح کا تزکیہ ہو۔ برطانوی مصنف آئی ایف کلارک کا کہنا ہے کہ 1871 اور 1914 کے عرصے میں ایسا کوئی سال مشکل سے ہی آیا ہوگا جس کے اندر کسی نہ کسی یورپی ملک میں کوئی ایسا ناول یا کہانی نہ شائع ہوئی ہو جس میں آنے والی خوفناک جنگ کا ذکر نہ ہو۔ دوسری جنگ عظیم ایک بڑے خوفناک مگر ناگزیر عذاب کی صورت میں دیکھی گئی مگر اس اُمید کے ساتھ کہ ہلاکت اور بربادی کے اس عمل سے قوم نئی زندگی پائے گی مگر ایچ جی ویلز نے اپنی تصنیف The War of the Worlds کے ذریعے یہ سہانا خواب منتشر کر دیا۔ اس نے دکھایا کہ جنگ سے کیسی تباہی اور بربادی ہوسکتی ہے۔ لندن کے ویران مناظر ہین جن کی آبادی جراثیمی جنگ کی وجہ سے ختم ہوچکی ہے اور لندن کی سڑکوں پر پناہ گزینوں کا ہجوم ہے۔ اسے ان خطرات کا اندازہ تھا جو جنگ کی ٹیکنالوجی کے ساتھ سائنس کے اشتراک سے پیدا ہوسکتے تھے۔ اس کا اندازہ ٹھیک تھا۔ اسلحہ کی دوڑ سے یورپ تباہی کے دہانے پر پہنچ گیا۔ 1914 میں جنگ عظیم چھڑ گئی۔ یورپ کے لوگ اس جنگ میں اس امید پر شامل ہوئے کہ اس کے بعد کم از کم چالیس برس تک کوئی اور جنگ نہیں ہوگی مگر یہ جنگ ہی یورپ کی اجتماعی خودکشی ثابت ہوئی۔ نئے دور کی کامیابیوں کے باوجود یورپی قوموں میں اپنے آپ کو تباہ کرنے کی بے جا اور مریضانہ خواہش پیدا ہوگئی تھی۔

امریکہ میں بعض قدامت پسند پرٹیسٹنٹ بھی اسی وژن کی گرفت میں تھے مگر وہاں اس ڈراؤنے منظر نے مذہبی رنگ اختیار کر لیا تھا۔ متحدہ ریاستوں نے بھی شدید جنگ اور اس کے نتیجے میں انٹی کلائمکس کا سامنا کیا تھا۔ امریکی جنوبی اور شمالی ریاستوں کے درمیان خانہ جنگی (1861-65) کے تجربے سے گزر چکے تھے۔ شمالیوں کو یقین تھا کہ جنگ سے قوم کی برائیاں دور

ہو جائیں گی۔ سپاہی آنے والے رہنما کی فتح کے گیت گاتے تھے۔ واعظ متوقع معرکہ حق و باطل کی باتیں کرتے۔ ایک جنگ جو نور و ظلمت اور آزادی و غلامی کی قوتوں کے مابین ناگزیر تھی۔ انہیں اس نئے انسان اور نئی تقدیر کا انتظار تھا جنہیں اس آتشیں تصادم میں سے ابھرنا تھا مگر امریکہ میں بھی کسی بہادر نئی دنیا کا وجود نہیں تھا بلکہ جنگ کے اختتام تک شہر تباہ ہو چکے تھے۔ خاندان بکھر گئے تھے۔ سفید فام جنوبی آبادی کا ردعمل اس کے علاوہ تھا۔ خیالی جنگ کی بجائے شمالی ریاستیں زرعی معاشرہ سے صنعتی معاشرے میں بدلنے کے اذیت ناک عمل سے گزر رہی تھیں۔ نئے شہر تعمیر کئے گئے۔ پرانے شہروں کی آبادیاں ان کی وسعت سے زیادہ ہو گئیں۔ جنوبی اور مشرقی یورپ سے نئے آباد کاروں کے ہجوم ملک میں داخل ہونے لگے۔ فولاد، تیل اور لوہے کی فیکٹریوں کے ذریعے سرمایہ داروں نے بے شمار دولت کمائی جبکہ مزدور وہ وقت کی روٹی کو ترستے رہے۔ فیکٹریوں میں عورتوں اور بچوں کے ساتھ ظالمانہ سلوک کیا جاتا تھا۔ 1890 تک پانچ بچوں میں سے ایک بچہ مزدوری کرنے پر لگا تھا۔ کام کے لئے سہولتیں برائے نام، ملازمت کے اوقات طویل اور مشینیں خطرناک حد تک ناکارہ تھیں۔ شہروں اور دیہات کے درمیان ایک نئی خلیج حائل ہو گئی تھی کیونکہ امریکہ کے بڑے حصے بالخصوص جنوبی علاقے زراعت پر قانع رہے۔ اگر یورپ کی خوشحالی ریت کی دیوار تھی تو امریکہ ایسا ملک تھا جس کی ریڑھ کی ہڈی کمزور ہو رہی تھی۔

یورپ کے لوگ مستقبل کی جنگ کے سیکولر پہلو سے خوش تھے مگر امریکی اس سے متاثر نہیں ہوئے۔ شاید اس لئے کہ وہ نسبتاً زیادہ مذہبی تھے بلکہ بعض تو جرم و سزا کے مسئلے میں پہلے سے زیادہ دلچسپی لینے لگے کیونکہ خدا اور شیطان کے درمیان فیصلہ کن جنگ ان کے تصور میں بسی ہوئی تھی جس کے نتیجے میں بدی کا خاتمہ یقینی تھا۔ انیسویں صدی میں دنیا کے خاتمہ کے متعلق جس نئے وژن نے امریکہ میں مقبولیت حاصل کی اسے پری ملینل ازم (ہزاریہ سے قبل) کہتے ہیں جس کا مطلب ہے کہ مسیح اپنی ہزار سالہ حکومت سے پہلے ہی زمین پر واپس آ رہے ہیں۔ روشن خیالی کے قدیم اور زیادہ رجائیت پسند پوسٹ ملینیل ازم (بعد از ہزاریہ) میں یہ فرض کر لیا گیا تھا کہ انسان اپنی کوشش سے خدا کی بادشاہت قائم کرے گا۔ عیسیٰ اس کے بعد واپس آئیں گے۔ امریکہ میں نئے پری میلینم ازم کی تبلیغ ایک انگریز جان نیلسن ڈربی (1800-82) نے کی جسے انگلستان میں تو بہت کم ہم خیال میسر آئے تھے مگر 1859-79 کے عرصے میں اس نے امریکہ کے چھ کامیاب

دورے کئے۔ اسے ماڈرن دنیا میں کوئی خوبی نظر نہ آئی اس کے خیال میں وہ تیزی کے ساتھ بربادی کی طرف جارہی تھی۔ پہلے سے زیادہ نیک ہونے کی بجائے انسان اتنے گمراہ ہورہے تھے کہ خدا جلد ہی ان کا معاشرہ تباہ کرنے پر مجبور ہوجائے گا۔ جس سے نسل انسانی پر ناقابلِ بیان مصائب نازل ہوں گے مگر سچے عیسائی اس عذاب سے سرخرو نکلیں گے اور مسیح کی فیصلہ کن فتح اور بادشاہت سے فیض پائیں گے۔

ڈربی سمجھتا تھا کہ انجیل میں سیدھی سادی عام فہم باتیں بیان کی گئی ہیں اس لئے اس نے انجیل میں صوفیانہ معنی تلاش نہیں کئے کہ اس کے پیغمبروں اور مصنفوں نے علامتوں میں بات نہیں کی تھی بلکہ ایسی پیش گوئیاں کی تھیں جو بالکل اسی طرح وقوع پذیر ہوں گی جیسی کہ بیان ہوئی تھیں۔ پرانی دیو مالائیں اب واقعاتی لوگوں کی نظر سے دیکھی جاتی تھیں۔ سچائی کی بس یہی ایک شکل تھی جسے جدید مغرب کے اکثر لوگ تسلیم کرتے تھے۔ ڈربی نے نجات کی تاریخ سات مرحلوں میں تقسیم کی۔ یہ سکیم انجیل کے بغور مطالعے کا حاصل تھی۔ اس نے وضاحت کی ہر دور کا اختتام اس وقت ہوا جب انسان اتنے ظالم ہوگئے کہ خدا انہیں سزا دینے پر مجبور ہوگیا۔ پچھلا دور ہبوط آدم سیلاب نوح اور مسیح کے مصلوب ہونے جیسی مصیبتوں کے ساتھ ختم ہوا۔ اب انسان چھٹے دور میں جی رہے تھے جسے خدا بہت جلدی بڑی سخت تباہی کے ساتھ ختم کردے گا۔ جھوٹا نجات دہندہ دجال (جس کی آمد کی خبر سینٹ پال نے دی تھی) لوگوں کو فریب دے کر اپنے ساتھ ملائے گا اور پھر انسانوں پر نئی تباہیاں نازل کرنے کا سبب بنے گا۔ سات برس تک دجال خون خرابے، جنگ، بے شمار لوگوں کے قتل اور اپنے مخالفین پر مصیبتیں مسلط کرتا رہے گا مگر آخرکار مسیح زمین پر آکر اسے شکست دے گا۔ شیطان اور بدی کی طاقتوں کے خلاف فیصلہ کن جنگ لڑے گا اور ساتویں دور کا آغاز ہوگا مسیح ہزار سال حکومت کرے گا۔ اس وقت تک کہ جب قیامت آئے گی اور تاریخ کی رفتار رک جائے گی۔ یورپ کے 'مستقبل کی جنگ' کے خواب کی یہ مذہبی تعبیر تھی۔ اس کے ذریعے پتہ چلتا تھا کہ صحیح معنوں میں ترقی کرنے کے لئے تصادم اور تباہی ناگزیر ہے۔ خدا کی بخشش اور ہزار سالہ حکومت کے کیف وسرور کے باوجود یہ موت کی آرزو کا نیا اظہار تھا۔ مسیحیوں نے ماڈرن سوسائٹی کا خاتمہ خوف کے عالم میں فرض کرلیا تھا اور مریضانہ انداز اور ذہنیت کے ساتھ اس کی طرف بڑھ رہے تھے۔ مگر ایک اہم فرق بھی تھا۔ جہاں یورپ کے لوگ ہر شخص کو اگلی جنگ عظیم کے مصائب جھیلتے ہوئے

دیکھ رہے تھے۔ ڈربی نے ممتاز افراد کے لئے اس سے بچنے کا طریقہ سوچا۔ سینٹ پال کی ایک رائے کی بنیاد پر (جسے یقین تھا کہ مسیح کے دوسرے دور کے موقعہ پر جو مسیحی زندہ ہوں گے وہ بادلوں میں خدا سے ملنے جائیں گے) ڈربی سمجھتا تھا کہ مصائب کا دور شروع ہونے سے پہلے، دوبارہ جنم لینے والے عیسائیوں کے لئے خوشی کا ایک بڑا موقعہ ہوگا۔ جب وہ آسمانوں میں لے جائیں گے اور اس طرح اور آخر کے خوفناک عذاب سے بچ جائیں گے۔

ماقبل ہزار یہ والوں نے خوشی کے اس موقعہ کا تفصیل اور توجہ سے جائزہ لیا۔ انہیں یقین تھا کہ اچانک ہوائی جہاز کاریں اور ریل گاڑیاں ٹکرا کر پاش پاش ہو جائیں گی۔ از سر نو پیدا ہونے والے پائلٹ اور ڈرائیور ہوا میں معلق ہو جائیں گے جبکہ ان کی سواریاں قابو سے باہر ہو جائیں گی۔ سٹاک مارکیٹ میں مندا ہوگا اور حکومتوں کے تختے اُلٹ جائیں گے جو پیچھے رہ جائیں گے انہیں احساس ہوگا کہ وہ تباہ ہو گئے ہیں جبکہ اہل ایمان ہمیشہ راہ راست پر ہوں گے۔ نہ صرف یہ کہ یہ بدنصیب اور غمزدہ لوگ اذیت برداشت کریں گے بلکہ انہیں پتہ چلے گا کہ وہ ہمیشہ کے لئے معتوب اور ذلیل وخوار ہیں۔ پری میلینل ازم انتقامی تصور تھا۔ ممتاز و چیدہ افراد خیال کرتے کہ وہ نیچے ایسے لوگ دیکھ رہے ہیں جنہوں نے ان کے یقین و ایمان کا مذاق اُڑایا تھا اور ان کے مذہب کی تضحیک کی تھی۔ اسے نظرانداز کیا تھا اور اب بہت دیر بعد انہیں اپنی غلطی کا احساس ہوا تھا۔ اکثر پروٹیسٹنٹ بنیاد پرستوں کے گھروں میں آج بھی ایک تصویر موجود ہے جس میں دکھایا گیا ہے کہ ایک آدمی اپنے گھر کے باہر گھاس کاٹ رہا ہے۔ دوسرا جنم لینے والا اپنی بیوی کو حیرانی سے دیکھ رہا ہے جو خوشی اور مسرت کی کیفیت میں کھڑکی سے باہر دیکھ رہی ہے۔ کئی دیو مالائی واقعات کی طرح یہ منظر عبث تو لگتا تھا مگر اس کے پیچھے پوشیدہ حقیقت سفاک، اختلاف انگیز اور المناک تھی۔

عجیب بات یہ ہے کہ پری میلینل ازم سچی مذہبی مائتھالوجی کی نسبت سیکولرازم سے زیادہ قریب تھا جس سے اسے نفرت تھی۔ ڈارون، ہیگل اور مارکس سبھی مانتے تھے کہ نشوونما، تصادم کا نتیجہ ہے۔ مارکس نے تاریخ بھی دو مختلف ادوار میں تقسیم کر دی تھی جسے ایک مثالی دنیا پر ختم ہونا ہے۔ ماہرین ارضیات نے زمین بڑھنے کے مسلسل ادوار، قبل از تاریخ کے جانداروں کے فوسل میں تلاش کئے جو پہاڑوں اور چٹانوں میں بکھرے ہوئے ملے ہیں۔ پری ملینل پروگرام، انیسویں صدی کی سائنسی فکر کے مطابق تھا۔ وہ جمہوریت اور سادہ بیانی میں بھی نمایاں تھا۔ اس

میں مخفی اور علامتی معنی نہیں تھے کہ جو صرف چیدہ افراد کی سمجھ میں آسکیں تمام عیسائی (چاہے ان کی تعلیم بہت کم ہو) اس سچائی کو سمجھ سکتے تھے جو انجیل میں سب کے لئے بیان ہوئی ہے۔ ہر بات کے بالکل وہی معنی تھے جو بیان ہوئے تھے۔ میلینیل ازم کے معنی دس صدیاں اور 485 برسوں کے معنی 485 برس ہی تھے۔ اگر پیغمبر اس کا حوالہ کہیں دیتے تھے تو اس کا مطلب چرچ نہیں تھا بلکہ یہودی تھے۔ مسیح اور شیطان کے درمیان جنگ کی پیش گوئی کے معنی ہیں کہ یہ جنگ بالکل اسی طرح ہو کر رہے گی۔ دی سکوفیلڈ ریفرنس بائبل کی اشاعت (9-1906) کے بعد ہر مسیحی کے لئے انجیل پڑھنا آسان ہو گیا تھا کیونکہ اس کی ترتیب میں میلینیل (ہزاریہ) اپروچ مدنظر رکھی گئی تھی۔ سی آئی سکوفیلڈ نے تاریخ کو عام لوگوں کے لئے سہل اور قابلِ فہم بنانے والی اپنی اس اپروچ کی وضاحت انجیل تھی۔ میلینل ازم کا اصرار یقین پر تھا جو اصل میں جدیدیت کا ردِعمل ہے کیونکہ جدیدیت جان بوجھ کر سوالات کھلے چھوڑ دیتی ہے اور 'قطعی سچ' کے امکانات رَد کر دیتی ہے۔ ایک زمانے سے امریکی پروٹیسٹنٹ ایسے کسی ماہر کے خلاف تھے جسے جدید معاشرے کے طرزِ عمل کو سمجھنے کا واحد اہل سمجھا جائے۔ مگر انیسویں صدی کے آخر تک یہ صورتحال بدل چکی تھی۔ اس عرصے میں امریکی معیشت نے بے تحاشا نشیب و فراز دیکھے۔ چونکہ امریکی زرعی زندگی کے بندھے ٹکے معمول کے عادی تھے اس لئے وہ اس سے بہت بدحواس ہوئے۔ مندا گرم بازاری کا اس طرح پیچھا کرتا تھا کہ رات ہی رات میں بھاری رقمیں ڈوب جاتیں۔ معاشرے پر پراسرار اَن دیکھی اقتصادی قوتوں کا قبضہ تھا۔ سماجیات کے ماہرین نے بھی یہی بتایا کہ انسانی زندگی، اقتصادی قوتوں کے اختیار میں ہے جنہیں عام آدمی نہیں سمجھ سکتا۔ ڈارون کے پیروؤں نے لوگوں کو بتایا کہ زندگی ایک حیاتیاتی عمل کے ماتحت ہے جسے ظاہری آنکھ نے نہیں دیکھا۔ ماہرین نفسیات دماغ کی پوشیدہ لاشعوری قوتوں کی بات کرتے تھے۔ اونچے درجہ کے نقاد بضد تھے کہ خود انجیل بھی وہ نہیں جو ہونے کا اسے دعویٰ ہے اور یہ کہ واضح طور پر ایک سیدھے سادے، سمجھ میں آنے والے صحیفے کو درحقیقت ان گنت وسائل سے مرتب کیا گیا اور گمنام لکھاریوں نے قلم بند کیا ہے۔ اکثر پروٹیسٹنٹ جو چاہتے تھے کہ ان کا مذہب انہیں تحفظ دے وہ اس پیچیدہ دنیا کے اندر ذہنی گرداب میں مبتلا ہو گئے۔ وہ چاہتے تھے کہ ان کا مذہب اتنا آسان ہو کہ ہر شخص کی سمجھ میں آسکے۔

مگر چونکہ انیسویں صدی کے آخر میں سائنس اور ریشنلزم کی حکمرانی تھی اس لئے مذہب کو

بھی ریشنل ہونا ہی تھا۔ بعض پروٹیسٹنٹ اپنا مذہب سائنسی اور منطقی لحاظ سے مضبوط بنانا طے کر چکے تھے کہ اسے دوسرے کسی لوگوس کی طرح واضح، قابل بیان اور معروضی ہونا چاہیے مگر ماڈرن سائنس ان لوگوں کے بس کی بات نہیں تھی جو اندھے یقین کے متلاشی تھے۔ ڈارون اور فرائیڈ کے انکشافات کی بنیاد ایسے غیر مصدقہ مفروضوں پر تھی جو زیادہ روایتی پروٹیسٹنٹ عیسائیوں کی نظر میں غیر سائنسی تھے۔ ان کی بجائے وہ بیکن کے ابتدائی سائنسی وژن کو اہمیت دیتے تھے جس کے پاس ان قیاس آرائیوں کے لئے کوئی وقت نہیں تھا۔ بیکن کا کہنا تھا کہ ہم اپنی حسیات پر مکمل بھروسہ کر سکتے ہیں کیونکہ ہمارے لئے صحیح معلومات کا وہی ایک ذریعہ ہیں۔ اسے یقین تھا کہ دنیا کا نظام ریشنل اصولوں پر قائم ہے جو سب کچھ جاننے والے ایک خدا کے ہاتھوں میں ہے اور یہ کہ سائنس کا منصب شعبدہ بازیاں یا بے معنی قیاس آرائیاں نہیں بلکہ غیر معمولی واقعات سے متعلق اپنی رائے قائم کرنا اور اسے ایسی تھیوری میں سمونا ہے جس کی بنیاد حقیقت پر ہو۔ پروٹیسٹنٹ اٹھارویں صدی کی سکاچ روشن خیالی کے فلسفہ میں بھی دلچسپی لیتے تھے جو کانٹ کے داخلیت پسند فلسفہ علم کے خلاف تھا اور جس کا دعویٰ تھا کہ سچ معروضی ہے اور عقل سلیم وخلوص رکھنے والے ہر انسان کی پہنچ میں ہے۔

تیقن کی یہ تلاش وہ خلاء پر کرنے کی ایک کوشش تھی جو جدید زندگی کا لازمی حصہ تھا اور ریشنلزم پر مکمل یقین رکھنے والوں کے شعور پر ایک گہرا گھاؤ تھا۔ امریکی پروٹیسٹنٹ آرتھر پیئرسن کی خواہش تھی کہ انجیل کی وضاحت بالکل بے لاگ اور سائنسی طرز میں کی جائے اس کی کتاب کا عنوان (کئی نا قابل شکست ثبوت) ہی یہ ظاہر کرتا ہے کہ وہ مذہب سے کس قسم کے یقین کی توقع رکھتا تھا۔

''مجھے انجیل کی دینیات پسند ہے کیونکہ یہ اس طرح شروع نہیں ہوتی کہ ایک مفروضے کو حقائق اور فلسفے میں لپیٹ کر بددیانت لوگوں کے مفاد کے مطابق بنا دیا جائے بلکہ بیکن کے سسٹم کے مطابق پہلے خدائی احکامات اور تعلیمات جمع کی جاتی ہیں پھر ان سے عام قوانین اور اصول اخذ کئے جاتے ہیں جن پر حقائق مرتب کئے جا سکتے ہیں۔''

یہ خواہش قابلِ فہم تھی مگر انجیل کی دیومالائیں اتنی واقعاتی نہیں لگتی تھیں جیسی کہ پیئرسن کو توقع تھی۔ نہ انجیل نے کبھی ایسا ظاہر کیا تھا دیومالائی زبان اپنا ہونے کا جواز کھوئے بغیر ریشنل زبان

میں منتقل نہیں ہوسکتی تھی۔شاعری کی طرح اس کے معانی بھی اتنے گریز پا تھے کہ کسی اور طریقے سے بیان ہو ہی نہیں سکتے تھے۔ایک بار جب دینیات نے اپنے آپ کو سائنس میں بدلنے کی کوشش کر لی تو اس سے وہ ریشنلزم کا ایک مضحکہ خیز نمونہ ہی پیش کر سکی کیونکہ ان سچائیوں میں سائنسی تجربوں کی تاب نہیں تھی۔اس نقلی مذہبی لوگوس سے مذہب ناگزیر طور پر کچھ اور بدنام ہوا۔

نیوجرسی میں پرنسٹن کی پریسٹر درسگاہ سائنسی پروٹیسٹنٹ ازم کا قلعہ تھی۔قلعہ اس لئے ہے کہ ریشنل عیسائیت کی مہم میں شدت کا عنصر اکثر شامل رہتا تھا اور وہ مستقل طور پر دفاعی حیثیت میں لگتی تھی۔1873 میں چارلس ہوج، چیئر مین دینیات پرنسٹن یونیورسٹی نے اپنی تصنیف ''با قاعدہ دینیات'' شائع کی۔اس عنوان سے بھی سائنسی تعصب صاف ظاہر ہے۔ہوج کا کہنا تھا کہ ماہرین دینیات کا یہ منصب نہیں کہ وہ لفظوں سے ماوراء ان کے معنی تلاش کریں بلکہ انجیل کی تعلیمات سیدھے صاف طریقے سے بیان کرنا ہے۔انجیل کا ہر لفظ خدا کا حکم ہے اس لئے اسے سنجیدگی کے ساتھ سمجھنا چاہیے۔اسے علامتوں اور استعاروں کے ذریعے مسخ نہیں کرنا چاہیے۔ چارلس کے بیٹے اے ہوج نے 1878 میں اپنے والد کی جگہ لی اور انجیل کے اصلی معنوں کی حمایت میں لکھا۔اس کا مضمون ''پرنسٹن ریویو'' میں شائع ہوا جسے ایک کلاسک کی حیثیت حاصل ہوئی۔اس نے کہا انجیل کی تمام کہانیاں اور بیانات غلطیوں سے پاک ہیں اور ان کی اطاعت لازم ہے۔''انجیل نے جو کہا ہے وہ سچ ہے۔اگر انجیل کہے کہ وہ وحی ہے تو انجیل وحی ہے۔'' مگر یہ دلیل کچھ بھی ہو، سائنٹفک نہیں ہے۔نہ اس کی کوئی ریشنل اور معروضی حیثیت ہے۔ریزن (عقل) پر پرنسٹن کے انحصار نے ہی اسے جدیدیت کی صف میں لا کھڑا کیا مگر اس کے دعوے حقائق سے مختلف تھے۔عیسائیت نے صحیح دلیل کے ذریعے ہی مقبولیت حاصل کی ہے۔وارفیلڈ نے اپنے ایک آرٹیکل میں لکھا ''صرف عقل کے زور سے ہی عیسائیت اپنی بادشاہت کے اتنی قریب آئی ہے اور اسی کے زور سے وہ اپنے تمام دشمن روند دے گی۔'' عیسائیت کی تاریخ پر ایک سرسری نظر ڈالنے سے پتہ چلتا ہے کہ جدیدیت سے پہلے جیسا کہ تمام مذاہب میں عقل صرف دیومالائی حوالے سے آئی ہے۔عیسائیت نے صحیح دلیل کی بجائے وجدان، تصوف اور عبادت پر انحصار کیا ہے۔صحیح دلیل کبھی عیسائیت کی مقبولیت کا واحد سبب نہیں رہی۔وارفیلڈ کی شدت پسند امیجری میں (جس کا مقصد دشمنوں کو الجھانا تھا) عدم تحفظ کا احساس بھی چھپا ہوا ہوتا ہے۔اگر عیسائیت کا پیغام اتنا ہی

صاف اور واضح تھا تو ایسا کیوں ہے کہ اسے بے شمار لوگوں نے ماننے سے انکار کر دیا۔

پرنسٹن کے مذہبی تصور میں مایوسی کا عنصر بھی تھا۔ مذہب کو اپنی زندگی کے لئے سائنسی افراد کے ایک بڑے طبقے کے خلاف لڑنا تھا۔ چارلس ہوجز نے 1874 میں کہا۔ عیسائیوں کے لئے بڑی پریشانی تھی جنہوں نے اپنے مؤقف کی بنیاد سائنسی دلیل پر رکھی تھی جبکہ نیچرل سائنس، انجیل کے لفظی معنوں کو رَد کرتی ہوئی لگتی تھی اسی لئے ہوجز نے ''ڈارون ازم کیا ہے؟'' لکھی جو ارتقائی تصورات پر مذہب کی طرف سے پہلا بڑا حملہ تھا۔ ہوجز کی رائے میں ڈارون ازم بری سائنس ہے۔ اس نے ''اوریجن'' کا مطالعہ اچھی طرح کیا تھا اور ڈارون کے اس دعوے کو اہمیت نہیں دیتا تھا کہ کائنات کی تخلیق محض ایک اتفاق یا حادثہ ہے جس میں خدا کا کوئی دخل نہیں۔ اس سے ابھرتے ہوئے پروٹیسٹنٹ سیکولرازم کی ذہنی افتاد ظاہر ہوتی تھی۔ ہوجز سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اس کی فکر سے مختلف کوئی خیال معقول بھی ہوسکتا ہے۔ لوگوں کا فرض ہے کہ وہ ایسے بلند بانگ مفروضوں اور تھیوریوں کی مخالف کریں جیسے کہ ڈارون نے پیش کئے ہیں اور جو تسلیم شدہ حقائق سے متصادم ہیں۔ یہ درخواست انسان کی عقل سلیم سے ہے۔ خدا نے انسان کو بے خطا وجدانی صلاحیتیں دی ہیں۔ اگر ڈارون ان کا انکار کرتا ہے تو اس کے خیالات ناقابل فہم ہین اس لئے انہیں رَد کر دینا چاہیے۔ پرنسٹن میں نشوونما پانے والی سائنسی عیسائیت دونوں لحاظ سے ناکام ہوگئی۔ ہوج پرانے قدامت پسندانہ طریقے سے ریزن کا راستہ روک رہا تھا اور اسے آزادی کے ساتھ پھیلنے سے باز رکھنا چاہتا تھا حالانکہ آزادی جدیدیت کی خصوصیت اور اس کا تقاضا تھی۔ مگر دیومالا کو لوگوس کی سطح پر گراتے ہوئے وہ قدیم روحانیت کا منہ چڑا رہا تھا۔ اس کی دینیات بری سائنس اور اس کا مذہب ادھورا تھا۔

اگر ہوج اور وارفیلڈ مذہب کی وضاحت صحیح ایمان کی صورت میں کر رہے تھے تو ہنری وارڈ بیچر (87-1943) جیسے پروٹیسٹنٹ اور بھی آزاد خیال تھے۔ وہ کہتے تھے۔ ''ذاتی خیالات کی حیثیت ثانوی ہے مذہبی معاملات میں اختلاف کی اجازت نہ دینا عیسائیت کی روح کے خلاف ہے۔'' یہ آزاد خیال عیسائی ڈارون ازم اور انجیل پر تنقید کے جدید سائنسی نظریات سمجھنا چاہتے تھے۔ بیچر کی رائے میں خدا ایک دور الگ تھلگ شخصیت نہیں بلکہ وہ زمین پر جاری قدرتی عمل میں ہر لمحہ حاضر و موجود رہتا ہے۔ اپنی تخلیق سے کبھی نہ ختم ہونے والی اس کی دلچسپی کا ثبوت فطرت کا

ارتقائی عمل ہے۔ محبت کا مسیحی تصور اس کے نظریئے کی صحت سے کہیں زیادہ اہم ہے۔ آزاد خیال پروٹیسٹنٹ شہروں اور گلی کوچوں میں سماجی کام کرنے کی اہمیت پر زور دیتے تھے۔ انہیں یقین تھا کہ ان کی انسانی دوستی زمین پر خدا کی بادشاہت قائم کردے گی۔ مذہب کا یہ رجائی تصور ان آسودہ اور خوشحال درمیانی طبقوں کے لئے بہت مناسب تھا جو جدیدیت سے تمام فائدے حاصل کر رہے تھے۔ 1880 تک شمالی ریاستوں کے تقریباً اکثر اہم پروٹیسٹنٹ سکولوں میں یہ نئی دینیات پڑھائی جاتی تھی۔ John Bescom (ارتقاء اور مذہب) 1897 اور John Fiske (نیچر سے خدا تک 1899) جیسے دینیات کے استادوں کو یقین تھا کہ سائنس اور مذہب میں کوئی تضاد نہیں۔ دونوں خدا کے ہر جگہ اور ہر وقت موجود ہونے پر ایمان رکھتے تھے اور سمجھتے تھے کہ نبض کی طرح کائنات کی ہر حرکت خدا کے موجود ہونے کی شہادت ہے۔ تمام تاریخ میں نوع انسان کا روحانی شعور نشو ونما پاتا رہا ہے۔ یہاں تک کہ اب انسانیت ایک نئی دنیا کی دہلیز پر ہے جس میں مرد اور عورتیں بالآخر محسوس کریں گے کہ نام نہاد مافوق الفطرت اور فطرت میں کوئی فرق نہیں انہیں خدا کے ساتھ اپنی شاندار قربت کا احساس ہوگا اور وہ آپس میں دوستی اور امن سے رہیں گے۔

ہر ہزار سالہ وژن کی طرح اس لبرل دینیات کو بھی مایوس کرنا ہی تھا۔ آپس میں قریب ہونے کی بجائے امریکی پروٹیسٹنٹ محسوس کرنے لگے کہ ان میں سخت پھوٹ پڑ چکی ہے اور یہ کہ اختلافات ان کے فرقہ کی دھجیاں اڑا دیں گے۔ انیسویں صدی کے انجام تک اصل مسئلہ ارتقاء نہیں تھا 'برتر تنقید' اہمیت اختیار کر چکی تھی۔ آزاد خیال سمجھتے تھے کہ انجیل کے متعلق نئے نظریات بعض پرانے اصولوں اور اعتقادات کی حیثیت شاید کم کر دیں مگر بالآخر وہ انجیل میں گہری بصیرت حاصل کرنے میں مدد دیں گی۔ مگر روائت پرستوں کے لئے 'برتر تنقید' ایک ڈراؤنی بات تھی۔ وہ جدید صنعتی معاشرے کی ہر برائی کی علامت سمجھی جانے لگی تھی جو ہر پرانے یقین کو جھٹلا رہی تھی۔ اس عرصہ میں عام لوگوں کے سامنے نئے تصورات لائے گئے جن کے ذریعے عیسائیوں کی الجھن میں اضافہ کے لئے یہ نئے انکشافات کئے گئے کہ Pentateuch موسیٰ نے نہیں لکھی تھی، نہ ہی مناجات حضرت داؤد کا کام تھا۔ مسیح کی پیدائش بس کہنے کی بات تھی اور مصر پر نازل ہونے والی دس بلائیں قدرتی حادثہ تھیں جنہیں معجزے کہا گیا۔ 1888 میں انگریز ناولسٹ مسز ہمفری وارڈ نے Robert Elsmere کے نام سے ناول شائع کیا جس میں ایک نوجوان پادری کی کہانی بیان

کی گئی تھی جس کے مذہبی عقائد پر 'برتر تنقید' نے اتنے اعتراض کئے کہ وہ اکتا کر مستعفی ہو گیا اور لندن کے East End میں سماجی کام کے لئے اپنے آپ کو وقف کر دیا۔ ناول بے حد مقبول ہوا جس کے معنی تھے کہ اکثر لوگ ہیرو کے شبہات سے متفق تھے جیسا کہ رابرٹس کی بیوی نے کہا 'اگر انجیل کی تعلیمات تاریخی لحاظ سے سچی نہیں تو میری سمجھ میں نہیں آتا کہ پھر وہ کیونکر سچی ہیں اور ان کی حیثیت کیا ہے'۔ نئی دنیا کے ریشنل گمان و بدظنی نے مغرب کے اکثر عیسائیوں کے لئے متھ کی قدر و قیمت اور اس کے کردار کو سمجھنا ناممکن بنا دیا تھا۔ مذہب کو ریشنل اور متھ کو لوگوس ہونا ہی تھا۔ اب سچ کو واقعاتی اور سائنسی ہونے کے علاوہ کسی اور صورت میں دیکھنا ممکن ہی نہ رہا تھا۔ گہرا خوف تھا کہ انجیل کے متعلق یہ نئے خیالات عیسائیت کا بنیادی سٹرکچر کمزور نہ کر دیں۔ اگر ہمارا کوئی بے خطا معیار نہیں ہے تو اس کے معنی تو یہ ہوئے کہ ہمارا کوئی معیار ہی نہیں ہے۔ امریکی پادری الیگزنڈر میکالسٹر نے کہا ایک معجزہ رد کر دیں تو تسلسل تقاضا کرتا ہے کہ تمام معجزے رَد کریں۔ اگر یونس نے تین دن مچھلی کے پیٹ میں نہیں گزارے تھے تو کیا عیسیٰ کسی مقبرے سے دوبارہ زندہ ہو کر اٹھے تھے؟ جیمز ریمین سینڈر کا سوال تھا اگر ایک بار اس طرح انجیل کی تعلیمات کی دھجیاں ارائی گئیں تو تمام اچھی قدریں ختم ہو جائیں گی۔ ڈبلیو مچل کی رائے میں اس بدمستی کفر اور ارتداد کی ذمہ دار 'برتر تنقید' تھی۔ پریسٹبیرین ایس بی لیمبڈن نے اسے طلاق کے بڑھتے ہوئے واقعات، کرپشن، جرائم اور قتل کی وجہ قرار دیا۔

'برتر تنقید' پر ریشنل انداز سے بات نہیں ہو سکتی تھی کیونکہ اس سے بعض بنیادی خدشات پیدا ہو سکتے تھے جب لبرل پریسٹبیر بن چارلس برگز پر کفر کا الزام عائد ہوا اور 1891 میں نیویارک پریسٹبیری کی طرف سے اس پر مقدمہ چلا کہ اس نے 'برتر تنقید' کا دفاع پبلک میں کیا تھا تو یہ خبر نیویارک ٹائمز کے پہلے صفحہ پر چھپی۔ جب وہ الزام سے بری ہوا تو ''نیویارک ٹریبون' نے اسے 'برتر تنقید' کی جیت سمجھی مگر فرقہ کی جنرل اسمبلی نے فیصلہ منسوخ کر کے برگز کو پادری کے منصب سے الگ کر دیا۔ مقدمہ اشتعال انگیز تھا۔ اس ہنگامے سے فرقہ میں پھوٹ پڑ گئی۔ دوسو پریسٹبیر یوں میں سے نوے برگز کے مخالف تھے۔ اس وقت کے کفر کے مقدمات میں سے یہ مقدمہ بہت مشہور ہوا جس کے دوران میں ایک کے بعد دوسرا فرد لبرل فرقے سے خارج کیا گیا۔ 1900 تک جب شور و غل ختم ہوا تو پتہ چلا کہ 'برتر تنقید' کے نقطۂ نظر نے ہر جگہ مقبولیت

حاصل کرلی ہے۔ اکثر فرقوں میں لبرل بدستور اہم عہدوں پر فائز تھے اور قدامت پسند حواس باختہ مگر خاموش تھے پھر بھی یہ دکھاوے کا امن ایک دھوکہ تھا۔ دیکھنے والے جانتے تھے کہ پریسٹبیرن ہوں میتھوڈسٹ ہوں، پیکسٹ یا ڈی سائیپلز (Disciples) ہوں تقریباً ہر فرقے میں دو الگ فریق موجود تھے جو انجیل کا مطالعہ صرف نئے یا صرف پرانے انداز میں کرنا چاہتے تھے۔

بعض عیسائی اس جدوجہد کی تیاری کرنے لگے جو آنے والی تھی۔1886 میں تجدید پسند Dwight Moody نے شکاگو میں موڈی بائیبل انسٹی ٹیوٹ(99-1837) قائم کی تاکہ ''برتر تنقید' کے اثرات کا مقابلہ کیا جائے اور ایک ایسی جماعت بنائی جائے جو پادریوں اور عام لوگوں میں حائل شگاف پر کرسکے اور ان باطل تصورات کا مقابلہ کرے جو قوم کو تباہی کے دہانے پر لے آئے ہیں۔ موڈی کو امریکی بنیاد پرستی کا باپ کہا جاتا ہے۔ پرنسٹن کی طرح اس کی بائیبل انسٹی ٹیوٹ قدامت پسند عیسائیت کا مرکز بن گئی مگر ہوجز اور وارفیلڈ کی نسبت موڈی عقائد میں کم ہی دلچسپی لیتا تھا اس کا پیغام جذباتی مگر سادہ تھا۔ مسیح کے ذریعے ہی گناہگار کی نجات ممکن ہے۔ روحوں کی نجات موڈی کی ترجیح تھی۔ وہ ہر عیسائی کے ساتھ کام کرنے کے لئے تیار ہوجاتا جسے گناہ گاروں کی نجات میں دلچسپی تھی قطع نظر اس کے کہ اس کے عقائد کیا ہیں۔ وہ لبرل عیسائیوں کے سماجی کام میں ان کا ساتھ دیتا اور اس کی انسٹی ٹیوٹ کے گریجویٹ اپنے آپ کو غریبوں کو خدمت کے لئے وقت کردیتے تھے مگر موڈی کو یقین تھا کہ اس عہد کے منکرین خدا نظریات دنیا کو تباہ کردیں گے۔ دنیا کے حالات سنبھل نہیں رہے تھے جیسا کہ لبرل سمجھتے تھے بلکہ اور زیادہ خراب ہورہے تھے1886 میں کہ جس سال اس نے اپنی انسٹی ٹیوٹ قائم کی شکاگو میں ایک ایسا المیہ ہوا جس نے سب کو ہلا کر رکھ دیا۔ ایک ٹریڈ یونین ریلی کے دوران مظاہرین کا تصادم پولیس کے ساتھ ہوا تو ایک بم پھٹنے سے سات پولیس والے ہلاک ہوگئے اور ستر دوسرے افراد زخمی ہوگئے۔ لگتا تھا کہ یہ فساد صنعتی تہذیب کی برائیوں اور خطرات کا عکس ہے۔ موڈی اسے مکمل تباہی کے حوالے سے دیکھتا تھا۔ یا تو یہ لوگ نجات پاسکیں گے ورنہ بے دینی کمیونزم اس ملک میں اس شدت سے پھیلیں گے کہ ہر سو خوف اور دہشت کرفرماں روائی ہوگی۔

بائیبل انسٹی ٹیوٹ ایک زبردست بنیاد پرست ادارے کی صورت اختیار کرگئی۔ وہ لوزن یشیوا (یہودی مذہبی اکیڈمی) کی طرح وہ اس منکر خدا دنیا میں ایک محفوظ اور مقدس پناہ گاہ تھی۔

جس نے ان لوگوں کی تربیت کی جنہیں آگے چل کر جدید معاشرے پر جوابی حملہ کرنا تھا۔ وہ قدامت پسند پروٹیسٹنٹ بھی موڈی کے راستے پر ہی چلے جنہیں آنے والی بنیاد پرستی کی تحریک میں اہم کردار ادا کرنا تھا۔William Bell Riby نے1902میں نارورن بائبل سکول کی بنیاد رکھی اور1907میںLyman Stewart نے لاس اینجلس میں بائبل انسٹی ٹیوٹ قائم کی۔اہم فرقوں کے وہ رجعت پسند متحد ہونے لگے جولبرل عناصر سے مات کھا گئے تھے۔انیسویں صدی کے آخر میں پہلی بائبل کانفرنس منعقد ہوئی جہاں رجعت پسند پروٹیسٹنٹ جمع ہوکر انجیل کالفظی مطالعہ کامن سینس (عقل سلیم) کے انداز میں کر سکتے تھے۔انہوں نے 'برتر تنقید' سے اپنے ذہن صاف کئے اور اپنے قبل از ہزار سالہ جشن کے تصورات پر بحث کرتے رہے۔ انہوں نے ایک امتیازی شناخت بنانے کی ابتدا کر دی تھی۔اس پر ہجوم کانفرنس کے دوران انہیں اپنی آزادی اور طاقت کا احساس ہوا۔

ایک امتیازی شناخت کی تخلیق جدید تجربے کا قدرتی جواب تھا۔ نئے شمالی صنعتی شہروں میں سب کچھ آپس میں گڈ مڈ ہو رہا تھا۔1890 تک نیویارک کے ہر پانچ شہریوں میں سے چار شہری نئے آباد کار تھے یا ان کے بیٹے تھے۔انقلاب کے وقت امریکہ میں پروٹیسٹنٹ غالب اکثریت میں تھے۔ابWASP کی شناخت بپتسمہ دینے والوں کے سیلاب میں ڈوبتی نظر آنے لگی۔ بدقسمتی سے ایک الگ شناخت پر اصرار سے 'غیریت' کا احساس پیدا ہوتا ہے اور اس 'غیرت' کی مخالفت پر لوگ کمر باندھ لیتے ہیں۔سازش کا خوف جدیدیت کے ہنگاموں کا سامنا کرنے کی خصوصیت بن کر جاری رہتا تھا اور بالخصوص یہودیوں، عیسائیوں اور مسلمانوں کی بنیاد پرست تحریکوں میں صاف جھلکتا تھا جو سب اپنے دشمنوں کی مسخ شدہ اور اکثر خوفناک تصویر پیش کرتے تھے۔ امریکی پروٹیسٹنٹ بہت عرصہ سے رومن کیتھولک عیسائیوں سے نفرت کرتے تھے اور Deists فری میسنز اور مورمونز کی سازشوں سے ڈرتے تھے جو اکثر اوقات عیسائی معاشرہ کو کم تر سمجھتے تھے۔ انیسویں صدی کے آخر میں یہ بے چینی پھر بڑھ گئی۔1887میں American Protective Association بنائی گئی تھی جس کے اراکین کی تعداد2,250,000 تک پہنچ گئی اور جو امریکہ کی سب سے بڑی کیتھولک دشمن جماعت بن گئی تھی۔اس نے غالباً امریکی کیتھولک بشپ کی طرف سے اپنے پیروؤں کے نام جعلی خطوط بھیجے کہ وہ تمام پروٹیسٹنٹ آبادی قتل کر دیں

اور امریکہ کی ملحد حکومت کا تختہ الٹ دیں۔1885 میں جوشوا سٹرانگ نے Our Country: Its Possible Future and Present Crisis شائع کی جس میں کیتھولک مسیحیوں کو قوم کے لئے بدترین خطرہ کہا گیا تھا۔ انہیں ووٹ دینے کے معنی یہ ہوں گے کہ شیطانی روحوں کے لئے امریکہ کے دروازے کھول دیئے جائیں۔ پہلے ہی امریکہ اتنے اطالوی آباد کاروں کا عذاب سہہ رہا تھا جن کی تعداد گوتھ قبیلے کے ان افراد سے دگنی تھی جنہوں نے پانچویں صدی میں رومی سلطنت کا خاتمہ کیا تھا۔ امریکہ کسی زبردست تباہی کے خیالات مین گم تھے۔ سازش کی تھیوریوں کے ذریعے وہ اپنے بے نام اور بے حقیقت خوف کا اطلاق اپنے حقیقی دشمنوں پر کرتے تھے جس سے انہیں ان پر قابو پانے میں مدد ملتی تھی۔

یورپ میں الگ شناخت کے ساتھ جڑے ہوئے سازش کے خوف نے ایک نئی سائنسی نسل پرستی کی صورت اختیار کر لی جو1920 تک امریکہ نہیں پہنچی تھی۔ اس کا محور زیادہ تر یہودی تھے اور یہ جدید سائنسی کلچر کی پیداوار تھی جس نے یورپ کے لوگوں کو اس قابل بنا دیا تھا کہ وہ اس مہارت سے اپنا ماحول کنٹرول کریں جس کی مثال پہلے کہیں نہیں ملتی۔ انہوں نے اپنے نئے مشاغل سے سیکھ لیا تھا کہ وہ بے کار اور ضرر رساں چیزیں ضائع کر دیں۔ ایسے وقت جب یورپ کی ریاستوں کی سب سے اہم آئیڈیالوجی قومیت تھی۔ یہودیوں کا نظریہ ناگزیر اور طبعی طور پر بین الاقوامیت تھا۔ جن سائنسی تصورات نے اس لئے نشوونما پائی تھی کہ ان کی مدد سے Volk کی اہم حیاتیاتی اور جنیاتی خصوصیتوں کی وضاحت ہو سکے ان میں یہودیوں کی شمولیت مشکل تھی۔ جیسا کہ نئی قومیں اپنی توجیہہ نئے سرے سے کر رہی تھیں تو انہیں اپنی ضد(Other) کی تلاش بھی تھی کہ جس کے ساتھ وہ اپنا قد ناپ سکیں۔ اس مقصد کے لئے یہودی با آسانی میسر تھے۔ اس جدید نسل پرستی کا مقصد یہودیوں کو معاشرے سے اس طرح ختم کرنا تھا جس طرح باغبان باغ سے جھاڑ جھنکار صاف کرتا ہے یا جس طرح سرجن کینسر کاٹ کر پھینک دیتا ہے۔ یہ نئی نسل پرستی ایک قسم کی سماجی انجینئرنگ تھی جو اس یقین سے ابھری تھی کہ بعض لوگ ناقابل اصلاح ہوتے ہیں یہ صدیوں پرانی عیسائیوں کی مذہبی بدظنی تھی جسے اب سائنسی بنیاد مہیا کی گئی تھی۔

انہی دنوں لفظ 'یہودی' ایک ایسی علامت بن گیا جس پر لوگ جدیدیت کے سماجی ردوبدل کے بارے میں اپنے خدشات کا اطلاق کر سکتے تھے۔ جب یہودی اپنے گیٹوز سے نکل کر

عیسائیوں کے ہمسائے بنے اور سرمایہ دارانہ حیثیت میں غیر معمولی کامیابی حاصل کی تو لگتا تھا کہ وہ پرانے دور کی تباہی کے نقیب ہیں۔ یورپ کا بھی جدیدیت کے متعلق یہی تجربہ تھا کہ وہ کئی قسم کے امتیازات ختم کرتی ہے اور نئی صنعتی دنیا پرانی رکاوٹیں ہٹا رہی تھی۔ بعض لوگ تو اسے انارکی سے تعبیر کرتے تھے کیونکہ اس کی کوئی واضح شکل اور متعین سرحدیں نہیں تھیں۔ وہ یہودی خصوصی طور پر پریشان تھے جو معاشرے کے بڑے دھارے میں شامل ہو چکے تھے۔ کیا اب 'غیر یہودی' بن کر وہ ایسی خلیج عبور کر سکتے تھے جو ناقابل عبور تھی۔ نئی یہود دشمنی نے انہیں اپنے رنج اور آزردگی کے اظہار کا موقعہ مہیا کر دیا جو جدیدیت کے ہنگاموں اور سماجی کنفیوژن سے پریشان تھے۔ ان لرزہ خیز تبدیلیوں کی وضاحت کرنا گویا انہیں محدود کرنا تھا جیسا کہ بعض پروٹیسٹنٹ مسیحیوں کو نظریات اور اصولوں کی سخت گیرانہ وضاحت کے ذریعے یقین کی تلاش رہی جبکہ دوسروں نے سماجی دیواریں از سر نو حائل کر کے خلاء کو اپنے سے دور رکھا۔

1880 کے عشرے تک روشن خیالی کی رواداری المناک طور پر برائے نام رہ گئی تھی۔ روس میں آزاد خیال زار الیگزینڈر دوئم کے قتل کے بعد پیشوں کے حوالے سے یہودیوں پر نئی پابندیاں لگ گئیں۔ 1891 میں دس ہزار سے زیادہ یہودی ماسکو سے نکال دیئے گئے اور 1893 سے 1895 کے عرصے میں دوسرے علاقوں سے بھی وسیع پیمانے پر ان کا اخراج جاری رہا۔ وزارت داخلہ کی چشم پوشی بلکہ اس کی ایماء پر یہودیوں کا قتل عام ہوا اور انہیں لوٹا گیا۔ قتل عام اور مار دھاڑ کا یہ سلسلہ کہیں کشنیو کے قتل و غارت (1905) پر جا کر ختم ہوا جہاں پچاس یہودی مارے گئے اور پانچ سو زخمی ہوئے۔ یہودی مغرب کی طرف بھاگنا شروع ہوئے اور پچاس ہزار سالانہ کی اوسط سے مغربی یورپ، امریکہ اور فلسطین میں پناہ لینے لگے۔ مگر اپنے عجیب و غریب حلیے میں جب یہ مشرقی یہودی مغربی یورپ پہنچے تو پرانی تلخیوں کی یاد تازہ ہو گئی۔ 1886 میں جرمنی کے پہلے پارلیمنٹری سیکرٹری کا انتخاب سرکاری طور پر یہودیوں کے مخالف پلیٹ فارم سے ہوا۔ 1893 تک ان کی تعداد سولہ ہو گئی۔ آسٹریا میں کرسچین سوشلسٹ کارل لیوگٹ (1844-1918) نے ایک زبردست یہود دشمن تحریک شروع کی اور 1895 تک وہ ویانا کا میئر بن گیا۔ نئی یہودی دشمن تحریک کا اثر فرانس نے بھی قبول کیا حالانکہ وہ پہلا یورپی ملک تھا جس نے اپنے ملک کے یہودیوں کو آزادی کا درجہ دیا تھا۔ 5 جنوری 1895 کو جنرل اسٹاف کے واحد یہودی افسر الفریڈ ڈریفیس پر

یہ جھوٹا الزام لگا کر اسے سزا سنائی گئی کہ اس نے اہم راز جرمنی کے حوالے کئے ہیں۔ مشتعل ہجوم نعرے لگا تا رہا ڈریفیس مردہ باد، یہودی مردہ باد۔

بعض یہودی کبھی تو عیسائی ہو کر کبھی سیکولرازم کے رستے پر چل کر معاشرے میں جذب ہوتے رہے۔ بعض نے سیاست کا انتخاب کیا اور انقلابی سوشلسٹ بن کر فرانس اور مشرقی یورپ میں زندگی بسر کرنے لگے یا مزدور انجمنوں کے رہنما بن گئے۔ دوسروں نے سوچ لیا کہ کافروں کے معاشرے میں یہودیوں کے لئے کوئی جگہ نہیں۔ اس لئے ارض مقدس واپس جا کر یہودی ریاست قائم کریں۔ کچھ ایسے بھی تھے جنہوں نے اصلاح، قدامت پسندی اور نئی قدامت جیسے جدیدیت پسند یہودیت کے خواب دیکھے۔ بعض جدید معاشرے کی طرف سے بدستور منہ پھیرے رہے اور روایتی قدامت سے چمٹے رہے یہ سب لوگ نئی دنیا میں یہودیت کے مستقبل کے لئے پریشان تھے اور پرانے دور کو نئی زندگی دینا چاہتے تھے۔ مغربی یورپ اور امریکہ میں بھی وہ وہی لباس پہنتے تھے جو ان کے بزرگ روس اور پولینڈ میں پہنا کرتے تھے۔ ان میں سے اکثر ایک دشمن دنیا میں اپنی شناخت یہودی ہونے کی حیثیت میں قائم رکھنا چاہتے تھے۔ اسے مٹنے سے بچانے کی جدوجہد کر رہے تھے۔ کسی تحفظ اور تیقن کی تلاش میں تھے اور دنیا مین زندہ رہنے کے لئے لڑنے مرنے پر تیار تھا۔

اس موڈ کی عکاسی ہبد ہیزیڈم میں ایک نئے واقعہ سے ہوئی جواب روس میں قائم ہوا تھا اور ربی زلمن کے وارثوں کے زیر نگین تھا۔ پانچواں ڈوبر جو 1893 میں جانشین بنا یہودیت کے مستقبل کے لئے بہت فکر مند تھا۔ اس نے دور دراز ملکوں کے سفر کئے تھے اور لتھونیا میں اس کا رابطہ Misnagdim سے بھی تھا۔ اسے احساس ہوا کہ مذہبی احکام کی پابندی زوال پر ہے۔ 1897 میں اس نے ایک ہبد Yeshiva قائم کیا جو ولوزن کے Yeshiva کے نمونے پر تھا۔ ڈوبر بھی یہی چاہتا تھا کہ نوجوانوں کی ایک جماعت بن جائے جو خدا کے دشمنوں سے لڑ سکے۔ یہ دشمن زار یا اس کے افسر نہیں تھے۔ Lebavitch ہیزیڈم ایک بنیاد پرست تحریک بن رہی تھی اور جیسا کہ ایسی تحریکوں کے معاملے میں ہوتا ہے اس تحریک نے بھی اپنے ہم مذہبوں کی مخالفت سے اپنا آغاز کیا تھا۔ اس پانچویں ربی کی نظر میں دوسرے یہودی خدا کے دشمن تھے یعنی مسکیلم، صیہونی یہودی سوشلسٹ وغیرہ جو اس کے خیال میں مذہب خطرے میں ڈال رہے تھے۔ اس کے

Yeshiva (مدرسے) کے طلباء صالحین کہلاتے تھے۔ وہ اس کی فوج کے سپاہی تھے جو مصالحت اور رعایت کے بغیر لڑیں گے تاکہ سچی یہودیت کا بول بالا ہو۔ ان کی جدوجہد سے مسیح کی آمد کا راستہ ہموار ہوگا۔

صیہونیت جس کا مقصد فلسطین کو یہودیوں کی ریاست بنانا تھا۔ ان نئی یہودی تحریکوں میں سب سے دوررس تحریک تھی۔ یہ تحریک ایک رخی نہیں تھی کیونکہ اس کے رہنما جدید دور کے مختلف نظریات سے وابستہ تھے جس میں قوم پرستی، مغربی سامراجیت، سوشلزم اور سیکولرازم شامل ہیں۔ ہر چند کہ ڈیوڈ بن گورین (1973-1886) کی لیبر جمہوریت کو ہی جس کا مقصد فلسطین میں اشتراکی معاشرہ بنانا تھا بالآخر غالب صیہونی آئیڈیالوجی بننا تھا مگر صیہونی سرمایہ کاروں نے سرمایہ دارانہ نظام کا بھی بہت سہارا لیا۔ 1880 سے 1919 کے عرصہ میں یہودی تاجروں نے لاکھوں ڈالر عربوں اور ترکوں سے ان کی زمین خریدنے پر خرچ کئے اور اس سرمایہ کاری سے ان گنت فائدے حاصل کئے۔ تھیوڈور ہرزل (1904-1860) اور چیم وزمن 1952-1874 جیسے لوگ سیاسی جوڑتوڑ کے ماہر بن گئے۔ ہرزل کا اندازہ تھا کہ مستقبل کی یہودی ریاست مشرق وسطیٰ میں یورپ کی ایک کالونی ہوگی مگر دوسرے لوگ قومی ریاست بنانے کے حق میں نہیں تھے۔ بہتوں کو یہود دشمن ہنگاموں کا خوف تھا۔ یہودیوں کو مٹنے سے بچانے کے لئے ضروری تھا کہ ان کی ایک محفوظ پناہ گاہ ہو۔ ان کے مٹ جانے کے خوف کی نوعیت اخلاقی یا نفسیاتی نہیں تھی بلکہ جدیدیت کے مہلک پہلوؤں کا حقیقت پسندانہ جائزہ تھا۔

پرانے خیالات کے لوگ صیہونی تحریک کی ہر شکل سے بیزار تھے۔ انیسویں صدی میں دو مرتبہ صیہونیت کو مذہبی شکل دینے کی کوشش ہوئی مگر دونوں دفعہ مطلوبہ حمایت حاصل نہ ہوسکی۔ 1845 میں سرائیوو کے ایک یہودی Yashuda Hai Akalai(1798-1878) نے ارض کی مقدس واپسی کی متھ کو ایک عملی پروگرام بنانے کی کوشش کی تھی۔ مسیح ایک فرد نہیں بلکہ ایک عمل ہے جس کا آغاز یہودیوں کی اپنی کوششوں سے ہوگا۔ انہیں چاہیے کہ وہ منظم ہوں، متحد ہوں، اپنے لیڈروں کا انتخاب کریں اور جلاوطنی کی سرزمین سے چلے جائیں۔ بیس برس بعد زوی ہرش کے لیچر (1874-1791) ایک پولش یہودی نے بالکل یہی بات اپنی تصنیف صیہون کی تلاش میں کہی۔ الکلائی اور کالیچر دونوں قدیم مائتھالوجی کو نیچے زمین پر لا رہے تھے اور اسے سیکولر رنگ دے

رہے تھے مگر نیک اور پرہیزگار یہودیوں کی اکثریت کی نظر میں ایسا کوئی بھی آئیڈیا قابل نفرت تھا۔ جونہی صیہونی تحریک نے انیسویں صدی کے آخری برسوں میں زور پکڑا اور باسل (سویٹزرلینڈ) میں ہونے والی بڑی صیہونی کانفرنسوں کے دوران بین الاقوامی حیثیت اختیار کی، پرانے خیالات کے یہودیوں نے بڑے سخت الفاظ میں اس کی مذمت کی۔ جدیدیت سے پہلے متھ ایک لائحہ عمل نہیں سمجھی جاتی تھی۔ لائحہ عمل بننا لوگوس کا منصب تھا۔ متھ کا میدان ایسے عمل کو یعنی دینا اور اس کے لئے روحانی بنیاد مہیا کرنا تھا۔ شبیتائی زیوی کی مثال سے ظاہر ہو چکا تھا کہ سیاسی معاملات میں ان کہانیوں اور تصورات سے کام لینا کتنا تباہ کن ہوسکتا ہے جن کا تعلق سائیکی کی ان دیکھی دنیا سے ہے۔ اس ناکامی کے صدمہ کے بعد مسیحائی مائتھوس کو لوگوس سمجھنے اور اس سے عملی مقاصد کے لئے کام لینے کی ممانعت نے یہودیوں کے راستہ میں ایک زبردست رکاوٹ کی حیثیت اختیار کر لی۔ نجات حاصل کرنے کو کوئی انسانی کوشش یا انجام تک جلدی پہنچنے کے لئے عملی قدم اٹھانا کہ مقدس بادشاہت قائم ہو سب کچھ قابل نفرت قرار پایا۔ صیہون واپس جانے کے لئے بہت سی دعائیں کرنے سے بھی یہودیوں کو منع کر دیا گیا۔ ایسی کوئی بھی کوشش خدا کے خلاف بغاوت سمجھی جاتی تھی جو واحد ذریعہ نجات ہے۔ 'ایسی کوشش کرنے والے ہر شخص کا تعلق دشمن کیمپ سے ہے۔ یہودیوں کو سیاست میں حصہ نہیں لینا چاہیے' جلاوطنی کی حالت میں یہ شرط ان پر عائد کی گئی۔ شیعہ مسلمانوں کی طرح یہودیوں نے بھی عملی سیاست سے کنارہ کر لیا۔ یہودی اپنی تاریخ سے یہ سبق سیکھ چکے تھے کہ متھ کو تاریخ میں بدلنے کی کوشش کتنی ہلاکت آفریں ہوسکتی ہے۔

اس دن تک صیہونیت اور یہودی ریاست (جو تحریک نے قائم کی) خود جدیدیت سے زیادہ اختلاف انگیز رہے ہیں۔ صیہونیت اور اسرائیلی ریاست کے حق میں یا اس کے خلاف کوئی قدم ہر قسم کے یہودی بنیاد پرست کے لئے طاقت کا محرم بن جاتا ہے۔ زیادہ تر صیہونیت کے ذریعے ہی سیکولر جدیدیت یہودیوں کی زندگی میں داخل ہوئی اور اسے ہمیشہ کے لئے بدل کر رکھ دیا۔ یہ اس لئے ہوا کہ صیہونیت کے پہلے رہنماؤں نے یہودیت کی سب سے مقدس علامت، سرزمین اسرائیل کو ریشنل اور عملی حقیقت میں بدل دیا۔ ان ابتدائی برسوں میں پرانے خیالات رکھنے والوں کی بڑی اکثریت کے لئے یہ سب کچھ ایک مقدس حقیقت کو پاؤں تلے روندنا تھا۔ ان کے خیال میں یہ دانستہ بے دینی تھی جس کے ذریعے صدیوں پرانی مذہبی روایت نظرانداز کی گئی

تھی۔

سیکولر صیہونی مذہب کو رَد کرنے میں بڑے بے باک تھے۔ ان کی تحریک یہودیت کے خلاف ایک بغاوت تھی۔ ان میں اکثر دہریئے، سوشلسٹ اور مارکسٹ تھے۔ بہت کم ایسے تھے جو تورات کے احکام پر عمل کرتے تھے۔ ان میں سے بعض کو تو واقعی مذہب سے نفرت تھی۔ وہ سمجھتے تھے کہ مذہب ہی کی وجہ سے یہودی ناکام ہوئے کیونکہ وہ بیکار بیٹھے مسیحا کی آمد کا انتظار کرتے رہے۔ بجائے اس کے کہ مذہب ظلم اور جبر کے خلاف جدوجہد میں ان کی مدد کرتا۔ مذہب نے یہودیوں کو دنیا سے پسپائی کا رستہ دکھایا۔ یہودیوں کے یروشلم کی دیوارِ گریہ (جو قدیم عبادت گاہ کی آخری مقدس یادگار تھی) کے ساتھ لپٹ لپٹ کر رونے کے نظارے نے انہیں بہت مایوس کیا۔ مافوق فطرت پر یہ بزدلانہ انحصار ہر اس مقصد کے خلاف تھا جسے وہ حاصل کرنا چاہتے تھے۔ صیہونی، گیٹو کی بیمار اور اذیت ناک زندگی سے چھٹکارا چاہتے تھے۔ وہ ایک نیا یہودی اور نئی یہودی شناخت تخلیق کرنے کا عزم رکھتے تھے۔ نیا یہودی جو آزاد و خودمختار ہو اور اس کی تقدیر اس کے اپنے ہاتھ میں ہو۔ مگر اپنی اصلیت اور اپنی عزتِ نفس کی اس تلاش کے معنی تھے کہ یہودی مذہب سے چھٹکارا حاصل کر لیا جائے۔

سب سے بڑی بات یہ ہے کہ صیہونی باعمل اور حقیقت پسند تھے۔ اسی بات نے انہیں نئے دور کے انسان کی شکل میں بدل دیا تھا۔ پھر بھی وہ زمین دو انتہائی مقدس حقیقتوں، خدا اور تورات کا ناگزیر حصہ ہے جسے ان سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ کبالہ کے صوفیانہ سفر میں زمین علامت کے طور پر باطن کی آخری سطح سے جڑی ہوئی اور خدا کی موجودگی سے ہم آہنگ ہے جس کا احساس کبالائی کو اپنے وجود کی زمین پر ہوتا ہے۔ یہودی شناخت میں زمین کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ اپنی اپروچ میں چاہے وہ کتنے ہی باعمل اور حقیقت پسند ہوں، صیہونی جانتے تھے کہ کوئی اور زمین یہودیوں کو بچا نہیں سکتی، نہ ہی ان کی سائیکی کا گھاؤ بھر سکتی تھی۔ Peretz Smelenskin (1842-95) (جو ملائی اسٹیبلشمنٹ کا سخت مخالف تھا) کو یقین تھا کہ یہودی ریاست کے لئے صرف فلسطین ہی مناسب جگہ ہے۔ Leo Pinsker نے بھی بالآخر تسلیم کیا کہ یہودی ریاست فلسطین میں ہونی چاہیے اور Theodor Herd تو تقریباً اپنی لیڈری ہی گنوا بیٹھا تھا جب اس نے باسل میں دوسری صیہونی کانفرنس (1898) میں یہودی ریاست کے لئے یوگنڈا کا نام لیا۔

اسے مجبور کیا گیا کہ وہ تمام اراکین کے سامنے کھڑا ہو، سر اٹھائے اور دعا کرے کہ ''یروشلم اگر میں تجھے بھلا دوں تو میرا دایاں ہاتھ ٹوٹ جائے۔'' صیہونی تلے ہوئے تھے کہ اپنی بالکل سیکولر بلکہ خدا سے خالی مہم کو ایک زندہ حقیقت بنانے کے لئے اس دیو مالا کی طاقت سے فائدہ اٹھائیں۔ یہ کہ وہ کامیاب ہو گئے، بے شک یہ ان کی فتح تھی مگر اس دیو مالائی، مقدس جغرافیے کی تصدیق سے ہمیشہ کے طرح مسائل ہی پیدا ہوئے بالخصوص جب انہوں نے اسے حقیقت میں تبدیل کرنے کی کوشش کی۔ پہلے زمانے کے صیہونیوں کو فلسطین کی ارضی تاریخ سے بہت کم واقفیت تھی۔ پچھلے دو ہزار برسوں میں ان کا نعرہ 'زمین کے بغیر لوگ اور لوگوں کے بغیر زمین' رہا جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ اس حقیقت کو بالکل نظر انداز کر دیتے ہیں کہ زمین پر فلسطینی عرب آباد ہیں اور فلسطین کے متعلق ان کے اپنے خواب اور اپنی اُمنگیں ہیں۔ صیہونیت ایک سیکولر یہودی ریاست قائم کر کے اپنے محدود عملیت پسند اور جدید مقاصد میں کامیاب تو ہو گئی مگر اس نے اسرائیل کے لوگوں کو فتنہ و فساد کی ایک ایسی بھٹی میں جھوک دیا کہ تادم تحریر تو اس سے نجات کی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔

جیسا کہ ہم جانتے ہیں کہ مصر اور ایران کے مسلمانوں کی جدیدیت کے متعلق پہلا تجربہ یہی تھا کہ وہ یورش پسند، لٹیرے اور جارحیت پسند ہے۔ آج یورپ کے لوگ مسلم بنیاد پرستوں کے یہ الزامات سننے کے عادی ہو چکے ہیں کہ مغربی کلچر بے ہودہ ہے۔ ان کی پالیسیوں کی بنیاد شیطانیت پر ہے۔ انسانی حقوق جمہوریت اور سیکولرازم جیسی قدروں کو حقارت سے دیکھا جاتا ہے۔ ایک مفروضہ ہے کہ اسلام اور مغرب میں کوئی مطابقت نہیں ان دونوں کے مقاصد سخت مخالفانہ ہیں اور یہ کہ اسلام ہر اس چیز کا دشمن ہے جس چیز کا علم بردار مغرب ہو۔ مگر یہ بات نہیں جیسا کہ ہم دوسرے باب سے جان چکے ہیں کہ مسلمان اپنی روحانیت کے زور پر ان تصورات اور قدروں تک رسائی حاصل کر سکے جو آج کے مغربی خیالات سے بہت مشابہ ہیں۔ انہیں یہ بصیرت حاصل ہوئی کہ مذہب اور سیاست کو جدا کر سکیں۔ فرد کی آزادی کا احترام کریں اور ریشنل طرز فکر عام کریں۔ انصاف اور مساوات کا قرآنی تصور، جدید مغرب خیالات کے مطابق بھی بہت مقدس ہے۔ اس لئے یہ حیرانی کی بات نہیں کہ انیسویں صدی کے آخر میں مسلمانوں کے کئی ممتاز مفکر مغرب سے متاثر تھے۔ وہ دیکھ سکتے تھے کہ مغرب کے لوگوں اور مسلمانوں کی قدریں مشترک ہیں یہ اور بات ہے کہ مغرب نے ایک زیادہ باصلاحیت، متحرک اور تخلیقی معاشرہ بنانے کے لئے مسلسل

جدوجہد کی ہے۔ جسے مسلمان اپنے ملکوں میں از سرِ نو تخلیق کرنے کی آرزو کرتے ہیں۔

انیسویں صدی کے دوسرے نصف میں ایران کے اندر دانش وروں، مفکروں، سیاستدانوں اور لکھاریوں کا ایک حلقہ مغربی کلچر کا بہت شیدائی تھا۔ فتحدی اخوندازاد (78-1812) ملکوخان (1908-1833)، عبدالرحیم طالب زادہ (1911-1834) اور مرزا آقا خان کرمانی (1908-1853) بعض لحاظ سے صیہونیوں کی طرح ہی باغی تھے۔ علماء کے ساتھ ان کا تصادم مسلسل ہوتا رہا کیونکہ وہ مکمل طور پر سیکولر طرز حکومت چاہتے تھے اور اس بنیادی تبدیلی کے لئے مذہب سے مدد لیتے تھے۔ صیہونیوں کی طرح انہیں بھی یقین تھا کہ روائتی مذہب (ان کے معاملے میں شیعیت) نے لوگوں کو آگے نہیں بڑھنے دیا۔ اس نے ترقی کی رفتار روک دی اور آزادی اظہار پر پابندی لگا دی جس نے مغربی انقلاب میں فیصلہ کن کردار ادا کیا تھا۔ کرمانی خصوصی طور پر بہت بے باک تھا۔ ''اگر مذہب عملی نہیں تو بے کار ہے۔ امام حسین کو رونے سے کیا حاصل اگر غریب انصاف سے محروم ہیں۔''

جبکہ یورپ کے علما، اشتراکیت اور غریبوں کی بہتری کے لئے جدوجہد کے اس دور میں سائنس، ریاضی، سیاست، معاشیات اور انسانی حقوق کا مطالعہ کر رہے ہیں۔ ایرانی علماء صفائی اور پیغمبر کی معراج پر بحث کرتے ہیں۔''

کرمانی مصر تھا کہ سچے مذہب کے معنی ریشنل فکر اور مساوی حقوق ہیں۔ اس کے معنی اونچی عمارتیں، صنعتی ایجادیں، فیکٹریاں، رابطے کے وسیع ذرائع، علمی ترقی، عام لوگوں کی بہبود اور انصاف کی بالادستی ہے۔ مگر کرمانی یقیناً غلطی پر تھا۔ اس سلسلے میں مذہب نے کچھ نہیں کیا تھا۔ یہ سب لوگوس یعنی ریشنل طرز فکر کا کمال تھا۔ جس کے ذریعے یہ سارے کام ہوئے۔ مذہب کا منصب ان عملی کارناموں کو معنی دینا تھا۔ ایک لحاظ سے کرمانی اس وقت بھی کہتا تھا جب اس نے معیشت پر ترقی میں حائل ہونے کا الزام لگایا۔ قدامت پسند اور جدیدیت سے پہلے کے مذہب کا ایک کام یہ تھا کہ لوگوں کو اپنے معاشرے کی طبعی کوتاہیاں تسلیم کرنے پر آمادہ کرے۔ اگر ایرانی، ترقی کے لئے وقف نئی دنیا میں بھر پور حصہ لینا چاہتے تو مذہب اس کی اجازت نہ دیتا۔ اسلام کو بدلنا تھا مگر کیسے؟

اکثر سیکولر رہنماؤں کی طرح کرمانی اور اس کے دوست اپنی قوم کے انتشار کے لئے مذہب

کو ذمہ دار ٹھہراتے تھے۔ان کا کہنا تھا کہ عربوں نے اسلام یونہی ایرانیوں پر مسلط کر دیا جس سے ایرانی عوام کو نقصان پہنچا۔ چنانچہ انہوں نے قبل از اسلام کے ایران سے متعلق اپنے ادھورے علم کی بنیاد پر ایرانی شناخت تخلیق کرنے کی کوشش کی۔مغرب کی متعلق ان کا نظریہ بھی اتنا ہی ادھورا اور غیر تسلی بخش تھا۔ وہ مغربی جدیدیت کی پیچیدہ فطرت سے واقف ہی نہیں تھے مگر اس کے ہرادارے کو ایک طرح کی مشین (انیسویں صدی میں ترقی، سائنس اور طاقت کی علامت) سمجھتے تھے جو میکانکی طور پر یورپ کے پورے معاشرہ کو تشکیل دیتی تھی۔اگر ایرانی (شریعت کی بجائے) مغرب کے سیکولر قوانین کا مطالعہ کرتے یا یورپی طرز کی تعلیم پاتے تو ماڈرن اور ترقی پسند ہوتے۔ وہ جدید معیشت اور صنعت کاری کی اہمیت نہیں سمجھ سکتے تھے۔ یورپی تعلیم یقیناً نوجوان ایرانیوں پر امکانات کے نئے دروازے کھول دیتی مگر ان کے معاشرتی نظام میں کوئی تبدیلی ہی نہ آسکے تو تعلیم کیا کرے۔ایران میں جدیدیت کے عمل کی ابتدا ہی ہوئی تھی۔ایرانیوں کو ابھی زرعی کلچر سے صنعتی تہذیب تک پہنچنے کے لئے یہ عمل ہی کافی تھا جس کی تمنا ان کے ریفارمروں کو تھی کہ یہاں ہر شخص آزادی کے ساتھ سوچ سکے۔ایک زرعی معاشرہ تو اس قسم کی آزادی برداشت کر سکتا ہے نہ اس کی حمایت کر سکتا۔مغربی ادارے شاید کوئی مدد کر سکتے مگر وہ اپنے آپ ہی تو ان لوگوں کی ذہنیت نہیں بدل سکتے تھے جن کے ذہنوں پر قدامت کی گہری چھاپ تھی۔

دراصل اصلاح پسندوں کی اپنی سوچ بھی ایک حد تک پرانی دنیا میں اٹکی ہوئی تھی۔جدید معاشرے سے ان کی نامکمل واقفیت کا خیال رکھتے ہوئے یہ حیرانی کی بات نہیں۔ان کے ترقی پسندانہ رجحانات کی وجہ باب ازم یعنی اصفہان کا صوفیانہ فلسفہ اور مغربی کتابیں تھیں۔اس شیعی روحانیت نے انہیں یہ آزادی اور جرأت دی کہ وہ پرانی پابندیاں توڑ تو دیں مگر قدامت پسندانہ انداز میں توڑیں۔کرمانی کا دعویٰ تھا کہ اسے ریشنلزم پر پورا پورا یقین ہے۔'ریزن' (عقل) اور سائنسی ثبوت میرے قول و فعل کی بنیاد ہیں، مگر وہ دارون ازم کو ملا صدرا کے اس ترقی پسندانہ وژن سے جوڑتا تھا جس کے ذریعے سب کی ترقی اور بھلائی چاہی گئی تھی۔ملکوخان نے بھی یہی کیا۔وہ دونوں مغربی سائنسی ریشنلزم شامل کر کے مسلمانوں کے قدیم تصور علم کی وسعت دے رہے تھے۔ اکثر ریفارمر، جدید فلسفیوں کی بجائے از منہ وسطیٰ کے فلسفیوں کی طرح بحث کرنا پسند کرتے تھے وہ سب آئینی حکومت کے تصور کی حمایت کرتے تھے تاکہ شاہوں کے اختیارات محدود ہوں۔ایران

میں اس بحث کا آغاز کر کے انہوں نے بہت اہم کردار کیا تھا مگر وہ بھی قدیم فلسفیوں کی طرح اشراف پسند (ممتاز لوگوں کو اہمیت دینے والے) تھے۔ انہوں نے ایسی حکومت نہیں سوچی تھی جسے اکثریت کی حمایت حاصل ہو۔ ملکوخان کا وژن فلسفی بادشاہ کا تھا جو جاہل عوام کو صحیح راستہ دکھائے۔ نئے سیاسی سائنس دانوں کے جمہوری تصور کے ساتھ اس کا کوئی تعلق نہیں تھا۔ کثیرالتعداد پارٹیوں کا سسٹم طالب زادہ کی سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ اس کی رائے میں اپوزیشن کا کام بس اتنا تھا کہ وہ حکمران پارٹی کی پالیسیوں کا خیال رکھے اور بحران کی صورت میں حکومت سنبھال لے۔ مغرب کے لوگوں کو اقتصادی، سیاسی، صنعتی اور سماجی تبدیلیاں لانے میں صدیاں لگ گئی تھیں تب کہیں جا کر وہاں جمہوریت قائم ہوئی۔ یہ بات حیرانی کی نہیں تھی کہ ایرانی ریفارمرا سے پوری طرح سمجھ نہیں سکے۔ وہ عبوری تھے اور وہ صرف عبوری افراد ہی ہو سکتے تھے۔ انہوں نے اپنی قوم کو حالات بدلنے کی طرف راغب تو کیا مگر جدیدیت کی وضاحت صحیح طور پر نہ کر سکے۔

کرمانی اور ملکوں خان جیسے دانش ور ایران کی ترقی میں اہم کردار ادا کرتے رہے۔ علماء کے ساتھ ان کی کشمکش بھی بعض اوقات جاری رہی مگر صدی کے آخر تک علماء نے ثابت کر دیا کہ وہ رسمی اور پرانے فرائض تک محدود نہیں بلکہ سیاست میں بھی مداخلت کے لئے تیار ہیں اگر انہیں پتہ چل جائے کہ عوام کا مفاد شاہوں کے ہاتھوں خطرے میں ہے۔ 1891 میں ناصر الدین شاہ (1829-96) نے ایک برطانوی کمپنی کو ایران میں تمبا کو کی پیداوار اور فروخت کا اجارہ دے دیا۔ قاچار شاہ برسوں سے اس قسم کی رعائتیں دے رہے تھے مگر صرف ان علاقوں میں جہاں ایرانی شامل نہیں تھے۔ تمبا کو ایران کی بڑی مقبول فصل تھی اور ہزاروں زمینداروں، دکانداروں اور برآمد کرنے والوں کی معاش کا ذریعہ تھی مگر دسمبر میں نجف کے ممتاز مجدد حاجی مرزا حسن شیرازی نے اپنے فتوے کے ذریعے ایران میں تمبا کو کا استعمال اور اس کی فروخت خلاف قانون قرار دے دی۔ یہ شاندار حکمت عملی تھی۔ ہر شخص نے تمبا کو نوشی ترک کر دی یہاں تک کہ غیر مسلم ایرانیوں اور شاہوں کی بیگمات نے بھی اس سے چھٹکارا حاصل کر لیا۔ اس کے نتیجہ میں حکومت کو اپنے مؤقف سے ہٹنا پڑا اور اس نے رعائتیں منسوخ کر دیں۔ یہ ایک پیغمبرانہ لمحہ تھا۔ اس لمحے نے ایرانی علماء کی زبردست طاقت کا ثبوت مہیا کر دیا۔ وہ مخفی امام کے واحد ترجمان تھے اور شاہ بھی ان کی اطاعت کرتے تھے۔ شیرازی کا فتویٰ ریشنل، عمل انگیز اور نتیجہ خیز تھا مگر صرف پرانے دیومالائی حوالے سے ہی اس میں

معنی پیدا ہوتے تھے۔ جیسے اس کے لئے امام کے اختیارات کام میں لائے گئے تھے۔

مصر میں بھی ماڈرن یورپ کے متعلق 1870 کے عشرے میں بہت جوش وخروش تھا اور جدیدیت کے اذیت ناک عمل اور مشکلات کے باوجود اسے اسلامی روح سے قریب سمجھا جاتا تھا۔ مصری مصنف تحتادی نے اپنی تصنیفات میں اس جوش وخروش کی بھرپور عکاسی کی تھی وہ محمد علی کا بڑا شیدائی تھا اس نے الازہر میں تعلیم حاصل کی تھی۔ اس کے بعد وہ امام کے طور پر جدید مصری فوج میں چلا گیا جس کے لئے اس کے دل میں بہت عزت تھی مگر 1826 میں محمد علی نے اسے اعلیٰ تعلیم کے لئے پیرس بھیج دیا۔ تعلیم کے لئے ملک سے باہر جانے والوں میں وہ پہلا طالب علم تھا۔ پانچ سال تک اس نے پیرس میں فرانسیسی قدیم تاریخ، یونانی دیومالا، جغرافیہ، حساب اور منطق کی تعلیم حاصل کی۔ بالخصوص یورپی 'روشن خیالی' کے تصورات سے وہ بہت متاثر ہوا جس کا ریشنل وژن اس اس نے فلسفہ سے مشابہ پایا۔ وطن واپس آنے سے پہلے تحتادی نے اپنی ڈائری شائع کی جس میں جدید مغرب کی ابتدائی جھلک دکھائی گئی تھی۔ اس کی الگ ایک رائے تھی۔ وہ سمجھتا تھا کہ مذہب کے متعلق یورپ کے نظریہ میں یہ خامی ہے کہ اس کے ذریعہ مذہب کی اہمیت کم کر کے دکھائی جاتی ہے اور جدید فرانسیسی مفکروں کے یہ دعوے بھی کھوکھلے ہیں کہ ان کی ریشنل بصیرت پیغمبروں کی صوفیانہ بصیرت اور تخلیقی قوت سے کہیں بہتر ہے مگر تحتادی کو پیرس کا نظام بہت اچھا لگا جو اتنی خوبی سے چل رہا تھا۔ اس نے وہاں کی صاف سڑکوں، بچوں کی تعلیم، کاہلی کے فقدان اور کام کے لئے تڑپ کی بہت تعریف کی۔ یہ دیکھتے ہوئے کہ پیرس والے روایت کے اسیر نہیں بلکہ ہمیشہ چیزوں کی اصلیت اور اس کے ثبوت پر نظر رکھتے ہیں اسے فرانس کے ریشنل کلچر کی حقیقت پسندی نے بہت متاثر کیا وہ یہ دیکھ کر بھی متاثر ہوا کہ عام آدمی بھی پڑھ لکھ سکتا ہے اور اس پر بھی اس کی صلاحیت کے مطابق زندگی کا ہر دروازہ کھلا ہے۔ وہ جدت وایجاد کی تڑپ دیکھ کر بھی حیران ہوا کہ جو جدید زمانے کی حقیقی روح تھی۔ اس سے لوگوں میں تبدیلیاں آسکتی تھیں اور ان سے غلطیاں بھی سرزد ہوسکتی تھی مگر ایسی نہیں جیسی کہ سیاست جیسے اہم معاملات میں ہوتی ہیں۔ ہر شخص جو کسی فن کا ماہر ہے اسے یہ لگن رہتی ہے کہ ایسی چیز ایجاد کرے جسے پہلے کوئی نہ جانتا ہو یا ایسی چیز مکمل کرے جو ایجاد ہو چکی ہو۔

جب وہ مصر واپس آیا تو ترجمہ کے نئے بیورو کا ڈائریکٹر بن گیا۔ اس بیورو کے ذریعے یورپ

والوں کی تصنیفات مصریوں تک پہنچتی تھیں۔ تحتاوی مصر تھا کہ ''مصر کے لوگوں کو زندگی کا چلن مغرب سے سیکھنا چاہیے۔ اجتہاد کے دروازے کھل جانے چاہئیں۔ علماء وقت کے ساتھ قدم ملا کر چلیں اور شریعت نئے زمانے کے مطابق ہونی چاہیے۔ ڈاکٹروں، انجینئروں اور سائنس دانوں کا رتبہ مسلمان علماء کے برابر ہونا چاہیے۔ جدید سائنس سے اسلام کو کوئی خطرہ نہیں۔ یورپ والوں نے اپنی سائنس سپین کے مسلمانوں سے سیکھی ہے۔ سائنس سیکھتے ہوئے عرب دراصل اپنا ہی اثاثہ واپس اپنی تحویل میں لے رہے ہوں گے۔ اس لئے کہ بدلنا اب زندگی کا قانون ہے۔ تعلیم کامیابی کے لئے لازمی ہے۔ عام آدمی کو اسی طرح تعلیم دینی چاہیے جیسے فرانس میں دی جاتی ہے۔ لڑکیوں اور لڑکوں کا معیار ایک سا ہونا چاہیے۔'' تحتاوی کو یقین تھا کہ مصر شاندار مستقبل کی دہلیز پر ہے۔ وہ جدیدیت کے نشے میں مخمور تھا۔ اس نے اسٹیم انجن کی مدح میں ایک نظم لکھی اور دیکھا کہ نہر سویز اور امریکہ کا بین البراعظمی ریلوے نظام، زمین پر دور دور بکھرے لوگوں کو قریب لا رہے ہیں تاکہ وہ امن اور بھائی چارے کی فضا میں سانس لے سکیں۔ ''فرانسیسی اور برطانوی سائنس دانوں اور انجینئروں کو مصر میں آ کر بس جانے دو کہ صرف اسی طرح ترقی کی رفتار تیز ہوگی۔'' 1870 میں لبنان اور شام سے لکھاریوں کا ایک نیا گروپ آیا اور قاہرہ میں بس گیا۔ ان میں سے اکثر مسیحی تھے اور انہوں نے فرانسیسی اور امریکی مشنری سکولوں میں تعلیم پائی تھی۔ اس لئے مغربی کلچر سے واقف تھے۔ وہ نئے صحافی تھے۔ انہیں احساس ہوا کہ عثمانی علاقوں کی نسبت اسماعیل خدیو کے قاہرہ میں اظہار رائے کی زیادہ آزادی ہے۔ انہوں نے نئے رسالے اور میگزین شائع کئے جس میں طب، فلسفہ، سیاست، جغرافیہ، تاریخ، صنعت، زراعت، اخلاقیات اور سماجیات پر مضامین چھاپے جاتے جن کے ذریعے اہم جدید تصورات عام عرب قارئین تک پہنچائے جاتے۔ ان صحافیوں کو بہت زیادہ اثر ورسوخ حاصل ہوا۔ خصوصی طور پر یہ عیسائی عرب چاہتے تھے کہ مسلمان ریاستیں سیکولر ہوں اور جان لیں کہ تہذیب کی بنیاد مذہب نہیں، سائنس ہے۔ تحتاوی کی طرح وہ بھی مغرب کے شیدائی تھے اور اپنا یہی جذبہ انہوں نے مصر کے لوگوں تک پہنچایا۔

آگے چل کر جو مخالفت پیدا ہوئی اس کی روشنی میں اس ابتدائی گرویدگی پر نظر ڈالنا ضروری ہے۔ تحتاوی اور شامی صحافی، مشرق اور مغرب کے درمیان ہم آہنگی کے ایک مختصر سے عرصہ میں جی رہے تھے۔ لگتا تھا کہ یورپ میں اسلام کے خلاف صلیبی جنگوں کے زمانے کی نفرت دم توڑ چکی

ہے اور تحتادی کو فرانس اور برطانیہ سے کوئی سیاسی خطرہ محسوس نہیں ہوتا۔ ہر چند کہ پیرس میں اس کے عارضی قیام اور الجزائر پر فرانس کے ظالمانہ قبضہ کا زمانہ ایک تھا۔تحتادی کی رائے میں فرانس اور برطانیہ بس ترقی کے علم بردار تھے۔مگر 1871 میں قاہرہ کے اندر ایک ایرانی وارد ہوا جسے یہ خوف تھا کہ مغرب ساری دنیا پر اپنی قیادت مسلط کرنا چاہتا ہے۔ اگر چہ وہ شخص ایرانی اور شیعہ تھا مگر جمال الدین (97-1839) نے اپنے آپ کو الافغانی کے طور پر پیش کیا۔شاید اس لئے کہ خود کو سنی ظاہر کر کے وہ اسلامی دنیا میں اپنا حلقۂ اثر وسیع کرنا چاہتا تھا۔اس نے مدرسوں سے روائتی تعلیم پائی تھی جس میں فقہہ، فلسفہ اور تصوف (عرفان) شامل تھے۔ پھر بھی برطانوی ہند کے ایک دورے میں اسے یقین ہو گیا کہ آنے والا دور جدید سائنس اور ریاضی کا ہے۔مگر تحتادی کے طرح افغانی انگریزوں کی محبت میں مبتلا نہیں ہوا۔اس کا دورہ ایسے دنوں میں ہوا جب انگریزی حکومت کے خلاف 1857 کی بغاوت ہو چکی تھی۔افغانی نے ترکی، روس، عرب اور یورپ کا سفر کیا اور یہ محسوس کر کے بہت بے چین ہوا کہ مغرب ہر جگہ اپنی مداخلت اور طاقت کے ذریعہ اسلامی دنیا کو کچلنے والا ہے۔1871 میں وہ یہ مقصد لے کر قاہرہ پہنچا کہ مسلمانوں کو اسلام کے جھنڈے تلے جمع ہونے کا کہے گا تا کہ وہ مذہب کی مدد سے مغربی سامراج کا سامنا کریں۔

افغانی پر جوش، فصیح، شعلہ بیان مگر زود رنج تھا کبھی کبھار اس کا اچھا اثر نہیں پڑتا تھا مگر اس کی شخصیت کے کرشماتی ہونے میں کوئی شک نہیں۔ قاہرہ میں بڑی تیزی کے ساتھ اس نے اپنے پیرووں کا ایک حلقہ بنالیا اور انہیں تلقین کی کہ اس کے پاس اسلامی آئیڈیا کی تبلیغ کریں۔ یہ مسئلہ اس وقت بڑی شدت کے ساتھ زیر بحث تھا کہ جدید مصر کی سمت کیا ہو۔شامی صحافیوں نے سیکولر ریاست کے تصور کو فروغ دیا تھا۔تحتادی کا کہنا تھا کہ مصری مغربی طرز کا نیشنلزم اپنالیں۔افغانی کو دونوں سے کوئی واسطہ نہیں تھا۔اس کے خیال میں اگر مذہب کمزور ہوا تو مسلم معاشرہ بکھر کر رہے گا۔ایک ہی صورت ہے کہ مسلمان اپنی اصلاح کریں اور اپنی ثقافتی اور مذہبی روایات سے وابستہ رہیں اس طرح مسلم ممالک پھر طاقت حاصل کر سکیں گے اور خود اپنی سائنسی جدیدیت کے تصور کی تخلیق کر سکیں گے۔ اگر مسلمانوں نے ضروری قدم نہ اٹھایا تو امہ کا وجود جلد ہی ختم ہو جائے گا۔ وقت تھوڑا ہے، یورپی سامراجی روز بروز طاقتور ہو رہے ہیں جس سے بہت تھوڑے عرصہ میں اسلامی دنیا پر مغربی کلچر چھا جائے گا۔

افغانی کے مذہبی وژن پرمٹ جانے کا خوف غالب تھا جیسا کہ جدیدیت کی مشکلات کے بارے میں عام ردعمل رہا ہے، وہ سمجھتا تھا کہ ماڈرن بننے کے لئے یورپی طرز زندگی اپنانا ضروری نہیں۔ مسلمان اپنے طریقے سے بھی ماڈرن بن سکتے تھے ہین اگر انہوں نے فرانسیسیوں اور انگریزوں کی محض نقل کی اور اس نقل کے اوپر بھی مغربی اقدار کی تہ جمالی، اپنی روایات ترک کر دیں تو مسلمان اپنے آپ کو گنوا بیٹھیں گے۔ وہ نقالی کی بہت بری مثال ہوں گے۔ ان کی کمزوریوں میں سے کمزوریاں پیدا ہوتی رہیں گی۔ انہیں جدید سائنس کی ضرورت ہے جسے وہ یورپ سے ہی سیکھ سکتے ہیں۔ یہ بات بذات خود ہماری کمتری اور ہمارے زوال کا ثبوت ہے کہ ہم یورپ کی نقل کر کے مہذب بنتے ہیں۔ افغانی نے ایک اہم مسئلہ کی طرف اشارہ کیا تھا جہاں مغربی جدیدیت نے ایجاد اور اپنی تخلیقی قوت کے زور پر کامیابی حاصل کی تھی مسلمان اپنا معاشرہ نقالی کے ذریعے ہی ماڈرن بنا سکتے تھے یہ جدیدیت کے پروگرام میں ایک طبعی خرابی تھی جس سے مفر ممکن نہیں تھا۔

افغانی نے اصل مسئلہ تو سمجھ لیا تھا۔ اس کا حل بھی دلکش لگتا تھا مگر وہ قابلِ عمل نہیں تھا کیونکہ افغانی نے مذہب سے بہت زیادہ توقعات وابستہ کر لی تھیں۔ اس کا کہنا صحیح تھا کہ کلچری شناخت کھو دینے کا نتیجہ کمزوری، بیقراری اور خواری ہوگا۔ اس نے یہ بھی کہا تھا کہ نئے حالات کا سامنا تخلیقی طور پر کرنے کے لئے اسلام کو بدلنا ہوگا مگر مذہبی اصلاح بذات خود کسی ملک کو جدید نہیں بنا سکتی نہ ہی اس سے مغربی خطرہ ٹل سکتا ہے۔ سوائے اس کے کہ مصر صنعتی ملک بن سکتا اس کی معیشت نئی اور متحرک ہوتی اور زرعی تہذیب کی رکاوٹیں دور ہو سکتیں۔ کسی آئیڈیالوجی کی مدد سے ملک، یورپ کی سطح پر نہیں آ سکتا تھا۔ مغرب میں خودمختاری، جمہوریت، فکری آزادی اور رواداری کے تصورات اتنے ہی اس کی معیشت کی پیداوار تھے جتنے کہ فلسفیوں اور سیاسی مفکرین کے تھے۔ حالات جلد ہی بتا دیں گے کہ مصری اپنے آپ کو کتنا ہی آزاد اور ماڈرن محسوس کریں ان کی معاشی کمزوری انہیں سیاسی طور پر مغرب کا نشانہ اور محتاج بنا دے گی اور یہ ذلت آمیز غلامی ان میں جدیدیت کی صحیح روح کا پیدا ہونا مزید مشکل بنا دے گی۔

مگر جدیدیت کے لئے اپنی زبردست خواہش کے باوجود، ایرانی دانشوروں (جن سے ان کا مسلسل رابطہ تھا) کی طرح افغانی اب بھی کئی لحاظ سے پرانی دنیا کا آدمی تھا۔ ذاتی طور پر وہ سچا مسلمان تھا جو نماز روزے کا پابند اور اسلامی احکام کے مطابق زندگی بسر کرتا تھا۔ ملا صدرا کے

ارتقائی تغیر کے تصور سے اسے گہری دلچسپی تھی اور تصوف کے معاملے میں بھی وہ اسی سے متاثر تھا۔ وہ اپنے شاگردوں کو بھی فلسفہ کا باطنی علم سکھاتا اور ازمنہ وسطیٰ کے فلسفیوں کی طرح ان سے بحث کرتا۔ اپنے ہم عصر مذہبی مفکرین کی طرح وہ یہ ثابت کرنے کی کوشش کیا کرتا تھا کہ اس کا مذہبی تصور ریشنل اور سائنسی ہے۔ اس کا کہنا تھا کہ قرآن نے مسلمانوں کو سکھایا ہے کہ وہ ثبوت کے بغیر کسی دعویٰ کو تسلیم نہ کریں اور یہ بات نئی دنیا کے مزاج کے عین مطابق تھی بلکہ افغانی تو یہاں تک کہتا تھا کہ اسلام اور جدید سائنسی ریشنلزم ایک ہی چیز ہیں اور یہ کہ پیغمبر اسلام پر نازل ہونے والا قانون، قانون فطرت ہے اور اسلام کے تمام اصول نیچر اور منطق کے ذریعے ثابت ہو سکتے ہیں اور ان کی وضاحت بھی ممکن ہے حالانکہ یہ بات بالکل غلط تھی۔ ہر روائتی مذہب کی طرح اسلام لوگوس کی رینج سے باہر ہے اور اس کا انحصار تصوف اور پیغمبرانہ بصیرت پر ہے۔ افغانی نے بھی اسے اسی طرح سمجھا تھا ایک دوسرے موڈ میں اس نے سائنس کے عجز کا ذکر بڑی فصاحت کے ساتھ کیا کہ (سائنس) کتنی ہی دلآویز ہو مگر بنی نوع انسان کو پوری طرح مطمئن نہیں کر سکتی جو ہمیشہ آئیڈیل کی تلاش میں رہتا ہے اور جوان تاریک اور دور دراز علاقوں میں موجود رہنا چاہتی ہے جنہیں فلسفی دیکھ سکتے ہیں نہ سمجھ سکتے ہیں۔ ایرانی دانش وروں کی طرح افغانی اب بھی نئے اور پرانے کے درمیان بٹا ہوا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ اس کا مذہب بالکل ریشنل ہو مگر زمانہ قدیم کے صوفی کی طرح وہ دل ہی دل میں اچھی طرح جانتا تھا کہ اس کے مذہب کی مائیتھوس نے بنی نوع انسان کو دو بصیرت دی ہے جو سائنس کے بس کی بات نہیں۔

یہ تضاد ناگزیر تھا کیونکہ افغانی عبوری شخص تھا مگر اس میں کچھ دخل اس کے اضطراب کا بھی تھا۔ وقت تیزی کے ساتھ گزر رہا تھا اور افغانی انتظار نہیں کر سکتا تھا کہ اس کے خیالات مین یکسانیت پیدا ہو۔ وہ کہتا تھا مسلمان اپنے آپ کو مزید ریشنل بنائیں، یہ ان کی اولین ترجیح ہونی چاہیے۔ انہوں نے نیچرل سائنسز نظر انداز کیں اور یورپ سے پیچھے رہ گئے۔ انہیں کہا گیا کہ اجتہاد کے دروازے بند کریں اور ماضی کے علماء نے جو فیصلے دیئے ہیں انہیں قبول کریں۔ افغانی کا اصرار تھا کہ ایسی باتوں کا کوئی تعلق اسلام سے نہیں۔ اس سے ایک ایسی حاشیہ برداری کی حوصلہ افزائی ہوتی ہے جو نہ صرف ماڈرن سپرٹ کے خلاف ہے بلکہ اس سے مسلمانوں کے ایمان کی بنیادی اور امتیازی خصوصیات کی تردید بھی ہوتی ہے جو برتر اور غالب تھیں جیسا کہ سائنس اب

مغرب کی ''جاگیر'' ہے اور مسلمان کمزور ہیں۔ افغانی دیکھ سکتا تھا کہ پرانے قدامت پرستانہ خیالات ہی مسلمانوں کی پسماندگی کی بنیاد ہیں۔ جن کی علامت اجتہاد کے دروازے بند کرنا ہے مگر ایک ایسے ریفارمر کی طرح جو مذہب کی مائتھوس کولوگوس بنا کر پیش کرتا ہے اس سے خطرہ تھا کہ وہ مذہب کی تشنہ تعبیر اور سائنس کا غلط تصور پیش نہ کرے۔

یہی بات اس کی عملی سرگرمیوں کے متعلق کہی جا سکتی ہے۔ اس کا کہنا ٹھیک تھا کہ اسلام کا اظہار اس پر عمل کرنے سے ہوتا ہے۔ اسے قرآن کے اس فرمان پر پورا یقین تھا کہ خدا انسانوں کی حالت نہیں بدلتا جب تک کہ وہ اپنا باطن، اپنی نیت نہ بدلیں۔ مدرسوں میں دبکنے کی بجائے مسلمانوں کو عالمی سیاست میں حصہ لینا چاہیے۔ اگر وہ اسلام کو بچانا چاہتے ہیں۔ نئی دنیا میں سچ عمل انگیز ہے اسے مادی اور تجربہ مشاہدہ کی دنیا میں متحرک نظر آنا چاہیے۔ افغانی یہ ثابت کرنا چاہتا تھا کہ اسلام کی صداقت بھی اتنی ہی نتیجہ خیز ہو سکتی ہے جتنا کہ آج کی اس دنیا میں مغربی نظریات ہیں۔ اسے اندازہ تھا کہ یورپ جلد ہی ساری دنیا پر حکومت کرے گا۔ وہ مسلمان حکمرانوں کو اس خطرہ سے آگاہ کرنا چاہتا تھا۔ مگر افغانی کے اکثر انقلابی منصوبے خودکش اور اخلاقی لحاظ سے مشکوک تھے۔ ان میں سے کامیاب تو کوئی نہ ہوا مگر ان کی وجہ سے افغانی کی سرگرمیوں پر پابندیاں لگ گئیں۔ وہ حکومت دشمن سرگرمیوں کے جرم میں مصر سے 1879 اور ایران سے 1891 میں نکال دیا گیا۔ اگرچہ اس کے بعد اسے استنبول میں رہنے کی اجازت دے دی گئی مگر عثمانی حکمرانوں نے اسے سخت نگرانی میں رکھا۔ مذہب کو سیاسی لائحہ عمل کے طور پر استعمال کرنے میں بڑے خطرات ہیں۔ چنانچہ افغانی پر کھلا الزام تھا کہ وہ اپنی مہمل انقلابی سرگرمیوں کے لئے مذہب کی آڑ لیتا ہے۔ اس نے مذہب کو اپنی سیاست کے ساتھ پوری طرح ہم آہنگ نہیں کیا تھا۔ جب 1896 میں اس کے ایک پیرو نے اس کے کہنے پر ناصرالدین شاہ کو قتل کیا تو اس طرح افغانی نے ہر مذہب کے مرکزی اصولوں کی خلاف ورزی کی کیونکہ انسانی زندگی کا مکمل احترام ہر مذہب کا تقاضا ہے۔ اس نے اسلام کو نہ صرف بے اثر اور بے مصرف بلکہ غیر اخلاقی بنا کر دکھایا۔ اس کے فکری نقائص اس کی مایوسی، تشدد اور جارحیت پسندی سے پیدا ہوئے تھے۔

افغانی کو یقین ہو چلا تھا کہ اسلامی دنیا مغربی سامراج کے ہاتھوں مٹ جانے کو ہے۔ 1880 میں پیرس کے قیام کے دوران فرانسیسی لسانی ماہر، ارنسٹ ریناں کی ایک تصنیف میں اسے

نئی سائنسی نسل پرستی سے سابقہ پڑا۔ دونوں نے نئی دنیا میں اسلام کے مقام پر بحث کی۔ ریناں کا کہنا تھا کہ یہودیوں کی زبان عبرانی اور عربی دونوں بگڑی ہوئی اور مردہ زبانیں ہیں۔ ان میں وہ ترقی پسندانہ اور آگے بڑھنے والی خوبیاں نہیں ہیں جو آریائی لسانی نظام کا قدرتی حصہ ہیں۔ نہ وہ از سرِ نو زندہ ہوسکتی ہیں۔ اسی طرح یہودی نسلوں نے آرٹ، تجارت یا تہذیب کے میدان میں کوئی کارنامہ نہیں کیا اور اسلام تو خصوصی طور پر جدیدیت سے مختلف ہے جیسا کہ مسلمان ملکوں کی کمتری ان کی حکومتوں کی زوال پذیری اور خود مسلمانوں کا ذہنی دیوالیہ پن ہمارے سامنے ہے۔ افریقہ کے لوگوں کی طرح اسلامی دنیا کے لوگ بھی سائنسی ریشنلزم کو سمجھنے سے ذہنی طور پر معذور ہیں اور کوئی ایک بامعنی آئیڈیا بھی تخلیق کرنے کی اہلیت نہیں رکھتے۔ سائنس پھیلتی گئی اور ریناں نے بڑے یقین کے ساتھ پیش گوئی کی کہ اسلام جلد ہی بکھر جائے گا اور مستقبل قریب میں اس کا وجود ختم ہو جائے گا۔ یہ حیرانی کی بات نہیں کہ افغانی کو اسلام کے مٹ کا جانے خوف تھا اور یہ کہ افغانی مسلمانوں کے سائنسی ریشنلزم پر زیادہ زور دیتا تھا۔ ایک بالکل حقیقی چیلنج کے جواب میں مسلمانوں کی فکر میں ایک نئی مدافعت اور عذر خواہی دَر آئی تھی۔ ریناں جیسے جدید مفکرین کی تصانیف میں اسلام کے متعلق ان کے گھسے پٹے اور غلط نظریات نے اسلامی ممالک میں سامراجی اور نوآبادیاتی جارحیت کا جواز مہیا کر دیا۔

نوآبادیاتی نظام، یورپ کی سرمایہ دارانہ معیشت کی توسیع اور اس کے تقاضوں سے ابھرا تھا۔ ہیگل نے کہا تھا کہ ''صنعتی معاشرہ پھیلنے پر مجبور ہے اس لئے کہ اسے اپنی زندگی کے لئے اپنے سے باہر قوموں میں صارف تلاش کرنے ہیں۔ نئی منڈیوں کی یہ تلاش، نوآبادیت کے لئے زمین بھی مہیا کرے گی جس کی طرف شہری درمیانے طبقے کو بڑھنا ہے۔'' صدی کے خاتمے تک مشرق وسطیٰ میں نوآبادیاتی نظام رائج کرنے کا عمل تکمیل پا رہا تھا۔ 1830 میں فرانس نے الجزائر پر قبضہ کر لیا اور نو سال بعد برطانیہ نے عدن ہتھیا لیا۔ 1881 میں تونس پر قبضہ کر لیا گیا جبکہ 1889 میں سوڈان اور 1912 میں لیبیا اور مراکش غلام بنا لئے گئے۔ 1915 میں The sykes picot Agreement کی رو سے برطانیہ اور فرانس نے پہلی عالمی جنگ میں فتح کی پیش بینی کرتے ہوئے سلطنت عثمانیہ کے کئی علاقے آپس میں تقسیم کر لئے۔ یہ نوآبادیاتی جارحیت کا بدترین نمونہ تھا جس کا مقصد دراصل ان ملکوں کا طرز زندگی تباہ کرنا تھا۔

نوآبادیوں میں برآمد کرنے کے لئے خام مال پیدا ہوتا تھا جو یورپی صنعتوں میں کام آنے لگا اس کے عوض مغرب کی فیکٹریوں میں تیار شدہ سامان سستے داموں نوآبادیوں کو مہیا کیا جانے لگا۔ سستے داموں اس لئے کہ ان کی صنعتوں کو نقصان پہنچے اور وہ مغرب کی فیکٹریوں کا مقابلہ نہ کرسکیں۔ اس خیال سے کہ نئی کالونی جدید تکنیکی نظام میں صحیح جگہ پر ہو، فوج اور پولیس بھی مغربی انداز میں نئے سرے سے منظّم کرنا پڑی۔ معیشت کی اقتصادی، تجارتی اور پیداواری صورت بھی بدلنا پڑی اور نیٹیوز (مقامی لوگوں کے لئے توہین آمیز لفظ) کے لئے ضروری ہوا کہ وہ جدید تصورات سے کچھ واقفیت حاصل کریں۔ مقامی باشندوں کے لئے جدیدیت کا یہ عمل جابرانہ انتشار انگیز تھا۔ افغانی کی خواہش تھی کہ مسلمان اپنے آپ کو جدید بنائیں اور یورپ کی گھٹیا اور بھدی نقالی سے باز رہیں۔ نوآبادیات نے اسے ناممکن بنادیا۔ مشرق وسطیٰ کے وہ ممالک جو مغرب کے محکوم تھے اپنی مرضی سے ترقی بھی نہیں کرسکتے تھے۔ نوآبادیاتی طاقتوں کے ہاتھ ایک زندہ تہذیب معذور محتاج ہوگئی تھی۔ خودمختاری وآزادی کے فقدان سے غلامی کا رویہ اور عادت پیدا ہوئی جو سراسر جدیدیت کی روح کے خلاف تھی۔ یورپ کی وہ مقبولیت اور گرویدگی جسے ایرانی دانش وروں اور تحتاوی نے فروغ دیا تھا خواب وخیال ہوگئی اور اس کی جگہ یورپ کے خلاف نفرت نے لے لی۔

قاہرہ میں افغانی کے قیام کے دنوں میں بھی مصر پر نوآبادیاتی جال ڈالا جارہا تھا۔ اگرچہ مصر مکمل طور پر نوآبادی کبھی نہیں بنا۔ خدایوا سماعیل کی گراں قیمتی اصلاحات اور جدیدیت کے منصوبوں سے ملک دیوالیہ ہو چکا تھا۔ اس کا انحصار اب مکمل طور پر یورپ کے قرضوں پر تھا۔ 1875 میں خدیو کو مجبور کیا گیا کہ وہ نہر سویز انگریزوں کے ہاتھ بیچ دے۔ 1876 میں جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں نہر سویز کے مغربی حصہ داروں نے معیشت اپنے قبضے میں لے لی تھی۔ جب خدیو نے آزاد ہونے کی کوشش کی تو انگریزوں نے عثمانی سلطان کی صلاح سے اسے برطرف کردیا اور اسماعیل کا بیٹا توفیق خدیو بن گیا۔ 1887 میں مصری فوج کے بعض افسروں نے احمد بے عروبی کی قیادت میں بغاوت کردی۔ افغانی کے بعض پیرو اور کچھ دوسرے بھی ان کے ساتھ شامل ہوگئے جو مصر میں جدید آئینی حکمرانی چاہتے تھے۔ عروبی نئے خدیو پر اپنی نئی حکومت مسلط کرنے میں کامیاب ہوگیا۔ اس کی کامیابی کے فوراً بعد ہی قوم پرستوں کی بغاوت ہوئی۔ برطانوی حکومت

نے حصہ داروں کے مفاد کی حفاظت کے بہانے مداخلت کا فیصلہ کیا۔ 11 جولائی 1882 کو برطانیہ کی بحری فوج نے سکندریہ پر حملہ کیا اور عروبی کی فوجوں کو تل الکبیر کے مقام پر 13 ستمبر کو شکست دی۔ اس طرح انگریزوں نے مصر پر فوجی قبضہ کر لیا اگرچہ خدیو توفیق کو سرکاری طور پر بحال کر دیا گیا مگر صاف ظاہر تھا کہ مصر کا اصلی حاکم انگریز کونسل لارڈ کرومر تھا۔

کرومر عجیب شخص تھا اس کے خیال میں مصری قدرتی طور پر پسماندہ تھے، ان کی بھلائی کے لئے ضروری تھا کہ انہیں نو آبادی بنایا جائے۔ ریناں کی طرح کہ جب اس نے مسلمان ملکوں کے ساتھ اپنی زیادہ ترقی یافتہ قوم کا موازنہ کیا تو اس نے فرض کر لیا تھا کہ یورپ ہمیشہ ترقی کرنے والوں کی پہلی صف میں رہا ہے۔ اسے یہ خیال نہ آیا کہ فرانس اور انگلستان جیسے یورپی ملک مشرق وسطیٰ کی طرح کبھی خود بھی پسماندہ رہے ہیں اور یہ کہ وہ ایک ایسے ملک کی بات کر رہا ہے جسے ابھی ترقی کے کئی مراحل طے کرنے ہیں۔ وہ 'ایشیائیوں' کو طبعی اور پیدائشی طور پر ناقص سمجھتا تھا۔ مصر میں کرومر کی کارکردگی نمایاں رہی۔ اس نے مصر کی معیشت مستحکم کی۔ اس نے آب پاشی کا نظام بہتر بنایا اور کپاس کی پیداوار میں اضافہ کیا۔ اس نے جبری مشقت کا پرانا سلسلہ ختم کیا اور عدالتوں کی کارکردگی بھی بہتر بنائی مگر اس سارے عمل کی ایک قیمت تھی۔ خدیو اپنی حکومت کا برائے نام سربراہ تھا۔ اس لئے ہر وزارت میں ایک انگریز مشیر موجود رہتا تھا جس کا حکم حرف آخر سمجھا جاتا تھا۔ کرومر اسے ضروری خیال کرتا تھا۔ اس نے فرض کر لیا تھا کہ یورپین ہمیشہ ریشنل باصلاحیت اور ماڈرن ہوتے ہیں جبکہ ایشیائی فطری طور پر ناسمجھ، ناقابل اعتماد اور بدعنوان ہیں۔ اسی طرح اسلام بھی ایک سماجی نظام کی حیثیت سے ناکام ہو گیا ہے اور اس میں ترقی واصلاح کی صلاحیت نہیں۔

''ایسا جسم سنبھالنا ناممکن ہے جو درحقیقت ابھی مرا نہیں اور شاید اسے مرنے میں برسوں لگ جائیں مگر سیاسی اور سماجی لحاظ سے نزع کے عالم میں ہے جس کی خراب ہوتی ہوئی حالت کو مزید خراب ہونے سے روکنے کے لئے کوئی جدید دوا یا تدبیر کارگر نہیں ہو سکتی۔ اس نے واضح کر دیا کہ اس ہمیشہ سے بگڑے ہوئے ملک کی حالت بہتر بنانے کے لئے ابھی کچھ عرصہ کے لئے انگریزوں کی نگرانی ضروری ہے۔

انگریزوں کے قبضہ سے مصری سماج میں نئے اختلافات پیدا ہو گئے۔ مغربی تعلیم پانے والوں نے علماء کو پیچھے دھکیل دیا حالانکہ وہ اپنے آپ کو تعلیم کا ذریعہ اور علم کا نگہبان سمجھتے تھے۔ شرعی

عدالتوں کی جگہ لارڈ کرومر کی بنائی ہوئی یورپی سول عدالتوں نے لے لی۔ کاریگروں اور چھوٹے تاجروں پر بھی بہت برا اثر پڑا تھا۔ مغرب سے متاثر دانشوروں اور سرکاری افسروں کا ایک نیا طبقہ پیدا ہو گیا تھا جن سے لوگوں کی اکثریت دور رہتی تھی مگر سب سے نقصان دہ بات شاید مصریوں کی وہ ذہنیت تھی جس کے باعث وہ مصر کے خلاف انگریزوں کی مخالفانہ رائے اپنا لیتے تھے۔ چنانچہ افغانی کا ایک شاگرد محمد عبدہ (1849-1905) مصر پر انگریزوں کے قبضہ سے بہت پریشان ہوا۔ اس نے جدید دور کو سائنس کا سیلاب کہا جس میں مذہب کے روائتی پیرو ڈوب گئے تھے۔ ''یہ ایک دور ہے جس نے ہر میں اور مہذب قوموں میں ایک بڑا فرق واضح کر دیا ہے۔ ہمیں ان کی عظیم الشان حالت سے اور ہمیں ہماری غربت سے آگاہ کیا ہے۔ ان کی امارت اور ہماری مفلسی ان کے فخر اور ہماری عاجزی، ان کی طاقت اور ہماری کمزوری نے ان کی کامیابیوں اور ہماری خامیوں کو نمایاں کیا ہے۔''

یہ احساس کمتری مقبوضہ ملک کی مذہبی زندگی میں دَر آیا اور عبدہ جیسے ریفارمر کو مجبور کیا کہ وہ سامراجیوں کے اعتراضات کا جواب دیں کہ اسلام کسی بھی مغربی سسٹم کی طرح ریشنل اور ماڈرن ہے یہ حادثہ پہلی دفعہ ہوا کہ مسلمانوں کے فاتحین ان کی فکری سمت متعین کریں۔ عبدہ عروبی کی بغاوت میں شامل تھا اور انگریزوں کے فتح کے بعد جلاوطن کر دیا گیا تھا۔ پیرس میں وہ افغانی کے ساتھ جاملا۔ ان دونوں میں بہت سی باتیں مشترک تھیں۔ ابتدائی طور پر عبدہ نے افگانی، ٹالسٹائی، ریناں، سٹراس ان ہربرٹ سپینسر کو پڑھا۔ عبدہ نے یورپ میں کوئی اجنبیت محسوس نہیں کی اور وہاں کے لوگوں کی صحبت سے لطف اندوز ہوتا رہا۔ افغانی کی طرح عبدہ کو بھی یقین تھا کہ اسلام جدیدیت سے مطابقت رکھتا ہے اور واضح طور پر ایک ریشنل مذہب ہے مگر تقلید کی عادت افسوسناک اور گمراہ کن ہے۔ افغانی کی طرح وہ بھی صوفیانہ انداز نظر سے ریشنل فکر کا قائل تھا۔ یہ صوفیانہ تناظر ابھی پرانے زمانے کی روحانیت سے اوپر نہیں اٹھا تھا۔ آخر کار عبدہ سیاست کے معاملے میں افغانی سے الجھ پڑا۔ اس کا خیال تھا کہ انقلاب سے زیادہ ارتقاء مصر کے لئے ضروری ہے۔ وہ اپنے مرشد سے کہیں زیادہ گہرا مفکر تھا اور جانتا تھا کہ آزادی اور جدیدیت کے لئے کوئی شارٹ کٹ نہیں ہے۔ افغانی کے خطرناک اور بے معنی منصوبوں میں الجھنے کی بجائے وہ چاہتا تھا کہ مصر کے بعض اہم مسائل تعلیم کے ذریعے حل کرے۔ 1888 میں اسے مصر واپس آنے کی

اجازت مل گئی۔ وہ ملک کا محبوب ترین شخص بن گیا جو خدیو اور لارڈ کرومر دنوں کا ذاتی دوست تھا۔

اس وقت تک ملک میں بہت مایوسی پھیل چکی تھی۔ اکثر تعلیم یافتہ مصری یہ ماننے پر مجبور ہو گئے کہ اگرچہ انگریزوں کی مصر میں آمد اچھی نظروں سے نہیں دیکھی گئی مگر ملک پر لارڈ کرومر کی حکمرانی خدیو اسماعیل کی حکمرانی سے کہیں بہتر تھی مگر 1890 تک انگریزوں کے ساتھ تعلقات خراب ہو چکے تھے۔ انگریز افسر پہلے کی نسبت کم تر درجہ کے تھے اور مصریوں کے ساتھ تعلقات مضبوط بنانے کی زیادہ کوشش بھی نہیں کرتے تھے۔ انہوں نے حکمرانوں کی ایک مراعات یافتہ آبادی ضلع جیزہ میں الگ قائم کر لی۔ مصری سرکاری افسروں میں یہ احساس پیدا ہو گیا کہ نوجوان انگریز ان کی ترقی میں حائل ہیں۔ ان خصوصی مراعات کے خلاف بھی لوگوں میں غم وغصہ پیدا ہوا جو انگریزوں اور دیگر غیر ملکیوں کو حاصل تھیں اور جن کے ذریعے وہ ملکی قانون سے مستثنٰی تھے۔ زیادہ لوگ قومی رہنما مصطفٰی کامل کی آتش بیانی پر توجہ دینے لگے جس کا مطالبہ مصر سے انگریزون کا فوری انخلا تھا۔ عبدہ اسے لوگوں کے جذبات سے کھیلنے اور کھوکھلے دعوے کرنے والا شخص سمجھتا تھا۔ اسے اندازہ تھا کہ اس سے پیشتر کہ مصری ایک آزاد اور جدید ریاست چلائیں انہیں بعض نہایت اہم سماجی مسائل کا سامنا ہوگا جو غلامی کی وجہ سے اور ابھی الجھ گئے ہیں۔

عبدہُ کے خیال میں ایک بڑے مذہبی ملک میں سیکولر تصورات اور ادارے نتائج کرنے میں جلد بازی ہو رہی تھی۔ لوگوں کو انہیں اپنانے کے لئے وقت نہیں دیا جاتا۔ عبدہُ یورپ کے سیاسی اداروں کی قدر کرتا تھا کہ انہیں مصر میں پوری طرح رائج کیا جا سکتا ہے۔ لوگوں کی بڑی اکثریت نیا قانونی نظام نہیں سمجھ سکتی تھی۔ اس کی روح اور اس کے امکانات ان کے لئے محض اجنبی تھے۔ اس کے نتیجہ میں مصر ایک ایسا ملک بن گیا جس کا کوئی قانون نہین تھا۔ اس لئے اس نے جدید تقاضوں کی روشنی میں اسلامی قوانین میں ترمیم کا منصوبہ بنایا۔ اس پروگرام پر 1920 میں اس کی موت کے بعد عمل ہوا اور یہ سسٹم اب بھی مصر میں رائج ہے۔ عبدہ نے دیکھ لیا تھا کہ مصری سماج ٹوٹ رہا ہے اس لئے ضروری تھا کہ جدید قانونی اور آئینی اقدام، روائتی اسلامی رویوں اور اصولوں سے جوڑ دیئے جائیں ورنہ ان مصریوں کی اکثریت نئے اداروں کو سمجھ نہیں سکے گی جنہیں مغربی تصورات سے کوئی واقفیت نہیں۔ مثال کے طور پر شوریٰ کے اسلامی اصول کی واضح مطابقت جمہوریت سے ہے اور اجماع امت (جو اسلامی قانون میں مسلم ڈاکٹرین یا عمل کی تصدیق کرتی

ہے)لوگوں کو آئینی حکومت کے سمجھنے میں مدد دے سکتی ہے جس سے رائے عامہ، حکمران کی طاقت محدود کردیتی ہے۔

تعلیمی اصلاحات کی بھی فوری ضرورت تھی۔ اب تک تین مختلف تعلیمی نظام رائج تھے جس کے مقاصد علیحدہ علیحدہ تھے۔ اس سے معاشرے میں دراڑیں پڑ رہی تھیں۔ مذہبی سکولوں اور مدرسوں میں کہ جن پر اب بھی قدیم خیالات حاوی تھے۔ طالب علموں کو آزادی کے ساتھ سوچنے سے روکا جاتا تھا۔ عیسائی مشنری سکول جو کہ نوآبادیاتی نظام کے حامی تھے ان میں نوجوان مسلمانوں کو ان کے ملک اور مذہب سے الگ کردیا جاتا تھا۔ سرکاری سکول سب سے برے تھے وہ یورپی سکولوں کی بھدی نقلیں تھیں جہاں مذہبی تعلیم صفر تھی۔ جنہوں نے علماء سے تعلیم پائی تھی وہ ہر تبدیلی کے مخالف تھے جبکہ مغرب کے تعلیم یافتہ نوجوان ہر تبدیلی کے لئے تیار تھے مگر انہیں مغربی کلچر سے سطحی واقفیت تھی اور خود اپنے کلچر سے وہ دور ہو چکے تھے۔

1899 میں عبدہٗ مصر کا مفتی مقرر ہوا یعنی ملک میں اسلامی قانون کا سب سے بڑا مشیر۔ اس نے ارادہ کرلیا کہ وہ روایتی مذہبی تعلیم کی اصلاح کرے گا۔ وہ چاہتا تھا کہ مدرسوں کے طالب علموں کو سائنس بھی پڑھنی چاہیے تاکہ وہ جدید معاشرے میں بھرپور حصہ لے سکیں۔ اس وقت جامعہ الازہر عبدہ کے خیال میں اسلام کے اندر اس دور کے ہر غلط رجحان کی مثال تھا۔ اس نے نئی دنیا کی طرف سے منہ موڑ لیا تھا اور معذرت خواہانہ حیثیت اختیار کرلی تھی مگر علماء نے ان اصلاحات کی مخالفت کی جو عبدہ نافذ کرنا چاہتا تھا۔ محمد علی کے زمانے سے انہیں گلہ تھا کہ جدیدیت کا عمل تباہ کن حملہ ہے جس نے سیاست، قانون، تعلیم اور معیشت میں خدا کا دخل کم کردیا ہے۔ انہوں نے ہر ایسی کوشش کی مزاحمت کی جس کے ذریعے انہیں دنیا کے قریب آنے پر مجبور کیا جاتا اور ایرانی علماء کے برعکس مدرسوں سے باہر کی دنیا سے کٹ کر رہ گئے۔ ان کے معاملے میں عبدہٗ کو بہت کم کامیابی ہوئی۔ اس نے الازہر کی انتظامیہ جدید بنائی اور مدرسوں کی تنخواہوں اور کام کرنے کی سہولتوں میں اضافہ کیا مگر علماء اور طلباء دونوں نے نصاب میں جدید سیکولر مضامین شامل کرنے کی شدید مخالفت کی۔

ان مخالفتوں کا سامنا کرتے کرتے عبدہ ہمت ہار بیٹھا۔ 1905 میں اس نے مفتی کے عہدے سے استعفیٰ دیا جس کے تھوڑے عرصہ بعد وہ اس دنیا سے رخصت ہوگیا۔ افغانی اور عبدہٗ

دونوں کی جدوجہد سے پتہ چلتا ہے کہ ایسے مذہب کو جو دورِ قدیم میں ہی مکمل ہو چکا ہوئی دنیا کے بالکل مختلف تصورات میں بدلنا کتنا مشکل ہوتا ہے۔ وہ دونوں سیکولرازم کو تیزی کے ساتھ عام کرنے کے خطرات سے آگاہ تھے۔ اگرچہ تبدیلی کے اس عمل میں اسلام تسلسل بن سکتا تھا۔ مصری ایک دوسرے کے لئے اجنبی بن رہے تھے۔ اور وہ کہ جنہوں نے مغربی طور طریقے اختیار کر لئے تھے ان میں سے اکثر اپنے کلچر سے کٹ گئے تھے۔ مشرق ہو کہ مغرب انہیں کہیں قرار نہیں تھا۔ ان دیو مالائی اور مسلکی ریاضتوں کے بغیر کہ جو کبھی زندگی کو معنی دیتی تھیں وہ اسے خلاء میں اتر رہے تھے جو ماڈرن تجربہ کا حاصل تھا۔ پرانے ادارے برباد کئے جا رہے تھے جبکہ نئے ادارے اجنبی اور ایک حد تک ناقابلِ فہم تھے۔ افغانی اور عبدہٗ ذاتی طور پر اب بھی پرانی روحانیت سے سرشار تھے۔ جب وہ مذہب کے ریشنل ہونے پر اصرار کرتے تھے تو وہ یورپ کے سائنس دانوں اور ریشنلزم کے حامیوں کی نسبت (جو مذہبی وسیلے سے حاصل ہونے والی ہر سچائی جھٹلا دیتے تھے) ملا صدرا سے زیادہ قریب ہوتے تھے۔ جب وہ کہتے تھے کہ ریزن (عقل) ہی سچائی کا واحد معیار ہے ہر ڈاکٹرین کا ریشنل سطح پر ثابت ہونا ضروری ہے تو وہ باعمل صوفیاء جیسی بات کرتے تھے۔ قدیم اصولوں کے تحت تشکیل پانے والی عقل اور وجدان کو وہ تکمیل کا ذریعہ سمجھتے تھے۔ لیکن بعد میں آنے والی نسلوں کو مغربی ریشنلزم سے زیادہ قربت حاصل تھی اس لئے ان کی نظر میں تنہا عقل ہی تقدس کا شعور پیدا کرنے کے لئے کافی نہیں تھی۔ ماورائی مطالب کا یہ نقصان مغرب کی طرح، خودمختاری اور آزادی کے فوائد سے پورا نہ ہوا حالانکہ یہ ایجنڈا مغرب ہی نے بنایا تھا۔ یہاں تک کہ مذہبی معاملات میں بھی اس کا یہی ایجنڈا تھا۔

اس کی ایک بڑی افسوسناک مثال 1899 میں سامنے آئی جب قاسم امین 1865-1980 نے تحریر المرا (خواتین کی آزادی) شائع کی جس کے ذریعے بتایا گیا کہ مصر کی پسماندگی کی ذمہ دار وہاں کی عورتوں کی بدحالی، بالخصوص پردے کی رسم ہے۔ یہی رسم ان کی ترقی میں سب سے بڑی رکاوٹ اور یہی پسماندگی ملک کی ترقی میں حائل ہے۔ اس سے بڑا ہنگامہ پیدا ہوا۔ اس لئے نہیں کہ اس کتاب میں کوئی نئی بات کہی گئی تھی بلکہ اس لئے کہ ایک مصری مصنف نے نوآبادیاتی نقطۂ نظر اپنا لیا تھا۔ برسوں سے مصر کے مرد اور عورتیں دونوں مل کر عورتوں کی حالت میں بنیادی تبدیلیوں کا مطالبہ کر رہے تھے۔ عبدہ بھی قائل تھا کہ قرآن کی رو سے عورتیں اور مرد خدا

کے سامنے برابر ہیں۔ طلاق اور تعداد ازدواج سے متعلق روائتی فیصلوں کی کوئی بنیادی اہمیت نہیں۔ وہ بدلے جاسکتے ہیں اور انہیں بدلنا چاہیے۔ بہرحال عورتوں کی حالت کچھ بہتر ہوئی۔ محمد علی نے ایک سکول قائم کیا جہاں عورتوں کی ابتدائی طبی امداد کی تربیت دی جاتی تھی۔1875 تک تقریباً تین ہزار مصری لڑکیوں نے مشن اسکولوں میں تعلیم پائی۔1873 میں گورنمنٹ نے لڑکوں کے لئے پہلا سرکاری پرائمری سکول کھولا اور دوسرے ہی سال سیکنڈری سکول قائم کیا۔ لوگوں نے محسوس کیا کہ پبلک میں نظر آنے والی عورتوں کی تعداد بتدریج بڑھ رہی ہے۔ بعض نے پردہ ترک کردیا تھا۔ صدی ختم ہونے تک عورتیں رسالوں میں مضامین لکھ رہی تھیں ڈاکٹر اور ٹیچر بن رہی تھیں جب انگریز آئے تو تبدیلی کا عمل شروع ہو چکا تھا اگرچہ سفر کٹھن تھا مگر پہلا قدم اُٹھ چکا تھا۔

اسلام میں پردہ کی حیثیت بنیادی ہے نہ اوریجنل ہے۔ قرآن عورتوں کو اپنے سر ڈھانپنے کا حکم نہیں دیتا۔ عورتوں کا پردہ اور انہیں حرم میں الگ تھلگ رکھنے کی رسم پیغمبر اسلامؐ کے دنیا سے چلے جانے کے تین نسلوں بعد چلی ہے۔ جب مسلمانوں نے بازنطین کے عیسائیوں اور ایران کے زرتشتیوں کی نقل شروع کی جو ایک زمانے سے اپنی عورتوں کے ساتھ یہ سلوک کر رہے تھے مگر ان میں بھی سب عورتیں برقع نہیں پہنتی تھیں۔ برقع اعلیٰ حیثیت کی علامت تھا اس لئے صرف اونچے طبقہ کی عورتیں اسے پہن سکتی تھیں۔ کسان اور غریب عورتیں اسے نہیں پہنتی تھیں۔ قاسم امین کی کتاب نے پردے کا مسئلہ جدیدیت کی بحث میں شامل کر دیا۔ قاسم کا اصرار تھا کہ اگر پردہ ترک نہ کیا گیا تو مسلم دنیا پس ماندہ ہی رہے گی۔ کسی حد تک تحریر المرا کی وجہ سے پیدا ہونے والے جوش بلکہ خبط کی وجہ سے کئی مسلمانوں کے لئے تو پردہ مسلمان ہونے کا ثبوت بن گیا۔ جبکہ یورپ کے اکثر لوگوں کی نظر میں اسلام میں پردہ عورت سے نفرت کا ثبوت تھا۔

امین پہلا شخص نہیں تھا کہ جس نے مسلمانوں کی تمام کمزوریوں کی وجہ پردے کی رسم سمجھی ہو۔ جب انگریز آئے تو یہ رسم دیکھ کر حیران رہ گئے۔ اگرچہ ان دونوں بعض مغرب مرد نسوانیت کی تحقیر کرتے تھے اور چاہتے تھے کہ ان کی اپنی بیویاں گھروں میں محفوظ اور محدود رہیں۔ وہ عورتوں کی تعلیم اور ان کے لئے ووٹ کے حق کی مخالفت بھی کرتے تھے۔ لارڈ کرومر خوب آدمی تھا۔ وہ لندن کے اندر قائم ہونے والی عورتوں کی حامی لیگ کے بانیوں میں سے تھا۔ مصر پر اپنی شاندار تصنیف میں اس نے مسلمان عورتوں کی حالت کے متعلق اپنی گہری فکرمندی کا اظہار کیا۔ اس نے

لکھا ان کی بدحالی بچپن ہی سے انہیں دیمک کی طرح چاٹنا شروع کرتی ہے۔ ذرا سیانی ہوتی ہیں تو اپنی ماؤں کی حالت زار دیکھتی ہیں کہ جنہیں چاٹ کر ختم کر دیا جاتا ہے۔'' پردہ ایک تباہ کن رکاوٹ تھی جس کی وجہ سے مصری فکر و کردار کی وہ بلندیاں نہ چھو سکے جو مغربی تہذیب کے ہم رکاب تھیں۔ پردہ کے تباہ کن اثرات کا ماتم مشنری بھی کرتے تھے جن کے خیال میں عورت کو برقعہ پہنانا اسے زندہ درگور کرنا تھا یا اسے قیدی اور غلام بنانا تھا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مصریوں کو نوآبادیاتی دیکھ بھال کی کتنی شدید ضرورت تھی۔ پردے کے متعلق اس مغربی جائزے کو امین نے وقتی طور پر صحیح مان لیا۔ 'تحریر المرا' میں عورتوں کے حق میں کوئی بات تھی ہی نہیں اس میں تو مصری عورت کو غلیظ اور جاہل دکھایا گیا تھا۔ ایسی ماؤں کے ہوتے ہوئے مصر کا حال بدحال اور پسماندہ ہونے کے سوا کیا ہو سکتا تھا؟ مصریوں نے کبھی سوچا ہے کہ

''یورپ کے انسان جنہوں نے یہ کمال حاصل کیا کہ بجلی اور بھاپ کی قوت تسخیر کر لی، وہ جو ہر روز زندگی کی مسرتوں اور آسائشوں کی بجائے علم اور عزت کی خاطر اپنی جان خطرے میں ڈالتے ہیں یہ شاندار ہستیاں کہ جن کے ہم شیدائی ہیں اگر انہیں پردے میں کوئی خوبی نظر آتی تو کیا وہ اسے ترک کر دیتے؟

یہ حیرت کی بات نہیں کہ یہ بے جا خوشامد جوابی حملے کا سبب بنی عرب لکھاریوں نے اپنے سماج کا یہ نقشہ صحیح ماننے سے انکار کر دیا اور اسی گرما گرمی میں پردہ خواہ مخواہ نوآبادیت کے خلاف عزیمت اور جدوجہد کی علامت بن گیا اور بنا رہا۔ چنانچہ کئی مسلمان پردہ کو عورت کے لئے لازمی اور اسے سچے اسلام کی نشانی سمجھنے لگے۔ حقوق نسواں کی بات کرتے ہوئے اپنے پروپیگنڈے کا حصہ بناتے ہوئے (حالانکہ انہیں شاید اس سے کوئی ہمدردی نہیں تھی) انہوں نے مسلم دنیا میں عورتوں کے کاز کو سخت نقصان پہنچایا اور مذہب کو مسخ کرنے کے لئے ایک ایسا عدم توازن پیدا کر دیا جو پہلے کہیں موجود نہیں تھا۔

جدید تصورات مذہب کو بدل رہے تھے۔ یہودیوں، عیسائیوں اور مسلمانوں میں ایسے لوگ موجود تھے جو سمجھتے تھے کہ ان کے مذہب کو مٹ جانے کا خطرہ ہے۔ اس انجام سے بچانے کے لئے انہوں نے کئی طریقے سوچے۔ بعض نے نئی سوسائٹی سے بالکل ہی رشتہ توڑ لیا اور قلعوں اور پناہ گاہوں کے طور پر اپنے شدت پسند ادارے قائم کر لئے بعض جوابی حملے کے منصوبے بنانے

لگے۔ دوسرے لوگ مخالف کلچر کی تخلیق شروع کرنے لگے اور سیکولرازم کے سلسلے میں جدیدیت کے تعصب کو چیلنج کرنے کے لئے مضمون باندھنے لگے۔ یہ احساس روز بروز بڑھ رہا تھا کہ مذہب کو بھی جدید سائنس کی طرح ریشنل ہونا ہے بیسویں صدی کے ابتدائی برسوں میں ایک نئی متحارب مذہبیت نمودار ہوئی جسے ہم بنیاد پرستی کہتے ہیں۔

بنیادی اصول

(1900-25)

جنگ عظیم اول جو1914 میں یورپ کے اندر شروع ہوئی اور جس نے دیکھتے ہی دیکھتے فرانس کا عظیم الشان لینڈ اسکیپ ایک خوفناک جہنم میں بدل دیا، نوجوانوں کی ایک پوری نسل ہلاک کر کے، جنگ نے یورپ کو اس طرح تباہ کیا کہ شاید کبھی بحال نہ ہو۔ جنگ کے بعد کوئی بھی ہوش مند آدمی تہذیب کے مستقبل کے متعلق پراُمید نہ رہا۔ یورپ کی بڑی شائستہ اور ترقی یافتہ قوموں نے جنگی فنی مہارت کے ذریعے ایک دوسرے کو معذور اپاہج بنادیا تھا۔ اس طرح جنگ بذات خود اس مشینی دور کی پیروڈی بن گئی جس کے ذریعے اتنی طاقت اور دولت حاصل ہوئی تھی۔ ایک بار جب جبری بھرتی، فوجوں کی آمدورفت، اسلحہ سازی اور جنگی تیاریوں کا عمل شروع ہوا تو اس کی رفتار خود اپنے زور سے بڑھتی چلی گئی۔ سمجھ میں نہ آیا کہ اسے کیسے اور کہاں روکا جائے۔ یہ بے مقصد اور لاحاصل جنگ اس دور کی منطق اور ریشنلزم سے دست و گریبان تھی۔ حالانکہ جنگ کسی طور بھی انسان کی ضرورت نہیں تھی۔ مغرب کے لوگ اس خلاء میں گھورنے لگے جس کے موجود ہونے کا احساس بعض لوگوں کو برسوں پہلے ہو چکا تھا۔ مغربی معیشت کی حالت خراب ہونے لگی۔1910 سے معیشت اس طرح زوال پذیر ہوئی کہ 1930 کی سردبازاری اس کا لازمی انجام ہوا۔ دنیا ایک بے سوچی اوران دیکھی تباہی کی طرف گامزن تھی۔ آئرش شاعر ڈبلیو بی ییٹس نے 'دوسری آمد' کو امن کی فتح کے طور پر نہیں جانا بلکہ اسے بے رحم اور درندہ صفت عہد قرار دیا۔ مگر وہ زمانہ سائنس اور آرٹ کی دنیا میں بے مثال تخلیق اور حیرت انگیز کارناموں کا زمانہ بھی تھا۔

زندگی کے ہر میدان میں تخلیقی مفکرین پر ایک ہی دھن سوار تھی کہ یہ دنیا نئے سرے سے تخلیق کریں۔ ماضی کی رسمیں توڑ دیں اور آزار ہو جائیں۔ نئے لوگوں کی ذہنیت بالکل بدل چکی تھی اور اب وہ دنیا کو اس طرح نہیں دیکھ سکتے تھے جیسی کہ وہ تھی۔ اٹھارویں اور انیسویں صدی کے ناول میں واقعات کا بیان، اسباب وتنائج کا ذکر ترتیب اور سلیقے سے ہوتا تھا۔ نئی کہانی میں قاری کو بے یقینی اور تذبذب کے چوراہے پر بھٹکنے کے لئے تنہا چھوڑ دیا گیا تھا۔ پبلو پکا سو (1881-1973) جیسے آرٹسٹ اور پینٹر پینٹنگ میں اپنا موضوع بکھیر دیتے یا اسے ایک ہی وقت میں دو مختلف زاویوں سے دیکھتے اور گویا کہ جان بوجھ کر ناظر کی توقعات پر پانی پھیرتے۔ ان توقعات کی تحقیر کرتے اور ایک نئے وژن کی ضرورت کا اعلان کرتے۔ آرٹ اور سائنس دونوں میں یہ خواہش تھی کہ ابتدائی اور بنیادی اصولوں کی طرف واپس جائیں اور اس صفر سے نئے سفر کا پھر آغاز کریں۔ سائنس دانوں نے ایٹم یا ذرے کی تلاش شروع کی۔ سماجیات اور بشریات کے ماہرین نے قدیم معاشروں سے رجوع کیا مگر ایسا کرنے کا مقصد متروک راستوں پر واپس جانا نہیں تھا۔ نہ وہ ماضی کی از سرِ نو تخلیق چاہتے تھے بلکہ ان کا مقصد ماضی کے پرخچے اڑانا تھا اور ایٹم کا دل چیر کر اس کا جوہر دریافت کرنا تھا۔

ان میں سے بعض لوگوں کی کوششوں کا مقصد ایک نئی روحانیت کی تخلیق تھی جس میں خدا نہ ہو اور مافوق الفطرت نہ ہو۔ بیسویں صدی کے آغاز کی پینٹنگ، بت تراشی، شاعری اور ڈرامہ سب ایک بے ترتیب اور بدلتی ہوئی دنیا کے اندر معنی کی تلاش تھی۔ وہ ادراک کے نئے انداز اور نئی متھ تخلیق کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ سگمنڈ فرائڈ کی نفسیاتی تجزیئے کی سائنس کہ جس نے لاشعور کی بنیادی تہوں تک پہنچنے کی کوشش کی اسے بھی ایک نئی بصیرت کی جستجو تھی اور روحانی طاقت کے ایک چھپے ہوئے ذریعہ کو پانے کی آرزو تھی۔ فرائڈ کے پاس روائتی مذہب کے لئے کوئی وقت نہیں تھا کیونکہ وہ ایسی سائنس کو لوگوس کا سخت دشمن سمجھتا تھا مگر اس نے قدیم یونانی دیومالا کا نیا شعور پیدا کرنے کی کوشش کی اور خود دیومالائی کہانیاں لکھیں۔ جدید تجربے کے خوف اور دہشت نے اپنی معنویت کی تلاش میں شدت پیدا کر دی جو انسان کو مایوسی سے بچا سکے مگر جو منطقی اور متحرک فکر کے نارمل عمل سے حاصل نہیں ہو سکتی تھی۔ سائنسی ریشنلزم سے اپنی وابستگی کے باوجود فرائڈ نے بتایا کہ ریزن (عقل) صرف دماغ کے بیرونی حصے (چھلکے) کی نمائندہ ہے جس کے اندر لاشعور،

غیر ریشنل اور قدیم جوش وجذبوں کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر ہے جس کا ہمارے رویہ پر گہرا اثر ہوتا ہے مگر جس پر ہمارا کنٹرول برائے نام ہے۔

بنیادی اصولوں کا ایک نیا وژن دینے کے لئے مذہبی لوگ بھی ایسی ہی کوشش کر رہے تھے دور تک دیکھ سکنے والے لوگ سمجھ سکتے تھے کہ پوری طرح نئے بن جانے والے لوگوں کے لئے ناممکن تھا کہ وہ پرانی طرح مذہبی بن سکیں۔ قدیم روحانیت جس نے بعض لازمی پابندیوں کے ساتھ لوگوں کو جینا سکھا دیا تھا اور انہیں سمجھایا تھا کہ چیزیں جیسی ہیں ویسی ہی قبول کرلی جائیں۔ وہ روحانیت اس ماحول میں ان کی کوئی مدد نہ کرسکی۔ ان کے دیکھنے اور سوچنے کا انداز ہی پوری طرح بدل گیا تھا۔ مغرب میں کئی لوگ جن کی تعلیم پوری طرح ریشنل تھی وہ دیومالائی، صوفیانہ اور مسلکی رسموں کو ماننے کے لئے تیار نہیں تھے اگرچہ ان رسموں نے ماضی میں ماورائی قدر کا شعور پیدا کیا تھا۔ ان کے لئے واپسی کا کوئی رستہ نہیں تھا۔ اگر وہ مذہبی بننا چاہتے تھے تو انہیں ان رسموں، یقین وایمان اور ریاضتوں کو پروان چڑھانا تھا جو بالکل بدلے ہوئے نئے حالات میں ان سے ہم کلام تھیں۔ بیسویں صدی کے شروع کے لوگ مذہبی بننے کے لئے نئے رستوں کی تلاش میں تھے۔ جیسا کہ پہلے ایکسئل زمانہ(c700-200 BCE) میں لوگوں نے سمجھ لیا تھا کہ پرانی الحاد پرستی، ان کے نئے حالات میں کسی کام کی نہیں اس لئے انہوں نے عظیم مذاہب تشکیل کئے اس طرح اس دوسرے ایکسئل زمانے میں ایسے ہی چیلنج سے پالا پڑا تھا۔ صحیح معنوں میں کسی بڑے تخلیقی کام کی طرح مذہب کی تلاش بھی انتہائی مشکل تھی تلاش جاری ہے مگر ابھی تک کوئی فیصلہ کن تو کیا کوئی اطمینان بخش حل بھی سامنے نہیں آیا۔ جس مذہبیت کو ہم بنیاد پرستی کہتے ہیں وہ اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔

امریکہ کے پروٹیسٹنٹ کچھ عرصے سے کسی نئی چیز کی ضرورت سے باخبر تھے، انیسویں صدی کے آخر تک مختلف فرقے، مخالف سمتوں میں تقسیم ہو چکے تھے مگر 1890 کا وہ بحران جس میں کفر کے مقدمے اور جماعتوں سے اخراج ہو رہے تھے لگتا تھا کہ گزر چکا ہے۔ آزاد خیال اور قدامت پسند، صدی کے شروع میں اس نام نہاد ترقی پسند دور(1900-20) کے سماجی پروگراموں میں حصہ لے رہے تھے جس پروگرام کے ذریعے بے ترتیبی اور تیزی کے ساتھ پھیلنے والی صنعتوں سے پیدا مسائل سے نمٹنے کی کوشش کی گئی تھی۔ اصولی اختلافات کے باوجود ہر فرقہ سے تعلق رکھنے والے

پروٹیسٹنٹ ،ترقی پسند تھےاور تعلیم کی بہتری کے لئے باہمی تعاون کے ساتھ کام کرتے تھے۔شدید مشکلات کے باوجود وہ پراعتماد تھے۔لبرل دینی عالمWalter Rauschen Buschنے 1912میں لکھا کہ'امریکہ نے عیسائیت اختیار کرلی ہے اب صرف تجارت اورصنعت میں سچ کی فکراورروح کارفرما ہونا باقی ہے۔

بغیر خدا فیکٹریوں اور شہروں کی تذلیل کے لئے پروٹیسٹنٹوں نے سماجی رہبر کی ترکیب بنائی۔ یہ مسیح اورعبرانی پیغمبروں کی بنیادی تعلیمات کی طرف واپسی تھی جنہوں نے قیدیوں سے ملاقات کرنے ، بھوکوں اورضرورت مندوں کے لئے خوراک ولباس مہیا کرنے کی تلقین کی تھی۔ سماجی رہبروں نے خصوصی کلیسا بنائے جہاں غریبوں اورنوآبادکاروں کی عبادات اورتفریحات کے لئے سہولتیں فراہم کی جاتیں۔آزاد خیال پروٹیسٹنٹ چارلس سٹیلزل جس نے1911میں نیویارک کے کثیر تعداد آبادی کے علاقہ میں نیویارک لیبرٹمپل قائم کیا اس نے سوشلزم کوعیسائی بنانے کی کوشش کی''مسیحیوں کو چاہیے کہ وہ شہری حالات اورمحنت کشوں کے مسائل کا جائزہ لیں۔ بجائے اس کے کہ انجیل کی تاریخ کے متعلق باریکیوں میں الجھیں۔'' اس نے کہا: صدی کی ابتداء میں قدامت پسندعیسائی بھی سماجی پروگراموں میں اتنے ہی مصروف تھے جتنے کہ لبرل پروٹسٹنٹ مصروف تھے ہر چند کہ ان کے نظریات مختلف تھے۔شاید وہ اپنی سماجی جدوجہد کوصلیبی جنگوں کی نظر سے دیکھتے ہوں، انہیں شیطان کے خلاف جنگ سمجھتے ہوں یا موجودہ مادیت کے خلاف چیلنج گردانتے ہوں مگر وہ بچوں کی محنت کشی،کم تنخواہوں اورمزدوروں کے ماحول میں کام کرنے کے متعلق اتنے ہی فکرمند تھے جتنے کہ سٹیلزل(Stelzl) جیسے لبرل فکرمند تھے۔بعد میں قدامت پسند سماجی رہبروں پراعتراض کرنے لگے کہ ایک ایسی دنیا کو بچانے کی کوشش لاحاصل ہے تباہی جس کا مقدر ہے۔پھربھی صدی کے ابتدائی برسوں میں ولیم بی رائلے جیسا بڑا قدامت پسند نے جس 1902میں نارتھ ویسٹرن بائبل کالج قائم کیا تھا سماجی رہبروں کے ساتھ مل کر سماجی خدمات سرانجام دینے کے لئے تیار تھا۔اسےStelzl جیسے سماجی رہبروں کے طورطریقے پسند نہیں تھے جس نے لیون ٹروٹسکی اورایما گولڈ مین کواپنے ٹیمپل میں لیکچر دینے کے لئے بلایا تھا۔مگرقدامت پسند ابھی سیاسی منظر میں داخل نہیں ہوئے تھے اورتمام امریکہ میں اپنی سماجی بھلائی کی مہم خود چلاتے تھے۔

1909 میں ہارورڈ یونیورسٹی کے پروفیسر چارلس ایلیٹ نے 'مذہب کا مستقبل' کے موضوع پر ایک تقریر کی جس کی وجہ سے اکثر قدامت پسندوں کے دل ڈوب گئے۔ سادے اور صحیح اصولوں کی طرف واپسی کی یہ ایک اور کوشش تھی۔ ایلیٹ کا کہنا تھا کہ نئے مذہب کا بس ایک حکم ہوگا خدا سے محبت جو خلق خدا کی عملی خدمت میں ظاہر ہوگی۔ کلیسا نہیں ہوں گے نہ آسمانی کتابیں ہوگی۔ نہ عبادت کی ضرورت پڑے گی۔ خدا کی موجودگی اتنی واضح اور ناقابل تردید ہوگی کہ دعاؤں اور نمازوں کی ضرورت نہیں رہے گی۔ سچ پر عیسائیوں کی اجارہ داری نہیں ہوگی کیونکہ سائنس دانوں، سیکولرازم کے حامیوں اور مختلف مذاہب کے پیروؤں کے خیالات یکساں طور پر زندہ وتوانا ہوں گے۔ انسانی ہمدردی کی بناء پر مستقبل کا مذہب، جمہوریت، تعلیم، سماج سدھار اور بچاؤ کی دواؤں جیسے سیکولر خیالات سے الگ نہیں ہوگا۔ یہ انتہا پسندانہ اندازِ فکر برسوں کے اصولی اختلافات سے واپسی کا عمل تھا۔ ایسی سوسائٹی میں جو صرف مستند ریشنل اور سائنسی تصورات کی قدر کرتی تھی اس میں غیر مستند اصول ایک مسئلہ بن گئے۔ دینیات بڑی آسانی کے ساتھ ایک تسلیم شدہ عقیدہ بن سکتی تھی اس کی بجائے کہ وہ کسی الفاظ سے ماورا حقیقت کی علامت بن سکے۔ وہ ایک ایسا بت ہے جس کی خود اپنی ذات میں بڑی اہمیت ہے۔ ڈاکٹرین سے نظر بچا کر ایلیٹ اس سمت سے واپس جا رہا تھا جسے وہ اصلی اور بنیادی سمجھتا تھا۔ یعنی خدا اور ہمسائے سے محبت۔ دنیا بھر کے تمام مذاہب سماجی انصاف اور کمزوروں کی دستگیری پر زور دیتے ہیں۔ ہر روایت میں منظّم اور عملی ہمدردی کا یہ جذبہ واضح طور پر موجود ہے، اگر وہ پندارِ تقدس نہ بن جائے۔ چنانچہ ایلیٹ، نئی دنیا میں عیسائیوں کو درپیش ایک انتہائی اہم مسئلہ پر توجہ دے رہا تھا۔ ایسے مذہب کی تلقین کر رہا تھا جس کا انحصار لفظی اور فرسودہ اصول پرستی کی بجائے عمل پر ہو۔

قدامت پسند، بہرکیف بہت پریشان تھے۔ ان کی رائے میں غلطیوں سے پاک ڈاکٹرین کے بغیر کوئی مذہب عیسائی مذہب نہیں ہوسکتا۔ انہوں نے لبرل حلقوں کی طرف سے اس خطرہ کے مقابلے کا فیصلہ کر لیا۔ 1910 میں پرنسٹن کے پریسبٹیرین جنہوں نے یہ ڈاکٹرین وضع کی تھی انہوں نے پانچ لازمی احکام جاری کئے۔

۱۔ انجیل کی لفظی اور معنوی صحت، ۲۔ مسیح کی پیدائش، ۳۔ مسیح کا مصلوب ہو کر ہمارے گناہوں کا کفارہ دینا، ۴۔ جسمانی طور پر ان کا پھر زندہ ہونا، اور ۵۔ مسیح کے معجزوں کی معروضی

حقیقت، آخری عقیدہ قبل از ہزار سالہ جشن ولادت میں بدل دیا گیا۔ تیل کے لکھ پتی بیوپاری لی مین اور ملٹن سٹیورٹ، جنھوں نے لاس اینجلز کا بائبل کالج قائم کیا تھا انہوں نے ایک پمفلٹ کے بارہ شمارے شائع کئے جس کا عنوان بنیادی اصول تھا۔ جس میں ممتاز قدامت پسند ماہرین دینیات نے تثلیث پر بحث کی۔ 'برتر تنقید' کا مؤقف رَد کیا اور انجیل کے احکام کی نشرواشاعت پر زور دیا اور اس کی ہر اشاعت کی تیس لاکھ کاپیاں، ہر پروفیسر، غیر مقلد پادری اور امریکہ میں دینیات کے طالب علموں کو مفت بھیجیں۔ اس کے بعد اس پروجیکٹ نے بڑی علاماتی اہمیت اختیار کرلی۔ اس لئے کہ بنیاد پرست اس پر اپنی تحریک کے اثرات دیکھتے تھے۔ بہرحال اس وقت پمفلٹ پر تنقید میں بہت کم دلچسپی لی گئی۔ پمفلٹ کا لہجہ نہ انقلابی تھا اور نہ ہی انتہا پسندانہ تھا مگر جنگ عظیم کے عرصے میں خوف کا ایک عنصر قدامت پسند پروٹیسٹنٹ ازم میں دَر آیا اور وہ بنیاد پرست بن گیا۔ امریکیوں میں ہمیشہ یہ ذہنیت موجود رہی ہے کہ وہ ہر تصادم کو انسانی تاریخ کا خاتمہ سمجھتے ہیں۔ ان میں سے بہتوں نے جنگ عظیم کو قرب قیامت کی نشانی سمجھا۔ اس خوفناک قتل عام کے متعلق انہوں نے سوچ لیا کہ یہ کسی انجام کا آغاز ہے۔ یہ وہی لڑائیاں ہیں کہ انجیل میں جن کی پیش گوئی کی گئی ہے۔ 1914 سے 1918 میں تین بڑی بری (پروفیسی) پیش گوئی کانفرنسیں منعقد ہوئیں جن کے شرکاء نے بڑی باریک بینی کے ساتھ انجیل کا جائزہ لیا کہ گزرتے ہوئے وقت کے متعلق شاید کچھ اور اشارے مل جائیں۔ ہر چیز سے ظاہر ہوا کہ یہ پیش گوئیاں صحیح ثابت ہورہی ہیں۔ عبرانی پیغمبروں نے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ یہودی خاتمے سے پہلے اپنی سرزمین پر واپس چلے جائیں گے۔ اس لئے جب برطانوی حکومت نے 1917 میں اعلان بلفور جاری کیا جس کے ذریعے فلسطین میں یہودیوں کے لئے وطن کی حمایت کی گئی تھی تو قرب قیامت پر یقین رکھنے والے عیسائی رعب وجلال سے حیرت زدہ ہوگئے۔ سکوفیلڈ نے بتادیا تھا روس شمال کی طاقت ہے اور وہ قیامت سے کچھ پہلے اسرائیل پر حملہ کرے گا۔ 1917 کے بالشویک انقلاب نے یہ بات ثابت کردی کیونکہ اس نے دہریت پسند کمیونزم کو ریاستی نظریہ کا درجہ دے دیا۔ اس بات نے ان کے یقین کو مزید تقویت دی۔ لیگ آف نیشنز کے بننے سے بھی 1614 کی پیش گوئی پوری ہوئی۔ ان کا خیال تھا کہ یہ رومن سلطنت کی نئی شکل ہوگی جس کی سربراہی دجال کرے گا۔ عالمی واقعات کے مشاہدے کی وجہ سے قرب قیامت کو ماننے والے ان پروٹیسٹنٹوں میں مزید سیاسی

بیداری پیدا ہوئی۔ انیسویں صدی کے آخری دور میں لبرل عیسائیوں کے ساتھ خالص اصولی تنازعہ نے تہذیب کے مستقبل کی خاطر جدوجہد کی صورت اختیار کر لی۔ وہ اپنے آپ کو شیطانی طاقتوں کے خلاف برسر پیکار پہلی صف سمجھتے تھے۔ جنگ میں اور جنگ کے بعد جرمنوں کے ظلم کی داستانوں نے ان پر ثابت کر دیا کہ 'برتر تنقید' جنم دینے والی قوم کو رد کرنے میں وہ کتنے حق بجانب تھے۔ پھر بھی یہ وژن بڑے خوف کا ذریعہ تھا۔ خوف یہ تھا کہ 'برتر نقادوں' کیتھولک عیسائیوں اور کمیونسٹوں کے ذریعے غیر ملکی اثرات قوم میں سرایت کریں گے۔ بنیاد پرستی کا تصور نئی دنیا کے ہاتھوں بری طرح پسپا ہوا تھا۔ قدامت پسند پروٹیسٹنٹوں کی جمہوریت کے متعلق انتہائی تذبذب کے عالم میں تھے۔ خطرہ تھا کہ اس کے ذریعہ ہجوم حکمران ہوگا۔ سرخ جمہوریت آئے گی، اس کے ذریعے دنیا پر ایسی شیطانی سلطنت مسلط ہوگی جس کی پہلے کوئی مثال نہیں۔ بنیاد پرستوں کی نظر میں لیگ آف نیشنز بدی کا مظہر اور دجال کی پناہ تھی۔ بیسنٹ پال نے کہا تھا کہ دجال ایک عیار کاذب ہوگا جس کے اثر سے کوئی بھی آزاد نہیں رہے گا۔ انجیل کا فرمان ہے کہ خاتمے سے پہلے امن نہیں ہوگا بلکہ جنگ ہوگی۔ اس لئے لیگ کا راستہ خطرناک حد تک غلط ہے۔ خود دجال کا امن پسند ہونا خلاف قیاس نہیں۔ لیگ اور دوسرے بین الاقوامی اداروں سے بنیاد پرستوں کی بیزاری سے جدیدیت کے تصور سے بھی دہشت زدہ تھے۔ جدید سوسائٹی کی عالم گیریت کا سامنا کرتے ہوئے ان میں سے بعض لوگ جبلی طور پر قبائل پرستی کی سمت واپس چلے گئے۔

سازش کا یہ خوف جس کے ذریعے لوگ سمجھتے تھے کہ وہ اپنی بقاء کی جنگ لڑ رہے ہیں آسانی کے ساتھ جارحیت میں بدل سکتا تھا۔ مسیح کا جو تصور Dwight Moody نے پیش کیا اس کے مطابق مسیح اب محبت کرنے والا نجات دہندہ نہیں تھا۔ اسحٰق بیلڈ مین نے وضاحت کی کہ انجیل کا مسیح اس طرح سامنے آتا ہے کہ اب اسے کسی کی دوستی یا محبت کی تلاش نہیں۔ اس کے کپڑے دوسروں کے خون میں تر ہیں۔ وہ نازل ہوتا ہے تاکہ انسانوں کا خون بہائے۔ قدامت پسند لڑائی پر تیار تھے مگر اس نازک لمحے میں لبرل پروٹیسٹنٹ جارحیت پر اتر آئے۔ جنگ کے سلسلے میں آزاد خیال پروٹیسٹنٹوں کی اپنی مشکلات تھیں۔ جنگ نے دنیا کے متعلق ان کے وژن کو چیلنج کیا تھا جس کے مطابق دنیا خدا کی بادشاہت کی طرف بڑھ رہی تھی۔ اب اس تضاد سے بچنے کی ایک ہی صورت رہ گئی تھی کہ وہ جنگ عظیم کو ایسی جنگ خیال کریں کہ جس کے بعد کوئی جنگ نہیں ہوگی۔

اس طرح دنیا جمہوریت کے لئے محفوظ ہو جائے گی۔ وہ قبل ہزار یہ کے تشدد اور جمہوریت و لیگ آف نیشنز پر اس کے مخالفانہ تبصرے سے پریشان تھے۔ یہ اصول نہ صرف غیر امریکی بلکہ خود مسیحیت کے خلاف تھے۔ انہوں نے حملہ آور ہونے کا فیصلہ کر لیا۔ محبت اور ہمدردی کے دعوے کے باوجود ان کی مہم پر تشدد اور ظالمانہ تھی۔ 1917 میں شکاگو یونیورسٹی کے Divinity School جو امریکہ میں لبرل عیسائیوں کا ممتاز ادارہ تھا اس کے ماہرین دینیات نے موڈی بائبل انسٹی ٹیوٹ پر حملہ شروع کر دیا۔ پروفیسر شرلے جیکسن چیز نے ان پر اپنے ملک کے غدار ہونے کا الزام لگایا جو غداری کے عوض جرمنی سے روپیہ لیتے تھے۔ ایلوایس ٹیلر نے انہیں بالشویکوں سے تشبیہ دی جو ایک ہی دن میں دنیا بدل دینا چاہتے تھے۔Alfred Dieffenbach نے انہیں مذہبی میدان میں ذہنی کج روی کی حیرت انگیز مثال کا نام دیا۔ موڈی بائبل انسٹی ٹیوٹ کے مخلص استادوں کا رشتہ دشمنوں سے جوڑ کر (جنہیں وہ نہ صرف سیاسی مخالف بلکہ شیطان سمجھتے تھے) لبرل گروپ نے بڑی بھدی حرکت کی تھی۔ موڈی بائبل انسٹی ٹیوٹ کے صدر اور ایڈیٹر جیمز ایم گرے نے جواب دیا کہ یہ لبرل حلقوں کی امن دوستی تھی جس کی وجہ سے جرمنی نے اسلحہ کی دوڑ میں امریکہ کو مات دی۔ انہی کی وجہ سے جنگی تیاریوں کو نقصان ہوا۔ تھامس ہی ہٹرٹن نے بتایا کہ لبرل جرمنوں سے ملے ہوئے تھے کیونکہ برتر تنقید جسے وہ اپنے Divinity School میں پڑھاتے تھے۔ اسی کی وجہ سے جنگ ہوئی اور جنگ کی وجہ سے جرمنی میں اعلیٰ قدریں پامال ہوئیں۔ دوسرے قدامت پسندانہ مضامین میں ریشنلزم اور ارتقائی تھیوری پر جرمنوں کے مذکورہ مظالم کا الزام لگایا گیا۔ لاس اینجلز کی بائبل انسٹی ٹیوٹ کے ہاورڈ ڈبلیو کیلوگ کا اصرار تھا کہ دنیا پر مسلط ہونے تہذیب کے خاتمے اور خود مسیحیت کی تباہی کی سازش کا ذمہ دار ارتقاء کا فلسفہ ہے۔ اس تند و تیز اور دونوں اطراف سے غیر مسیحی تنازعہ نے مٹ جانے کا گہرا خوف، حساس دلوں میں پیدا کر دیا۔ برتر تنقید کے معاملے میں صلح صفائی کا کوئی امکان نہیں تھا کہ اسے قدامت پسند بدی کی علامت سمجھتے تھے۔ انجیل کا لفظی بیان اور صداقت خود عیسائیت کی اپنی زندگی اور موت کا مسئلہ تھا۔ انجیل پر نقادوں کے حملوں کا نتیجہ انارکی اور تہذیب کی مکمل پامالی ہوگا۔ پادری جان سٹرے ٹن نے اپنے مشہور وعظ ''اگر نیویارک شہر پشیمان نہ ہوا تو کیا تباہ ہو جائے گا؟'' میں نے کہا تھا۔ تصادم حد سے باہر نکل چکا ہے اور اختلاف دور کرنا ممکن نہیں رہا۔

اگست 1971 میں ولیم بیل رائلے The Fundamentalist کے ایک ایڈیٹر اے سی ڈکسن (1854-1925) اور تجدید پسند روبین ٹوری (1856-1928) کے ساتھ بیٹھا اور ایک ایسوسی ایشن قائم کرنے کا فیصلہ کیا جس کا مقصد انجیل کی لفظی تشریح اور قبل ہزاریہ کی سائنسی ڈاکٹرین کا فروغ تھا۔ 1919 میں رائلے نے ایک بہت بڑی کانفرنس کا فلاڈیلفیا میں اہتمام کیا جس میں تمام فرقوں سے متعلق پروٹیسٹنٹ عیسائیوں کے چھ ہزار افراد نے شرکت کی اور رسمی طور World's Christian Fundamentalists Association (WCFA) قائم کی۔ اس کے فوراً بعد رائلے نے مذہبی گیت گانے والوں کا طائفہ اور چودہ مبلغین ساتھ لئے اور امریکہ کے دورے پر نکل کھڑا ہوا۔ آزاد خیال اس اچانک حملے کے لئے بالکل تیار نہیں تھے۔ بنیاد پرست مقررین کا استقبال اس گرم جوشی سے ہوا کہ رائلے کو یقین ہونے لگا کہ اس نے ایک نئی اصلاحی تحریک کی ابتدا کی ہے۔ بنیاد پرستوں کی مہم گویا کہ جنگ تھی جس میں ان کے لیڈر جنگ کی امیجری بے دریغ استعمال کرتے تھے۔ ''میں سمجھتا ہوں وقت آ گیا ہے'' ای اے ولیم نے کرسچین اور کرز میگزین میں لکھا ''جبکہ اس ملک کی انجیل دوست قوتیں اور خصوصی طور پر بائبل انسٹی ٹیوٹ نہ صرف مذہب کے دفاع کے لئے اٹھیں بلکہ ایک متحدہ اور جارحانہ طاقت بن جائیں'' اسی شمارے میں جیمز ایم گریے نے تائید کی کہ چرچ میں مدافعانہ اور جارحانہ اتحاد قائم ہونا چاہیے۔ کیورٹس لی لٹرز نے بنیاد پرست کی تعریف یہ کی کہ جو دشمن کے ہاتھوں کھویا ہوا اپنا علاقہ حاصل کرنا چاہیے اور مذہب کے بنیادی اصولوں کی خاطر لڑے۔ رائلے اور آگے گیا ''یہ صرف ایک لڑائی نہیں بلکہ مسلسل جنگ ہے جس سے مفر نہیں''۔ بنیاد پرستوں کا دوسرا مقصد لبرل افراد کو فرقوں میں سے نکالنا تھا۔ بنیاد پرستوں کی اکثریت پریسبیٹرین یا Baptist تھی اور اسی وجہ سے شدید اختلافات کا سامنا تھا۔ اپنی شاندار تصنیف ''عیسائیت اور لبرل ازم'' 1923 پریسبیٹرین عالم (1881-1937) Graham Mechen بنیاد پرستوں کے بڑے دانش ور نے یہ بحث کی کہ لبرل کافر ہیں جو انجیل کی بنیادی صداقت سے منکر ہو کر خود عیسائیت کا انکار کرتے ہیں۔ فرقوں کی جنرل اسمبلیوں میں خوفناک لڑائیاں ہوتیں جب بنیاد پرست پریسبیٹرین نے اپنا پانچ نکاتی مسلک چرچ پر مسلط کرنے کی کوشش کی۔ رائلے، انتہا پسندوں پر مشتمل اپنی بائبل بیپٹسٹ یونین بنانے کے لئے بیپٹسٹ اسمبلی سے الگ ہو گیا۔ بعض بنیاد پرست بیپٹسٹ فرقوں کے اندر رہ کر ان

میں اصلاح کرنے کے خیال سے اہم فرقوں سے وابستہ رہے مگر انہیں رائلے کی نفرت کے سوا کچھ حاصل نہ ہوا۔

مہم جاری رہی، جذبات اس حد تک مشتعل ہوئے کہ ثالثی کی کوئی کوشش حالات مزید خراب کر دیتی۔ جب لبرل مبلغ ہیری ایمرسن فوسڈک(1969-1878) ایک صلح کل آدمی اور وقت کے سب سے بارسوخ امریکی پادری نے رواداری کی تلقین کی تو جواب میں جس کینہ توزی کا مظاہرہ ہوا اس سے اندازہ ہو سکتا تھا کہ ان لبرل تصورات سے کتنی نفرت کی جاتی تھی۔ یہ نفرت دوسرے فرقوں تک بھی پہنچی۔ لیکچر کے بعد بے شمار لوگوں نے بنیاد پرستوں میں شمولیت اختیار کی اور ان کے کاز کی پرزور حمایت کے لئے تیار ہوئے۔ جو فرقے اس تنازع سے الگ رہے ان کی صفوں میں موجود قدامت پسندوں نے انہیں چیلنج کیا کہ وہ عیسائیت کی حیات انگیز اور ابدی صداقتوں کی وضاحت کریں۔1923 تک یہ لگتا تھا کہ بنیاد پرست جیت جائیں گے اور وہ سب فرقوں کو لبرل ازم کے خطرہ سے نجات دلائیں گے مگر قوم کو ایک نئے خطرے نے آن لیا جس سے بنیاد پرستی کی تمام تحریک نظروں سے گر گئی۔

ہوا یہ کہ 1920 میں ایک جمہوریت پسند سیاستدان ولیم جیننگ برائن (1925-1860) نے سکولوں اور کالجوں میں نظریہ ارتقاء کی تعلیم کے خلاف مہم شروع کر دی۔ اس کی رائے کے مطابق پہلی جنگ عظیم کے مظالم اور ہلاکتوں کی ذمہ داری ڈارون ازم پر تھی۔ برائن دو کتابوں سے متاثر تھا۔ جن کے متعلق خیال تھا کہ وہ نظریہ ارتقاء اور جرمن عسکریت پسندی میں براہ راست رشتہ ثابت کرتی ہیں۔ بینجمن کڈ کی ''دی سائنس آف پاور' 1918 اور ورنن ایل کیلوگ کی ''ہیڈ کوارٹر نائٹس' 1917 جس میں ان جرمن افسروں کے انٹرویو شامل تھے جنھوں نے ڈارون ازم کے اثر پر بات کی جس نے جرمنی کو اعلان جنگ پر اُکسایا۔ صرف یہ نہیں ''کہ دنیا میں طاقتور زندہ رہتا ہے یا اسے ہی زندہ رہنا چاہیے''، کے تصور نے تاریخ کی خونخوار ترین جنگ کی بنیاد رکھی بلکہ یہی سائنس انسانوں کی ہلاکت کے لئے زہریلی گیس بناتی ہے اور ہمیں سکھاتی ہے کہ ہمارے بزرگ جانور تھے اور انجیل میں سے مافوق الفطرت اور معجزاتی عنصر مٹا دینا چاہتے تھے۔ برائن نے اس رائے کے علاوہ اپنی تصنیف 'خدا اور لافانیت پر ایمان' میں ماہر نفسیات جیمز ایچ لیوبا کے مرتب کردہ اعداد وشمار دیئے جن سے ثابت کیا گیا تھا کہ کالج کی تعلیم ایمان کو

خطرے میں ڈال دیتی ہے۔ ڈارون ازم کی وجہ سے نوجوانوں میں خدا، انجیل اور عیسائیت کے بنیادی اصولوں پر بے یقینی پیدا ہو رہی ہے۔ برائن کچھ ایسا بنیاد پرست بھی نہیں تھا نہ اس نے انجیل نئے سخت گیرانہ لفظی معنوں میں پڑھی تھی مگر اس کی ''ریسرچ'' نے اسے قائل کر دیا کہ نظریہ ارتقاء کا تہذیب، شائستگی اور اخلاقیات کے ساتھ کوئی رشتہ نہیں۔ جب اس نے امریکہ کے دورے میں اپنا لیکچر 'ڈارون ازم کا خطرہ' مختلف مقامات پر دیا تو سامعین کی بڑی تعداد نے اسے سنا اور میڈیا نے زبردست کوریج دی۔ برائن کے خیالات سطحی، خام اور غلط تھے مگر لوگ اسے سننا چاہتے تھے۔ پہلی جنگ عظیم نے سائنس کا ہنی مون ختم کر دیا تھا اب اس کے خوفناک امکانات کے متعلق بے چینی تھی۔ بعض حلقوں میں تو اسے محدود رکھنے کی خواہش تھی۔ ڈارون کی سائنس، بعض سائنسی ماہرین کی طرف سے بے چینی پھیلانے والی ذہنیت کی بہترین مثال تھی۔ سادہ اور سہل مذہب کے خواہش مند کسی ایسے معقول جواز کی تلاش میں تھے جو ان کی سمجھ میں آئے اور جس کی بناء پر وہ ارتقائی نظریہ رَد کر سکیں۔ برائن نے ان کی یہ خواہش پوری کر دی اور تن تنہا ارتقاء کا موضوع بنیاد پرستوں کے ایجنڈے میں سرفہرست لے آیا۔ یہ ایسا کام تھا جو نئے بنیاد پرستانہ خیالات کی تائید کرتا تھا کیونکہ ڈارون نے انجیل کی لفظی اور اصلی صداقت کی تردید کی تھی۔ اس کے اثرات کے متعلق برائن کی توجیہہ نے نئے خدشات کو ہوا دی جو پہلی عالمی جنگ کے بعد ظاہر ہوئے تھے جیسا کہ پچاس سال پہلے چارلس ہوج نے کہا تھا کہ 'ڈارون کا دعویٰ' بیکن سے متاثر بنیاد پرستوں کی نظر میں قابل نفرت تھا جو ابھی تک آغاز جدیدیت کے سائنسی نقطۂ نظر سے چپٹے ہوئے تھے۔' دانش ور اور سکالر یبل ہاورڈ اور بڑے مشرقی شہروں میں نئے خیالات کو شاید گرمجوشی سے قبول کر لیتے تھے مگر چھوٹے امریکی شہروں میں اکثر لوگوں کے لئے وہ خیالات اجنبی تھے۔ وہاں یہ محسوس کیا جاتا تھا کہ ان کے کلچر کو سیکولر حکومت نظر انداز کر رہی ہے۔ پھر بھی ارتقاء کے خلاف مہم شاید کبھی بھی 'برتر تنقید' کی جگہ بنیاد پرستی کو نہ دیتی اگر جنوب میں ایک ڈرامائی تبدیلی نہ ہوئی ہوتی جس نے اب تک بنیاد پرستی کی لڑائی میں بہت کم حصہ لیا تھا۔

جنوب والوں کو بنیاد پرست بننے کی ضرورت نہیں تھی۔ اس مرحلے پر جنوبی ریاستیں، شمال کی نسبت زیادہ قدامت پسند تھیں اور جنوبی فرقوں میں اتنے لبرل افراد نہیں تھے کہ ان کے خلاف بنیاد پرستوں کی جانب سے کسی مہم کی ضرورت پڑتی مگر سکولوں میں نظریہ ارتقاء کی تعلیم کی وجہ سے

بڑی بے چینی تھی۔ یہ کسی بدیسی نظریئے کے ہاتھوں سماج کو غلام بنانے کی ایک مثال تھی۔فلوریڈا، مسی سی پی، لیوزیانا اوا کنساس میں بل پیش کئے گئے تا کہ ڈارون کی تھیوری کا پڑھانا خلاف قانون قرار دیا جائے۔ ٹینی سی میں ارتقاء دشمن قوانین خصوصی طور پر زیادہ سخت تھے۔انہیں آزمانے اور آزادئ اظہار کے حق میں علامت کے طور پر قدم اٹھاتے ہوئے ایک نوجوان استاد جان سکوپس نے اعتراف کیا کہ اس نے اپنے سکول کی بیالوجی کی کلاس میں ایک دفعہ پرنسپل کی جگہ لے کر قانون کی خلاف ورزی کی تھی۔ جولائی 1925 میں اس کے خلاف مقدمہ شروع ہوا تو امریکن سول لبرٹی یونین نے اس کے دفاع کے لئے وکیلوں کی ایک ٹیم بھیجی جس کا سربراہ کلے رینس ڈارو (1857-1938)۔رائلے اور دوسرے بنیاد پرست رہنماؤں کی درخواست پر ولیم جیننگ برائن استغاثہ کی طرف سے وکالت پر آمادہ ہوا جب ایک بار ڈارو اور برائن اس میں ملوث ہو گئے تو مقدمہ سول آزادی تک محدود نہ رہا اور خدا اور سائنس کے مابین ایک مقابلہ بن گیا۔

سکوپس کا مقدمہ دو انتہائی مخالف نظریوں کے درمیان تصادم تھا۔ ڈارو اور برائن دونوں نہایت اہم امریکی قدروں کا دفاع کر رہے تھے۔ دارو آزادئ اظہار کے حق میں تھا جبکہ برائن عام لوگوں کے حقوق کے لئے لڑتا تھا جو ایک زمانے سے علماء اور ماہرین کے اثر ورسوخ سے بیزار تھے۔ برائن کی ہر سیاسی جدوجہد عوام کے لئے تھی۔(In His Image(1922 پر تبصرے میں ڈارون کے جواب میں برائن نے دعویٰ کیا کہ وہ ان لوگوں کی بہت اکثریت کی زبان ہے جنہیں بات کرنا نہیں آتی۔ درحقیقت وہی ان کے خیالات وجذبات کا واحد ترجمان ہے۔ کیونکہ وہ ان کی بات سن سکتا ہے اور سمجھ سکتا ہے۔ وہ سیاسی زندگی کا لازمی حصہ ہیں انہیں نظرانداز نہیں کیا جاسکتا نہ انہیں عضو معطل سمجھنا ہے۔ یہ بات بے شک ٹھیک تھی مگر بدقسمتی سے برائن ان کی بے چینی اور مسائل کی مؤثر ترجمانی نہ کر سکا جبکہ ڈارو نے سائنس کی آزادی اور ترقی کے حق میں شاندار بحث کی۔ برائن کا اصرار تھا کہ ثبوت نہ ہونے کی بناء پر لوگوں کو حق حاصل ہے کہ وہ ڈارون کے غیر مستند مفروضے کو غیر اخلاقی اثرات کی وجہ سے رَد کر دیں۔ جہاں سکوپس کے خیال میں اس کا مقدمہ ایک تماشہ تھا ڈارو اور برائن اس کے بارے میں سخت سنجیدہ تھے اور اپنے طور پر ان قدروں کے لئے لڑ رہے تھے جنہیں وہ مقدس سمجھتے تھے مگر جب برائین کٹہرے میں کھڑا ہوا تو دارو کی بے رحم جرح نے اس کی سادہ لوحی اور ذہنی خلفشار کو سب پر آشکارا کر دیا۔اس نے برائن کو مجبور کر دیا

کہ وہ مان لے کہ دنیا چھ ہزار سال سے کہیں زیادہ پرانی ہے۔ جیسا کہ انجیل کے حقیقی معنوں سے ظاہر ہے کہ پیدائش کے 'چھ دن' جس کا ذکر کتاب پیدائش میں موجود ہے۔ ان چھ دنوں میں سے ہر دن چوبیس گھنٹوں سے زیادہ طویل تھا اور یہ کہ اس نے انجیل کی اصلیت کے متعلق کبھی کوئی تنقیدی جائزہ نہیں پڑھا اسے دوسرے کسی مذہب میں دلچسپی نہیں اور آخر میں اس کا کہنا کہ ان چیزوں کے متعلق میں نہیں سوچتا جن چیزوں کے متعلق میں نہیں سوچتا اس نے صرف ان چیزوں کے متعلق سوچا جن کے متعلق اس نے ''کبھی کبھار'' سوچا تھا۔ یہ برائن کی مکمل شکست تھی۔ ڈارو اس مقدمہ میں سے ریشنل انداز فکر کا ہیرو بن کر ابھرا۔ بوڑھا برائن نا قابل فہم، نکمے اور نا اہل شخص کی طرح رَد کر دیا گیا اور مقدمہ کے چند روز بعد تھکاوٹ سے چور ہو کر مر گیا۔

سکوپس کو سزا ہوئی مگر اے سی ایل یو نے اس کا جرمانہ ادا کر دیا۔ ڈارو اور جدید سائنس فتح یاب ہوئے۔ اخباروں نے خوشی خوشی برائن اور اس کے ساتھیوں کو مایوس کن اور گمراہ قرار دیا۔ خصوصی طور پر ایک صحافی ایم ایل مینکن نے بنیاد پرستوں کو قوم کے لئے عذاب کہہ کر رَد کیا۔ اچھا ہوا کہ برائن نے ایک چھوٹے سے گاؤں میں زندگی کے دن پورے کئے۔ اسے دیہاتیوں سے محبت تھی اور ان متکبر مبلغین سے بھی جو اونچی وادیوں میں مقیم تھے۔ بنیاد پرست ہر جگہ موجود ہیں اور ہر جگہ وہ جو سیکھ رہے ہیں وہ عام فانی انسانوں کے لئے ایسا بوجھ ہے جو ان کی بساط سے باہر ہے۔

بنیاد پرستوں کا تعلق ماضی سے ہے وہ سائنس اور فکری آزادی کے دشمن ہیں۔ نئی دنیا میں ان کے لئے کوئی کردار نہیں۔ جیسا کہ میز ڈشپلے نے اپنی تصنیف 'جنگ اور سائنس' (1927) میں لکھا ''اگر بنیاد پرست کئی فرقوں میں اقتدار حاصل کر لیتے اور اپنی پابندیاں لوگوں پر بزور قانون عائد کر دیتے تو امریکی اپنے کلچر کا بہترین حصہ ضائع کر دیتے اور تاریک دور میں واپس دھکیل دیئے جاتے۔ سیکولرازم کے آزاد خیال حامیوں نے خطرہ محسوس کر کے جوابی حملہ کر دیا۔ کلچر ہمیشہ ایک اختلافی مسئلہ ہوتا ہے جہاں مختلف گروہ اپنا نقطۂ نظر منوانے کی کوشش کرتے ہیں۔ ڈیٹن کے مقدمہ میں سیکولرازم کے حامیوں کی جیت ہوئی۔ بنیاد پرستوں کو اپنی حقارت کا نشانہ بناتے ہوئے انہیں احساس دلا دیا گیا تھا کہ ان کی کوئی حیثیت نہیں اس لئے اپنی ہار مان لیں۔ سکوپس کے مقدمہ کے بعد بنیاد پرست خاموش ہو گئے لبرل حلقوں نے فرقوں کا کنٹرول سنبھال لیا۔ لگتا تھا کہ ان میں کوئی

سمجھوتہ طے پا گیا ہے۔ ولیم بیل رائلے اور اس کے پیروؤں نے اپنی جدوجہد، عشرے کے آخر تک کردی۔ رائلے اس پر تیار تھا کہ لبرل ہیری فوسڈک کے ساتھ پینل پر بیٹھے گے بنیاد پرست منظر سے غائب نہیں ہوئے تھے بلکہ ان کے نظریات مقدمہ کے بعد مزید انتہاپسندانہ ہو گئے تھے۔ کلچر کے بڑے دھارے کے خلاف ان میں شدید جذبات پیدا ہو گئے تھے۔ ڈیٹن میں انہوں نے سیکولرازم کے حامیوں کے اس نظریئے کے خلاف سخت جدوجہد کی تھی کہ مذہب بوسیدہ اور بے محل ہے اور صرف سائنس اہم ہے مگر یہ نقطۂ نظر نہ وہ مؤثر طور پر بیان کر سکے اور نہ ہی اسے پیش کرنے کے لئے انہوں نے مناسب مقام منتخب کیا تھا۔ جرمنی سے خوف اور دشمنی کا برائن کا رویہ نامناسب تھا جبکہ ڈارون کی حیثیت کم کر کے دکھانا بھی غلط تھا۔ مذہب کے اخلاقی اور روحانی احکام انسانوں کے لئے اشد ضروری ہیں انہیں سوچے سمجھے بغیر تاریخ کے کوڑے میں نہیں پھینک سکتے کہ بے لگام ریشنلزم کو تقویت حاصل ہو۔ سائنس اور اخلاقیات کا باہمی تعلق ہمیشہ فکر مندی کا باعث رہا ہے مگر ڈیٹن میں بنیاد پرست اپنا مقدمہ ہار گئے۔ انہیں ایسا لگا کہ ان کے ساتھ توہین آمیز سلوک ہوا ہے اور انہیں گم نامی کے گڑھے میں دھکیل دیا گیا ہے۔ پچاس برس پہلے امریکہ میں نیو لائٹس کی اکثریت ہو گئی تھی مگر سکوپس کے مقدمہ کے بعد میں وہ اجنبی بن گئے۔ مینکن جیسے سیکولرازم کے حامیوں کی مضحکہ خیزی نے الٹا اثر کیا۔ بنیاد پرستوں کے مذہب کی جڑیں خوف اور بے چینی میں پیوست تھیں جو ریشنل ازم کی بحث سے ختم نہیں ہو سکتی تھیں اور ڈیٹن کے بعد تو وہ مزید انتہا پسند ہو گئے تھے۔ مقدمہ سے پہلے نظریہ ارتقاء ان کے لئے اہم مسئلہ نہیں تھا اور چارلس ہوج جیسے لفظی معنوں میں یقین رکھنے والوں نے بھی مان لیا تھا کہ دنیا کی عمر چھ ہزار سال سے زیادہ ہے یعنی جو بھی انجیل میں کہا گیا ہے بہت کم بنیاد پرست پیدائش کی نام نہاد سائنس پر یقین رکھتے تھے جس سائنس کے مطابق کتاب پیدائش سائنسی طور پر درست تھی۔ مگر ڈیٹن پینٹی کوسٹلسٹ زبان اور لفظوں سے گریز کرتے ہیں کیونکہ صوفیاء کے کہنے کے مطابق الفاظ اس حقیقت کے اظہار پر قادر نہیں جو تصورات اور عقل سے ماوراء ہے۔ پینٹی کوسٹل مادری بولیوں میں بات کرتے تھے اس یقین کے ساتھ کہ مقدس روح ان پر بھی اسی طرح نازل ہوئی ہے جس طرح پینٹی کوسٹ کی یہودی ضیافت میں مسیح کے حواریوں پر نازل ہوئی تھی جب خدا کی موجودگی نے اپنا اظہار آگ کی زبانوں میں کیا اور حواری میں یہ اہلیت پیدا کی کہ وہ عجیب و غریب زبانوں میں بات کر سکیں۔

کوسٹلسٹس کے پہلے گروپ کا روح سے سامنا لاس اینجلز کے ایک چھوٹے سے مکان میں 9اپریل 1906 کے اندر ہوا۔اس گروپ کا لیڈر ولیم جوزف سیمور(1870-1915) ان غلاموں کا بیٹا تھا جو سول وار کے بعد آزاد کئے گئے تھے اور جو عرصہ سے ایک ایسے مذہب کی تلاش میں تھے جو سفید فام پروٹیسٹنٹ فرقوں کی نسبت تکلفات سے آزاد ہو۔1900 تک وہ روحانیت میں شامل ہو گیا جسے پیغمبر جوئل کے کہنے کے مطابق یقین تھا کہ صحت، وجد، زبانیں اور پیش گوئی جو قدیم چرچ کے اختیار میں تھیں یوم آخرت سے فوراً پہلے خدا کے بندوں کے لئے بحال کر دی جائیں گی۔جب سیمور اور اس کے ساتھیوں کو روح سے سابقہ پڑا تو یہ خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی۔افریقی امریکنوں اور سفید فام محروم لوگوں کا ہجوم اس کثرت سے اس کی دوسری عبادت میں شامل ہوا کہ انہیں ازوسا سٹریٹ کے ایک مقام پر منتقل ہونا پڑا۔چار برس کے عرصے میں کوسٹلز کے سینکڑوں گروپ امریکہ بھر میں پھیل گئے اور ان کی تحریک پچاس ملکوں میں پہنچ گئی۔یہ پہلی پینٹی کوسٹل تحریک اس عام بیداری کے سلسلے کی کڑی تھی جس کا سلسلہ جدید دور میں جاری رہا جب لوگوں کو یقین ہو گیا تھا کہ ایک بڑی تبدیلی وقوع پذیر ہونے والی ہے۔سیمور اور پہلے پینٹی کوسٹلوں کو یقین تھا کہ آخری دن آ گئے ہیں جلد ہی مسیح کی واپسی اتنی جلدی ممکن نہیں جتنی جلدی کہ توقع کی جا رہی ہے تو پینٹی کوسٹلسٹ اپنے تجزیے اور توجیہیں بدلنے لگے۔انہوں نے اسے خدا کے ساتھ نئے طریقے سے بات کرنا سمجھا۔سینٹ پال نے واضح کیا تھا کہ جب مسیحیوں نے دعا کرنا مشکل سمجھا تو ''ایک دل خراش آواز کے ساتھ روح خود ہماری شفاعت کے لئے بڑھی۔وہ ایک خدا کی طرف بڑھ رہے تھے جس کے ساتھ مکالمہ کا کوئی امکان نہیں۔''

ان ابتدائی برسوں میں ایسا لگا کہ ایک نیا عالمی نظام ان پینٹی کوسٹل عبادات میں کروٹ لے رہا ہے۔معاشی عدم تحفظ کے وقت اور بڑھتی ہوئی اکتاہٹ و بیزاری میں گورے اور کالے مل کر عبادت کرتے اور آپس میں گلے ملتے۔سیمور کو یقین ہو گیا تھا کہ زبانوں کے تحفہ کی بجائے یہ نسلی ملاپ آخری دنوں کی فیصلہ کن نشانی ہے۔پینٹی کوسٹل تحریک میں صرف دوستی اور رفاقت کا ماحول ہی نہیں تھا بلکہ رقابتیں اور گروہ بندیاں بھی تھیں۔ان کے بعض سفید فام افراد نے اپنے علیحدہ گرجے قائم کر لئے تھے مگر لوگوں میں تحریک کی غیر معمولی مقبولیت سے ظاہر تھا کہ حالات بدلنے کے لئے لوگ بغاوت پر بھی آمادہ ہیں۔پینٹی کوسٹلوں کی ایک عبادت کے موقعہ پر عورتیں اور مرد عجیب زبانوں

میں بولتے رہے وجد اور کیف ونشاط کے عالم میں جھومتے رہے اور یہ محسوس کرتے رہے کہ ان کے جسم ایک ایسے سرور کی حالت میں جھوم رہے ہیں جو بیان سے باہر ہے۔لوگ رنگین لہریں ہوا میں تیرتے ہوئے دیکھتے اور لگتا کہ فتح کے سرور میں زمین پر لوٹ رہے ہیں خوشی کا یہ بے تحاشہ اظہار خطرناک تھا مگر ان ابتدائی دنوں میں لوگ عظیم بیداری (Great Awakening) کی طرح مایوسی کا شکار نہیں ہوئے تھے۔افریقی امریکن میں وجد آفرین روحانیت کے بہتر شناور تھے۔اگرچہ بعد میں بعض سفید فام پینٹی کوسٹلسٹ ذہنی عیاشی میں مبتلا ہوگئے۔اپنی ابتداء سے ہی تحریک نے محبت اور ہمدردی پر زور دیا تھا جن کی وجہ سے فرد میں ڈسپلن پیدا ہوا۔سیمور کا کہنا تھا کہ تمہیں غصہ آئے بری باتیں یا غیبت کرو مجھے اس کی پرواہ نہیں کہ تمہاری کتنی ہی زبانیں ہوں۔مگر مقدس روح کے ساتھ تم نے بپتسمہ نہیں لیا۔خدا نے یہ رحمت نازل کی تا کہ سب غریب اور محروم لوگ جمع ہو جائیں اور ہم سب سے محبت کریں، ان کے ایک مفسر ڈی ڈبلیو مائی لینڈ نے 1910 میں لکھا ''خدا حقیر چیزیں اور کمتر لوگ اکھٹے کر رہا ہے اور وہ ان میں جلوہ گر ہے۔'' محبت اور یگانگت ، بنیاد پرست عیسائیت کی نفاق انگیزی کا واضح تضاد تھا اگر کسی مذہبیت کا آخری امتحان عیسائی مذہب ہے تو اس صورت میں پینٹی کوسٹلسٹ بے شک آگے بڑھ رہے تھے۔

جیسا کہ امریکی عالم ہاروے کوکس نے پینٹی کوسٹلزم کے متعلق اپنے بصیرت افروز مطالعہ میں کہا ہے کہ تحریک کا مقصد ان تمام تجربات سے فائدہ اٹھاتا تھا جنہیں جدید مغرب نے رَد کر دیا تھا۔ اسے ریزن (عقل) کی نئی بالادستی کے خلاف عوامی بغاوت کہہ سکتے ہیں۔پینٹی کوسٹلزم اس وقت منظر پر آیا جب لوگوں میں سائنس کے متعلق شبہات پیدا ہونے شروع ہوگئے تھے اور جب مذہب پسندوں میں یہ تکلیف وہ احساس پیدا ہو چلا تھا کہ محض عقل پر انحصار کرنے سے مذہب پر پریشان کن اثرات مرتب ہوئے ہیں کیونکہ مذہب کا انحصار روائتی طور پر وجدانی، تخیلاتی اور جمالیاتی ذہنی ڈسپلن پر ہے۔جب بنیاد پرست انجیل پر مبنی اپنے مذہب کو پوری طرح سائنسی اور استدلالی بنانے میں لگے ہوئے تھے پینٹی کوسٹلسٹ واپس مذہب کی روح تک جانے کی کوشش کر رہے تھے جس کی وضاحت کوکس نے ان لفظوں میں کی کہ سائیکی کا وہ قدرتی سلسلہ جس کے ذریعے مقصدیت اور معنویت کی نہ ختم ہونے والی تلاش جاری رہتی ہے۔جب بنیاد پرست مذہب کو مستند ریشنل مفروضہ سے جوڑ کر مذہبی واردات کو دماغ کے خارجی حصوں تک محدود

کررہے تھے پینٹی کوسٹلسٹ مذہب اور مائتھالوجی کے لاشعوری سرچشموں کا جائزہ لے رہے تھے جہاں بنیاد پرست لفظ اور 'اصلی' کی اہمیت پر زور دے رہے تھے۔ پینٹی کوسٹلسٹ روائتی بولی سے گریز کر کے ابتدائی روحانیت تک پہنچنے کی کوشش کرتے تھے جوروایت کی تہہ میں موجود ہوتی ہے۔ جدید خیالات کے مطابق مرد اور عورتیں یہ دنیا صرف عملی نقطۂ نظر سے دیکھتے ہیں مگر پینٹی کوسٹلسٹ وجد اور ماورائیت کے لئے انسانی خواہش کا اظہار کر رہے تھے۔ اس قسم کے مذہب کی مقبولیت سے واضح تھا کہ ہر شخص جدیدیت کے سائنسی ریشنلزم سے متاثر نہیں تھا۔ جدیدیت سے دستبرداری کی وجہ سے پتہ چلتا تھا کہ بعض لوگوں کے خیال میں مغرب کی بہادر نئی دنیا میں کوئی نہ کوئی کمی ضرور تھی۔

اس مطالعہ کے دوران ہمیں اکثر یہ اندازہ ہوگا کہ جنہیں جدیدیت سے بڑے بڑے فائدے حاصل نہیں ہوئے ان لوگوں کا مذہبی رویہ روحانیت کی کمی کا شدید احساس دلاتا ہے جسے سیکولر معاشرے میں بالکل نظرانداز کر دیا جاتا ہے یا اہمیت نہیں دی جاتی۔ امریکی نقاد سوسین سونٹاگ نے زبان کے معاملے میں وہ مستقل بے چینی محسوس کی ہے جو مغربی اور مشرقی تہذیبوں میں اس وقت ظاہر ہوتی ہے جب فکر اور روحانیت بلندیوں پر ہوتے ہیں۔ ایسے موقعہ پر ہی لوگ انسانی کلام کی صلاحیت سے صوفیاء کی طرح غیر مطمئن ہوتے ہیں کہ زبان شاید خیالات کا ساتھ نہ دے سکے۔ تمام مذاہب کے صوفیاء متفق ہیں کہ آخری حقیقت لازمی طور پر حتمی ہوتی ہے اور یہ کہ اس کا اظہار ممکن نہیں، وہ بیان کے دائرے سے باہر ہے۔ بعضوں نے وجدانی طرز تکلم اختیار کیا تاکہ یہ شعور پیدا ہو کہ جب انسان کا سامنا مقدس اور ماورا سے ہوتا ہے تو لفظ اور ریشنل تصورات اس کا ساتھ چھوڑ دیتے ہیں نہ ان کی بات سمجھ میں آتی ہے جیسا کہ تبتی راہب گہری بھنبھناہٹ کو ذریعہ اظہار بناتا ہے یا مثال کے طور پر ہندو گروناک میں سے آوازیں نکالتا ہے۔ ازوسہ سٹریٹ کے پینٹی کوسٹلسٹ کو ان طریقوں میں سے ایک کا خیال سوجھا تھا جس میں مختلف روائتوں کے ذریعے خدا کو خالص انسانی سلسلہ فکر میں قید کرنے سے منع کیا تھا۔ بنیاد پرست بہرحال مخالف سمت میں جا رہے تھے مگر دونوں اپنے اپنے طریقے سے اس حقیقت پر اپنا ردعمل ظاہر کر رہے تھے جس کے مطابق بیسویں صدی کی ابتدائی دہائیوں تک جدیدیت ایسی پیچیدگی میں الجھ چکی تھی جس کی پہلے کوئی مثال نہیں۔ سکوپس کے مقدمہ میں برائن نے عام لوگوں کی کامن

سینس (عقل سلیم) کی بھرپور حمایت کی تھی اور ماہرین کے ظلم وزیادتیوں پر کاری ضرب لگائی تھی۔ اب پینٹی کوسٹلسٹ عقل کی اجارہ داری کے خلاف بغاوت کر رہے تھے مگر بنیاد پرستوں کی طرح مصر تھے کہ معمولی پڑھے لکھوں کو بھی بولنے کا حق دیا جائے اور ان کی بات بھی سنی جائے۔

اپنی مخصوص اور تادیبی دیندار سے وفادار رہتے ہوئے بنیاد پرست پینٹی کوسٹلسٹس سے نفرت کرتے تھے۔ دارفیلڈ کا کہنا تھا کہ معجزوں کا دور ختم ہوا۔ پینٹی کوسٹلسٹ بھی کیتھولک عیسائیوں جتنے ہی برے ہیں کیونکہ انہیں بھی یقین ہے کہ خدا آج بھی فطرت کے قوانین باقاعدگی سے بدلتا رہتا ہے۔ پینٹی کوسٹلسٹ کی کم نظری اس سائنسی اور لفظی کنٹرول کی توہین تھی جسے بنیاد پرست مذہب سے منسلک کرنا چاہتے تھے تاکہ مذہب ایک ایسی دنیا میں سلامت رہ سکے جو اس کی دشمن ہے۔ بعض بنیاد پرست، پینٹی کوسٹلسٹس کو توہم پرست اور متعصب سمجھتے تھے۔ ایک بنیاد پرست نے تو تمام تحریک کو شیطانی فعل قرار دے دیا۔ یہ توہین آمیز رویہ نئی پروٹیسٹنٹ بنیاد پرستی کا افسوسناک رجحان تھا اور سکوپس کے مقدمہ کے بعد تو یہ تعزیری رویہ اور شدت پکڑ گیا حالانکہ انجیل کی روح سے اس کا کوئی تعلق نہیں تھا مگر اپنے اختلافات کے باوجود دونوں فریق وہ خلاء پُر کرنے کی کوشش کر رہے تھے جو جدید مغربی دنیا میں ریزن (عقل) کی فتحیابی سے پیدا ہو گیا تھا۔ اس ابتدائی مرحلے میں محبت پر زور اور ڈاکٹرین سے بیزاری کی وجہ سے پینٹی کوسٹلسٹس مڈل کلاس لبرل پروٹیسٹنٹ سے قریب تھے اگرچہ ہم دیکھیں گے کہ ان میں سے بعض تو انتہا پسند بنیاد پرست کیمپ کا رخ کریں گے اور انسان دوستی کی اہمیت فراموش کر دیں گے۔

انیسویں صدی کے دوران یہودی دنیا میں بھی مذہب کی مبالغہ آمیز ریشنل صورت سے اکتاہٹ کے آثار پیدا ہو چلے تھے۔ جرمنی میں ہرمن کوہن (1842-1918) اور فرینز روزن زویگ (1886-1929) جیسے فلسفیوں نے روشن خیالی کی قدریں زندہ رکھنے کی کوشش کی۔ اگرچہ روزن زویگ نے قدیم مائیتھالوجی کے تصورات کی تجدید اس انداز سے کرنے کی کوشش بھی کی جو نئے لوگوں کی سمجھ میں آ سکے۔ اس نے تورات کے احکام (جو ہمیشہ ریشنل انداز سے ہی واضح نہیں ہو سکتے تھے) کی وضاحت علامتوں کے طور پر کی جن کا رخ اپنے آپ سے گزر کر خدا کی طرف ہوتا تھا۔ ان مراسم سے یہودیوں میں ایک باطنی رویہ پیدا ہوا جس نے ایسے امکانات کو جنم دیا کہ یہودیوں میں سننے اور انتظار کرنے کا حوصلہ پیدا ہو۔ انجیل میں پیدائش کی کہانیاں ہماری

باطنی زندگیوں کے حقائق کا اظہار میں مارٹن بوبر(1878-1965) جیسے عالموں نے مذہب کی ان مختلف صورتوں کی طرف توجہ دلائی جنہیں ریشنلسٹ مؤرخ رد کر چکے تھے۔ بوبر نے ہیزیڈم کی شادابی کو یاد کیا اورScholem نے کبالہ کی دنیا دریافت کی مگر ان پرانی روحانیتوں کا تعلق ایک مختلف دنیا سے تھا۔اب وہ روحانیتیں یہودیوں کے لئے مبہم اوران کی سمجھ سے باہر تھیں کیونکہ اور ریشنلزم میں جذب ہو چکے تھے۔صیہونی اپنے سیکرلرنظریئے کو بھی مذہبی نظریہ کی طرح اہم سمجھتے تھے اوراسے بھی اسی انداز سے دیکھتے تھے۔لوگوں کو روحانی خلاء آخری کسی طورتو پر کرنا تھا تاکہ مایوسی اورانتشار کی نذر نہ ہو جائیں۔اگر روائتی مذہب کام نہ آیا تو انہوں نے سیکولرسٹ روحانیت ایجاد کر لی جس نے ان کی زندگی کو نئے معنی دیے۔صیہونیت، دوسری جدیدی تحریکوں کی طرح ایک تحریک تھی جس کا مقصد ایک ایسی بنیادی اور واحد قدر کی طرف واپسی تھا جو نئے انداز سے یہودی ہونے کی ترجمان ہو۔اپنی زمین پر واپس جا کرانہیں نہ صرف یہود دشمن طاقتوں سے پناہ مل جائے گی بلکہ تورات کبالہ اور خدا کے بغیر ہی ان چرکوں کا مداوا ہو جائے گا جوان کی سائیکی پر لگے تھے۔صیہونی مصنف ایشرفیسبرگ(1856-1927) کا کہنا تھا کہ یہودیوں کو اور زیادہ سائنسی اورریشنل انداز سے دنیا کو دیکھنا چاہیے مگر صحیح معنوں میں ماڈرن ہوتے ہوئے وہ چاہتا تھا کہ یہودیت کی صحیح روح کی طرف لوٹا جائے مگر صرف اسی صورت میں ایسا ممکن ہے کہ یہودی اپنی جڑوں کی طرف واپس جائیں اور فلسطین میں رہنے لگیں۔صیہونی جو اکثر مذہب سے نفرت کیا کرتے تھے قدرتی طور پر اپنی تحریک کا ذکر قدیم انداز میں کرنے لگے۔ایلیاہ ایک عبرانی لفظ انہوں نے آبادکاروں کے لئے استعمال کرنا شروع کر دیا جس کا مطلب بلندیوں میں چلے جانا ہے۔وہ آبادکاروں کواولم کہنے لگے (یعنی وہ جو اوپر اٹھے یا جوزائرین ہیں) نیا آبادکار زرعی بستی میں آکر شامل ہوتا تو اسےChalutz کہا جاتا جس کے مذہبی معنی آزادی،نجات اور بچالینا ہے۔ جب وہ حیفہ کی بندرگاہ پر پہنچے تو صیہونیوں نے زمین چومنا شروع کر دی۔وہ اپنی آبادکاری کو بھی ولادت کے مترادف سمجھنے لگے اور بعض اوقات اپنی طاقت کے احساس کے طور پر انجیل کے سرداروں اور بزرگوں کی طرح اپنے نام بدلنے لگے۔

مزدور صیہونیت کی رحانیت کا ذکر بڑی فصاحت اور زوردار طریقے سے ہارون ڈیوڈ گارڈن(1856-1922) نے کیا ہے جو1904 میں فلسطین آیا اور گلیلی میںDagania ڈیگنیا

کی ایک نئی کوآپریٹیو میں کام کیا۔ وہاں اسے معلوم ہوا کہ مذہبی یہودی شیخیناہ، نیٹشے، مارکس اور ٹالسٹائی کا طالب علم بھی تھا۔ اسے یقین ہو گیا تھا کہ جدید صنعتی معاشرے نے عورتوں اور مردوں کو اپنے آپ سے دور کر دیا ہے۔ وہ خود اپنی ذات میں جلاوطن ہو گئے ہیں۔ انہوں نے زندگی کا ایک طرفہ اور ضرورت سے زیادہ ریشنل روّیہ اپنایا ہے۔ اس کے توڑ کے لئے انہیں نیچرل لینڈ سکیپ (فطری منظر) میں ڈوب کر تقدس کا فوری اور صوفیانہ شعور حاصل کرنا ہے کیونکہ اسی مقام پر لامحدود نے خود کو بنی نوع انسان پر ظاہر کیا تھا۔ یہودیوں کے لئے یہ منظر فلسطین ہے۔ یہودیوں کی روح سرزمین اسرائیل کے فطری ماحول سے پیدا ہوتی ہے۔ گورڈن کا کہنا تھا: صرف یہودی اسے محسوس کر سکتے ہیں جسے کبالائی بالکل واضح شفاف آسمان کی نہ ختم ہونے والی گہرائی صاف تناظر اور پاکیزگی کی دھند کہتے ہیں۔ محنت کے ذریعے آباد نامعلوم خدا کا شعور پیدا کرتا اور اپنے آپ کو ازسرنو تخلیق کرتا جس طرح صوفیاء اپنی روحانی ریاضتوں کے دوران کرتے ہیں۔ زمین پر کام کرتے ہوئے ایک نااہل اور بکھرا ہوا شخص ایک قدرتی، نارمل اور بھرپور شخصیت میں بدل جاتا، گورڈن کے لئے یہ محض اتفاق نہیں تھا کہ محنت اور خدمت جیسے الفاظ بھی عبادت گاہوں میں دعاؤں کی زینت تھے اب صیہونیوں کی نظر میں تقدیس نیکی اور تکمیل جیسے لفظ گلیلی کی پہاڑیوں اور کھیتوں کھلیانوں میں کام کرتے ہوئے ان کی سخت محنت اور جان فشانی کے گواہ تھے۔

سیکولرازم کو روحانیت کے سانچے میں ڈھالنے کے لئے یہودیوں کی طرف سے جو نت نئی اور جرأت مندانہ کوششیں ہوئیں ان میں سے سب سے اہم کوشش ربی ابراہام یتزک کک (1861-1935) کی ہے جو 1904 میں ربی بننے کے لئے فلسطین پہنچا۔ قدامت پرستوں کے برعکس کک پر صیہونی تحریک کا گہرا اثر ہوا تھا مگر وہ باسل میں ہونے والی دوسرے صیہونی کانفرنس (1898) کے نمائندوں کے اس بیان پر کانپ گیا کہ صیہونیت کا مذہب سے کوئی تعلق نہیں۔ اس نے اس بیان کی سخت مذمت کی ''اس سے ہماری نوخیز قومی تحریک پر موت کے کالے سائے لہرانے لگے ہیں اس سے اس کی زندگی کے سوتے سوکھ جائیں گے یہ ایک زہر ہے جو صیہونیت کو چاٹ رہا ہے۔'' کک اکثر قدیم پیغمبروں کی طرح بولتا تھا مگر اس کے خیالات میں جدید رجحانات بھی تھے۔ وہ ان مذہبی لوگوں میں سے تھا جنہوں نے پہلے عالمی جنگ سے پہلے دیکھ لیا تھا کہ نیکی اور دینداری کے بغیر قوم پرستی ہلاکت ہے۔ اس نے انقلاب فرانس کی مثال دی جو اونچے

تصورات سے شروع ہو کر ظلم اور خون خرابے پر ختم ہوا۔ ایک خالص سیکولر نظریہ خدائی امیج کو روندڈالتا ہے۔ اگر اس نظریئے کے مطابق ریاست سب سے اعلیٰ قدر ہے تو حکمران ایسے لوگوں کو مٹادیتے ہیں جوان کے خیال میں قوم کی بھلائی میں حائل ہیں۔ اگر قوم پرستی یکہ وتنہا لوگوں کے دلوں میں گھر کے لے تو ان کی اخلاقی سطح بلند کرنے کی بجائے انہیں انسانیت کے درجہ سے گرادیتی ہے۔'' ایسے سیکولر نظریات یقیناً رائج رہے ہیں جنہوں نے مافوق الفطرت سے رجوع کئے بغیر لوگوں میں انسانی حرمت کا گہرا شعور پیدا کیا ہے جبکہ مذاہب عام طور پر کسی بھی سیکولر تصور سے زیادہ ہلاکت خیز رہے ہیں۔ مگر کک کا کہنا بروقت تھا اس لئے کہ بیسویں صدی کی خصوصیت ہی شروع سے آخر تک قوم پرست اور سیکولر حکمرانوں کے ہاتھوں ایک نسل کشی کے بعد دوسری نسل کشی رہی ہے۔ کک بے چین تھا کہ کہیں صیہونیت بھی اسی طرح ظالمانہ قوت اور یہودی ریاست خطرناک بت پرستی نہ بن جائے مگر اسے یہ یقین بھی تھا کہ یہودی ریاست کو خدا سے دور کرنے کی کوئی کوشش کامیاب نہیں ہوسکتی کیونکہ یہودی وجودی حیثیت میں خدا سے جڑے ہوئے ہیں۔ انہیں چاہے اس کا علم ہو یا نہ ہو۔ جب وہ فلسطین پہنچا تو اس کے پہلے فرائض میں سے ایک فرض تھیوڈور ہرزل کی شان میں لیکچر دینا تھا جو نوجوانی میں مرگیا تھا۔ فلسطین کے قدامت پسند اس لیکچر پر بہت خفا ہوئے کیونکہ وہ صیہونیت کو خلقی طور پر ایک بدی سمجھتے تھے۔ کک نے ہرزل کو مسیحا کے طور پر پیش کیا۔ ایک ناکام مسیحا، جسے مسیحائی عہد کے آغاز میں ہی یہودیوں کے دشمنوں سے لڑنا تھا اور یروشلم کے دروازے پر جان دینی تھی۔ اس کی کوشش سے بہرحال آخری مسیحا کے لئے رستہ ہموار ہوگیا تھا۔ ہرزل کے متعلق کک کی یہ رائے تھی۔ کک نے کئی تعمیری کام کئے تھے مگر جہاں تک اپنے نظریئے میں سے مذہب کو نکال دینے کا تعلق ہے تو اس سلسلہ میں اس کی تصانیف نقصان دہ تھیں۔ اوران کے مقدر میں بھی اس کے مسیحا کی طرح ناکام ہونا لکھا تھا مگر کک نے یہ بھی کہا کہ صیہونیت کی مخالفت پرانے خیالات کے لوگ بھی اپنے آپ کو مادی تبدیلیوں کا مخالف بنا کر تباہی کے راستے پر لے جارہے ہیں۔ انہوں نے یہودیوں کو کمزور کردیا ہے۔ سیکولر اور مذہبی یہودی دونوں ایک دوسرے کے محتاج تھے۔ ایک کے بغیر دوسرے کا وجود ممکن نہیں تھا۔ اس سے پرانے قدامت پرستانہ وژن کی طرف دھیان جاتا ہے۔ جدید دنیا سے پہلے کی دنیا میں مذہب اور عقل کے میدان الگ تھے مگر دونوں ایک دوسرے کے معاون تھے۔ دونوں کا ہونا ضروری تھا

کیونکہ ایک کے بغیر دوسرا نامکمل اور بے اثر تھا۔ کک ایک کبالائی اور پرانے زمانے کے تصوف اور مائتھالوجی سے متاثر تھا مگر بعض دوسرے مصلحین کی طرح وہ بھی اپنے نقطۂ نظر میں ترقی پسند تھا۔ اسے پورا یقین تھا کہ تغیراب زندگی کا قانون ہے اور یہ کہ زرعی کلچر کی غلامی ختم ہونی چاہیے چاہے یہ عمل کتنا ہی اذیت ناک ہو۔ اسے یقین تھا کہ نئے صیہونی آبادکار یہودیوں کو آگے بڑھائیں گے اور آخرکار ان کے نجات دہندہ ثابت ہوں گے۔ ان کی سفاکانہ عملیت پسندی کا تعلق لوگوس سے ہے جس کے بغیر اس دنیا میں انسانوں کے لئے زندہ رہنا ممکن نہیں مگر جب تک یہ لوگوس تخلیقی طور پر یہودیت کی مائتھوس سے جڑی ہوئی نہ ہو وہ اپنے معنی کھو بیٹھے گی اور زندگی سے کٹ کر بکھر جائے گی۔ جب کک فلسطین پہنچا تو سیکولرازم کے ان نوجوان حامیوں کے ساتھ پہلی بار ملا۔ چند سال پہلے جب انہوں نے مذہب کو رَد کیا تھا تو کک بہت مایوس ہوا تھا مگر جب اس نے انہیں کام کرتے ہوئے دیکھا تو اسے اپنے خیالات بدلنے پڑے تب اسے پتہ چلا کہ ان کی اپنی ایک روحانیت ہے۔ بے شک وہ گستاخ اور بدتمیز تھے مگر ان میں مہربانی، ایمانداری، رحم دلی اور راست بازی جیسی اعلیٰ خوبیاں بھی تھیں۔ علم اور بلند خیالی ان میں بہت عام تھی۔ ان کی سرکشی اور بھی اہم تھی (جس سے کمزور اور مجہول نالاں تھے) کہ اس سے یہودیوں کے آگے بڑھنے میں مدد ملی تھی۔ یہودیوں کی ترقی اور ان کی قسمت بنانے میں ان کی تیز کلامی ناگزیر تھی۔ جب اس نے صیہونی آبادکاروں کی تعریف کی تو اس نے چن چن کر ان کی ایسی خوبیاں بیان کیں جن سے قدیم دور کے کسی بھی دانش ور کو نفرت ہو سکتی تھی۔ جس دور میں کہ لوگ اپنی زندگیوں پر شاکر ہو کر بیٹھے رہتے اور حالات کو بدلنے کا نام نہ لیتے تھے اگر بعض افراد اس غلامی سے انکار کرتے تو اس سماج میں بڑی بے چینی محسوس کی جاتی تھی۔

یہ بے چین روحیں اپنی طاقت کا برملا اظہار کرتی ہیں وہ کسی بھی پابندی اور قید کو ماننے سے انکار کرتی ہیں۔ قوت کے اس مظاہرے سے دنیا بہتر اور قوم وانسانیت متحرک ہوتی ہیں۔ صرف شروع میں یہ ایک بحران سا لگتا ہے۔ اگر تلمود دور کے ربیوں نے یہ پیش گوئی نہ کی ہوتی کہ گستاخی اور جسارت کا ایک دور آئے گا جب نوجوان اپنے بزرگوں کے خلاف ہو جائیں گے، تو یہ بغاوت محض مسیحا کے قدموں کی آہٹ تھی، اداس قدم، جو ایک نشاط انگیز زندگی کی طرف لے جاتے ہیں۔

مذہبی مفکرین میں سے کک پہلا مفکر تھا جو نئے سیکولرازم سے متاثر ہوا تھا اگرچہ اسے یقین تھا کہ صیہونیوں کی اس مہم سے آخر کار فلسطین میں مذہب کی تجدید ہوگی۔ سیکولر اور مذہبی عناصر کو لوگوس اور مائتھوس کی نمائندگی کرتے ہوئے اور شانہ بہ شانہ امن کی زندگی گزارتے ہوئے دیکھنے کی بجائے اس نے ہیگل کے متضاد قوتوں کے جدلیاتی تصادم کے اس وژن کو آگے بڑھایا جو نجات کی صورت میں ایک کل میں بدل جاتا ہے۔ سیکولرازم کے حامی مذہبی عناصر سے متصادم تھے مگر اس بغاوت کے ذریعے صیہونی تاریخ کو نئی تکمیل کی طرف دھکیل رہے تھے تمام مخلوق، خدا کے ساتھ حتمی ملاپ کے لئے آگے بڑھ رہی تھی۔ یہ حقیقت ارتقائی عمل میں نظر آتی ہے جسے جدید سائنس نے بیان کیا یا کوپرنیکس، ڈارون اور آئن سٹائن کے سائنسی انقلاب میں جس نے روائتی تصورات ختم کردیئے مگر نئے علم کو جنم دیا۔ پہلے عالمی جنگ کا عذاب بھی لوریائی الفاظ میں 'برتنوں کا ٹوٹنا' تخلیقی عمل کا حصہ تھا جو بالآخر ہماری دنیا میں نیکی بحال کردے گا۔ 'مذہبی یہودیوں کو اس نظر سے صیہونی بغاوت دیکھنی چاہیے ایسا وقت بھی آتا ہے جب تورات کے قوانین مسترد کردینے چاہییں۔ کک نے سرکشی سے کہا 'جب لوگ مختلف راستے کی تلاش میں ہوتے ہیں، ہر چیز نئی اور بے مثل، صحیح راستہ دکھانے والا کوئی نہیں ہوتا اس لئے پابندیاں توڑ دینے سے مقصد حاصل ہوتا ہے بظاہر تو یہ افسوس کی بات ہے مگر حقیقت میں خوشی کا ذریعہ ہے۔' کک کی نظر سے مشکلات پوشیدہ نہیں تھیں۔ مذہبی اور سیکولر یہودیوں کے مابین جنگ ٹھنی ہوئی تھی۔ ہر فریق اپنے آپ کو سچا سمجھتا تھا۔ صیہونی غیر ضروری پابندیوں کے خلاف جدوجہد میں سچے تھے جبکہ قدامت پسند بجا طور پر روایت کو قبل از وقت ترک کردینے سے پیدا ہونے والے انتشار سے بچنا چاہتے تھے مگر ہر فریق جزوی طور پر سچا تھا۔ ''ان کے باہمی تصادم سے ایک ایسی وحدت جنم لے گی جس سے صرف یہودی ہی نہیں بلکہ تمام دنیا فائدہ اٹھائے گی۔ ہماری نشاۃ ثانیہ سے دنیا بھر کی تہذیبوں کی تجدید ہوگی۔ تمام مذاہب نئی زندگی پائیں گے۔'' یہ کسی مسیحا کا خواب تھا۔ کک کو واقعی یقین تھا کہ وہ آخری دور میں زندہ ہے اور جلد ہی تاریخ کو آخری بار مکمل ہوتا ہوا دیکھے گا۔

کک اپنی نئی متھ بنا رہا تھا جس کا تعلق اس کے اپنے دور کے غیر معمولی واقعات اور کبالہ کی دائمی علامتوں سے تھا مگر نئے دور کا آغاز ہوتے ہوئے اس کی متھ کا رخ مستقبل کی طرف تھا وہ ایک اذیت ناک اور مضطرب وقت کا ذکر کرتا ہے جس کے زور سے تاریخ آگے بڑھ رہی ہے۔

اس کی بجائے کہ یہودی قارئین کوتمام چیزیں اسی طرح قبول کرنے کی ترغیب دیں جیسی کہ وہ ہیں یا ہوسکتی ہیں کک کا کہنا تھا کہ ماضی کے سارے مقدس قوانین کا خاتمہ ضروری ہے تاکہ نیا آغاز ہوسکے۔اس جدید رجحان کے باوجود کک کی متھ کا تعلق، بدستور ایک لحاظ سے جدیدیت سے پہلے کی دنیا سے تھا۔ مذہبی اور ریشنل صیہونی ان دونوں فریقوں کے متعلق اس کا خیال، مائتھوس اور لوگوس کے قدیم تصور سے مشابہہ تھا۔ ریشنل عملیت پسند تاریخ کو آگے بڑھارہے تھے جیسا کہ ہمیشہ لوگوس کا کردار رہا ہے جبکہ مذہبی جو مائتھوس اور مسلک کے نمائندہ ہیں وہ اس عمل کو معنی دیتے تھے۔ دونوں کی محنت یکساں ہے۔''ہم بنیادیں بناتے ہیں اور آبادکار دیواریں اٹھاتے ہیں۔'' اسے بہت شوق تھا کہ قدامت پسندون کا بتائے کہ متھ کے بغیر صیہونیوں کی سرگرمیاں نہ صرف بے معنی بلکہ خطرناک ہیں صیہونیوں کو شاید پتہ نہ ہومگر وہ خدا کے آلۂ کار ہیں۔ تاکہ خدا کی بادشاہت کا منصوبہ پورا ہو۔صرف اسی وجہ سے ان کی مذہبی بغاوت قابل قبول ہے۔اور بہت ہی جلد۔ کک کا خیال تھا کہ یہ واقعہ اس کی زندگی میں ہوگا۔ارض مقدس میں ایک روحانی انقلاب ہوگیا اور تاریخ سرخرو ہوگی۔

قدیم دور کے دستور کے مطابق کک کی یہ خواہش نہیں تھی کہ اس کی متھ ایک نظریہ یا کسی عمل کا ایجنڈا بن جائے۔اس کے پیرو بہت تھوڑے تھے اس کی زندگی میں اسے خبطی سمجھا جاتا تھا۔ کک نے فلسطین میں صیہونیوں کی سرگرمیوں کا کوئی سیاحی حل نہیں تجویز کیا۔'سب کچھ خدا کے ہاتھ میں ہے،' کک کی دیومالا اس کے پیروؤں کو صرف اس قابل کردیتی تھی کہ وہ دیکھ سکیں کہ ان کے آس پاس کیا ہورہا ہے۔ کک اس بات سے بالکل بے تعلق دکھائی دیتا تھا کہ مستقبل میں یہودی ریاست کی شکل کیا ہوگی۔ جہاں تک میرا تعلق ہے میرا مسئلہ روحانیت ہے جس کی جڑیں پاکیزگی میں ہوں۔اس نے اپنے بیٹے یہودا(1891-1981) کولکھا۔ مجھے اس کی پرواہ نہیں کہ سرکاری سطح پر معاملات کیا رخ اختیار کرتے ہیں۔ اگر روح زندہ ہے تو مطلوبہ مقاصد پورے ہوسکتے ہیں۔اس لئے کہ روشن اور آزاد دینداری کے اعلیٰ ترین اظہار کے ذریعے ہم حکومت کے تمام راستے روشن کرسکتے ہیں۔ گمراہی کے موجودہ دور میں سیاست کرپٹ اور ظالم ہاتھوں میں ہے۔ کک کو حکمرانوں کی زبردست ناانصافیوں سے سخت نفرت تھی۔خوش قسمتی سے یہودیوں نے 70 قبل مسیح سے (جب انہوں نے ارض مقدس کھوئی اور جلاوطن ہوگئے تھے) عملی سیاست میں

کوئی حصہ نہیں لیا تھا۔ جب تک کہ دنیا اخلاقی اور روحانی لحاظ سے بہتر ہو جائے۔ یہودی سیاست سے باہر رہیں۔ ظلم اور خون ریزی کے ہوتے ہوئے انہیں حکومت میں شامل نہیں ہونا چاہیے مگر دنیا جلد ہی سدھر جائے گی۔ جب ایسا ہو جائے تو یہودی اپنی حکومت بنالیں اور اپنی مرضی کی پالیسیاں نافذ کریں ایک دفعہ خدا کے یہ بندے واضح اور یقینی طور پر اپنی زمین پر آباد ہو جائیں پھر وہ سیاست کو ظلم اور زیادتی سے پاک کر دیں گے۔ جدید دنیا سے پہلے متھ کے ذریعے عملی قدم نہیں اٹھائے جاتے تھے یہ کام لوگوس کا تھا اور کک کے خیال میں اب یہ کام آباد کاروں کے لئے تھا۔

کک کا بدستور یہی خیال تھا کہ موجودہ صورتحال میں سیاست اور مذہب کا نباہ ممکن نہیں۔ یہ خیال قدامت پرست دنیا میں ایک ٹابو(Taboo) کی شکل اختیار کر گیا تھا۔ صیہونی جنہوں نے مذہب کو نظرانداز کر دیا تھا وہ تمام عملی کام سرانجام دے رہے تھے۔

کک1935 میں اسرائیل کی ریاست قائم ہونے سے تیرہ برس پہلے انتقال کر گیا تھا۔ اس نے وہ حالات نہیں دیکھے جو یہودیوں کو عربوں کے فلسطین کو اپنی ریاست بنانے میں پیش آئے۔ نہ1948 میں اس نے750,000 فلسطینیوں کا اخراج ان کے اپنے گھروں سے ہوتے ہوئے دیکھا، نہ اسرائیلیوں اور عربوں کے درمیان ہونے والی جنگوں میں بہتا ہوا خون اس نے دیکھا، نہ اسے اس حقیقت کا سامنا کرنا پڑا کہ اسرائیلی ریاست کے بننے کے پاس سال بعد بھی اکثر یہودی سیکولرازم کے پیرو ہیں۔ اس کے بیٹے زوی یہودا نے سب کچھ دیکھا اور اپنے بڑھاپے میں اپنے باپ کی مائتھوس کو عملی سیاست کا پروگرام بنایا اور ایک بنیاد پرست تحریک قائم کی۔ مگر اس ہنگامہ خیز دور میں کیا یہودی سیاست سے باہر رہ سکتے تھے؟ صرف یہ نہیں کہ ماڈرن سوسائیٹی بتدریج یہودیوں کی مخالف ہو رہی تھی بلکہ سیکولرازم یہودیوں پر چھا رہا تھا اور روائتی طرز زندگی کی اہمیت کم ہو رہی تھی۔ مشرقی یورپ میں جدید دور ابھی شروع ہی ہوا تھا۔ روس اور پولینڈ کے اکثر ربی بدستور نئی دنیا سے منہ موڑے اور سیاست سے کنارہ کئے ہوئے تھے۔ کوئی اچھا یہودی جمہوری ریاست کی جدید سیاست زندگی کے سمجھوتوں اور سودابازیوں میں حصہ لے کے اپنی دیانت کیونکر خاک میں ملا سکتا تھا۔ وہ اس طرح تورات کے تقاضے کیسے پورے کر سکتے تھے۔ کافروں کے ساتھ سودابازی کر کے اور ان سیاسی اداروں کا حصہ بن کر یہودی اپنی قوم پر بے دینی کے دروازے کھول دیں گے جس سے اس میں کرپشن پھیل جائے گی مگر Misrgdic Yeshivot اور

پولینڈ کے ہیز ہڈم نے اختلاف کیا۔ وہ دیکھ سکتے تھے کہ کئی صیہونی جماعتیں اور یہودی سوشلسٹ پارٹی یہودیوں کو بہکا کر منکرین خدا کے راستے پر لے جارہے تھے۔ وہ سیکولرازم کی سمت ان کا رجحان روک دینا چاہتے تھے اور سمجھتے تھے کہ اس نئے خطرہ سے نئے انداز میں اس کے ہتھیاروں کے ذریعے نمٹا جاسکتا ہے۔ مذہبی یہودیوں کو چاہیے کہ وہ سیکولرزم کے حامیوں کا سامنا انہی کے حربوں سے کرنے سے گریز کریں۔ اس طرح قدامت پسند کے حق میں ایک جدید سیاسی جماعت تیار ہوجائے گی۔ یہ بالکل ہی نیا آئیڈیا نہیں تھا۔ ایک عرصہ سے روس اور پولینڈ کے یہودی اپنے مفاد کے لئے حکومت کے ساتھ مذاکرات کرتے تھے نئی قدامت پسند پارٹی نے یہ کام زیادہ منظّم اور بہتر طریقہ سے جاری رکھا۔ 1912 میں Missgdic Roshey Yeshivot اور ہیزیڈم نے ''دی یونین آف اسرائیل'' کے نام سے ایک نئی پارٹی بنائی۔ اس پارٹی میں Mizrochi ''مذہبی صیہونیوں کی ایسی ایشن'' کے اراکین شامل ہوئے۔ یہ ایسوسی ایشن ربی اسحٰق جیکب (1915-1839) نے 1901 میں قائم کی Mizrochi ربی کک سے مختلف اور کم انقلابی تھا۔ کک نے تو صیہونی مہم کو ایک زبرست مذہبی رجحان سمجھا تھا مگر زیادہ قدامت پسند اس سے متفق نہیں تھے۔ صیہونیوں کی سیاسی سرگرمیوں کے کوئی مذہبی معنی نہیں تھے جس کے لئے قدامت پسندوں کی حمایت ضروری تھی۔ اگر فلسطین میں یہ وطن قائم ہوسکے تو مزورچی کے خیال میں یہ ایک روحانی تجدید ہوگی۔ 1911 میں باسل کی دسویں صیہونی کانفرنس انہیں فلسطین میں ان کے مذہبی سکولوں کے لئے مساوی رقم مہیا نہ کرسکی چنانچہ صیہونیت کے ساتھ وہ مزید تعاون کرسکتے تھے جس کا مقصد انقلابی سیکولرازم تھا۔ اب وہ اگودت اسرائیل کے ساتھ چلنے کے لئے تیار تھے جس کی شاخیں جلد ہی مشرقی اور مغربی یورپ میں پھیل گئیں مگر مغرب میں اگودت کے اراکین نے یہ تحریک روسی اور پولش یہودیوں کی نسبت (جو براہ راست اقدام کے متعلق بہت محتاط تھے) بڑی مختلف روشنی میں دیکھی۔ روس اور پولینڈ کے یہودیوں نے اگودت کو محض دفاعی تنظیم سمجھا جس کا کام اس نازک دور میں یہودیوں کے مفاد کا خیال رکھنا تھا جبکہ مشرقی یورپ کی حکومتیں جدید ہونے کی کوشش میں تھیں۔ انہوں نے اپنی سرگرمیاں محدود رکھیں۔ نئے سیاسی فریم ورک میں یہودیوں کی حالت بہتر ہوبنانے کی کوشش میں صیہونیت سے توبہ کی اور پولش ریاست کی اطاعت قبول کرلی مگر مغرب میں جہاں جدید ہونے کا عمل تیز تھا، یہودی مختلف کام کرنے کے

لئے تیار تھے۔ مغرب میں اگودت کے اکثر اراکین نئے قدامت پسند تھے جو بذات خود یہودیت کی نئی شکل تھی۔ اب وہ نئی دنیا کے عادی ہوگئے تھے اور انہیں اس کے تقاضوں سے خوف نہیں آتا تھا بلکہ وہ انہیں بدلنا چاہتے تھے اپنی پارٹی کو ایک دفاعی تنظیم بنانے کی بجائے ان کی خواہش تھی کہ وہ جارحانہ رویہ اپنائیں اور اس کے لئے انہوں نے ابتدائی بنیاد پرستی کو فروغ دیا۔

مشرقی یہودیوں کی طرح اگودت کا آغاز جیکب روزینہم(19656-1870) کے لئے کوئی مجبوری نہیں تھی بلکہ ایک عالم گیر واقعہ تھا۔ 70 قبل مسیح کے بعد پہلی مرتبہ یہودیوں کا ایک متحدہ مرکز قائم ہوا تھا۔ اگودست اسرائیل پر خدا کی حکومت کی علامت اور یہودیوں کی مرکزی تنظیم تھی پھر بھی روزینہم سیاست کے معاملے میں ذرا محتاط تھا اور چاہتا تھا کہ اگودت اپنی سرگرمیاں یہودی سکولوں کی دیکھ بھال اور یہودیوں کے معاشی حقوق کے تحفظ تک محدود رکھے۔ نوجوان اراکین زیادہ باغی اور احتجاجی بنیاد پرستوں سے زیادہ قریب تھے آئزاک برنز(1946-1883) کی خواہش تھی کہ اگودت ہمت کرے وار یہودی معاشرہ کی اصلاح کا کام شروع ہو۔ Premellenalists کی طرح وہ دنیا کے کاموں میں خدا کی نشانیاں دیکھ سکتا تھا۔ جنگ عظیم اور اعلان بالفور مسیحا کے قدموں کی آہٹ تھی۔ ’یہودیوں کے لئے ضروری ہے کہ وہ بورژوازی معاشرے کی کرپٹ قدریں رَد کردیں، یورپ کی حکومتوں کے ساتھ تعاون ترک کردیں اور ارض مقدس میں تورات کی بنیاد پر مذہبی حکومت قائم کریں۔ یہودی تاریخ بگڑ چکی ہے، یہودی اپنی روایات سے ہٹ چکے ہیں۔ یہ وقت ہے کہ یہودی تاریخ صحیح خطوط واپس لائی جائے اور اگر یہودی پہلا قدم اٹھا سکیں تو کرپٹ ڈیاسپورا (جلاوطنی) چھوڑ کر اپنی اصلی قدروں کی طرح لوٹ جائیں اور تورات کے احکام کے مطابق اپنے وطن میں زندگی گزاریں، خدا مسیحا بھجوائے گا۔

یہودی عالم ایلن ایل مٹلمین نے نوٹ کیا کہ اگودت کے ابتدائی تجربہ سے پیدا چلتا ہے کہ بنیاد پرستی کس طرح کام کرتی ہے۔ یہ جدید سیکولر سوسائیٹی کا فوری جواب نہیں بلکہ اس وقت پھیلتی پھولتی ہے جب جدیدیت کا عمل خاصا آگے بڑھ جاتا ہے۔ پہلے تو روایت پسند، مشرقی یورپ میں اگودت کے اراکین کی طرح صرف یہ کوشش کرتے ہیں کہ وہ کس طرح اپنے مذہب، نئے چیلنج کے مطابق بنا سکیں۔ وہ بعض جدید خیالات اور ادارے اپنا لیتے ہیں اور ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ یہ روایت کے لئے نئے نہیں یہ کہ مذہب اتنا جاندار ہے کہ ایسی تبدیلیاں جذب کر سکے مگر

جب سوسائٹی مکمل طور پر سیکولر اور ریشنل بن جاتی ہے تو بعض لوگ یہ تبدیلیاں قبول نہیں کرتے۔ انہیں احساس ہونے لگتا ہے کہ سیکولر جدیدیت، قدامت پسند مذہب کی سراسر مخالف ہے اور بنیاد قدروں کے لئے خطرہ ہے تو وہ اس کا بنیاد پرستانہ حل تلاش کرنا شروع کرتے ہیں جو انہیں بنیادی اصولوں کی طرف واپس لے جاتا ہے اور اس طرح جوابی حملے کا منصوبہ تیار ہوتا ہے۔

وہ مسلمان جن کے متعلق ہم غور کر رہے ہیں۔ ابھی اس منزل سے دور تھے مصر میں جدیدیت کا عمل ابھی مکمل ہونے سے بہت دور تھا اور ایران میں وہ شروع نہیں ہوا تھا مسلمان ابھی اسلامی تناظر میں رکھ کر نئے خیالات کو سمجھنے کی کوشش کر رہے تھے یا سیکولرازم اپنا رہے تھے۔ بنیاد پرستی، مسلم دنیا میں ظاہر نہیں ہوئی تھی جب تک کہ یہ ابتدائی مصلحتیں بعض مسلمانوں کی نظروں میں ناکافی ثابت نہ ہوئیں۔ ویسے مسلمان سیکولرازم کو اسلام کی تباہی کا سامان سمجھتے تھے اور مشرق وسطیٰ میں جہاں مغربی جدیدیت اجنبی تناظر میں نافذ کی جارہی تھی۔ وہ اکثر انہیں سخت جارحانہ لگی۔

ترکی جیسے نئے سیکولر ملک میں یہ بات اور بھی واضح تھی۔ پہلی عالمی جنگ کے بعد عثمانی سلطنت کو جس نے جرمنی کی طرف سے جنگ میں حصہ لیا تھا یورپی اتحادیوں کے ہاتھوں شکست ہوئی، جنہوں نے سلطنت عثمانیہ کے حصے بخرے کر دیئے اور اس کے پرانے صوبوں میں اپنے احکام جاری کر دیئے۔ یونانیوں نے اناطولیہ اور پرانے عثمانی مرکز پر حملہ کر دیا۔ 1921 سے 1922 کے دوران مصطفیٰ کمال اتاترک (1881-1938) نے ترک قوم پرست فوجوں کی قیادت جنگ آزادی میں کی اور یورپی طاقتوں کو ترکی سے دور رکھنے اور آزاد ریاست بنانے میں کامیاب ہوگیا۔ ملک کو جدید یورپین خطوط پر چلایا گیا۔ اسلامی دنیا میں پہلے ایسی کوئی مثال نہیں تھی۔ 1947 تک ترکی میں ایک باصلاحیت بیوروکریسی اور سرمایہ دارانہ معیشت قائم ہوگئی اور مشرق وسطیٰ میں پہلی کثیر جماعتی سیکولر جمہوریت نے جنم لیا مگر یہ کامیابی نسل کشی کے عمل کے ساتھ شروع ہوئی۔ 1894 سے 1927 تک مختلف عثمانی اور ترک حکومتوں نے غیر ملکی عناصر سے نجات حاصل کرنے کے لئے اناطولیہ کے یونانی اور آرمینی باشندوں کو قتل یا جلاوطن کر دیا جو بوژوازی کا 90 فیصد تھے۔ صرف یہ نہیں کہ اس اخراج نے نئی ریاست کو ترکی کی قومی تشخص دیا بلکہ اس نے اتاترک کو خالص ترک کمرشل طبقہ پیدا کرنے کا موقعہ دیا جس نے جدید صنعتی معیشت کے قیام میں اس کی حکومت سے تعاون کیا۔ کم از کم دس لاکھ آرمینیوں کا قتل بیسویں صدی میں نسل کشی کا

پہلا واقعہ تھا جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ ربی کک کا کہنا سچ تھا کہ سیکولر قوم پرستی اتنی ہی مہلک اور خطرناک ہوسکتی ہے جتنی کہ مذہب کے نام پر ہونے والی جلاوطنی یا جنگ ہوسکتی ہے۔

ترکی میں سیکولرازم پھیلانے کا عمل جارحانہ بھی تھا۔ اتاترک نے اسلام کو مغربی رنگ دینے کا ارادہ کرلیا تھا وہ چاہتا تھا کہ مذہب انسان کا ذاتی معاملہ ہو۔ قانونی سیاسی اور معاشی اعتبار سے اس کا کوئی اثر نہ ہو۔ مذہب ریاست کے ماتحت ہوگیا۔ صوفی سلسلے ختم کردیئے گئے۔ تمام مدارس اور قرآن سکول بند ہوگئے مغربی لباس قانونی طور پر مسلط کردیا گیا۔ عورتیں برقعہ اور مرد فیض کیپ نہیں پہن سکتے تھے۔ اسلام نے آخری مقابلہ کیا جب نقشبندی صوفی سلسلہ کے سربراہ شیخ سعید السوری نے ایک بغاوت کی قیادت کی جسے اتاترک نے بڑی آسانی اور مہارت کے ساتھ دو مہینوں میں کچل دیا۔ مغرب میں سیکولرازم کو آزادی کا ذریعہ سمجھا گیا تھا بلکہ شروع میں تو اسے مذہبی ہونے کا بہتر طریقہ کہا گیا۔ سیکولرازم ایک مثبت رویہ تھا جس نے رواداری سکھائی تھی مگر مشرق وسطیٰ میں اس کا تجربہ جبر و تشدد کی صورت میں ہوا۔ جب بعد میں مسلم بنیاد پرست سیکولرازم کو اسلام کا دشمن قرار دیتے تھے تو ان کا اشارہ اکثر اتاترک کی طرف ہوتا تھا۔

مصر نے ترکی کی طرح نہ تو آزادی جلدی حاصل کی اور نہ ہی وہاں جمہوریت قائم ہوئی۔ پہلی عالمی جنگ کے بعد مصری قوم پرستوں نے آزادی کا مطالبہ کیا تھا۔ اس موقعہ پر فسادات ہوئے۔ ریل کی پٹریاں اکھاڑی گئیں۔ انگریزوں پر حملے ہوئے اور ٹیلیگراف کی لائنیں کاٹی گئیں۔ 1922 میں انگریزوں نے مصر کو کسی حد تک آزادی دی، خدیو فواد، نیا بادشاہ بنا۔ مصر کو ایک لبرل آئین اور نمائندہ پارلیمانی ادارہ بنادیا گیا مگر یہ حقیقی جمہوریت نہیں تھی اور نہ ہی آزادی تھی کیونکہ برطانیہ نے دفاع اور خارجہ پالیسی اپنے پاس رکھی۔ 1923 اور 1930 کے درمیان وفد پارٹی نے مطالبہ کیا کہ انگریز مصر سے چلے جائیں۔ وفد پارٹی بڑی اکثریت کے ساتھ انتخابات میں کامیاب ہوتی تھی مگر ہر بار بادشاہ یا انگریزوں کے دباؤ میں آکر مستعفی ہوجاتی تھی۔ یہ جمہوری نظام برائے نام تھا جس کی وجہ سے مصریوں کو وہ خودمختاری حاصل نہ ہوتی تھی جو نئی دنیا کا لازمی حصہ تھی۔ انگریز جتنی زیادہ مداخلت انتخابی عمل میں کرتے جمہوریت اور زیادہ مشکوک نظر آتی تھی۔

بیسویں صدی کی پہلی تین دہائیوں میں ممتاز مصری مفکرین کا رجحان سیکولرازم کی طرف

تھا۔عبدہ کے پیرو لطفی السیّد(1963-1872) کی تصانیف میں اسلام کا بہت کم ذکر تھا۔لطفی کو یقین تھا کہ مغرب کی کامیابی کا راز ان کی قوم پرستی میں ہے۔وہ چاہتا تھا کہ جدید ادارے اسلامی بنیاد پر قائم کئے جائیں۔اسلام کے متعلق اس کا نظریہ بہت مبالغہ آمیز تھا۔ٹھیک ہے کہ جدید قومی شعور پیدا کرنے میں مذہب نے اہم کردار ادا کیا تھا مگر ایسا کرنے والے عناصر میں مذہب صرف ایک عنصر تھا۔اسلام کے پاس کوئی خصوصی یا امتیازی بات نہیں تھی۔اسلام کو سرکاری مذہب بننا ہی تھا کیونکہ اکثر مصری مسلمان ہیں اور اسی نے ان میں زندگی کا شعور پیدا کیا تھا مگر کسی دوسرے معاشرے میں بالکل یہی کام کوئی اور مذہب کرتا۔ایک اور کتاب السلام واصول الحکم، جس کا مصنف علی عبدالرزاق(1966-1888) تھا اس کی رو سے جدید مصر کو اسلام کے ساتھ اپنا تعلق بالکل توڑ لینا چاہیے اس نے لکھا کہ خلافت کے ادارہ کا قرآن میں کہیں ذکر نہیں اور یہ کہ پیغمبر اسلام، بیسویں صدی کے معنوں میں ریاست یا حکومت کے سربراہ نہیں تھے۔اس لئے کوئی چیز مصریوں کو ایک بالکل سیکولر اور مغربی طرز کی حکومت بنانے سے نہیں روک سکتی۔

الرازق کی کتاب کے خلاف بڑا ہنگامہ ہوا بالخصوص ایک صحافی رشید رضا (1935-1865) نے اعلان کیا کہ اس قسم کی باتوں سے مسلمان قوموں کا اتحاد کمزور ہوتا ہے اور وہ آسانی کے ساتھ مغربی سامراج کا شکار بن سکتی ہیں۔رضا پہلا مسلمان تھا جس نے سیکولرازم کی بجائے شریعت کی بنیاد پر ایک جدید اسلامی ریاست قائم کرنے کی تجویز پیش کی۔اپنی زبردست تصنیف، الخلیفہ(23-1922) میں اس نے خلافت بحال کرنے کے موضوع پر بحث کی۔وہ عبدہ کا سوانح نگار اور اس کا بہت چاہنے والا تھا اور اگرچہ وہ مغربی فکر سے اچھی طرح واقف تھا لیکن وہ عبدہ کی طرح مغرب کے لوگوں میں گھل مل نہ سکا۔مغرب کے خلاف اتحاد قائم کرنے کے لئے مسلمانوں کا متحد ہونا ضروری تھا مگر یہ حل وقت طلب اور صبر آزما تھا۔اس سے پیشتر کہ صحیح معنوں میں جدید خلافت قائم ہو۔اس کی تیاریوں میں بہت وقت لگتا تھا۔اس نے مستقبل کا خلیفہ ایسے مجاہد کے طور پر سوچا جسے اسلامی شریعت پر مکمل عبور ہوگا اور جو اسے ضرر پہنچائے بغیر جدید سانچے میں ڈھال دے گا۔اس طرح وہ ایسے قوانین بنا سکے گا جن کی اطاعت مسلمان فی الواقع کریں کیونکہ باہر سے درآمد کرنے کی بجائے ان کی بنیاد مسلمانوں کی اپنی روایات پر ہوگی۔رضا ویسا ہی ریفارمر تھا جیسے کہ ابن تیمیہ اور عبدالوہاب تھے۔وہ بیرونی خطرے کا سامنا بنیادوں کی طرف

واپسی سے کرنا چاہتا تھا۔ ماڈرن مسلمان ایک نیا اور متحرک اسلام، سلف یعنی مسلمانوں کی پہلی نسل کے تصورات کی سمت لوٹ کر ہی تخلیق کر سکتے تھے مگر رضا کی سلفاء تحریک ماضی کی طرف غلامانہ واپسی نہیں تھی۔ جدیدیت کی ابتداء کے مصلحین کی طرح وہ جدید مغرب کے علم اور قدروں کو سمجھنے کی کوشش انہیں اسلامی تناظر میں رکھ کر رہا تھا۔ وہ ایک ادارہ قائم کرنا چاہتا تھا جہاں طالب علموں کو بین الاقوامی قانون، سماجیات، تاریخ عالم، مذہبی اداروں کی تنظیم اور مغربی سائنس کے اصولوں سے روشناس کیا جائے اسی وقت جبکہ وہ اسلامی فقہہ کا مطالعہ کرتے ہیں۔ اس طریقہ سے علماء کا ایک نیا طبقہ پیدا ہوگا جو الازہر کے علماء کے برعکس (جنہیں مایوسی کی حد تک وقت سے پیچھے سمجھتا تھا) اپنے زمانہ کے لوگ ہوں گے جو اجتہاد کے اہل اور اس کی روایت سے وفا کریں گے۔ ایک دن ان نئے علماء میں سے شاید کوئی جدید خلیفہ بھی پیدا ہو۔ رضا بنیاد پرست نہیں تھا وہ اب بھی اسلام اور جدید مغربی کلچر میں خلیج پیدا کرنے کی بجائے اسے پاٹنے کی کوشش کر رہا تھا مگر اس کی تصانیف نے مستقبل کے بنیاد پرستوں کو متاثر کیا۔ اپنی زندگی کے آخری دنوں میں رضا مصری قوم پرستوں سے دور ہو گیا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ سیکولرازم مسئلے کا حل نہیں ہے۔ وہ اتاترک کے مظالم پر ششدر رہ گیا۔ جب ریاست سب سے اونچی قدر بن جائے تو ایسا ہی ہوتا ہے۔ کوئی نہیں ہوتا جو حکمران کو قوم کے مفاد میں ان کی عملی مگر ظالمانہ پالیسیوں پر ٹوکے۔ رضا کو یقین تھا کہ اگر مغرب میں نہیں تو مشرق وسطیٰ میں ظلم اور غیر رواداری، مذہب کے زوال کی وجہ سے ہیں۔ ایسے وقت جبکہ مصر کے کئی ممتاز مفکر اسلام سے منہ موڑ رہے تھے رضا اپنے اس یقین پر قائم تھا کہ جدید مسلم ریاستوں کے لئے مذہب کی طرف سے عائد کردہ پابندیاں ضرور ہیں۔

اگر مصر میں لوگ یہ سمجھتے تھے کہ یورپ کی کامیابی کا راز ان کی قوم پرستی ہے تو بیسویں صدی کے آغاز میں ایرانی کامیابی کا راز ان کی آئینی حکومت کو سمجھتے تھے۔ اس موقعہ پر کئی مصریوں کی طرح، ایرانی بھی مغرب کی تقلید کرنا چاہتے تھے۔ 1904 میں جاپان کے (جس نے حال ہی میں آئینی حکومت بنائی تھی) ہاتھوں روس کو زبردست شکست ہوئی۔ زیادہ عرصہ نہیں ہوا تھا کہ جاپان، ایران کی طرح جاہل اور پسماندہ تھا۔ مگر اب، مصلحین کے مطابق اپنی آئین کی بدولت یورپ کا ہمسر تھا اور یورپ کو اس کے اپنے کھیل میں ہرا سکتا تھا۔ بعض علماء کو بھی یقین ہو گیا تھا کہ شاہوں کی آمرانہ حکومت سے نجات کے لئے نمائندہ حکومت ضروری ہے جیسا کہ سید محمد طباطبائی ایک

آزادی خیال مجتہد نے اسے اس طرح واضح کیا۔

'خود ہم نے کبھی آئینی حکومت نہیں دیکھی مگر اس کے متعلق سن رکھا ہے۔ جنہوں نے آئینی ملک دیکھے ہیں انہوں نے ہمیں بتایا ہے کہ ایک آئینی حکومت ملک میں امن اور خوشحالی لائے گی اس سے ہم میں جوش اور امنگ پیدا ہوئی ہے' مصری علماء کے برعکس کہ جنہوں نے ڈر کر مدراس میں پناہ لے لی تھی ایرانی علماء انقلاب کا پہلا دستہ تھے اور آنے والے واقعات میں فیصلہ کن کردار ادا کرتے تھے۔

دسمبر 1905 میں تہران کے گورنر نے حکم دیا کہ شوگر کے کئی تاجروں کے پاؤں پر شوگر کی قیمت کم نہ کرنے کے جرم میں ضربیں لگائی جائیں۔ تاجروں کا کہنا تھا کہ بھاری درآمدی ٹیکس کی وجہ سے شوگر کی قیمت زیادہ ہے۔ بازاریوں اور علماء کی ایک بڑی تعداد نے تہران کی شاہی مسجد میں پناہ لی۔ جب تک وزیراعظم عین الدولہ کے آدمیوں نے ان کی جان نہیں چھڑائی۔ فوراً ہی ملاؤں کی ایک معقول تعداد نے طباطبائی کی پیروی کی اور ایک مزار پر جمع ہوئے سب نے مطالبہ کیا کہ شاہ ایک نمائندہ، ادارہ انصاف قائم کرے۔ شاہ نے مطالبہ مان لیا اور علماء واپس تہران آئے مگر جب وزیراعظم کی طرف سے مطالبہ پورا کرنے کے کوئی آثار دکھائی نہ دیئے تو تہران کے علاوہ دوسرے صوبوں میں بھی فسادات شروع ہو گئے۔ مشہور واعظین نے حکومت کی شدید مذمت کی عوام میں بے چینی پھیل گئی۔ بالآخر جولائی 1906 میں کے ملا ترک وطن کے بعد قم روانہ ہو گئے جبکہ چودہ ہزار تاجر برطانوی سفیر کی پناہ میں چلے گئے۔ تمام کاروبار بند ہو گیا احتجاج کرنے والوں نے عین الدولہ کی برطرفی اور نمائندہ اسمبلی کے قیام کا مطالبہ کیا اور بعض صاحب علم مصلحین نے آئین پر بحث شروع کی۔ آئینی انقلاب ابتدائی طور پر کامیاب ہو گیا۔ جولائی کے آخر میں وزیراعظم برطرف کر دیا گیا اور اکتوبر میں پہلی مجلس (جس میں منتخب علماء کی معقول تعداد موجود تھی) کا اجلاس تہران میں ہوا۔ ایک برس کے بعد نئے شاہ محمد علی نے بنیادی قانون کی منظوری دی جو بلجیم کے آئین کی طرز پر بنایا گیا تھا۔ جس کے لئے تمام اہم معاملات میں مجلس سے منظوری حاصل کر لی تھی۔ تمام شہری مذہب کی تمیز کے بغیر قانون کے سامنے برابر تھے اور آئین ان کی آزادی اور حقوق کا ضامن تھا۔ تہران میں آزاد خیالی کا دور دورہ تھا پہلی مجلس نے اخبارات کو نئی آزادی دی تو فوراً ہی طنزیہ اور تنقیدی آرٹیکل شائع ہونے شروع ہو گئے۔ نئی سوسائٹیاں بنائی

گئیں۔قومی بنک قائم کرنے کا منصوبہ تیار ہوا اور نئی میونسپل کونسلوں کے انتخابات ہوئے۔تبریز کے نہایت ذہین رکن اسمبلی سید حسن تقی زادہ نے مجلس میں بائیں بازو کی جمہوری پارٹی کی قیادت سنبھالی جبکہ مجتہد آیت اللہ طباطبائی اور مجتہد سید عبداللہ بہنہائی قدامت پسند پارٹی کے رہنما تھے جو شریعت کی حیثیت کے حق میں آئین کے اندر چند شقیں شامل کرنے میں کامیاب ہوگئی۔مگر آزاد خیال ملاؤں اور مصلحین کے درمیان تعاون کے باوجود پہلی مجلس میں شدید اختلاف پیدا ہوگئے۔ کتنے ہی ارکان اختلافی حلقوں سے منسلک تھے یعنی ملکم خان اور کرمانی جن کے دلوں میں علماء کے خلاف نفرت کا سوا کچھ نہیں تھا۔اکثر وہ ان خفیہ جماعتوں کے رکن ہوا کرتے تھے جن کا مقصد انقلابی خیالات کی تشہیر تھا اور اگرچہ بعض آزاد خیال ملاؤں کا ان سے رابطہ بھی تھا مگر مصلحین عام طور پر ملاؤں کے خلاف تھے اور انہیں ترقی میں حائل سمجھتے تھے۔وہ علماء جنہوں نے مصلحین سے اس توقع پر تعاون کیا تھا کہ آئین کے ذریعے شریعت ملک کا قانون بن جائے گی وہ بری طرح مایوس ہوئے۔ پہلی مجلس نے تعلیم کے شعبہ میں فوری طور پر ملاؤں کی طاقت دبانے کے لئے ضروری اقدامات کئے اور ستم ظریفی یہ تھی کہ جس آئینی انقلاب کی زبردست حمایت اکثر ملاؤں نے کی تھی وہی انقلاب ملک میں ملاؤں کی زبردست طاقت کی زوال کا سبب بننے لگا۔

شیعہ علماء نے پہلے سیاست میں کبھی بھی اتنا عملی کردار ادا نہیں کیا تھا۔بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ انہوں نے محض اپنے مفاد کی خاطر ایسا کیا تھا اور اس لئے بھی مغرب کے بے دین کہیں ان کے حقوق پر ڈاکہ نہ ڈالیں۔دوسرے کہتے ہیں کہ شاہوں کی آمرانہ طاقت کا راستہ روکنے کے لئے آئین کی حمایت شیعوں کے اس پرانے عہد کا اعادہ تھا کہ وہ ظلم کے خلاف ہمیشہ لڑیں گے جو مصلحین علماء کی زبردست طاقت کا اندازہ کر سکتے تھے وہ انقلاب میں محتاط رہے تھے کہ مسلمانوں کے جذبات مجروح نہ کریں مگر وہ عرصہ سے ملاؤں کے خلاف تھے اور ایک بار جب طاقت ان کے ہاتھ آگئی تو انہوں نے ارادہ کرلیا کہ وہ تعلیم اور قانونی نظام کو سیکولر بنادیں گے۔سب سے پہلے اس خطرے کا احساس شیخ فضل اللہ نوری (1843-1909) تہران کے تین ممتاز علماء میں سے ایک عالم) کو ہوا جس نے 1907 میں آئین کے خلاف ایجی ٹیشن شروع کردی۔اس کا مؤقف تھا کہ مخفی امام کے نہ ہونے کی وجہ سے ساری حکومتیں باطل ہیں اس لئے پارلیمنٹ غیر اسلامی ہے۔ مجلس کی بجائے مجتہد، امام کے نائب ہیں اس لئے انہیں قوانین بنانے چاہئیں اور لوگوں کے

حقوق کا خیال رکھنا چاہیے۔ اس نئے نظام کے تحت علماء کئی اداراوں میں محض ایک ادارہ ہوں گے۔ وہ کبھی بھی لوگوں کے روحانی پیشوا نہیں بن سکیں گے اس طرح مذہب تباہ ہوجائے گا۔ نوری نے مطالبہ کیا کہ مجلس کم ازکم اتنا تو کرے کہ اپنے فیصلوں کی بنیاد شریعت کو بنائے اس کے اعتراضات کی بناء پر آئین میں ترمیم کی گئی۔ مجلس نے پانچ علماء پر مشتمل ایک پینل منتخب کیا جسے اختیار دیا گیا کہ اسلام سے ٹکرانے والا ہر قانون ویٹو کردے۔ پھر بھی نوری کا نکتۂ نظر اقلیتی تھا۔ نجف کے مجتہدین کی اکثریت نے آئین کی حمایت کی اور حمایت کرتے رہے۔ انہوں نے نوری کا مؤقف اس بنیاد پر رَد کردیا کہ شرعی ریاست اس لئے ممکن نہیں کہ اسلامی قوانین کے صحیح نفاذ کے لئے مخفی امام کا ہونا لازمی ہے۔ اس کے باوجود شیعوں کی روحانی بصیرت نے سیکولر طرز حکومت کی حمایت کی اور آج بھی ان کی نظر میں اکثر علماء دربار کی بڑھتی ہوئی کرپشن اور حکومت کے معاشی عدم تحفظ سے بہت نالاں تھے جس کی وجہ سے قاچاروں نے غیر ملکیوں کو ناجائز مراعات دیں۔ وہ دیکھ چکے تھے کہ انہی حرکتوں کی وجہ سے مصر پر فوجی قبضہ ہوا۔ یہ حالت بالکل واضح ہوگئی کہ قاچارون کی حکومت کی ظالمانہ پالیسیاں، آئین کے ذریعے روک دی جائیں۔ اس نکتۂ نظر کا زور دار اظہار شیخ محمد حسین نینی (1850-1936) نے اپنی تصنیف 'قوم کو فہمائش اور عوام کی آگہی' میں کیا جو 1909 میں نجف سے شائع ہوئی۔ نینی کا کہنا تھا کہ صرف نمائندہ حکومت مخفی امام کا صحیح بدل ہے۔ ایسی اسمبلی قائم کرنا جو ظالم حکمران کا ہاتھ روک سکے ایک ایسا عمل ہے جو شیعوں کی شان کے عین مطابق ہے۔ ایک ظالم حکمران اسلام میں بدترین گناہ اور شرک کا مرتکب ہوتا ہے کیونکہ وہ خود کو خدائی طاقت کا مالک اور اپنے آپ کو خدا سمجھنے لگتا ہے اور اپنی رعایا پر اپنی خدائی مسلط کرتا ہے۔ حضرت موسیٰ کو فرعون کی طاقت ختم کرنے کے لئے بھیجا گیا تھا جس نے اپنے لوگوں پر ظلم کیا اور انہیں غلام بنایا اس لئے اسے مجبور کردیا گیا کہ وہ خدا کے احکام مانے اس طرح مذہبی رہنماؤں کی مدد سے نئی مجلس یہ یقینی بنائے کہ شاہ خدا کے احکام کی تعمیل کریں۔ آئین کی انتہائی سخت مخالفت علماء کی طرف سے نہیں بلکہ نئے شاہ کی جانب سے ہوئی جس نے جون 1908 میں ایک روسی قازق بریگیڈ کی مدد سے بغاوت اور مجلس بند کردی۔ نامور ایرانی علماء اور ریفارمر قتل کردیئے گئے مگر تبریز کے ہردل عزیز محافظوں نے شاہی حملہ آورں کا مقابلہ بختیاری قبیلے کی مدد سے کیا اور اگلے مہینے ہی بغاوت کا خاتمہ کر کے شاہ کو برطرف کردیا اور اس جگہ اس کا ننھا بیٹا تخت نشین ہوا۔ شاہ کے قائم

مقام کا فرض ایک آزاد خیال ایرانی کو سونپا گیا۔ دوسری مجلس منتخب ہوئی مگر مصر کی طرح نوآموز پارلیمانی جمہوریت کا حلیہ مغربی طاقتوں نے بگاڑ دیا۔ جب مجلس نے ایران کی بیمار معیشت کو سنبھالا دینے اور برطانیہ وروس کے پرانے پھندے سے ایران کو نکالنے کے لئے معیشت کے ایک نوجوان امریکی مشیر مارٹن شسٹر کا تقرر کیا تو روسی فوجوں نے ایران پر یورش کر دی اور دسمبر 1911 میں مجلس بند کر دی۔ مجلس کے بحال ہونے میں تین برس لگے جب تک وہ برطانیہ اور روس کی اجازت سے بحال ہوئے کتنے ہی ایرانی مایوس اور بددل ہو گئے۔ ان کی اُمید صرف آئین سے وابستہ نہیں تھی۔ نہ وہ صرف اسے ہی اپنے درد کی دوا سمجھتے تھے پھر بھی مایوسی کے عالم میں انہوں نے ایران کی حیات نو ایک ظالمانہ التوا کی نذر کر دی۔

پہلی عالمی جنگ ایران کے لئے بڑی انتشار انگیز تھی جس کی وجہ سے ایرانیوں کو ایک مضبوط حکومت کی سخت کمی محسوس ہوئی۔ 1917 میں برطانوی اور روسی فوجوں نے سارا ایران لتاڑ دیا۔ روسی انقلاب کے بعد روسی تو چلے گئے مگر انگریزوں نے ان علاقوں کا رخ کیا جو انہوں نے ملک کے شمال میں خالی کئے تھے مگر وہ جنوب میں واقع اپنے اڈوں میں موجود رہے۔ برطانیہ کی اب خواہش تھی کہ ایران کو اپنی نگرانی میں لے۔ 1908 میں ملک کے اندر تیل دریافت ہوا تھا اور مراعات ایک انگریز ولیم نوکس ڈی ارسی (D,Arcy) کو دی گئیں تھیں۔ 1909 میں اینگلو پرشین آئل کمپنی بنائی گئی اور ایرانی تیل برطانوی جہازوں میں بھرا جانے لگا۔ ایران اب سونے کی چڑیا تھی مگر مجلس انگریزوں کے خلاف ہو گئی۔ 1920 کے اندر تمام ملک میں انگریزوں کے خلاف مظاہرے ہونے لگے۔ مجلس نے روس اور امریکہ سے مدد چاہی تو برطانیہ اپنا منصوبہ ترک کرنے پر مجبور ہو گیا مگر ایرانی دل گرفتہ تھے کہ انہوں نے اپنی آزادی دوسری بڑی طاقتوں سے اپیل کر کے قائم رکھی جن کا اپنا مفاد ایرانی تیل کے ساتھ وابستہ تھا۔ اب ایران میں نمائندہ حکومت قائم تھی اور آئین بھی تھا مگر یہ سب بے کار تھا کیونکہ مجلس کے پاس حقیقی اختیارات نہیں تھے۔ امریکیوں نے بھی محسوس کیا کہ انگریز ایران کے انتخابات میں مستقل دھاندلی کرتے ہیں اور ایرانی آزادانہ اظہار رائے سے روک دیئے جاتے ہیں۔ پابند صحافت اور مارشل لاء کی وجہ سے ایرانی کسی طور پر بھی اپنے جذبات کا اظہار نہیں کر سکتے تھے۔

بے اطمینانی کے اس دور میں ایک چھوٹے سے گروہ کے لئے یہ نسبتاً آسان ہو گیا کہ وہ

حکومت کا تختہ الٹ دے۔اس گروہ کی قیادت سید ضیاء الدین طباطبائی اور شاہ کے قازق بریگیڈ کے کمانڈر رضا خان (1944-1877) کے پاس تھی۔فروری 1921 میں ضیاء الدین وزیر اعظم اور رضا خان وزیر جنگ بن گیا۔انگریز اس تبدیلی پر رضامند ہو گئے کیونکہ ضیاء الدین انگریزوں کا جانا پہچانا حامی تھا اور انہیں اُمید تھی کہ اس کے انتخاب اسے ایران کو زیرنگین لانے کے معاملے میں ان کے عزائم پورے ہوں گے مگر رضا خان دونوں رہنماؤں میں سے زیادہ طاقتور تھا۔ وہ جلد ہی اس قابل ہو گیا کہ اس نے ضیاء الدین کو جلاوطنی پر مجبور کر دیا۔رضا خان نے فوراً ملک کو جدید بنانا شروع کر دیا اور لوگ چونکہ مایوسی اور تبدیلی پر آمادہ تھے اس لئے رضا خان وہاں بھی کامیاب ہوا جہاں اس کے پیش رو ناکام ہوئے تھے۔سماجی اصلاحات سے اسے کوئی دلچسپی تھی نہ اسے غریبوں کا کوئی خیال تھا۔اس کا مقصد ملک کی مرکزیت فوج اور بیوروکریسی کو مضبوط بنانا تھا۔ ہر مخالفت سختی کے ساتھ دبادی جاتی تھی۔شروع سے ہی رضا نے روس اور امریکہ کے ساتھ اچھے تعلقات رکھے تاکہ ایران،، برطانیہ سے نجات حاصل کر سکے۔اس کوشش میں اس نے امریکہ کی فنی امداد اور سرمایہ کاری کے عوض نیوجرسی کی سٹینڈرڈ آئل کمپنی کو تیل کے سلسلے میں مراعات دیں۔1925 میں رضا اس پوزیشن میں تھا کہ آخری قاچار شاہ کو حکومت چھوڑ دینے پر مجبور کرے اس کا اصل مقصد جمہوریہ کا قیام تھا مگر علماء اس پر معترض تھے۔مجلس میں آیت اللہ مدرس نے اعلان کیا کہ جمہوریہ خلاف اسلام ہے۔علماء کے سامنے اتاترک کی مثال تھی اور وہ نہیں چاہتے تھے کہ ایران بھی ترکی کے راستے پر گامزن ہو۔رضا کے شاہ بننے پر اعتراض نہیں تھا۔ وہ علماء کے ساتھ بدستور اچھے تعلقات اب بھی چاہتا تھا۔اس نے انہیں یقین دلایا کہ اس کی حکومت اسلام کا احترام کرے گی اور اس کی قانون سازی کا تصادم شریعت کے ساتھ نہیں ہوگا۔بھری مجلس نے پہلوی سلسلہ کے آغاز کی حمایت کی مگر زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا کہ رضا شاہ نے علماء کے ساتھ اپنا وعدہ توڑا اور سیکولرازم کی ترویج میں اتاترک کو بھی پیچھے چھوڑ دیا۔بیسویں صدی کی تیسری دہائی کے خاتمے تک سیکولرازم کا بول بالا تھا۔مذہبی سرگرمیوں کا بہت زور تھا زیادہ پرجوش تحریکوں کو ایک حد سے آگے نہیں جانے دیا گیا تھا۔اس لئے وہ سیکولرازم کے لئے خطرہ نہیں بن سکتی تھیں مگر ان برسوں میں جو بیج بوئے گئے انہوں نے اس وقت جڑ پکڑی جب جدید سیکولرازم کی بعض خامیاں ظاہر ہوگئیں۔

جوابی کلچر
(1925-60)

جب سے نیٹشے نے خدا کی موت کا اعلان کیا تھا جدید دور کے لوگوں کو مختلف طریقوں سے اس خلاء کا علم ہوگیا تھا جوان کے کلچر میں پیدا ہو چکا تھا۔ فرانسیسی ادیب اور مفکر سارتر (1905-80) نے اسے انسانی شعور میں خدا کے بنائے ہوئے شگاف سے تعبیر کیا جہاں وہ ہمیشہ رہتا تھا مگر اپنے پیچھے ایک خلاء چھوڑ کر غائب ہوگیا ہے۔ سائنسی ریشنلزم کے حیرت انگیز کارناموں نے مغرب سے متاثر اکثر لوگوں کے لیے خدا کے تصور کو ناقابل یقین اور ناممکن بنادیا تھا۔ اس لئے کہ قدیم دیومالائی شعور کو دبا دینے سے اس کا گہرا تعلق تھا۔ ایسے مسلک کے بغیر جو دین داری اور تقدس کا احساس پیدا کرے، خدا کی علامت بے معنی اور بے جان ہو چکی تھی مگر جدید خیالات کے افراد دل گیر نہیں ہوئے۔ دنیا کئی لحاظ سے اب بہت بہتر جگہ تھی اور وہ نئی سیکولر روحانیتوں کی بنیاد رکھ رہے تھے۔ وہ انہیں ادب، آرٹ، جنس، نفسیات، منشیات بلکہ کھیلوں میں بھی تلاش کرتے تھے۔ ماورائی معنی کا شعور جس نے ان کی زندگیوں کو ایک قدر دی تھی اور زندگی کی گہرائیوں سے ان کا تعلق قائم کر دیا تھا۔ بیسویں صدی کے وسط تک مغرب میں اکثر لوگوں نے فرض کرلیا تھا کہ مذہب اب دنیا کے معاملات میں کوئی اہم کردار ادا نہیں کرسکتا۔ اس لئے اسے فرد کا ذاتی معاملہ بنادیا گیا۔ سیکولرازم کے حامی جو اقتدار میں تھے یا میڈیا پر قابض تھے۔ انہیں یہ بات صحیح لگی۔ مغرب کی عیسائی دنیا میں مذہب اکثر ظلم اور جبر سے عبارت رہا ہے، جدید ریاست کا مطالبہ ایک روادار معاشرہ کا مطالبہ تھا۔ اب صلیبی جنگوں کا زمانہ واپس نہیں آسکتا تھا۔ سیکولرازم

قائم رہنے کے لئے آیا تھا مگر بیسویں صدی کے وسط تک دنیا کو یہ حقیقت بھی ماننی پڑی کہ خلاء محض نفسیاتی خلاء نہیں رہا تھا بلکہ ایک گرافک اور ڈراؤنی تجسیم بن گیا تھا۔

1914 اور 1945 کے درمیان یورپ اور روس میں سات کروڑ انسان تشدد کی موت مر چکے تھے۔ جرمنی (جس کا تعلق یورپ کی انتہائی مہذب سوسائٹیوں سے تھا) نے بدترین مظالم کا ارتکاب کیا تھا۔ اب یہ سمجھنا ممکن نہیں رہا تھا کہ ریشنل تعلیم، بربریت کو ختم کر دیتی ہے۔ کیونکہ جرمنوں کی چیرہ دستیوں سے ظاہر ہوا تھا کہ ایک عظیم یونیورسٹی اور قیدیوں کو اذیت دینے والے کیمپ ایک ہی مقام پر واقع ہوسکتے ہیں۔ نسل کشی اور ہلاکتوں کے ذریعے نازیوں اور روسیوں کی اصلیت ان کے ماڈرن ہونے کے بارے میں ظاہر ہوچکی تھی۔ ان سے پہلے کسی نے ایسے مظالم کرنے کے خواب بھی نہیں دیکھے تھے۔ دوسری عالمی جنگ (45-1939) کی تباہیاں جاپانی شہروں ہیروشیما اور ناگاساکی پر پہلا ایٹم بم گرانے کے بعد ختم ہوئیں۔ یہ بھی جدید سائنس اور ماڈرن کلچر کی ہلاکت خیزیوں کا دہشت ناک منظر تھا۔ برسوں سے عورتیں اور مرد دنیا کے خاتمے کے لئے خدا کی طرف سے نازل ہونے والی تباہی کی راہ دیکھ رہے تھے۔ اب پتہ چلا کہ دنیا کے خاتمہ کے لئے انسان کسی مافوق فطرت طاقت کے محتاج نہیں ہیں انہوں نے اپنی حیرت انگیز مہارت اور علم کے ذریعے بڑے مؤثر طریقہ سے خود ہی اپنی تباہی کے سامان پیدا کر لئے ہیں۔ جب انہوں نے زندگی کی ان نئی حقیقتوں کے متعلق سوچا تو لوگ پہلے سے کہیں زیادہ ریشنلزم کی خامیوں سے واقف ہوگئے۔ اس درجہ تباہی کا سامنا کرتے ہوئے ریزن (عقل) خاموش تھی۔ اس کے پاس کہنے کے لئے کچھ نہیں تھا۔

یہ آشوب اور تباہی نئے دور کی لئے برائی کی علامت بن گئی۔ یہ جدیدیت کی ضمنی پیداوار تھی۔ جس نے شروع ہی سے کہیں کہیں نسل کشی کی کاروائیوں میں حصہ لیا تھا۔ نازیوں نے صنعتی دور کی کئی ایجادوں سے انسانوں کی ہلاکتوں کا کام لیا تھا۔ ہلاکت کے کیمپ صنعتی چمنی تک فیکٹری کی پیروڈی تھے۔ انہوں نے اس مقصد کے لئے ریل، نہایت ترقی یافتہ کیمیکل صنعت اور بیوروکریسی زور شور سے استعمال کی۔ یہ آشوب اس ریشنل اور سائنسی منصوبہ بندی کی ایک زندہ مثال تھا جس میں ہر چیز ایک بالکل واضح اور واحد مقصد کے تابع ہوتی ہے۔ جدید سائنسی نسل پرستی کی پیداوار یہ آشوب سوشل انجینئرنگ میں قطعی حیثیت رکھتا تھا جسے بیسویں صدی کا گارڈن

کلچر کہا جاتا تھا۔ سائنس بذات خود موت کے کیمپوں میں موجود تھی اور وہاں نسل کشی کے تجربات میں شریک تھی۔ اس تباہی سے کم از کم یہ تو ثابت ہوا کہ سیکولر نظریہ بھی صلیبی جنگوں جتنا ہی ہلاکت خیز ہوسکتا ہے۔

یہ آشوب ان خطرات سے بھی خبردار کرتے ہیں جن سے خدا کی موت کی صورت میں انسانی شعور سے دوچار ہوتا ہے۔ مسیحیت میں خدا کے نہ ہونے کی تعبیر دوزخ ہے۔ نازی کیمپ دوزخ کی اسی امیجری کے عکاس تھے جو صدیوں سے یورپ والوں کے ذہنوں پر مسلط تھی۔ کھال کھینچنا، شکنجے میں کسنا، کوڑے لگانا، چیخنا چلانا، معذور اور بگڑے ہوئے جسموں کا مذاق اڑانا، شعلے اور گندی ہوائیں، یہ سب مسیحیوں کو جہنم کی یاد دلاتیں جن کی منظر کشی یورپ کے شاعروں، آرٹسٹوں، بت تراشوں اور ڈرامہ نویسوں نے کی تھی۔ Auschwitz ایک تاریکی میلہ تھا جس کے انسان اس زندگی کی ایک جھلک دیکھ سکتے تھے جو تقدس اور دینداری کے شعور کے بغیر ترتیب پاتی ہے۔ مذہب نے سب سے بڑا کام یہ کیا کہ دیومالا، مراسم، مسلکی اور اخلاقی معاملات کے اندر بنی نوع انسان میں پاکیزگی اور تقدس کا احساس پیدا کیا۔ بیسویں صدی کے وسط تک دکھائی دینے لگا کہ مادر پدر آزاد ریشنلزم زمین پر دوزخ برپا کرسکتا ہے جو خدا کے نہ ہونے کے ساتھ لازم وملزم ہے۔ ایک نیست ونابود کردینے والا جذبہ تھا جس نے ہمیشہ سے کہیں زیادہ طاقت پانے والوں کی اجتماعی تباہی کا دائرہ وسیع کرنے کی ترغیب دی۔ قدیم دور میں خدا کی علامت نے انسانی طاقت کی حدیں متعین کردی تھیں، عورتوں اور مردوں کے اعمال پر ایک پابندی عائد کردی تھی۔ قانون انہیں یاد دلاتا تھا کہ دنیا ان کی جاگیر نہیں کہ وہ جو چاہیں یہاں کرتے پھریں۔

نئے انسان نے اب خودمختاری وآزادی کی اہمیت اتنی بڑھادی کہ کسی قادر مطلق کی ضرورت نہ رہی۔ خدائی طاقت کی قانون سازی حقیر لگنے لگی۔ اس تبدیلی سے شاید انسانی وقار میں نمایاں اضافہ ہوا مگر آشوب اور تباہی نے بتادیا کہ ایسی تمام پابندیاں منسوخ کردینے اور قوم یا حکومت کو سب سے اعلیٰ قدر قرار دینے کا نتیجہ کیا ہوسکتا ہے۔ زندگی اور دنیا کے احترام کے لئے انسان کو نت نئے طریقے دریافت کرنے ہوں گے۔ ایسے طریقے جو مافوق الفطرت کی ادھوری علامتوں کے سامنے نئے دور کے شعور اور وقار کا سر نہ جھکنے دیں۔ نازی کیمپ اور ایٹم بم Mushroom بادل ایسے واقعات ہیں جن کے متعلق ہمیں سوچنا ہے اور محسوس کرنا ہے تا کہ ہم

جدید مغربی سائنسی کلچر کے بارے میں کسی غلط فہمی یا تعصب کے شکار نہ ہو جائیں بلکہ انہی کے ذریعہ تو ہم سمجھ سکتے ہیں کہ بعض مذہبی افراد جدید سیکولر سوسائٹی کے متعلق کیا سوچتے ہیں جبکہ انہیں اس میں خدا کے نہ ہونے کا احساس بھی ہے۔ بعض بنیاد پرست، جدیدیت کا موازنہ بدی اور شیطانیت سے کرتے ہیں۔ جدید شہروں یا سیکولر آئیڈیالوجی کے متعلق ان کا تصور انہیں اسی طرح غم وغصہ میں مبتلا کر دیتا ہے جس طرح سیکولرازم کا ایک آزاد خیال حامی Auschwitz کی تاریکیوں سے لرز جاتا ہے۔

بیسویں صدی کے وسط میں تینوں توحید پرست مذاہب کے بنیاد پرستوں نے معاشرے کی بڑی لہر سے کنارہ کشی اختیار کر لی تاکہ جوابی کلچر پیدا کریں جو ان کی مرضی اور سوچ کے مطابق ہو۔ انہوں نے محض دل برداشتہ ہو کر ایسا نہیں کیا بلکہ بعض اوقات اپنے خوف اور دہشت سے مجبور ہو کر ایسا کرتے تھے۔ ضروری ہے کہ ہم اس خوف اور بے چینی کا اندازہ کریں جو بنیاد پرستی کی تہہ میں چھپا ہوا ہے۔ صرف اسی صورت مین ہم اس کے طیش وغضب اور ہر لحظہ پھیلتی ہوئی بدی کے خوف کو سمجھ سکتے ہیں۔

بعض یہودیوں نے آشوب سے پہلے ہی نئی دنیا کو شیطنت کے روپ میں دیکھنا شروع کر دیا تھا۔ دراصل نازیوں کے مظالم نے اس یقین کو تقویت دی کہ نہ صرف غیر یہودی مایوس کن حد تک برے تھے بلکہ اکثر ماڈرن یہودی بھی لازمی طور پر قابل گرفت تھے۔ 1930 تک قدامت پسند یہودی جنہیں ماڈرن کلچر سے کوئی واسطہ نہ تھا وہ ہیزیڈک یا یشیوا میں جذب ہو گئے تھے انہیں امریکہ یا فلسطین جانے کی ضرورت نہ خواہش تھی 1930 اور 1940 کے پیچیدہ حالات کا تقاضا تھا کہ ان کی زد سے بچ جانے والے یہودی یورپ اور سوویت یونین سے نکل جائیں۔ ہیزیڈم کے کچھ لوگ فلسطین چلے گئے جہاں ان کا سامنا صیہونیوں سے تھا جو ایک ایسا ملک بنانے کی کوشش کر رہے تھے جہاں یہودی مستقبل کی تباہ کاریوں سے محفوظ رہیں۔

(Edah Haredis) ایڈاہاریڈس یروشلم کا ایک نہایت قدامت پسند فرقہ اعلان بالفور سے بہت پہلے ہی صیہونیت کے سخت خلاف تھا۔ یہ چھوٹا سا گروپ 1920 تک فلسطین کے 175,000 یہودی مکینوں میں سے صرف 9000 کی توجہ اور تعاون حاصل کر سکا۔ اپنی مذہبی تعلیمات میں کھوئے ہوئے انہیں اپنے آپ کو سیاسی طور پر منظم کرنے کا خیال کبھی نہ آیا مگر جلد ہی

اگودت اسرائیل ان کے ساتھ ہوگئے جو نئے سیاسی داؤ پیچ سیکھ چکے تھے۔ نظریات عام طور پر اب بھی اگودت صیہونیت کے خلاف تھے مگر اس کے اراکین نے سیکولرازم کے اثر میں توازن قائم رکھنے کی کوشش میں اپنی الگ مذہبی آبادی قائم کرلی۔ جہاں نوجوان تلمود اور تورات کے ساتھ جدید مضامین بھی پڑھا کرتے۔ اس رعائت سے قدامت پسندوں کے شدت پسند حلقے بہت پریشان ہوئے جن کے خیال میں اگودت مخالف کیمپ میں شامل ہوگئے تھے۔ قدامت پسندوں کے اس باہمی تصادم سے ایک بنیاد پرست تحریک پیدا ہوئی جو اپنے پہلے مرحلے میں (جیسا کہ اکثر ہوتا آیا ہے) ہم مذہبوں کی باہمی آویزش کی پیداوار تھی۔

استرداد پسند قدامت پسندوں کا بڑا ترجمان ربیHoyyim Eleazir Shapiron of Mankacs(1872-1937) ہنگری جیوری کے ممتاز رہنماؤں میں سے تھا جس نے 1922 میں اگودت کے خلاف بڑی زوردار مہم شروع کی تھی اس کی رائے میں اگودت کے اراکین نے صیہونیوں کے ساتھ ساز باز کررکھی تھی اور اسکولوں کے معصوم بچوں کی گمراہ کررہے تھے۔ وہ ارض مقدس کی بے حرمتی کررہے تھے جس کا مقصد عبادت اور مذہب کی تعلیم ہے۔ سلوواکیہ کی ایک میٹنگ میں ہیزیڈم کے زیادہ جوشیلے حصے نے ربیMankacze سے اتفاق کیا اور اگودت کے ساتھ کسی قسم کا تعلق رکھنے پر پابندی لگادی۔ اگودت کے متعلق ان کی رائے صحیح نہیں تھی کیونکہ اگودت کی تو تخلیق ہی صیہونیت کی مخالفت کے لئے ہوئی تھی۔ گروپ اس سے بھی آگاہ تھا کہ وہ مشرقی اور مغربی یورپ میں قدامت پسندوں کی بھاری اکثریت سے متصادم تھا جنھوں نے صیہونیت قبول نہیں کی تھی مگر وہ اگودت کے خلاف شپیرا کی پابندی کو انتہائی قدم سمجھتے تھے تاہم وہ یہ علیحدگی صیہونیت سے اپنے وجدانی خوف کی وجہ سے جائز سمجھتے تھے۔ پابندی کی دستاویز پر دستخط کرنے والا ہیزیڈم میں سے پہلا شخص ہے نوجوان ربی Joel Mashe Teitelbam(1888-1979) جو کچھ عرصہ بعد شمار (ہنگری) کے ہیزیڈم کا لیڈر اور اسرائیلی ریاست اور صیہونیت کا سب سے طاقتور مخالف بن گیا۔

جب شپیرا اور تیتلبوم نے فلسطین میں صیہونیKebbutzim کے متعلق سوچا تو نازیوں کے موت کیمپوں جیسا ہی ظلم اور خوف محسوس کیا۔ یہ مبالغہ نہیں کہ تیتلبوم نے (کہ جس نے بمشکل اپنی جان بچائی اور اپنے دوستوں کے ساتھ جلاوطن ہوکر امریکہ چلا گیا) آشوب اور تباہی کی تمام

تر ذمہ داری صیہونیوں کے بدترین گناہوں پر عائد کی۔ ''صیہونیوں نے یہودیوں کی اکثریت گمراہ کر کے ایسے بدترین گناہوں میں مبتلا کی کہ جن کی پہلے کوئی مثال نہیں اس لئے یہ حیرانی کی بات نہیں کہ خدا نے غضبناک ہو کر کوڑے برسانا شروع کر دیئے'' یہ لوگ استرداد پسند صیہونیوں کے زرعی کارناموں کا کوئی مثبت پہلو نہ دیکھ سکے جو صحراؤں کو گلزار بنا رہے تھے نہ ہی ان کے لیڈروں کی سیاسی بصیرت کی داد دے سکے جو یہودیوں کی زندگی بچانے کی کوشش کر رہے تھے۔'' یہ ظلم توہین اور بدی کی قوتوں کا آخری بلّہ ہے'' صیہونی دہریے ہیں اور ایمان سے محروم ہیں اگر وہ یہودیوں میں سب سے زیادہ عبادت گزار ہوں تو بھی ان کی ہر کوشش بدی ہے۔ کیونکہ وہ خدا کے خلاف بغاوت ہے۔ خدا کا حکم ہے کہ یہودی جلاوطنی کی ہر صعوبت ہر سزا برداشت کریں اور اس سے اپنے آپ کو بچانے کی کوشش نہ کریں۔

شپیرا کی نظر میں یہودی بھی اس قابل نہیں تھا کہ یروشلم کی پاک زمین پر آباد ہو چہ جائے کہ صیہونی جنہیں اپنی بغاوت کا اعتراف بھی تھا۔ صرف وہ شخص جس نے اپنی پوری زندگی عبادت اور مذہبی تعلیم کے لئے وقف کی ہو وہاں اطمینان سے رہ سکتا تھا۔ جہاں کہیں بھی کوئی مقدس مقام یعنی اسرائیل کی سرزمین ہو بدی کی طاقتیں اس پر حملہ آور ہونے کے لئے جمع ہو جاتی ہیں۔ پاک زمین بذاتِ خود ان ظالم طاقتوں سے بھری ہوئی ہے جو خدا کے قہر کو دعوت دیتی ہیں۔ خدا کی بجائے اب شیطان یروشلم میں رہتا ہے۔ صیہونی سمجھتے ہیں کہ وہ زمین پر نازل ہو رہے ہیں حالانکہ وہ دوزخ کی گہرائیوں میں اتر رہے ہیں۔ پاک زمین خدا سے خالی ہے اور جہنم بن گئی ہے اور جیسا کہ صیہونی سمجھتے ہیں اسرائیل کی زمین گھر نہیں بلکہ درحقیقت میدانِ جنگ ہے۔ بدترین حالات میں وہاں صرف وہی رہ سکتے ہیں جو کسان یا گھر گرہستی والے نہیں بلکہ جنگجو ہیں، خدا سے ڈرنے والے اور میدان جنگ کے دلیر، جو خدا کا بچا کھچا ورثہ محفوظ کرنے کے لئے یروشلم کے مقدس پہاڑ پر جنگ کرنے کے لئے جاتے ہیں۔ تیتلبوم نے صیہونیوں کے متعلق سوچا کہ وہ تکبر اور بدی کی تازہ مثال ہیں جن کے ذریعے یہودیوں پر مسلسل بربادیاں نازل ہوئیں۔ برج بابل، سنہرے بچھڑے کی عبادت اور دوسری صدی میں بارکوچبا (Bar Kachba) کی بغاوت جن میں ہزاروں یہودیوں کی جانیں ضائع ہوئیں اور شیبا تائی زیوی کی مضحکہ خیز ناکامی۔ مگر صیہونیت بدترین کفر ہے اس کی کوئی مثال نہیں۔ اس تکبر، خود پسندی اور بداطواری نے دنیا کی بنیادی ہلا دی

ہیں۔ تعجب نہیں کہ یہ قہر خدا کی طرف سے نازل ہوا ہو۔ چنانچہ ایمان والے اپنے آپ کو اس بدی سے الگ رکھیں۔ یروشلم میں ربی مارگولیس، شپیرا اور تیتلبوم دونوں کا بر امداح تھا اور چاہتا تھا کہ تیتلبوم، ایداہ ہیریڈس کی قیادت سنبھالے۔ مارگولیس نے اسرائیل کی مخالف تاریخ لکھی تھی جس میں اس نے ایک برسرِ پیکار اقلیت کا ذکر کیا تھا جو صدیوں سے مسلسل خدا کے نام پر یہودیوں سے لڑا کرتی تھی۔ انہوں نے تین ہزار اسرائیلی قتل کر دیئے تھے جنہوں نے سنہرا بچھڑا پوجا تھا جب وادیٔ سینا میں موسیٰ پر تورات نازل ہو رہی تھی۔ اسی وجہ سے خدا نے انہیں دوسرے قبائل پر فضیلت دی نہ کہ عبادت گاہوں میں ان کی عبادت کی وجہ سے ایسا کیا۔ موسیٰ بڑے پر جوش اور باہمت نبی تھے زندگی بھر وہ دوسرے یہودیوں سے لڑتے رہے تھے۔ ہارون کے پوتے فائینہز نے زمری کے خلاف بغاوت کر دی حالانکہ وہ اسرائیل کا شہزادہ تھا اس لئے کہ زمری حرام کاری کا مرتکب ہوا تھا۔ ایلی یاہ نے اہاب کے خلاف تلوار اٹھائی اور بعل کے 450 پیغمبر قتل کر دیئے۔ خدا کی خاطر ان کا جوش وجذبہ بے اختیار ہو کر اکثر غصہ کی صورت میں ظاہر ہوتا وہ سچے اور اطاعت گزار یہودی تھے کبھی تو انہیں کافروں کے خلاف لڑنا پڑتا کبھی اپنے ہم مذہب یہودیوں کے خلاف ہتھیار اٹھاتے مگر جنگ کا مقصد نیک ہوتا تھا۔ ''ایماندار یہودی ان یہودیوں سے کٹ کر الگ ہو جائیں جو اگودت کے ممبر ہیں اور جنہوں نے خدا کا دامن چھوڑ کر بدی کا راستہ اختیار کر لیا ہے۔ صیہونیوں کا ساتھ دے کر اگودت نے یہودیوں کو سب سے زیادہ نقصان پہنچایا ہے۔ ان کا ساتھ گناہ ہے اور شیطان کے ساتھ معاہدہ ہے۔''

چنانچہ علیحدگی ناگزیر ہے جیسے تورات مقدس سے ناپاک روشنی سے تاریکی دودھ سے گوشت اور سبت سے ہفتہ کے باقی ایام الگ کرتی ہے اسی طرح راست بازوں کو بدی سے الگ رہنا چاہیے۔ باغی کبھی سچائی کے دامن میں واپس نہیں آئیں گے۔ ان ظالم یہودیوں سے الگ رہ کر اور ان سے الگ عبادت کر کے ہیریڈم وہ جو دیاتی خلیج جسمانی طور پر ظاہر کر رہے تھے جو مافوق طبیعاتی سطح پر ان کے درمیان موجود تھی۔ اس ڈراؤنے خیال کا مطلب تو یہ ہوا کہ ان برائیوں میں رہتے ہوئے اہل ایمان کی زندگی کی ہر تفصیل کائناتی اہمیت کی حامل تھی ان کا لباس، پڑھنے لکھنے کے طریقے اور داڑھی کا اسٹائل بھی، سب کچھ صحیح ہونا چاہیے۔ یہودیوں کی زندگی عذاب میں تھی اور کسی قسم کی جدت سختی کے ساتھ منع تھی۔ ''خیال رکھنا چاہیے کہ کوٹ کا دایاں

کا لر بائیں کے اوپر ہوتا کہ خدا کا دایاں ہاتھ بائیں طرف غالب ہو بائیں طرف جو بدی کی طاقت اور جذبہ کی نمائندہ ہے۔'' جہاں احتجاجی بنیاد پرست خلاء پر کرنے کے لئے سخت اصولی صحت کے اندر یقین کی تلاش میں تھے یہ صیہونی دشمن کٹر قدامت پسند، خدائی قانون کے معاملے میں بال کی کھال اتار کر یقین کی منزل پر پہنچنا چاہتے تھے۔ یہ روحانیت کی ایک ایسی قسم تھی جو شدید خوف میں مبتلا تھی جس خوف میں کمی کے لئے پرانی حدیں محفوظ رکھنا، نئی رکاوٹیں کھڑی کرنا، سخت علیحدگی اور روایت کی سخت پابندی ضروری ہے۔

یہ منکرانہ انداز ان یہودیوں کی سمجھ سے باہر تھا جن کی نظر میں صیہونیوں کے کام حیرت انگیز تھے۔ بیسویں صدی میں یہودیوں، عیسائیوں اور مسلمانوں سبھی کو اس کٹھن صورتحال کا سامنا کرنا پڑا۔ بنیاد پرستوں اور جدید سیکولر دنیا کے معاملے میں مثبت رویہ رکھنے والوں کے درمیان ایک نا قابل عبور خلیج حائل تھی مختلف گروہ ایک ہی طریقہ سے حالات کا اندازہ نہیں کر سکتے۔ ریشنل دلائل بے کار تھے کیونکہ اختلاف ایک گہری اور دماغ کی وجدانی سطح سے ابھرتا تھا جب شپیرا، تیتلبوم اور مارگولیس نے سیکولر صیہونیوں کی بامعنی اور ریشنل سرگرمیوں کا جائزہ لیا تو انہیں بس ایک ہی اعتراض سوجھا کہ خدا کہیں نہیں اس لئے سارا عمل شیطنت پر مبنی ہے۔ جب انہوں نے موت کیمپوں میں نازیوں کی ریشنل اور ظالمانہ سرگرمیوں کے متعلق سنا تو صیہونیوں کے فکر و عمل میں بھی ان کی مشابہت دریافت کر لی۔ دونوں کا خدا نہیں تھا اس لئے دونوں کا عمل شیطانی تھا۔ آج بھی یروشلم کے صیہونیت دشمن علاقوں میں پلے کارڈوں کے ذریعے اسرائیل کے سیاسی لیڈروں کا موازنہ ہٹلر سے کیا جاتا ہے کسی اجنبی کی نظر میں یہ موازنہ غلط اور گمراہ کن ہو سکتا ہے مگر اس سے ہمیں اس خوف کا اندازہ ہوتا ہے جو سیکولرازم کی وجہ سے بنیاد پرستوں کے دل میں پیدا ہونا ممکن ہے۔

اسرائیل کی زمین پر سیکولر ریاست بنانے کے تصور نے ہی ایک طابو (Taboo) کی خلاف ورزی کی تھی۔ صدیوں سے اس گم گشتہ سرزمین نے علاماتی اور صوفیانہ حیثیت حاصل کر لی تھی جس نے اسے مقدس تثلیث کی طرح خدا اور تورات سے جوڑ دیا تھا۔ ان لوگوں کے ہاتھوں اس زمین کی تذلیل سے (کہ جنہوں نے مذہب نظر انداز کر دیا تھا) غم وغصہ کے جذبات پیدا ہو گئے۔ بعض یہودی اسے ارض مقدس کی آبروریزی کے مترادف سمجھتے تھے، صیہونی جس قدر اپنے مقاصد میں کامیابی کے قریب پہنچ رہے تھے ہیریڈم کے بعض جوشیلے افراد اور زیادہ مشتعل ہو رہے تھے۔

1938 تکAmm Blanاور Ashron Katzenellenbogenجو دونوں اگودت سے الگ ہو چکے تھے اس لئے کہ اس پر صیہونیوں کے ساتھ تعاون کا الزام ہے۔ ایداہ ہیریڈس سے بھی مستعفی ہو گئے۔ یہودیوں نے حال ہی میں عربوں کے حملہ سے بچنے کے لئے ایک خصوصی ٹیکس لگایا تھا مگر انہوں نے ٹیکس ادا کرنے سے انکار کر دیا۔ اپنے انکار کے جواز میں ان دونوں نے تلمود کی ایک کہانی بیان کی کہ تین صدیاں پہلے رومنوں کے دور میں جب ایک یہودی بستی کے دفاع کا انتظام فلسطین میں کیا جا رہا تھا تو دو یہودی بزرگوں نے مسلح محافظوں سے کہا کہ تم شہر کے محافظ نہیں بلکہ اسے تباہ کرنے والے ہو۔ تورات کا علم حاصل کرنے والے شہر کے حقیقی محافظ ہیں۔ چنانچہ ایک نئی تنظیم بنالی گئی شیرون اور بلبو نے اس کا نام ''شہر کے محافظ'' رکھا۔ یہودی صیہونیوں کی مسلح کوششوں کے ذریعے محفوظ نہیں ہوں گے تورات کی تعلیم پر عمل کرنے والے نیک اور مخلص قدامت پسند ان کی حفاظت کریں گے'' انہوں نے صیہونیوں کے تناظر کو چیلنج کیا۔ ان کی رائے تھی کہ جس لمحے یہودیوں کو تورات عطا کی گئی تھی تو وہ دوسری قوموں سے مختلف مدار میں داخل ہو گئے تھے۔ انہیں سیاست یا مسلح جدوجہد میں حصہ نہیں لینا تھا بلکہ اپنے آپ کو روح کے معاملات کے لیے وقف کر دینا تھا۔ یہودیوں کی تاریخ میں واپس لا کر صیہونیوں نے درحقیقت خدا کی بادشاہت سے ہاتھ اٹھالیا ہے اور ایسی حالت میں آ گئے ہیں کہ جہاں یہودیوں کے ہونے میں کوئی معنی نہیں ہیں۔ صیہونیوں نے انہیں ان کی فطرت سے جدا کر کے تباہی کے راستے پر ڈال دیا ہے۔

صیہونیوں کی کامیابیوں کے ساتھ ساتھ ''شہر کے محافظوں'' کی الجھنوں میں اضافہ ہو رہا تھا۔ ظالم کیوں سرخ رو ہوئے ہیں؟ 1948 میں جب اسرائیلی ریاست قائم ہوگئی تو تیتلبوم اور بلبیوم اس نتیجے پر پہنچے کہ شیطان نے تاریخ میں براہ راست مداخلت کی ہے اور یہودیوں کو رسوائی اور ذلت کی راہ دکھائی ہے۔ قدامت پسندوں اور الٹرا قدامت پسندوں میں سے اکثر یہودیوں نے نئی ریاست یہ کہہ کر قبول کی کہ ''اس کی کوئی مذہبی اہمیت نہیں اور اسرائیل میں رہنے والے یہودی اب بھی جلاوطن ہیں بالکل اسی طرح جس طرح کہ جلاوطنی میں تھے، کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ ''اگودت اسرائیلی یہودیوں کے مذہبی حقوق کی خاطر اسرائیلی حکومت سے مذاکرات کے لئے اسی طرح تیار تھا جس طرح وہ یورپ کی غیر یہودی حکومتوں کے ساتھ اس سلسلے میں مذاکرات کرتے تھے مگر ''شہر کے محافظ'' کسی ایسی سرگرمی میں حصہ نہیں لیتے تھے۔ 14 مئی 1948 کو

اسرائیل کے قیام کے فوراً بعد انہوں نے انتخابات میں حصہ لینے پر پابندی لگادی۔ اپنے اداروں کے لئے حکومت کی امداد لینے سے انکار کر دیا اور قسم کھالی کہ سرکاری اداروں میں کبھی قدم نہ رکھیں گے۔ انہوں نے اگودت پر بھی اپنے حملے تیز کر دیئے جن کی طرف سے اسرائیل کی حمائت ظلم کی انتہا تھی ''اگر ہم ذرہ بھر بھی'' خدا نہ کرے' برائیوں، غاصبوں اور بے ایمانوں کے خلاف اپنی نفرت میں کمی کریں۔ اگر ہم اس علیحدگی سے دستکش ہوں جس کا حکم ہمیں ہماری تورات نے دیا ہے تو پھر ہر برائی کے لئے راستہ کھلا ہے کیونکہ ہم نے سیدھا راستہ چھوڑ کر غلط راستہ اختیار کرلیا ہے۔'' صیہونیوں نے تقریباً تمام یہودی خدا سے دور کر دیئے ہیں کیونکہ صیہونی اعلیٰ اور مقدس قدروں کے منکر ہیں۔

صیہونی جتنی زیادہ مقبولیت یہودیوں میں حاصل کرتے رہے، نئی ریاست کامیابی کے ساتھ آگے بڑھتی رہی، نیتوری کارتا (شہر کے محافظ) کے اصولی اختلاف ان کے ساتھ اور گہرے ہوتے گئے۔ صلح کا کوئی امکان نہیں تھا کیونکہ اسرائیلی ریاست شیطان کی تخلیق تھی۔ جیسا کہ تیتلبوم نے سمجھایا کہ ''کسی یہودی کے لئے ممکن نہیں کہ ریاست پر اس کا ایمان ہوا اور تورات کی تعلیمات پر بھی عمل کرے کیونکہ یہ دونوں بالکل مخالف سمتیں ہیں۔'' اگر سیاستدان اور حکومت کے وزیر تلمود کے عالم ہوں اور اس کے احکامات باقاعدگی اور خلوص کے ساتھ بجالانے والے ہوں تو بھی ریاست شیطانی عمل ہے کیونکہ اس نے خدا کے خلاف بغاوت کی ہے۔ نیتوری کارتا کے پاس اتنا وقت نہیں تھا کہ وہ Knesset یعنی اسرائیلی پارلیمنٹ میں اگودت کی کوششوں سے مذہبی قانون سازی کا انتظار کرے۔ یہ کوئی نیکی نہیں کہ سبت پر پبلک ٹرانسپورٹ محدود کر دی جائے یا مذہبی طلباء فوج میں بھرتی نہ کئے جائیں۔ یہ تو خدا کے قانون کو انسانی قانون میں بدلنا ہوا۔ یہ تورات کی تنسیخ اور حکالا کی توہین کے مترادف ہے۔ جیسا کہ ربی شمعون اسرائیل پوزن، نیویارک کی ستمر ہیز یڈم کے ممتاز سکالر نے Knesset میں اگودت کے اراکین کے متعلق کہا تھا کہ ''حیف ہے ان پر جو ہر روز ظالموں کی اسمبلی میں بیٹھتے ہیں جس اسمبلی کا نام Knesset ہے۔ جھوٹی اور جعلی کاروائیاں اور دستخط کرتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ ووٹ کی اکثریت سے وہ فیصلہ کرسکتے ہیں کہ تورات کے احکام مزید پامال ہوں گے یا خدا کی تورات کو اختیار عطا فرمایا جائے گا۔''

اس کے باوجود ''نیتوری کارتا'' نے بھی صیہونیوں کی طرف کشش محسوس کی۔

بلئو کا صیہونیوں کو دغاباز کہنا معنی خیز تھا۔ یہودیوں کی ریاست یہودیوں کی زمین میں ایک ایسا لالچ ہے جو یہودیوں کے دلوں میں گھر کر لیتا ہے۔ یہ بنیاد پرستوں کی مشکلات کا ایک حصہ ہے۔ وہ اکثر انتہائی جدید کارناموں سے مسحور ہوتے ہیں اور ان کی طرف کھنچتے بھی ہیں جن سے کہ خوف کی حالت میں دور بھاگتے ہیں۔ احتجاجی بنیاد پرستوں کے ذہنوں میں دجال کا تصور کہ ایک دلکش معقول اور اثر آفرین دغاباز کچھ اس قسم کا تذبذب اور الجھن تھی۔ جدیدیت کے متعلق بنیاد پرستوں کے وژن میں الجھن اور تناؤ تھا جو دھما کہ خیز ہو سکتا تھا جیسا کہ بلئو نے کہا کہ صیہونیوں کے مخالفوں کی پرہیزگاری ایک بااصول نفرت ہے، اور نفرت اکثرت اس محبت کے ساتھ ساتھ رہتی ہے جس کا اعتراف نہیں کیا جاتا۔ اسرائیلی ریاست کا خیال کر کے ہیز یڈم غضبناک ہو جاتے ہیں مگر وہ قتل نہیں کرتے بلکہ آج تک وہ اسرائیل میں ان کاروں پر پتھر پھینکتے ہیں جن کے ڈرائیور سبت کے دن سفر کر کے قانون توڑتے ہیں۔ بعض اوقات اپنے ساتھی ہاریڈی کے گھر پر حملہ کر دیتے تھے کہ وہ ٹیلی ویژن سیٹ خرید کر یا اپنی بیوی کو واہیات لباس پہننے کی اجازت دے کر مطلوبہ معیار کے مطابق زندگی گزارنے میں ناکام رہا تھا۔ یہ پرتشدد حرکات 'خدا کی تقدیس' کے نام پر اور بدی کی قوتوں پر ضرب لگانے کے لئے کی جاتی تھیں جنہوں نے ہیز یڈم کو تمام اطراف سے گھیر لیا تھا اور انہیں مٹا دینا چاہتی تھیں مگر یہ ناممکن نہیں کہ یہ پرتشدد حملے ان کے اپنے ہی دلوں میں دفن خواہشوں کو مار ڈالنے کی ایک کوشش ہو۔

صیہونیت مخالف ہیز یڈم ایک چھوٹی سی اقلیت تھی۔ اسرائیل میں ان کی تعداد دس ہزار جبکہ امریکہ میں ستر اسی ہزار کے لگ بھگ ہوں گے مگر ان کا اثر و نفوذ نظر انداز نہیں کیا جا سکتا اگرچہ اکثر الٹرا اقدامت پسند صیہونیوں کے خلاف ہونے کی بجائے ان کی حمایت کرتے تھے۔ نیتوری کارتا اور ستمر ہیز یڈم جیسے دوسرے انتہا پسند ان سے قربت میں یہ قباحت محسوس کرتے تھے کہ انہیں بھی حکومت کا نیازمند خیال نہ کیا جائے۔ اسرائیلی ریاست سے بھی تعلق اعتدال پسند ہیز یڈم (جنہیں یہودیوں کی ریاست کے ساتھ تعاون میں اپنی دیانت کے فقدان کا احساس تھا) کو یاد دلاتی تھی کہ دنیاوی معاملات میں اسرائیلی کتنا ہی طاقتور اور کامیاب ہو گیا ہو یہودی اب بھی جلاوطنی کی حالت میں ہیں اور جدید دور کی سیاسی اور کلچری زندگی میں کوئی جائز حصہ نہیں لے سکتے۔

ہیز یڈی کی طرف سے اسرائیل کو محض شیطانی تخلیق سمجھنا اور اس کے سوا کچھ نہ سمجھنا ایک

ایسی ریاست کے خلاف بغاوت تھی جہاں وہ رہائش پذیر تھے۔ جب سبت کے دن کاروں پر پتھر برسائے جاتے تھے یا عورتوں کی عریانی سے مشتعل ہوکر وہ ان کے پوسٹر پھاڑنے لگتے تھے تو یہودی ریاست کے سیکولر تصورات کے خلاف وہ بغاوت کرتے تھے جن تصورات کا واحد معیار افادیت اور ریشنلزم تھا۔ تینوں توحید پرست مذاہب کے بنیاد پرست عملی لوگوں کے خلاف صف آرا ہیں جو روحانی مسائل کو نظرانداز کرتے ہوئے ماڈرن سوسائیٹی پر حکمران ہے جو تقدس اور پارسائی کے تصورات کو اہمیت نہیں دیتی۔ چونکہ سیکولر حکومت طاقتور ہوتی ہے اس لئے اکثر بنیاد پرست اس کی مخالفت چھوٹے علاماتی اقدامات تک محدود رکھتے ہیں۔ اپنی کمزوری کے احساس اور جنگ کے زمانے میں حکومت کی محتاجی کے اعتراف سے بنیادی پرستوں کے غم وغصہ میں اور اضافہ ہوتا ہے۔ ہیریڈم کی بھاری اکثریت اپنا احتجاج سیکولر ریاست سے عدم تعاون اور جوابی کلچر پیدا کرنے تک محدود رکھتی ہے ایسا کلچر جو ہرقدم ہر موڑ پر سیکولرازم کی قدریں چیلنج کرتا ہے۔

ہیریڈم کی متبادل سوسائیٹی کا مقصد وہ خلاء پر کرنا تھا جو نئے تصورات سے پیدا ہوا ہے۔ نازی آشوب کے بعد یہ خلاء یہودیوں کے لئے خوفناک حد تک گرا فک ہوگیا تھا۔ زندہ بچنے والے تلے ہوئے تھے کہ ہیریڈک عدالتین اوMisangtio Yeshivoاسرائیل اورامریکہ میں قائم کریں۔ یہ عمل ان یہودیوں کی بخشش کا باعث بنے گا جو ہٹلر کے کیمپوں میں فنا ہوئے اور بدی کی قوتوں کے خلاف بغاوت کا قدم بھی ہوگا۔ وہ سمجھتے تھے کہ اپنے اداروں کو نئی زندگی دینے اور مرنے والوں کو نہ صرف دوبارہ زندہ کرے بلکہ ہمیشہ سے زیادہ طاقتور بنانے سے وہ نیکی اورسچائی کی جنگ لڑ رہے ہیں۔ دوسری عالمی جنگ کے بعد نئے مدرسے (Yeshivot) اسرائیل اور امریکہ میں قائم کیے گئے۔1943 میں ربی ایرون کوٹلر1962-1891 نے امریکہ میں پہلا لیتھواینین Yeshivot بنایا۔1948 کے بعد تل ابیب کے نزدیکBnet Brakتورات کا نیا شہر کہلایا۔ جس کے لئے Yeshivot میں سارے اسرائیل اور جلاوطنی سے طلباء آئے۔ یہاں کا سرپرست ربی کارلٹز (1943-1878) تھا۔ ان اداروں نے ہمیشہ سے زیادہ Yeshivot کو ہیریڈک کی زندگی کا محور بنا دیا۔ تورات کی تعلیم زندگی پر محیط ہوگئی شادی کے بعد بھی مرد اپنی تعلیم جاری رکھتے ان کی بیویاں انہیں معاشی امداد دیتیں "جدیدیت کی نئی خطرناک دنیا میں، جس نے تمام یورپی یہودیوں کا نام ونشان تقریباً مٹا دیا، خارجی دنیا سے برائے نام رابطہ

کے ساتھ اور ہر وقت تورات میں ڈوبے ہوئے افراد یہودیت کے نئے نگہبان ہوں گے۔''

کوٹلر سمجھتا تھا کہ تمام دنیا اس کے طلباء کی وجہ سے قائم ہے۔ خدا نے زمین و آسمان صرف اس لئے تخلیق کئے ہیں کہ لوگ تورات پڑھ سکیں۔ اگر یہودی دن رات مقدس قانون کا صرف مطالعہ کریں تو اس کے تقاضے پورے ہو جائیں گے۔ اگر وہ رک گئے تو کائنات فوراً تباہ ہو جائے گی۔ یہ ایک ایسی خدا پرستی تھی جس کے ڈانڈے تباہی سے ملے ہوئے تھے۔ وہ کہتے کہ ہر قسم کی سیکولر تعلیم نہ صرف وقت کی بربادی ہے بلکہ دشمن کلچر میں جذب ہونا ہے۔ یہودیت کی کوئی شکل جو جدید کلچر کا کوئی پہلو بھی اپنے اندر جذب کرے چاہے وہ مذہب ہو صیہونیت ہو اصلاح یا قدامت پسندی ہو، بالکل ناجائز ہے۔ ایک ایسی دنیا میں جس نے حال ہی میں یہودیت کو فنا کرنے کا فیصلہ کیا ہو، ایسا کوئی سمجھوتہ نہیں ہوسکتا۔ سچا یہودی اپنے آپ کو دنیا سے دور رکھے اور مکمل طور پر تورات کے احکام کی تعمیل میں مصروف رہے۔ جنگ کے بعد قائم ہونے والے نئے Yeshivot سے بنیاد پرست روحانیت کی مایوسی ظاہر ہوتی تھی۔ بیسویں صدی کے دوران صرف کتاب مقدس ہی جدیدیت کے ساتھ یہودیوں کی تباہ کن آویزش میں محفوظ رہ گئی۔ ساٹھ لاکھ یہودی ہلاک ہو چکے تھے Yeshivot اور ہیزیدک کورٹ برباد ہو گئے انہیں کے ساتھ ہی یہودیوں کے علم وفضل کی کلاسیکی یادگاریں بھی ختم ہو گئیں۔ گیٹو کی زندگی کا انداز بھی ہمیشہ کے لئے رخصت ہو گیا۔ پاک زمین صیہونیوں کی وجہ سے ناپاک ہو رہی ہے۔ یہ خلاء پر کرنے کے لئے ایک سچے یہودی کو تورات سے وابستہ رہنا چاہیے جو خدا کے ساتھ اس کا آخری رشتہ ہے۔

نازی آشوب (Holocaust) کی پھیلائی ہوئی تباہی کے بعد تورات کی تعلیم کے انداز بدل گئے۔ گیٹو کی دنیا میں کتنی ہی روایتی رسمیں اس طرح قبول کر لی گئیں جیسی کہ ان تک پہنچتی تھیں۔ تورات کے مطابق زندگی گزارنے اور اس پر عمل کرنے کا متبادل کوئی طریقہ نہیں تھا۔ مراسم ادا کرنے کے بالکل صحیح طریقے، پناہ، گزینوں کی پہلی نسل کے خمیر میں تھے۔ مگر ان کی آنے والی نسلیں جو اپنے مقتول بزرگوں کی کھوئی ہوئی دنیا کی از سر نو تخلیق کے لئے بے تاب تھیں اتنے وجدانی طور پر ان مراسم کی ادائیگی کے انداز سے آگاہ نہیں تھیں جنہیں باقاعدہ طور سے کبھی لکھا بھی نہیں گیا تھا۔ معدوم ہوتی ہوئی تورات کی یہ دنیا بازیافت ہونے کا بس ایک ہی طریقہ تھا کہ باریک بینی کے ساتھ تورات کا جائزہ لیا جائے۔ 1950 سے Yeshiva کی دنیا میں علمی اور تحقیقی

مضامین کا سیلاب سا آ گیا جن میں وہ نازک اور باریک بیان کے انداز اختیار کئے گئے تھے جو آشوب سے پہلے یورپ میں بالکل قدرتی اور معمول کی بات لگتے تھے۔ ہر آنے والی نسل نے اس علم پر اپنے پیش روؤں سے زیادہ انحصار کیا اور فیض پایا۔ اس کے نتیجے میں یہودیوں کی زندگی تورات کے ساتھ اور زیادہ منسلک ہوگئی اور لکھے ہوئے لفظ پر ہمیشہ سے زیادہ تکیہ کرنے لگی۔

'بنیاد پرست یہودیت' میں ایک اور مشکل بھی تھی۔1960 کی دہائی مین ربی سملہ ایلبرگ کی آمد میں ہوئی تو اس نے رائے ظاہر کی کہ ''پوری مذہبی زندگی میں دوررس انقلاب آ رہا ہے تو رات کے شہر میں یہودی احکام کی پابندی ہمیشہ سے زیادہ کررہے ہیں۔'' یہ بڑی بہادری کا کام ہے اور ایک طرح سے خدا کی خدائی کو بحال کرنا ہے۔ خوراک کے معاملہ میں بنی براک کی ہیزیڈم نئی پابندیوں اور تکلفات کی تلاش میں تھے چاہے ان سے زندگی مزید دشوار ہو جائے۔

اس کا آغاز1930 کی دہائی میں ہیزن اش نے کیا تھا جب وہ پہلی دفعہ فلسطین آیا۔ مذہبی صیہونیوں کے ایک وفد نے اس سے وضاحت چاہی۔ وہ اپنی بستیوں میں یہودیوں کا زرعی قانون نافذ کرنا چاہتے تھے اور تورات کے مطابق پاک زمین میں کھیتی باڑی شروع کرنا چاہتے تھے ''کیا اس کا یہ مطلب ہے کہ قانون کے مطابق ہر سات سال بعد وہ اپنے کھیت بنجر رہنے دیں؟'' یہ سبیا تائی سال منانا سخت وقت طلب اور زراعت کے جدید طریقوں کے بالکل خلاف تھا جن کا مقصد پیداوار بڑھانا تھا۔ ربی کک نے تو نوآبادکاروں کے لئے کوئی عذر ڈھونڈ لیا تھا مگر ہیزن اش کوئی رعائت دینے کے خلاف تھا۔ ''مشکلات کا سامنا کرنے میں بڑائی ہے۔ قانون کا تقاضہ ہے کہ کسان کسی بڑی بھلائی کے لئے قربانی دیں۔'' سبیا تائی سال کا مقصد زمین کی پاکیزگی کا جشن منانا تھا تا کہ یہودی اس کی حرمت محسوس کریں اور جان لیں کہ تمام اعلیٰ مقاصد کی طرح یہ انفرادی اور ذاتی خواہشوں اور حاجتوں سے ماوراء ہے۔ زمین یہودیوں کی تجوریاں بھرنے کے لئے نہیں کہ اپنے مفاد کے لئے وہ اسے بنجر بنا دیں۔ سچے مذہبی کسان کا فرض ہے کہ وہ سیکولر آبادکاروں کی ریشنل مادہ پرستی کو چیلنج کرے جو صیہونیت تو ہو سکتی ہے مگر یہودیت ہرگز نہیں ہو سکتی۔

بنی براک میں ہیزن اش نے ایک تقریب کی صدارت کی جسے ربی البرگ نے ''پابندیوں کی دنیا'' کہا اور اپنے شاگردوں سے کہا کہ احکام کی تعمیل کے لئے سخت طریقے تلاش کریں۔ ایسا

ڈسپلن جوانہیں جدیدیت کے عملی تصورات سے بالکل الگ کردے۔ یورپ کے روایت پسند مسیحی حلقوں میں اس سخت گیری پر تیوری چڑھائی گئی تھی وہاں کے ربی اتنے محتاط افراد کی رائے کا احترام تو کرتے تھے جو قانون کے باریکیوں میں دلچسپی لے رہے تھے مگر ایسی سخت گیری عائد کرنے کی اجازت نہیں دی کیونکہ اس سے اختلاف پیدا ہو سکتے تھے۔ جولوگ ان فرقوں سے تعلق رکھتے تھے جن میں جانور ذبح کرنے کے معیار بہت سخت تھے وہ ایسے یہودیوں کے ساتھ مل کر ان کا گوشت نہیں کھاسکتے تھے جو یہودی ذبح کرنے کے قواعد کی پابندی نہیں کرتے تھے۔ سخت گیری ماضی کے بزرگوں کی توہین تھی جو ایسے معاملات میں اتنا تکلف نہیں کرتے تھے۔ تورات کی توجیہہ میں ربی نرمی کی طرف مائل تھے۔ ممتاز اور نمایاں افراد کو یہ اجازت نہیں دی جاسکتی تھی کہ وہ عام یہودیوں کے لئے احکام کی تعمیل ناممکن بنادیں۔ بنی براک کی سخت گیری اس نئے کلچر کا حصہ تھی جسے ہیریڈم تخلیق کرنے کی کوشش میں تھے۔ انہوں نے ایسا مذہبی معیار بنایا جو جدیدیت کی روح کے خلاف تھا۔ جدیدیت میں صلاحیت اور عمل سب سے بڑا معیار تھا۔ ایسے وقت جب قدامت پسند اور نئے تقلید پسند یہودی، ریشنل اور سہل مذہبی زندگی کی تلاش میں قانون کے بعض حصے نظرانداز کررہے تھے ہیریڈم نے اپنی جفاکش ریاضتوں کے پیش نظر معاشرہ کے بڑے دھارے کا ساتھ دینے سے انکار کردیا۔ بنی براگ میں آمد پر ربی ایلبرگ نے محسوس کیا کہ یہ اپنے آپ میں ایک دنیا ہے۔ ہیریڈی یہودی جدید معاشرہ کی بجائے ان یہودیوں سے دور ہو رہے تھے جنہیں تکلفات کی زیادہ پرواہ نہیں تھی۔ انہیں اپنی رسموں کے مطابق حمام اور خوراک کی سخت محتاط دکانیں اور مختلف قسم کے قصائی چاہیے تھے۔ وہ زمانے کے مزاج کے خلاف اپنی ایک امتیازی شناخت بنارہے تھے۔

اسی طرح یشوا میں بھی یہودی سیکولر کالج کے طلباء کی طرح تعلیم نہیں پارہے تھے کہ علم حاصل کریں اور پھر زندگی میں اس پر عمل کریں۔ عبادت گاہوں کے مراسم اور جانوروں کی قربانی جیسے تورات کے کئی احکام ناقابل عمل تھے اس کے باوجود طلباء اپنے دن، ہفتے، مہینے اور سال اپنے استادوں کے ساتھ اس بوسیدہ اور دوراز کار قانون سازی کی بحث میں ضائع کردیتے صرف اس لئے کہ اس کا تعلق خدا کے قانون سے تھا۔ عبرانی الفاظ کا دہرانا جو خدا نے کسی معنی میں موسیٰ سے وادیٔ سینا میں کہے تھے خدا کے ساتھ قربت کا ذریعہ بن گئے۔ قانون کی ہر تفصیل سے واقفیت

حاصل کر کے طلباء علاماتی طور پر خدا کے قریب ہو جاتے تھے۔ ایک ایسے دور میں کہ جس نے بڑی بے دردی کے ساتھ خدا کا قانون نظر انداز کر دیا تھا یہودی ہمیشہ سے زیادہ دلجمعی کے ساتھ اس پر عمل کر رہے تھے۔ اپنے آپ کو ماضی کے ربیوں کی قانونی رائے سے باخبر کر کے طالب علم روایت کے ساتھ اپنا رشتہ جوڑتا تھا۔ یشوا میں تعلیم کے طریقے بھی اتنے ہی واضح اور دوٹوک تھے جتنا کہ تعلیم کا نصاب تھا اور تعلیم کا مقصد اس انیا میں رہنے کے آداب سکھانا نہیں تھا بلکہ ایسی سوسائیٹی میں خدا کی تلاش تھی جو اسے بے دخل کر چکی تھی۔ یشوا کی دنیا میں ہر چیز سیکولر دنیا سے مختلف تھی۔ معاشرے کے بڑے دھارے میں (مرد 1950 تک اعلیٰ صنف سمجھے جاتے تھے) مرد باہر جا کر کاموں میں مصروف رہتے جبکہ عورتیں گھر کی تنہائی میں پڑی رہتی تھیں۔ سیکولر اسرائیل میں فوج تقریباً مقدس ادارہ بن رہی تھی جس سے وابستگی مردوں اور عورتوں دونوں کے لئے لازمی تھی، مرد اپنی فوجی یونٹ میں زندگی بھر ریزروڈیوٹی کے لئے موجود رہتا، یشوا کے طالب علم کو بہر حال فوجی ملازمت معاف تھی۔ مگر اعلان کرتا کہ وہ یہودیوں کا حقیقی محافظ ہے اور بدی کی قوتوں کے خلاف جنگ کی پہلی صف میں موجود ہے۔

ہیزیدم کی نظر میں جدیدیت، اسرائیل کی ریاست میں بھی جلاوطنی اور خدا سے دوری تھی۔ آشوب کے ذریعے اس کی حقیقت ظاہر ہو چکی تھی ایسی دنیا میں ایک یہودی کی زندگی آسان نہیں تھی، تورات کی تعلیم پر کھل کر پیسہ خرچ کیا گیا اور اسے خوب پھیلایا گیا۔ طلباء کو سیکولر دنیا سے دور رہنے کی تلقین کی گئی۔ ایک ہیزیڈی ماہر تعلیم کا کہنا ہے کہ یشوا ایک نوجوان کو تورات کے ساتھ مکمل وابستگی ہی نہیں سکھاتا بلکہ اسے اس دنیا سے دور رہنا بھی سکھایا جاتا ہے۔ یشیوا کی دیواریں مسلسل یاد دلاتی تھیں کہ تورات کے لئے یہ دنیا سازگار نہیں۔ مخالف کلچر، معاشرہ سے طلباء کی دوری بڑھانے کے لئے بنایا گیا۔ جیسا کہ اے ولف 'Education in the face of the Generation-1954' میں لکھا کہ ''یشوا کے یہودی نے اپنے باپ دادا کا دور واپس لانے کے لئے خود کو وقف کیا ہوا ہے۔ قطع نظر اس کے کہ سیکولرازم کے حامی اس بات سے بے تعلق ہیں۔ ہم بالکل تنہا کھڑے ہیں ہم اپنے گردوپیش سے بالکل مختلف ہیں۔ یہودی ریاست میں بھی ہیریڈم اکیلے اور الگ ہیں۔ جن تاریخی شخصیتوں کے ناموں پر سڑکوں کے نام رکھے گئے ہیں ہم انہیں پسندیدگی کی نظر سے نہیں دیکھتے۔ ہم سب اکیلے ہیں۔''

ریشنل جدیدیت کے خلاف ہیریڈم کی بغاوت زیادہ تر پسپائی پر مبنی تھی۔ مگر اسی دور میں لیو باؤچ ہیزیڈم جو ایک طویل عرصہ سے حبد یشیوا روس میں محاذ آرائی کی تیاریاں کر رہا تھا، جارحیت پر اتر آیا۔ بالشویکوں نے روس میں حبد کا نام ونشان تقریباً مٹا دیا تھا۔ یہودی سکول اور یشوا بند کر دیئے گئے تھے تورات کی تعلیم انقلاب دشمن قرار دی گئی خلاف ورزی کی سزا بھوک، جیل یا موت تھی۔ چھٹے ربی Joseph Isaac Schncarson (1880-1950) نے یہ اقدامات مسیحا کی ولادت کے درد سمجھے۔ مذہبی لوگوں کے لئے یہ کافی نہیں کہ وہ دنیا سے الگ ہو جائیں ہیزیڈم پر لازم ہے کہ وہ خدا کی خاطر نئی دنیا تسخیر کریں روس میں ربی نے یہودیوں کی ایک زیر زمین تنظیم بنائی جہاں یشیوا کے گریجوئٹ تورات اور تلمود کی تعلیم دیتے تھے اور نوجوان یہودیوں کو احکام پر تعمیل کرنا سکھاتے تھے۔ اسے جلاوطن کر دیا گیا مگر اس نے اپنا کام پولینڈ میں جاری رکھا۔ اپنی جماعت نئے خطوط پر منظّم کرتا رہا۔ اور دنیا بھر میں لوباوچ سے رابطہ قائم رکھنے کے لئے نئی کمیونیکیشن ٹیکنالوجی سے بھی کام لیتا رہا۔ جب ربی بھاگنے پر مجبور کر دیا گیا تو وہ امریکہ پہنچ چکا تھا اس نے اپنا کام جاری رکھا اور اپنی پروپیگنڈہ مہم کے ذریعے ان یہودیوں کو حوصلہ دیا جو مایوس ہو کر نیو کارک کی زندگی میں جذب ہو گئے تھے اور اس طرح اپنی شناخت کھو چکے تھے۔ یہ پسپائی کی بجائے قدم آگے بڑھانے کی کوشش تھی۔ 1949 میں ربی نے ایک قابل تعریف کام کیا کہ Kfar Habad کے نام سے اسرائیل میں پہلی ہیزیڈک بستی بسائی۔ اس نے صیہونیت کے خلاف اپنی عداوت ترک نہیں کی تھی۔ مگر اسے یقین تھا کہ ان آخری دنوں میں اسرائیل کی مسخ شدہ مملکت میں اس کا پیغام ضرور پہنچے گا۔

1950 میں ربی کا انتقال ہو گیا۔ اس کا داماد Menacham Mendel Schnesson (1904-94) اس کا جانشین مقرر ہوا۔ یہ ایک حیرت انگیز بات تھی جس سے ظاہر تھا کہ حبد سیکولرازم کو بدلنے کے لئے اسے قبول کرنے کو بھی تیار تھا۔ یہ ساتواں ربی یشیوا کا فارغ التحصیل نہیں تھا بلکہ اس نے ماڈرن تعلیم پائی تھی۔ اس نے یہودی فلسفہ برلن میں پڑھا تھا اور میرین انجینئرنگ سوبورن میں سیکھی تھی۔ جب وہ 1941 میں امریکہ آیا تھا تو اس نے نیوی میں کام کیا تھا اس کے علاوہ اس نے بڑے ربی کے مشن میں اس کا ہاتھ بھی بٹایا تھا۔ وہ ربی نئی دنیا کی پیداوار تھا اور دنیا بھر میں یہودیوں کی بھلائی کے لئے وسیع پیمانے پر میڈیا کی خدمات حاصل کر سکتا تھا۔ اب

صرف یشیوا کے طلباء ہی ربی کی فوج کے سپاہی نہیں تھے بلکہ ہر حبدی یہودی اس کا سپاہی تھا۔ ربی نے بڑی احتیاط کے ساتھ اپنی مہم منظّم کی اور 1970 میں سیکولرازم کے خلاف بھرپور جوابی حملہ شروع کیا۔ ہزاروں نوجوان اقلیت میں تھے یا سیکولرازم کا حصہ بن چکے تھے، حبدہاؤس ایسا مرکز تھا جہاں یہودیت کے متعلق اطلاعات وتعلیمات فراہم کی جاتی تھیں۔ سبت اور اس کے علاوہ دوسری تقریبات منعقد ہوتی تھیں، کلاسیں لگتی تھیں، لیکچر دیئے جاتے تھے۔ دوسرے نوجوان ہیزیڈم کیمپس میں چلے جاتے۔ امریکہ کی سڑکوں پر نکل آتے اور آنے جانے والے یہودیوں کو کسی ایک حکم پر عمل لوگوں کے سامنے کرنے کی ترغیب دیتے۔ آئیڈیا یہ تھا کہ اس عمل سے وہ خدائی شمع روشن ہوگی جو ہر یہودی کی روح میں موجود ہے۔

دنیا کے ساتھ ربی کے مراسم بہت اچھے تھے اس کا سائنسی علم حبد ہیزیڈم کے قدیم مائتھوز کے پہلو بہ پہلو موجود تھا۔ میرین حیاتیات (Marinecology) کے متعلق اس کے علم نے اسے روحانی کیفیتوں سے محروم نہیں کیا تھا اس نے مسیحائی کے تصور کی خوب تبلیغ وتشہیر کی اور حبد کی قیادت کا انتخاب جیت گیا۔ اس کی روحانیت میں لوگوس اور مائتھوس دونوں بصیرت کا ذریعہ تھے۔ وہ کسی بھی احتجاجی بنیاد پرست کی طرح انجیل کی لفظی اور اصلی تعبیر کرتا اس طرح کہ تقریباً چھ ہزار سال پہلے خدا نے چھ دنوں مین دنیا بنائی تھی مگر اسے یہ بھی یقین تھا کہ جسم اور روح یا مادہ وتوانائی کے بارے میں جدید سائنسی انکشافات انسانوں کے لئے حقیقت کی عضوی یکتائی کا نیا ثبوت ہیں جو انہیں توحید کا سبق دیتا ہے۔ اس کی زبردست مہم نئے طریقوں سے منظّم کی گئی تھی وہ جانتا تھا کہ اسے اپنے وسائل سے کیا کام لینا ہے، وہ سیکولرازم کے حامی مردوں اور عورتوں سے بات کرنا بھی خوب جانتا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ حبد کے تصوف اور دیومالا نے لیویاوچ کو یہ اعتماد دیا تھا کہ وہ پیچھے ہٹنے کی بجائے قدم آگے بڑھائیں۔ نئے ربی روشن خیالی کی روح کے خلاف ہوگئے تھے مگر ربی شینورزلمن پہلے ربی اور حبد کے بانی نے یہ کوشش کی تھی کہ اس کے ہیزیڈم میں اپنے زمانے کی دنیا کے متعلق ایک اثباتی نقطۂ نظر پیدا ہوجائے ساتواں ربی دیومالائی تناظر میں اپنی ریشنل صلاحیتوں سے کام لیتے ہوئے اسی اصلی روح کی طرف واپس ہوا تھا۔ حبد نے مقدس اور غیر مقدس کی جدید تقسیم کو ماننے سے انکار کردیا تھا، ہر چیز چاہے کتنی ہی عام اور معمولی ہو اس میں روحانی چمک ضرور ہوتی ہے "سیکولر یہودی" کے نام سے کوئی یہودی نہیں، Goyism میں بھی پاکیزگی کی صلاحیت

موجود ہے۔ اپنی زندگی کے آخری دور میں ربی نے امریکہ کے غیر یہودیوں کی بھلائی کے لئے کام شروع کیا جو اس کے خیال میں ان کے لئے مفید اور ضروری تھا۔ نئے دور میں لیویاچ نے بڑی تکلیفیں اٹھائیں انہیں ہٹا دینے کی کوششیں بھی ہوئیں مگر ربی نے انہیں سکھایا تھا کہ نفرت اور انتقام کے خواب نہ دیکھیں بلکہ دنیا کو ایسی جگہ سمجھیں جہاں وہ خدا کو واپس لا سکتے ہیں۔

امریکہ میں احتجاجی بنیاد پرستوں نے بالآخر اپنا ایک جوابی حملہ جدیدیت کے خلاف شروع کر دیا۔ اگرچہ وہ اس سے پہلے شکست کھا چکے تھے مگر موجودہ دور میں انہوں نے ہیزیڈی یہودیوں کی طرح اپنے حفاظتی جوابی کلچر کی تخلیق پر توجہ دی۔ سکوپس کے مقدمہ کے بعد پروٹیسٹینٹ بنیاد پرست عوام سے دور ہو کر اپنے گرجوں اور کالجوں میں محدود ہو گئے۔ آزاد خیال مسیحی سمجھنے لگے کہ بنیاد پرستی کا بحران ختم ہو گیا ہے۔ دوسری عالمی جنگ ختم ہونے تک بنیاد پرست کمزور اور غیر اہم ہو گئے اور لوگ بڑے بڑے فرقوں کی طرف توجہ دینے لگ گئے مگر منظر سے غائب ہونے کی بجائے بنیاد پرست مقامی سطح پر مضبوط ہونے لگے۔ بڑے فرقوں میں اب بھی قدامت پسندوں کی اچھی خاصی تعداد موجود تھی۔ آزاد خیال افراد کو فرقوں سے نکال دینے کے معاملہ میں ان کی اُمیدیں ختم ہو چکی تھیں مگر بنیادی اصولوں پر ان کا ایمان بدستور قائم تھا۔ وہ اکثریت سے کٹ کر الگ تھلگ رہتے تھے۔ جو زیادہ بنیاد پرست تھے انہوں نے اپنے گرجے الگ بنالئے۔ وہ سمجھتے تھے کہ منکرین خدا لبرل عیسائیوں سے الگ رہنا ان کا مقدس فرض ہے۔ انہوں نے نئی تنظیمیں اور نئے نیٹ ورک بنانے شروع کر دیئے جن میں Evangelist کی نئی نسل کا فکری تعاون شامل تھا۔ 1930 تک امریکہ میں بنیاد پرستوں کے کم از کم پچاس بائیبل کالج بن چکے تھے۔ ڈیپریشن کے برسوں میں چھبیس مزید کالج قائم ہو گئے اور بنیاد پرستوں کا ایلینوائے میں واقع Wheaton College امریکہ میں سب سے زیادہ تیزی کے ساتھ ترقی پذیر لبرل آرٹس کالج تھا۔ بنیاد پرستوں نے اپنے اشاعتی اور نشریاتی ادارے بھی بنالئے۔ جب 1950 کی دہائی میں ٹیلی وژن آیا تو نوجوان بلی گراہم، ریکس ہیمبرڈ اور اورل رابرٹس نے پرانے تجدید پسند واعظوں کی جگہ لیتے ہوئے Televangelist کے طور پر اپنا کام شروع کیا۔ ایک بہت بڑے اور بظاہر نظر نہ آنے والے نشریاتی ادارے نے تمام بنیاد پرستوں میں رابطہ قائم کر دیا۔ وہ اپنے آپ کو غیر سمجھتے تھے مگر ان کے کالجوں، ریڈیو اور ٹیلی ویژن نے ان کی دشمن دنیا میں انہیں ایک گھر دے دیا۔

وہ مخالف کلچر جو پروٹیسٹینٹ بنیاد پرست تخلیق کر رہے تھے اس میں ان کے کالج، اردگرد کے عامیانہ ماحول کے درمیان محفوظ اور مقدس پناہیں تھیں۔ وہ الگ رہ کر طہارت کی فضا بنا رہے تھے بوب جونز یونیورسٹی فلوریڈا1927 میں قائم ہوئی تھی ٹینیسی سے ہوکر اپنے آخری مقام گرین ولا جنوبی کیرولائنا پہنچی۔ وہ نئے بنیاد پرست اداروں کے تصورات کی نمائندہ تھی اس کا بانی بیسویں صدی کے آغاز کا ایکEvangelistدانشور نہیں تھا مگر ایک ''محفوظ'' سکول بنانا چاہتا تھا جوان نوجوانوں کی مدد کرے جو دہریت کے خلاف جنگ کی تیاری کرتے ہوئے اپنے مذہب کی حفاظت کرنا چاہتے تھے۔ دہریت کے متعلق اس کا خیال تھا کہ وہ سیکولر یونیورسٹیوں میں سرائیت کر چکی تھی۔ طلباء کولبرل آرٹس کے ساتھ 'کامن سینس عیسائیت' سکھائی جاتی تھی۔ ہر شخص کے لئے ضروری تھا کہ وہ ہر سمسٹر میں انجیل کا کم از کم ایک کورس کرے۔ گرجا میں جائے، مسیحی طرز زندگی اختیار کرے، لباس اور سماجی میل ملاپ میں قواعد کی سخت پابندی کرے۔ نافرمانی اور غداری ناقابل برداشت اور ناقابل معافی گناہ تھے۔ باب جونز یورنیورسٹی اپنے آپ میں ایک دنیا تھی اس نے نصاب اور ڈسپلن میں سستی شہرت کے حصول کے لئے نہیں کی تھی اس لئے کہ اسٹیبلشمنٹ کے ساتھ کسی قسم کی سمجھوتہ بازی اس کی نظر میں گناہ تھی۔ اس قربانی سے اسے داخلوں، نصاب اور لائبریری کے وسائل پر زیادہ اختیار حاصل ہو گیا تھا۔

یہ ڈسپلن لازمی تھا کیونکہ یونیورسٹی کے طلباء جانتے تھے کہ وہ حالت جنگ میں ہیں جیسا کہ حال ہی میں بتایا گیا تھا کہ اسکول انجیل پر دہریوں اور منکرین کے حملوں کے خلاف ہے تمام نام نہاد، آزاد خیال، ماڈرن اور نئے تقلید پسند ان حملوں میں شامل ہیں۔ یونیورسٹی کے عملے اور طلباء نے ان کے حملوں سے اپنا مذہب بچانے کے لئے دنیا سے منہ موڑا ہے۔ دنیا سے یہ علیحدگی کی باب جونز کے بیٹے (باب جونز دوئم) کے مطابق بنیاد پرستانہ شہادت کی بنیاد ہے۔ اس محاذ سے طلباء انجیل کا دفاع جنگی انداز میں کریں گے۔ امریکی طرز تعلیم پر تو یونیورسٹی کا اثر بہت کم تھا مگر عیسائی قوم اس سے متاثر بہت ہوئی۔ باب جونز یونیورسٹی ملک میں بنیاد پرست ٹیچر مہیا کرنے کا سب سے بڑا ادارہ ہے۔ اس کے گریجوئٹ اگر اپنی وسیع تعلیم کے لئے نہیں تو اپنے ڈسپلن اور مستعدی کے لئے مشہور ہیں۔

ان برسوں میں قائم ہونے والے بائیبل کالج اور یونیورسٹیاں ہیز یڈی یشیوا کی طرح تھے

الگ تھلگ اور محفوظ پناہیں۔ بنیاد پرست محسوس کرتے تھے کہ ان کا مذہب خطرے میں ہے انہیں امریکی زندگی کے مرکز سے ہٹا دیا گیا ہے۔ انہیں بتا دیا گیا ہے کہ وہ اپنے آپ کو دروازے سے باہر سمجھیں۔ اس آویزش میں گہرے دکھ اور غصے کا اظہار اس زمانے کے انتہا پسند عیسائیوں کی تقریروں میں ہوا۔ جنہوں نے آبادی کے نہایت کمزور حلقوں کے خوف اور نفرت کو زبان دی تھی۔ جیرلڈون راڈ جس نے ایک تنظیم 'عیسائیت کے محافظ' کی بنیاد رکھی 1930 میں نازی جرمنی گیا جب واپس آیا تو اس نے امریکیوں کو یہودی خطرے سے خبردار کرنے کا فیصلہ کیا۔ اسی وقت اس نے روزویلٹ کے ساتھ یہودیوں کے معاہدے کو شیطانی قرار دیا۔ ون راڈ نے امریکہ میں ہر لبرل رجحان کی مخالفت کی۔ بنیاد پرستوں نے آزاد خیال افراد کو ہر ہنگامے اور سچے عیسائیوں کی کمزوری کا ذمہ دار ٹھہرایا چاہے وہ سیکولرازم کے حامی ہوں یا نہ ہوں۔ ان کا رخ سیاسی دائیں بازو کی طرف تھا۔ انیسویں صدی میں Evangelist جب الوطنی کو بت پرستی سمجھتے تھے۔ اب وہ امریکی طرز زندگی کی حفاظت کا مقدس فرض بن گئی تھی۔ برجیس صلیبی جنگوں کا بانی اور کمیونسٹ دشمن پادری سوویٹ یونین کو شیطانی طاقت سمجھتا تھا اس نے جسے وہ کمیونسٹوں کی مداخلت کہتا تھا اس کے خلاف ان تھک جنگ لڑی۔ آزاد خیال صحافت، بائیں بازو کے ٹیچر اور سپریم کورٹ سب اس کی رائے میں امریکہ کو کمیونسٹ بنانے کی سازش تھی۔ کارل میک انٹائر جو بائیبل پریسٹرین چرچ بنانے کے لئے پریسبائی چرچ سے علیحدہ ہوا اسے ہر جگہ چھپے ہوئے دشمن نظر آتے تھے بڑے بڑے فرقے خود امریکہ میں عیسائیت ختم کرنے کی شیطانی سازش کا حصہ تھے۔ 1950 میں میک انٹائر جوزف میکارتھی کی کمیونسٹ دشمن جنگ میں شامل ہو گیا ان انتہا پسندوں میں کوئی خصوصیت تو نہیں تھی مگر وہ بہت بارسوخ تھے۔ 1934 تک ون راڈ کے Defender Magazine کے چھ لاکھ افراد خریدار بن گئے۔ میک انٹائر کے Christian Beacon کے ایک لاکھ بیس ہزار خریدار بنے اس کے ریڈیو پروگرام Twentieth Century Christian Hour کے ذریعے ہزاروں خریداروں کا اضافہ ہوا۔ اس پروگرام کے توسط سے وہ ان عیسائیوں کو برا بھلا کہتا تھا جو اس کے نفرت انگیز موقف کی تائید نہیں کرتے تھے۔ تمام آزاد خیال پادری بھی اس کی تنقید کی زد پر تھے جو بعض لوگوں کی نظر میں بڑے مہربان اور اچھے عیسائی تھے مگر درحقیقت کمیونسٹ دہریئے انجیل کی توہین کرنے والے، جنس کے غلام تھے۔

بنیاد پرستی غصے کا مذہب بن رہا تھا مگر ہیز یڈی کی یہودیت کی طرح اس غصہ کی جڑیں خوف میں تھیں۔ یہ بات Premillenalism سے واضح تھی جو اس دور میں تحریک کا ثبوت بن گیا تھا۔ دوسری عالمی جنگ تک صرف Premillenaslists ہی اپنے آپ کو بنیاد پرست کہتے تھے۔ بلی گراہم جیسے عیسائی اپنے آپ کو evagelicals کہلانا پسند کرتے تھے اس گندی تہذیب میں روحوں کی بقا کے لئے دوسری قسم کے مسیحیوں کی ضرورت تھی قطع نظر اس کے کہ ان کے مذہبی عقائد کیا ہیں۔ اصلی بنیاد پرست علیحدگی پر زور دیتے تھے۔ جنگ کے برسوں میں ثابت ہو گیا کہ پوسٹ ملی نیئل (بعد از ہزاریہ) کے آزاد خیالوں کی رجائیت انہیں دغا دے گئی ہے۔ بنیاد پرست نئی اقوام کو کو بھی پرانی لیگ آف نیشنز کی طرح بے کار ادارہ سمجھتے تھے یہ دنیا کو دجال اور اس کی وجہ سے آنے والے مصائب کے لئے تیار کرے گی۔ ''انجیل ایسے مثالی خواب رد کرتی ہے'' ہربرٹ لاک ائیر نے 1942 میں لکھا ''یہ آخری جنگ نہیں۔ موجودہ بربادیوں سے نئے عذاب پیدا ہوں گے'' یہ تصور لبرل اسٹیبلشمنٹ کے نقطۂ نظر کے یکسر خلاف تھا۔ امریکہ میں دو قو میں تھیں جو جدید دنیا کے متعلق ایک رائے نہیں رکھتی تھیں Premillenial کا نقطۂ نظر بنیاد پرستوں کے احساس بے بسی کی تائید تھا ان کا خیال تھا کہ ایٹم بم کی پیش گوئی سینٹ پیٹر نے کی تھی جس نے کہا تھا کہ آخری دن آسمان ایک گرج کے ساتھ غائب ہو جائے گا تمام عناصر کو آگ لگ جائے گی۔ وہ ریزہ ریزہ ہو جائیں گے۔ زمین اور اس میں جو ہے جل کر بھسم ہو جائیں گے۔ آخری تباہی سے بچنے کی کوئی اُمید نہیں۔ ڈیوڈ گرے برن ہاؤس نے (1945) Elemity میں لکھا ''خدائی منصوبہ ناگزیر طور پر پورا ہونے کو ہے'' اپنی مشہور تصنیف The Atomic Age and the word of God (1948) میں بنیاد پرست مصنف دلبر سمتھ نے بحث کی کہ بم نے ثابت کر دیا ہے کہ لفظی اور اصلی معنوں پر یقین رکھنے والے سچے ہیں۔ انجیل میں ایٹمی دھماکے کی صحیح پیش گوئی سے ثابت ہو گیا کہ انجیل غلطیوں سے پاک ہے اور سیدھے سادہ معنوں میں پڑھنی چاہیے۔

ہر چند کہ اس تمام منظر نامہ کا تعلق مسئلہ جبر سے تھا مگر اس سے بنیاد پرستوں میں اعتماد اور برتری کا احساس پیدا ہوا حالانکہ کلچر کے بڑے دھارے نے انہیں حقیر جان کر الگ کر دیا تھا۔ وہ خصوصی طور پر جانتے تھے کہ اصل میں کیا ہو رہا ہے جبکہ آزاد خیال اور سیکولرسٹ اس سہولت سے محروم تھے۔ بیسویں صدی کے تباہ کن حالات واقعی مسیح کی آخری فتح کی طرف لے جا رہے تھے

پھر یہ کہ ایٹمی تباہی سے ایمان والے متاثر نہیں ہوں گے کیونکہ وہ آخرت سے پہلے آسمان پر اٹھالئے جائیں گے صرف مرتد ہی آخرت کے عذاب دیکھیں گے Premillenalism چنانچہ بنیاد پرستوں کی آزردگی کو ہوا دے رہا تھا جس کی وجہ سے انہوں نے انتقام کے خواب دیکھے تھے حالانکہ وہ خواب انجیل کی تعلیمات کے خلاف تھے۔ نئی اسرائیلی ریاست کے بارے میں ان کی رائے میں بھی کنفیوژن اور تضاد موجود تھا۔

Premillenalism کے بانی جان ڈیوی کی نظر میں یہودیوں کو مرکزی حیثیت حاصل تھی۔ 1917 کے بالفور ڈیکلریشن سے بنیاد پرست بہت خوش ہوئے تھے۔ 1948 میں اسرائیل کے قیام میں بنیاد پرست مبلغ جیری فالویل نے اسے مسیح کی واپسی کی سب سے بڑی نشانی کا نام دیا۔ 14 مئی 1948 ’جب بن گوریون نے اسرائیل کے قیام کا اعلان کیا تو اس نے اسے مسیح کے آسمان پر چلے جانے کے بعد تاریخ کا سب سے بڑا دن کہا‘ اسرائیل کی حمایت انتدائی تھی ان کے خیال میں اسرائیل کی تاریخ انسانی اثر اور اختیار سے باہر تھی، اسے ابدیت کے ہر پہلو سے بہر حال خدا کو بنانا ہی تھا، مسیح واپس نہیں آسکتا تھا قیامت بھی اس وقت تک ممکن نہیں تھی جب تک کہ یہودی ارض مقدس میں آباد نہ ہو جائیں۔

پروٹیسٹنٹ بنیاد پرست پرجوش صیہونی تھے مگر ان کی نظر میں ایک تاریک پہلو بھی تھا جان ڈربی نے بتایا تھا کہ آخری وقت فلسطین میں رہائش پذیر یہودیوں میں سے دوتہائی یہودی دجال کے ہاتھوں مارے جائیں گے۔ یہ پیش گوئی زکریا نے کی تھی اور ایسی تمام پیش گوئیوں کی طرح اس کے الفاظ کی توجیہہ الفاظ ہی کے مطابق ہو۔ بعض بنیاد پرستوں کی نظر میں ہٹلر کے مظالم یہودیوں کو بدلنے کے لئے خدا کی آخری کوشش اور آنے والے بدترین حالات کی نشان دہی تھی۔ ایک بنیاد پرست مصنف جان والورڈ نے پیش گوئیوں پر مبنی یہودیوں کی آخری اذیتوں کا ایک ٹائم ٹیبل دیا یعنی دجال یہودیوں کی عبادت گاہ کی تعمیر میں ان کی مدد کرے گا اور اپنے مسیحا ہونے کا انہیں یقین دلائے گا مگر وہ اس نئی عبادت گاہ میں عبادت کے لئے اپنی تصویر رکھ دے گا۔ اس ارتداد کے بعد 1,44,000 یہودی اس کے خلاف ہو جائیں گے اور عیسائیت اختیار کرلیں گے اور شہیدوں کی موت مریں گے۔ تب دجال یہودیوں پر سخت ظلم کرے گا اور وہ بہت بڑی تعداد میں مارے جائیں گے۔ تھوڑے سے اس کے ہاتھوں بچیں گے اور مسیح کی دوسری آمد پر اسے

مبارک دیں گے۔ جب پروٹیسٹنٹ بنیاد پرست اسرائیل کے قیام پر خوشی منا رہے تھے وہ وقت کے خاتمہ پر اپنی آخری نسل کشی کے خواب دیکھ رہے تھے۔ گویا یہودی ریاست صرف عیسائیوں کے مقاصد حاصل کرنے کے لئے بنی تھی۔ آخری دنوں میں تکلیفیں سہنا یہودیوں کا مقدر ہے چاہے وہ مسیح کو قبول کریں یا نہ کریں۔ امریکی احتجاجیوں نے یہودیوں کی طرح عذاب نہیں دیکھے تھے مگر جدیدیت کے متعلق بھی ان کی رائے مایوس کن تھی۔ انہوں نے نئی دنیا کی ریشنل اپروچ کے جواب میں انجیل پڑھنے کا سائنسی اور بنیادی طریقہ وضع کیا تھا پھر بھی ایک اگر مذہب کا سچا امتحان اس بات میں ہے کہ اس کے پیرو اپنے اندر رحم اور ہمدردی کا جذبہ پیدا کریں تو احتجاجی بنیاد پرست ایک مذہبی تحریک کی حیثیت سے اس آزمائش میں بری طرح ناکام ہوئے تھے۔ جیسا کہ سکوپس کے مقدمہ میں اس کی سائنس ناقص ثابت ہوئی تھی۔ درحقیقت انجیل کے بعض منتخب حصوں کی لفظی تعبیر سے انہیں یہ حوصلہ ہوا کہ جدیدیت کی منکر خدا اور ہلاکت خیز ذہنیت اپنائیں۔

مسلمانوں میں ابھی تک کوئی بنیاد پرست تحریک نہیں تھی کیونکہ ان میں جدیدیت کا عمل ابھی کافی حد تک آگے نہیں بڑھا تھا وہ ابھی دنیا کے چیلنج کا سامنا کرنے کے لئے اپنی مذہبی روایات کو نئی شکل دے رہے تھے اور اسلام کے ذریعے لوگوں کو نئے دور کا پیغام پہنچا رہے تھے۔ مصر میں ایک نوجوان استاد جمال الدین افغانی 'عبدہ' اور رضا کے خیالات لے کر آیا۔ جن کی اصلاحات ابھی دانش وروں کے محدود حلقے سے نکل کر عام لوگوں تک پہنچی تھیں ایسا ہونا بذات خود جدیدیت کا عمل تھا۔ پرانے مصلحین کے خیالات اب بھی قدامت پسندانہ رنگ لئے ہوئے تھے اکثر قدیم فلسفیوں کی طرح وہ بھی اشرافیہ میں سے تھے اس لئے وہ عوام کو اپنے اونچے خیالات کو سمجھنے کا اہل نہیں سمجھتے تھے۔ حسن البنیٰ (49-1906) نے وہ طریقہ دریافت کرلیا کہ جس کے ذریعے نئے تصورات ایک عوامی تحریک میں ڈھل سکتے تھے۔ اس نے قاہرہ کے دارالعلوم میں تعلیم پائی تھی اس نے مذہبی تعلیم کے ساتھ سائنس میں بھی اعلیٰ تعلیم حاصل کی تھی مگر بنیٰ صوفی بھی تھا اور زندگی بھر تصوف پر عمل کرتا رہا۔ بنیٰ کی نظر میں مذہب کوئی رسمی یا خیالی معاملہ نہیں اسے صرف ایمان اور عمل کے ذریعے سمجھنا ممکن ہے۔ وہ جانتا تھا کہ مصر کے لئے مغربی سائنس اور ٹیکنالوجی بہت ضروری ہے۔ اسے یہ بھی احساس تھا کہ مصری معاشرہ معاشی، سماجی اور سیاسی لحاظ سے جدید اور ترقی یافتہ ہو مگر یہ عملی اور ریشنل معاملات ہیں جنہیں روحانی اور نفسیاتی اصلاح کے دوش بدوش چلنا چاہیے۔

قاہرہ میں طالبِ علم کی حیثیت سے حسن البنیٰ اور اس کے دوست وہاں کے علمی انتشار سے بہت دل گیر ہوئے۔ تمام پارٹیاں بے مقصد اور بے نتیجہ بحثوں میں الجھی اور انگریزوں کے ہاتھوں میں کھلونا بنی ہوئی تھیں۔ مصر کی 'آزادی' کے باوجود انگریزوں کو ملک پر پورا اختیار حاصل تھا۔ پہلی دفعہ جب بنیٰ نے ایک ادارے 'اسماعیلیا' میں پڑھانا شروع کیا جو نہر سویز کے علاقہ میں واقع تھا اور جہاں انگریز بڑی حفاظت اور بے فکری کے ساتھ رہتے تھے تو وہاں کے لوگوں کی تذلیل دیکھ کر اسے بہت صدمہ ہوا۔ انگریزوں اور دوسرے آبادکاروں کو مقامی آبادی سے کوئی دلچسپی نہ تھی پھر بھی وہاں کی معیشت اور شہری ضرورت کے وسائل ان کے قبضہ میں تھے۔ اسے ان کے شاندار بنگلوں اور مصری مزدوروں کے تباہ حال جھونپڑوں کا فرق دیکھ کر بہت شرم آئی۔ ایک سچے مسلمان کی حیثیت سے بنیٰ اسے محض سیاسی معاملہ نہیں سمجھتا تھا کیونکہ مسلمانوں کی عام حالت، اسلام میں بنیادی اہمیت رکھتی ہے۔ یہ دیکھ کر بھی بنیٰ کو بہت دکھ ہوا کہ لوگ مسجدوں میں جانا ترک کر رہے ہیں مصریوں کی بڑی اکثریت جدیدیت کے عمل میں شامل نہیں تھی۔ جب کبھی انہیں مغربی خیالات کا سامنا ہوتا تو وہ پریشان اور بے بس ہوتے۔ ان تک ان خیالات کے پہنچنے کا بڑا ذریعہ قاہرہ سے شائع ہونے والے اخبارات تھے ان کا خیال تھا کہ مغربی تصورات کا اسلام کے ساتھ کوئی تعلق نہیں، ان میں کوئی قدر مشترک نہیں یا یہ کہ وہ اسلام کے خلاف ہیں۔ علماء نے پہلے ہی جدید دنیا سے منہ موڑ لیا تھا اس لئے وہ لوگوں کی کیا رہنمائی کرتے اور سیاستدانوں نے عوام کے سیاسی، معاشی اور تعلیمی مسائل حل کرنے کی کوئی قابل ذکر کوشش نہیں کی تھی۔ بنیٰ نے کچھ کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ قوم پرستی اور یورپ کے ساتھ مصر کے آئندہ تعلقات کے بارے میں بلند بانگ دعوؤں اور بحثوں کا کیا فائدہ جبکہ مصر کے زیادہ لوگ پریشان ہیں اور ہمت ہار رہے ہیں۔ اسی ذہنی اور روحانی کرب کا ایک ہی علاج بنیٰ کی سمجھ میں آیا کہ مسلمان قرآن وسنت کے بنیادی اصولوں پر عمل کریں۔

بنیٰ نے اپنے چند دوست ساتھ لئے اور کافی ہاؤسوں اور مسجدوں میں مصریوں کے سامنے اپنے خیالات بیان کرنے لگا اس نے انہیں بتایا کہ مغرب کے اثر اور سیاسی تبدیلیوں نے ان کا توازن بگاڑ دیا ہے اور وہ اب اپنے مذہب کو بھی نہیں سمجھتے اسلام مغربی طرز کا نظریہ نہیں اور نہ چند عقائد ورسوم کا مجموعہ ہے۔ اسلام مکمل طرز زندگی ہے۔ اگر اس کے مطابق زندگی گزاریں تو

مسلمان تو آبادیاتی طاقتوں کی غلامی سے نجات حاصل کرلیں گے اور اپنی کھوئی ہوئی طاقت اور توانائی دوبارہ حاصل کرسکیں گے ملت کی طاقت اور عظمت کے لئے انہیں اپنی شناخت بحال کرنی چاہیے۔ ہر چند کہ اس کی عمر بیس بائیس برس سے بھی کم تھی مگر اس نے لوگوں کو متاثر کیا۔ وہ مضبوط دل ودماغ کی کرشماتی شخصیت کا مالک اور قیادت کا اہل تھا مارچ 1928 کی ایک شام اسماعیلیہ کے چھ کارکن آئے اور انہوں نے اسے عملی قدم اٹھانے کے لئے کہا:

ہم اسلام کی شان وشوکت بحال کرنے اور مسلمانوں کی بہتری کے لئے نہیں جانتے کہ کیا کریں ہم اس ذلت اور غلامی سے تنگ آچکے ہیں عربوں اور مسلمانوں کی کوئی حیثیت، کوئی وقار نہین وہ غیروں کے ہاتھوں بکے ہوئے ہیں۔ ہمارے پاس اپنے خون، اپنی جانوں اور چند سکوں کے سوا کچھ نہیں عمل کا راستہ جسے تم دیکھ سکتے ہو ہم نہیں دیکھ سکتے نہ یہ جانتے ہیں کہ اپنے وطن، مذہب اور امت کی کیا خدمت کریں۔

بنی پر اس اپیل کا گہرا اثر ہوا۔ اس نے اور آنے والوں نے مل کر اسلام کے سپاہی بننے کا عہد کیا۔ اس رات اخوان المسلمین قائم ہوئی اور اس تیز رفتاری سے پھیلی کہ بنیٰ کی موت (1949) تک اس کی 2000 شاخیں مصر بھر میں قائم ہوگئیں، ہر شاخ کے مرد وزن ارکان کی تعداد تین لاکھ سے چھ لاکھ تھی۔ مصر میں معاشرہ کے ہر طبقہ کی یہ واحد نمائندہ جماعت تھی جس میں طلباء، سرکاری افسر، مزدور، کسان سبھی شامل تھے۔ دوسری عالمی جنگ تک یہ جماعت مصر کے سیاسی منظر پر سب سے طاقتور جماعتوں میں سے ایک تھی۔

پہلی رات سے ہی جماعت کی عسکریت پسندی کے باوجود بنیٰ نے ہمیشہ یہی کہا کہ اقتدار پر قبضہ کرنے یا حکومت کا تختہ الٹنے کی اسے کوئی خواہش نہیں۔ اس کی جماعت کا سب سے بڑا مقصد تعلیم ہے۔ اسے یقین تھا کہ جب لوگ اسلام کا پیغام سمجھ لیں گے اور ان کی حالت بدل جائے گی تو کسی تشدد کے بغیر طاقت حاصل کرلیں گے۔ شروع سے ہی بنیٰ نے ایک چھ نکاتی پروگرام بنایا جس سے اس پر افغانی 'عبدہ' اور رضا کی سلفیہ تحریک کا اثر ظاہر تھا (۱) قرآن کی تفسیر عہد کے حوالے سے (۲) اسلامی قوموں کا اتحاد (۳) زندگی کا معیار بلند کرنا اور سماجی انصاف کا حصول (۴) مفلسی اور جہالت کے خلاف جدوجہد (۵) غیروں کی غلامی سے مسلمان ملکوں کی آزادی (۶) دنیا بھر مین اسلامی امن اور رواداری کا فروغ۔ بنیٰ نہیں چاہتا تھا کہ اس کی جماعت باغی ہو یا

تشدد کی راہ پر چلے بلکہ اس کا مقصد مسلمان معاشرے کی بنیادی اصلاح تھی جسے نوآبادیت نے کھوکھلا کر کے اس کی جڑیں کاٹ دی تھیں۔ مصری اپنے آپ کو یورپ کے مقابلے میں کمتر سمجھتے تھے حالانکہ اس کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ ان کی اپنی شاندار کلچری روایات ہیں جو ہر درآمد کئے ہوئے نظریہ سے بہتر ہیں۔ انہیں روسی یا فرانسیسی انقلابات کی نقل نہیں کرنی ہے کیونکہ پیغمبر اسلامؐ تیرہ سو سال پہلے ہی آزادی، مساوات، رواداری اور سماجی انصاف کا اعلان کر چکے ہیں، شریعت کے مقابلہ میں کوئی غیر ملکی قانون مشرقِ وسطیٰ کے ماحول کے لئے سازگار نہیں۔ جب تک مسلمان غیروں کی نقل کرتے رہیں گے وہ کلچری بہروپیے ہی سمجھے جائیں گے۔

مگر پہلے تو بھائیوں اور بہنوں (اخوان المسلمین) کو ایک بار پھر اسلام سے واقفیت حاصل کرنی تھی۔ عزت اور آزادی کے لئے کوئی شارٹ کٹ نہیں۔ مسلمانوں کو نئے سرے سے بیدار اور منظم ہونا تھا اس مقصد کے حصول کے لئے بنّا نے ایک جدید سسٹم وضع کیا جس کی کارکردگی کا مسلسل جائزہ لیا جاتا تھا۔ کارکن تین علیحدہ گروپوں میں تقسیم کر دیئے گئے جن میں ایک مزدوروں دوسرا طلباء اور تیسرا سرکاری افسروں اور تاجروں کے لئے تھا۔ تینوں گروپ ہفتہ میں ایک مرتبہ روحانی تعلیم کے لئے آپس میں ملتے اور اپنی اپنی کارکردگی پر غور کرتے تھے۔ 1943 تک جب یہ سسٹم کامیاب نہ ہوسکا اور کارکنوں کی تعداد میں اضافہ نہ ہوا تو دس دس کارکنوں پر مشتمل کئی خاندان بنائے گئے جو ہر ہفتہ ایک جگہ جمع ہو کر اطمینان کرتے کہ تمام رکن احکام کے پابند ہیں اور شراب نوشی، جوا، زنا کے مرتکب نہیں ہوتے۔ اس سسٹم کے ذریعے مسلمانوں کو ایک لڑی میں پرونے کی کوشش ایک ایسے وقت ہو رہی تھی جب جدیدیت کے بوجھ تلے دب کر مصری معاشرے میں دراڑیں پڑ رہی تھیں۔

ایک مسیحی اصلاح تحریک نے اس وقت ڈاکٹرین کو اہمیت دے رکھی تھی اس کی ایک وجہ کسی حد تک جدید مغربی کلچر کا ریشنلزم تھا جس کی نظر میں مذہب عقائد پر عمل کرنے کا نام تھا۔ بنّا کی تحریک بہر حال دین داری کے پرانے تصور کے مطابق سرگرم عمل تھی مگر اس کا انداز نیا تھا۔ تمام عبادتوں، ریاضتوں اور اخلاقی ضابطوں کا مقصد خدا کے ساتھ ایک نیا باطنی تعلق قائم کرنا تھا۔ صرف اسی روحانی تناظر میں جدید ادارے اور اصلاحات مسلمانوں کے لئے کوئی معنی رکھتے تھے۔ 1945 میں بنّا نے بھرے اجلاس میں فیصلہ کیا کہ یہ وقت سماجی اور ترقیاتی پروگرام شروع کرنے کا

ہے جس کی شدید ضرورت تھی مگر جس پر کسی حکومت نے مؤثر طریقہ سے عمل نہیں کیا۔ اپنی نئی شاخ قائم کرتے ہی اخوان ہمیشہ لڑکوں اور لڑکیوں کے لئے سکول کے علاوہ مسجد بنا دیتے۔ انہوں نے نوجوان رضا کاروں کی ایک مضبوط تنظیم بھی قائم کر دی جو ایک جدید سکاؤٹ تحریک کے طور پر منظم کی گئی اور جس کے ذریعے نوجوانوں کو جسمانی اور تنظیمی تربیت دی جاتی تھی۔ دوسری عالمی جنگ تک یہ تنظیم ملک میں نوجوانوں کی سب سے مضبوط تنظیم بن چکی تھی۔ اب ان کوششوں کو ایک سمت دینے کی ضرورت تھی اس لئے کارکنوں کے لئے نائٹ سکول اور سول سروس کے امتحانات کے لئے تربیتی کالج بنائے گئے۔ دیہات میں نہ صرف کلینک اور ہسپتال قائم ہوئے بلکہ رضا کار وہاں صفائی کی حالت بہتر بنانے اور حفظان صحت کی تعلیم میں بھرپور عملی حصہ لیتے۔ اخوان المسلمین نے جدید خطوط پر ٹریڈ یونین قائم کیں اور مزدوروں کے حقوق کے بارے میں انہیں آگاہ کیا۔ انہوں نے محنت کشوں پر بدترین مظالم کے واقعات بتائے اور اپنی فیکٹریاں، انجینئرنگ، تعمیرات، پرنٹنگ پریس وغیرہ کی ہلکی صنعتیں شروع کر کے مزدوروں کے لئے روزی کے وسائل پیدا کئے۔

ان کے دشمنوں نے ہمیشہ بنیٰ پر 'ریاست کے اندر ریاست' قائم کرنے کا الزام عائد کیا۔ اس نے واقعی وسیع پیمانے پر کامیابی کے ساتھ جوابی کلچر تخلیق کیا تھا جس سے حکومت کی خامیوں کی نشان دہی ہوتی تھی جو ایک لحاظ سے خطرے کا باعث تھی۔ اس نے لوگوں کی توجہ تعلیم اور مزدوروں کی حالت زار کی طرف دلائی یہ بات بھی حکومت کے لئے پریشان کن تھی کہ صرف اس کی جماعت ہی کسانوں میں مقبول ہو۔ مگر سب سے اہم سوسائیٹی کے تمام اداروں کی واضح مسلم شناخت تھی اس کی تمام فیکٹریوں میں مساجد تھیں اور مزدوروں کو نماز ادا کرنے کے لئے وقت دیا جاتا تھا تنخواہیں اور ماحول اچھا تھا۔ مزدوروں کی انشورنش لازمی تھی جھگڑے انصاف کے ساتھ طے کر لئے جاتے۔ سوسائٹی کی ڈرامائی کامیابی نے ثابت کر دیا کہ عالم اور دانشور جو جی میں آئے کہیں مگر یہ حیثیت مسلم ہے کہ مصر کے لوگ مذہبی ہیں۔ اس سے یہ بھی ثابت ہوا کہ اسلام ترقی پسند ہے اور اب ساتویں صدی کے واقعات دہرانے ممکن نہیں۔ اخوان سعودی عرب کی نئی وہابی بادشاہت کے سخت خلاف تھے۔ وہابی اسلامی قانون کی جو لفظی توجیہہ کرتے تھے اس کی مذمت کے علاوہ چوروں کے ہاتھ کاٹنے اور زانیوں کو سنگسار کرنے کی سزائیں غلط سمجھتے تھے۔ آنے والے دور میں اسلامی ریاست کے طرز حکومت کا ان کے پاس کوئی واضح تصور نہیں تھا مگر وہ سمجھتے

تھے کہ قرآن وسنت کی روح زندہ رکھنے کی خاطر دولت کی مساوی تقسیم سعودی عرب سے بہتر انداز میں ہونی چاہیے۔ اس میں شک نہیں کہ ان کے خیالات زمانہ حاضر سے ہم آہنگ تھے حکمران ویسے ہی منتخب ہونے چاہئیں جیسے مسلمانوں کے پہلے دور میں ہوا کرتے تھے اور جیسا کہ خلفائے راشدین کا حکم تھا کہ حکمران آمر نہ ہو بلکہ لوگوں کے سامنے اس کا جواب دہ ہونا لازمی ہے۔ مطالبہ صرف اتنا تھا کہ مصر کو اجازت ہونی چاہیے کہ وہ اپنی ریاست کو اسلامی بنائے۔ روسیوں کا انتخاب کمیونزم اور مغرب کا جمہوریت ہے جن ملکوں میں مسلمانوں کی اکثریت ہے انہیں یہ حق حاصل ہونا چاہیے کہ اگر وہ چاہیں تو اپنے حکومت اسلامی بنیادوں پر بنائیں۔

سوسائیٹی خامیوں سے پاک نہیں تھی۔ عوام میں مقبولیت کی وجہ سے اس کا رویہ دانش وروں کے خلاف ہوگیا۔ ان کے اعلان اکثر عذر خواہی اور خودستائی پر مبنی ہوتے تھے مغرب کے متعلق اخوان کی رائے (جس میں مغرب کے ظلم، لالچ اور روحانی دیوالیہ پن پر زور دیا جاتا تھا) ان کے نوآبادیاتی تجربہ پر مبنی تھی۔ مغربی سامراج کا مقصد جیسا کہ اخوان کے ترجمان نے بیان کیا صرف ''ہمیں ذلیل کرنا، ہمارے ملکوں پر قبضہ کرنا اور اسلام کی تباہی'' ہے۔ اخوان کے رہنما اپنی صفوں میں اختلاف برداشت نہیں کرتے تھے۔ بنی مکمل اطاعت کا حکم دیتا تھا اور اپنی ذمہ داریاں اور اختیارات بہت کم کسی کے سپرد کرتا تھا جس کے نتیجہ میں اس کی موت کے بعد کوئی بھی اس کی جگہ نہ لے سکا اور اس کی جماعت بے مقصد داخلی فشار کے ہاتھوں تباہ ہوگئی مگر اس کی سب سے بڑی ناکامی 1943 میں ظاہر ہونے والے ایک دہشت پسند یونٹ 'خفیہ ہتھیار' کی وجہ سے ہوئی۔ چونکہ یونٹ خفیہ تھا اس لئے ہمیں اس کے متعلق بہت کم معلومات ہیں مگر رچرڈ پی مچل نے اس کے متعلق اپنے تجزیئے میں لکھا ہے کہ 1948 تک اس کے صرف ایک ہزار ممبر بن سکے تھے اور اس وقت تک اخوان کے اکثر رکن اس یونٹ کے وجود سے بے خبر تھے۔ ممبروں کی بڑی اکثریت کی نظر میں سماجی اور روحانی اصلاح اخوان کے قائم ہونے کا جواز تھا اس لئے وہ یونٹ کی دہشت پسندانہ سرگرمیوں سے خوش نہیں تھے مگر ایک بار جب کوئی تحریک خدا کے نام پر قتل وغارت شروع کردیتی ہے تو وہ تباہی کے راستے پر اندھادھند گامزن ہوجاتی ہے۔

1940ء مصر میں بڑے اضطراب اور بے چینی کا سال تھا۔ یہ بات صاف ہوگئی تھی کہ آزاد خیال جمہوریت ناکام ہوگئی ہے اور اکثر مصری پارلیمانی سسٹم کے متعلق پراُمید نہیں تھے انگریزوں

یا مصری قوم پرستوں کی سمجھ میں یہ بات نہیں آتی تھی کہ ایک ایسے ملک پر جدید طرز حکومت مسلط کرنا ممکن نہیں جو جدیدیت کے سطحی اور عجلت انگیز عمل کے نتیجہ میں اب بھی بنیادی طور پر زرعی اور فیوڈل تھا۔1923 اور 1950 کے درمیان تمام انتخاب میں قوم پرست وفد پارٹی کامیاب ہوئی مگر اسے صرف پانچ مرتبہ حکومت کرنے کی اجازت دی گئی۔ وفد پارٹی محلاتی سازشوں یا انگریزوں کے ہاتھوں مجبور ہو کر مستعفی ہوتی رہی۔ وفد پارٹی لوگوں کی حمایت سے بھی محروم ہوگئی جب انگریزوں نے جرمنی کے حامی وزیراعظم کو اقتدار سے الگ ہونے پر مجبور کر دیا اور اس کی جگہ وفد پارٹی کو چھوٹا دشمن سمجھتے ہوئے ان کی حکومت بنادی۔ دوسری عالمی جنگ کے عرصہ میں قاہرہ کے اندر تشدد اور مایوسی کا ماحول تھا۔ اس میں اس وقت بے پناہ اضافہ ہوا جب پانچ عرب (مصر سمیت) ملکوں کی فوجوں نے 1948 میں اسرائیل بننے کے بعد اس پر حملہ کر کے سخت ذلت آمیز شکست اٹھائی۔ عرب اب بھی اس واقعہ کو کائنات گیر تباہی کہتے ہیں اس المناک ماحول میں بعض عرب دہشت گردی کو نجات کا راستہ سمجھتے تھے۔ یقیناً یہ انوارالسادات کی رائے تھی جو آگے چل کر مصر کا صدر بنا۔ اس نے 1940ء میں انگریزوں اور ان کے حامیوں پر حملہ آور ہونے کے لئے 'قتل پارٹی' بنائی دوسری نیم فوجی تنظیمیں بھی تشدد ہی کو واحد حل سمجھتی تھیں۔

اب شاید یہ ناگزیر تھا کہ اخوان المسلمین جو مصر کی سیاست میں بڑی اہمیت حاصل کر چکی تھی اس کا بھی ایک دہشت پسند بازو ہو۔ مگر یہ افسوسناک بات تھی۔ یہ بات واضح نہیں کو خود بنّا نے 'خفیہ ہتھیار' کی سرگرمیوں میں کتنی دلچسپی لی۔ اس نے ہمیشہ ان کی مذمت کی مگر ان برسوں میں وہ حکومت کا بھی مخالف رہا۔ بنّا دہشت پسند یونٹ کی سرگرمیوں پر قابو نہیں پا سکتا تھا۔ ان سرگرمیوں کی وجہ سے واقعات کا ایک ایسا سلسلہ شروع ہوا جو بنّا کی موت اور اخوان المسلمین کی اخلاقی ساکھ پر حرف آنے کا باعث بنا۔ مارچ 1948 میں 'خفیہ ہتھیار' کے اراکین نے دہشت گردی کا ایک سلسلہ شروع کیا جس کا آغاز احمد الخزندر، ایک معزز جج کے قتل سے ہوا۔ یہ سلسلہ تمام گرمیوں میں قاہرہ کے اندر یہودیوں کی بستیوں پر حملوں کی صورت میں جاری رہا اور وزیراعظم محمد النقرشی کے قتل پر ختم ہوا۔

اخوان نے ان ہلاکتوں کی مذمت کی اور بنّا نے نقرشی کے قتل پر سخت افسوس کا اظہار کیا تاہم نئے وزیراعظم ابراہیم الہادی (جسے تمام سنجیدہ حلقے نفرت کی نظر سے دیکھتے تھے) نے اخوان

کو کچلنے کا موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔ وسیع پیمانے پر ان کی گرفتاریاں ہوئیں انہیں اذیتیں دی گئیں اور جولائی 1949 کے آخر تک جب عبدالہادی مستعفی ہو گیا تو تقریباً پانچ ہزار اخوان جیلوں میں تھے۔ اس سے پہلے 12 فروری 1949 کو ینگ مین مسلم ایسوسی ایشن کے ہیڈ کوارٹرز کے باہر غالباً وزیر اعظم کے ایماء پر حسن بنّا کو گولی ماردی گئی تھی۔

1950 میں اخوان نے خفیہ طور پر اپنی صفیں درست کرنا شروع کردیں اور حسن اسماعیل الحدیبی کو اپنا رہنما چن لیا۔ الحدیبی اپنی اعتدال پسندی اور تشدد سے بیزاری کے لئے جانا جاتا تھا۔ اُمید تھی کہ وہ پارٹی کو سنبھالا دے گا مگر یہ کام اس کے بس کا نہیں تھا۔ بنّا کی مضبوط قیادت کے بغیر پارٹی میں اختلافات پیدا ہو گئے حدیبی 'خفیہ ہتھیار' پر بھی قابو پانے میں ناکام ہو گیا جس نے 1954 میں ایک بار پھر پارٹی کو بدنام کردیا۔

اس وقت تک مصر پر نوجوان فوجی افسر جمال عبدالناصر (1918-70) کی حکومت قائم ہو گئی۔ جس نے 22 جولائی 1952 کو اپنی تنظیم 'ینگ آفیسرز' کی مدد سے پرانی بدنام حکومت کا تختہ الٹ دیا اور مصر میں انقلابی جمہوریہ قائم کرنے کی کوششیں شروع کردیں۔ ناصر نے ایک جنگجو قوم پرستی کا تصور دیا جو پرانے لبرل آئیڈیل سے مختلف تھا۔ 1920 اور 1930 کے عشروں کے مصری دانش وروں کے برعکس نئے عرب قوم پرست مغرب کے دلدادہ نہیں تھے۔ اور ان کے پاس 'پارلیمانی لبرل ازم' کے لئے وقت نہیں تھا جو مشرق وسطیٰ میں ناکام ہو چکا تھا۔ ناصر کی حکومت سوشلسٹ تھی اور روسیوں کے ساتھ اس کے دوستانہ تعلقات تھے اس نے انگریزوں کو مصر سے ہمیشہ کے لئے نکال دینے کا عزم کر رکھا تھا۔ مغرب اور اسرائیل دونوں کے بارے میں اس کا رویہ بہت سخت تھا۔ عرب اتحاد اس کی خارجہ پالیسی کا حصہ تھا اور وہ ان ایشائی اور افریقی ممالک کے ساتھ پائیدار دوستی چاہتا تھا جو یورپ کی غلامی سے آزاد ہونے کی کوشش کر رہے تھے۔ ناصر سیکولرازم کا زبردست حامی تھا۔ وہ کہتا تھا مذہب سمیت ریاست کو ہر چیز پر برتری حاصل ہے قومی مفاد پہلی ترجیح ہے باقی سب کچھ اضافی ہے۔ بالآخر ناصر مشرق وسطیٰ میں مقبول ترین حکمران بن گیا اور ناصرازم کو زبردست اہمیت حاصل ہو گئی۔ مگر ان ابتدائی برسوں میں ناصر نے سخت جدوجہد کی اس وقت وہ زیادہ مشہور نہیں تھا مگر اپنے کسی مخالف کو ابھرنے کا موقع نہیں دیتا تھا۔

ابتدا میں اخوان کے ساتھ ناصر کے اچھے تعلقات تھے اسے ان کی ضرورت بھی تھی چونکہ وہ

اپنی تقریروں میں اکثر اسلام کے حوالے دیتا تھا۔ اخوان نے اس کی بھر پور مدد کی اور انقلاب کے بعد امن اور قانون بحال کرنے میں نمایاں کردا ادا کیا مگر ان کے تعلقات میں بدمزگی بھی تھی اخوان کی بدمزگی مین یہ جان کر اور اضافہ ہوا کہ اپنے دعوں کے باوجود ناصر نہیں چاہتا کہ اسلامی حکومت قائم کرے۔ جب اسلامی اصول نافذ کرنے کے سلسلہ میں حدیبی کا مطالبہ اسے برا لگا تو ناصر حکومت نے ایک بار پھر اخوان المسلمین کو خلاف قانون (15.1.54) قرار دے دیا۔ ان پر الزام تھا کہ وہ حکومت کا تختہ الٹنے کی سازش کر رہے تھے اخوان کا ایک حصہ روپوش ہو گیا حکومت نے ان کے خلاف پروپیگنڈہ مہم شروع کر دی کہ اخوان نے غیر قانونی طور پر ہتھیار جمع کر لئے ہیں اور انگریزوں کے ساتھ حکومت کے خلاف ساز باز میں مصروف ہیں۔ حکومت نے اپنی اسلامی حیثیت منوانے کی کوشش شروع کر دی۔ انوارالسادات اب ناصر کی نئی اسلامی کانگرس کا سیکریٹری جنرل تھا۔ اس نے نیم سرکاری اخبار 'الجمھوریۂ' میں حکومت کے سچے اور لبرل اسلام پر مضامین لکھے۔ بالآخر اخوان کے ایک رکن عبداللطیف نے 16 اکتوبر 1954 کو ناصر پر قاتلانہ حملہ کر دیا۔

قاتلانہ حملے میں ناصر کی جان بچ گئی اور موت کے مقابلے میں اس کی جرأت اور قوت ارادی نے لوگوں کو اس کا اور گرویدہ بنا دیا۔ اب وہ اخوان کو کچلنے میں آزاد تھا۔ نومبر 1954 کے خاتمہ تک ایک ہزار اخوان گرفتار ہوئے اور ان پر مقدمے بنائے گئے۔ لاتعداد ایسے بھی تھے جن کا قصور پمفلٹ بانٹنے کے سوا کچھ نہ تھا اخوان کبھی عدالتوں میں نہیں لائے گئے بلکہ ناصر کی جیلوں اور اسیروں کے کیمپوں میں اگلے پندرہ برس تک تکلیفیں برداشت کرتے ہوئے۔ حدیبی کو عمر قید کی سزا ہو گئی مگر چھ دوسرے رہنماؤں کو گولی مار دی گئی۔ ایسا لگا کہ ناصر نے اخوان المسلمین کی کمر توڑ دی اور مصر کی واحد ترقی پسند اسلامی تحریک کی رفتار راستہ میں ہی رک گئی۔ سیکولرازم فتح یاب ہوتا ہوا نظر آیا۔ جب دو برس بعد سوئز بحران کے بعد ناصر عرب دنیا کا ہیرو بن گیا۔ اس بحران میں اس نے نہ صرف مغرب کا مقابلہ کامیابی کے ساتھ کیا بلکہ انگریزوں کو بھی بے پناہ ذلت سے دوچار کیا مگر اخوان کے خلاف اس کی کامیابی آخر کار اسے مہنگی پڑی۔ جو اخوانِ ناصر کی باقی زندگی تک کیمپوں میں رہے انہیں سیکولرازم کی شدید جارحیت کا تجربہ تھا۔ یہ کیمپ ہی تھے جہاں بعض اخوان نے بنّا کی اصلاح پسندی ترک کی اور ایک نئی متشدد سنی بنیاد پرستی کو جنم دیا۔

ایرانی بھی سیکولرازم کے بڑے شدید حملہ کا سامنا کر رہے تھے رضا شاہ کی جدیدیت کا عمل

ترکی اور مصر سے بھی تیز تھا اس لئے کہ جب رضا شاہ اقتدار میں آیا تو ایران نے بمشکل جدید ہونا شروع کیا تھا۔ رضا بڑے سخت مزاج کا آدمی تھا مخالفوں کو راستہ سے بڑی سختی کے ساتھ ہٹا دیا جاتا تھا۔ سب سے پہلے آیت اللہ مداری کی باری تھی جس نے مجلس میں شاہ کی مخالفت کی تھی۔ 1927 میں اسے قید کیا گیا اور 1937 میں قتل کر دیا گیا۔ رضا نے پہلی بار ملک میں مرکزیت قائم کی مگر سفا کانہ انداز میں بغاوتیں کچلتے ہوئے اور خانہ بدوش قبائل کی خوشحالی ختم کرتے ہوئے۔ خانہ بدوش قبائل اب تک خودمختار تھے رضا نے عدلیہ کی اصلاح کی۔ تین سیکولر قوانین سول، کمرشل اور کریمنل نافذ کئے جنہوں نے شریعت کی جگہ لے لی۔ اس نے صنعتیں پھیلانے اور جدید سہولتیں فراہم کرنے کی کوششیں بھی کیں۔1930 کی دہائی تک اکثر شہروں میں بجلی اور پاور پلانٹ آ چکے تھے مگر گورنمنٹ کے کنٹرول کی وجہ سے صحیح معنوں میں ایک زوردار سرمایہ دارانہ معیشت کی ترقی رک گئی۔ تنخواہیں کم اور لوٹ عام تھی۔ یہ سخت گیر طریقے ناکام ثابت ہوئے۔ ایران، اقتصادی آزادی حاصل کرنے میں ناکام ہو گیا تیل کی صنعت بدستور برطانیہ کی ملکیت تھی جس سے ایرانی معیشت کو کوئی تقویت نہیں ملتی تھی۔ اس لئے ایران غیر ملکی قرضوں اور سرمایہ کاری کا محتاج ہونے پر مجبور تھا۔

رضا کا پروگرام سطحی ثابت ہوا۔ اس نے صرف جدید ادارے پرانے زرعی نظام پر مسلط کر دیئے تھے۔ یہ اپروچ مصر میں پہلے ہی ناکام ہو چکی تھی اسے ایران میں بھی ناکام ہونا ہی تھا۔ نوے فیصد آبادی نظر انداز کر دی گئی جبکہ اس کا ذریعہ معاش صرف زراعت تھی۔ کھیتی باڑی کے پرانے بوسیدہ طریقے جاری رہے اگرچہ وہ غیر پیداواری تھے۔ بنیادی سطح پر معاشرہ کی اصلاح نہیں ہوئی تھی۔ رضا کو غریبوں کے مسائل سے دلچسپی نہیں تھی۔ جبکہ فوج کا بجٹ پچاس فیصد تھا صرف چار فیصد تعلیم پر خرچ کیا جاتا تھا اور تعلیم حاصل کرنا بھی صرف امیروں کا حق تھا۔ مصر کی طرح ایران میں بھی دو قومیں بن رہی تھیں جو ایک دوسرے کو نہیں سمجھتی تھیں۔ ایک 'قوم' مغرب سے متاثر درمیانے اور اوپر کے طبقوں پر مشتمل تھی جس نے رضا کے جدید پروگراموں کے ذریعے فائدے حاصل کئے تھے۔ 'دوسری قوم' غریب عوام کی تھی جو حکومت کی سیکولر قومیت سے بدحواس اور پریشان تھی اور ہمیشہ سے کہیں زیادہ اپنی رہنمائی کے لئے علماء پر انحصار کرتی تھی۔

مگر علماء خود رضا کے سیکولرازم کے بوجھ تلے دبے ہوئے تھے۔ اسے علماء سے نفرت تھی اور

وہ ایران میں ان کی طاقت کچل دینا چاہتا تھا۔ اس کی قومیت کی بنیاد اپنے علاقہ کے پرانے مقامی کلچر پر تھی جس میں سے اس نے اسلام کو حذف کر دیا تھا۔ اس نے محرم کی تقریبات پر پابندی لگادی اور مسلمانوں کو حج پر مکہ جانے سے روک دیا تھا۔ 1931 میں شرعی عدالتوں کے اختیارات سختی سے کم کر دیئے گئے۔ علماء صرف ذاتی نوعیت کے مقدمات سن سکتے تھے۔ دوسرے تمام مقدمات رسول عدالتوں کو بھیج دیئے جاتے تھے۔ ایران میں علماء غیر معمولی طور پر طاقتور تھے اب وہ اپنی طاقت کو بتدریج کم ہوتا ہوا دیکھ رہے تھے مگر مداری کے قتل کے بعد علماء احتجاج کرنے سے خائف تھے۔

لباس کی یکسانیت کے سلسلہ میں رضا کے قانون (1928) سے جدیدیت کے عمل کی سطحیت اور تشدد دونوں ظاہر ہوتے تھے۔ تمام مردوں کے لئے مغربی لباس لازمی تھا علماء صرف اس شرط پر اپنا عمامہ اور لبادہ پہن سکتے تھے کہ وہ امتحان کے ذریعے اپنے عالم ہونے کی سند سرکاری ادارے سے حاصل کریں۔ کچھ عرصہ بعد عورتوں کو پردہ کرنے سے روک دیا گیا۔ رضا کے سپاہی ان کے برقعے اپنی سنگینوں سے نوچ کر گلیوں میں ان کی دھجیاں اڑا دیتے تھے۔ رضا معاشرہ کی تہہ میں موجود قدامت پسندی کے باوجود ایران کو جدید دیکھنا چاہتا تھا اسے حاصل کرنے کے لئے وہ کچھ بھی کر سکتا تھا۔ عاشورہ (1929) میں قم کے اندر فیضیہ مدرسہ کے طلباء جب باہر سڑک پر نکلے تو پولیس نے انہیں گھیرے میں لے لیا ان کے ماتمی لباس پھاڑ ڈالے اور انہیں مغربی لباس پہننے پر مجبور کیا۔ مرد خاص طور پر چوڑے کناروں والا انگریزی ہیٹ پہننا ناپسند کرتے تھے کیونکہ وہ نماز پڑھتے ہوئے سجدہ میں رکاوٹ ڈالتا تھا۔ 1935 میں ایک افسوسناک واقعہ ہوا جب آٹھویں امام کی درگاہ (مشہد) پر لباس کے قانون کے خلاف احتجاج کرنے والے ہجوم پر پولیس نے گولی چلا دی۔ جس کی وجہ سے سینکڑوں نہتے مظاہرین ہلاک و زخمی ہوئے۔ یہ حیرت کی بات نہیں کہ ایرانی عوام سیکولرازم کی ہلاکت خیزی سے ڈرنے لگے، یہ سمجھ کر کہ اس کا مقصد مذہب کو جبر کی حالت سے آزاد کرنا نہیں (مغرب کی طرح) بلکہ اسلام کو تباہ کرنا ہے۔

بنیاد پرستی کے پھولنے پھلنے کے لئے یہ ماحول بالکل سازگار تھا مگر اس دور میں بنیاد پرستی کی تحریک پیدا نہیں ہوئی لیکن چار ایسی باتیں ہوئیں جنہوں نے آنے والے واقعات کی نشان دہی کر دی۔ پہلا واقعہ ایک مخالف کلچر کا پیدا ہونا تھا۔ شیخ عبدالکریم حائری

یزدی(1860-1936) ایک ممتاز مجتہد کو قم میں آباد ہونے کے لئے ملاؤں نے دعوت دی۔اس کا ارادہ تھا کہ قم کو شیعی نقشہ پر واپس لائے کیونکہ اسے عراق میں نجف اور کربلا کی فکر تھی جو اٹھارویں صدی میں ایرانی تشیع کا فکری مرکز بن گئے تھے۔ حائری کے قم پہنچنے کے تھوڑے عرصہ بعد انگریزوں نے واقعی بعض ممتاز علماء کو عراق سے جلاوطن کر دیا اور وہ بہت بڑے عالم جن میں سے ایک آئینی ماہر مجتہد نائینی قم میں آباد ہونے آیا۔شہر میں نئے سرے سے جان پڑ گئی۔ مدرسے آراستہ ہوئے اور ممتاز علماء وہاں پڑھانے لگے۔نو واردوں مین سے ایک دیندار عالم آیت اللہ سید آقا حسین بروجردی(1875-1961) مرجع تقلید (یعنی شیعہ کی اعلیٰ ترین مثال) تھا۔جس کی کشش سے مزید عالم قم آ گئے۔قم نے بتدریج نجف کی جگہ لینی شروع کر دی اور1960اور 1970 کی دہائی مین قم ایران کا مذہبی دارالحکومت اور شاہی دارالحکومت تہران کی مخالف کا مرکز بن گیا۔ان ابتدائی برسوں مین قم کے ملا سیاست سے الگ رہنے کی شیعہ روایت پر کاربند رہے کوئی سیاسی سرگرمی شاہ کے قہر کو دعوت دینے کے مترادف تھی اور قم کی تجدید کا خواب ادھورا رہنے کی وجہ بن سکتی تھی۔

دوسرا اہم واقعہ1920 میں قم کے اندر اس شخص کی آمد تھی جو ایران کا سب سے مشہور ملا سمجھا گیا۔شیخ حائری یزدی جب مغربی ایران سے قم آیا تو اس کے ساتھ کچھ شاگرد بھی تھے۔ان میں سے ایک شاگرد نوجوان روح اللہ موسوی خمینی(1902-89) تھا۔ پہلے خمینی معمولی سا شخص لگتا تھا۔وہ فیضیہ میں فقہ پڑھایا کرتا تھا۔کچھ عرصہ بعد اس نے تصوف اور اخلاقیات میں خصوصی تربیت حاصل کی جو فقہ کے مقابلے میں کم تر مضامین سمجھے جاتے تھے۔اس کے علاوہ وہ تصوف میں ملا صدرہ کا پیرو تھا جسے حکومت پہلے ہی شک کی نظر سے دیکھتی تھی۔ وہ سیاسی امور میں دلچسپی لیتا تھا مگر یہ بات بھی اس کی علمی حیثیت کے حق میں نہیں تھی خاص طور پر آیت اللہ بروجردی کے بعد جس نے سختی کے ساتھ شیعی روایت کے مطابق اپنی زبان بند رکھی اور علماء کو سیاست میں حصہ لینے سے روک کر 'مرجع' بن گیا، ایران میں یہ دور بہت ہنگامہ خیز تھا۔خمینی نے سیاست میں اپنی دلچسپی کے باوجود کوئی عملی قدم نہیں اُٹھایا پھر بھی1944 میں اس نے اپنی کتاب 'کشف الاسرار' شائع کی جس نے اس وقت معمولی مقبولیت حاصل کی۔شیعوں کے نقطۂ نظر سے پہلویوں کی پالیسی کو چیلنج کرنے کی وہ پہلی سنجیدہ کوشش تھی۔اس موقع پر بھی خمینی ابھی بنیاد پرست نہیں بلکہ ایک مصلح تھا۔اس کی

پوزیشن1906 کی پہلی مجلس سے مشابہ تھی جس نے مجتہدوں کے پینل کا آئیڈیا اس شرط پر قبول کیا تھا کہ شریعت کی خلاف ورزی کی صورت میں پینل کسی بھی پارلیمانی قانون سازی کو ویٹو کر سکے گا۔ خمینی اب بھی پرانے آئین کا حامی تھا اور اس جدید ادارہ کو اسلامی سیاق وسباق میں رکھنے کی کوشش کر رہا تھا کہ صرف خدا قانون بنانے پر قادر ہے اور شیعوں کے لئے مناسب نہیں کہ وہ اتاترک اور رضا شاہ جیسے حکمرانوں کی اطاعت کریں جنہوں نے اسلام کی تباہی کے لئے ہر ممکن کوشش کی ہے۔ مگر خمینی اب بھی اتنا روایت پسند تھا کہ وہ اس موقعہ پر علماء کی براہ راست حکمرانی کی تجویز پیش نہیں کر سکتا تھا جو شیعوں کے صدیوں پرانے عمل کے خلاف تھی۔ مجتہد جو خدائی قانون کے عالم ہیں اس کے خیال میں انہیں بس اتنی اجازت تھی کہ وہ ایک سیدھا سادہ آدمی سلطان کے طور پر منتخب کریں جو نہ تو خدائی قانون کی خلاف ورزی کرے اور نہ ہی لوگوں پر ظلم کرے۔

جب تک خمینی کی کتاب شائع ہوا انگریزوں نے جرمنی کی حمایت کی پاداش میں رضا شاہ کو تخت چھوڑنے پر مجبور کر دیا۔ جس سے ظاہر ہوا کہ آزادی کے بلند بانگ دعووٰں کے باوجود قاچاروں کی طرح رضا بھی مغربی طاقتوں کے شکنجہ میں جکڑا ہوا تھا۔1944 میں جب رضا شاہ کا انتقال ہوا تو اس کا بیٹا محمد رضا(80-1919)اس کا جانشین بنا۔ وہ بہت خاموش طبع اور ایک کمزور شخص تھا جو مشکل حالات میں تخت نشین ہوا۔ دوسری عالمی جنگ ایران کے لئے بڑی انتشار انگیز تھی۔ کارخانے اور فیکٹریاں بند ہو گئے تھے۔ مشینوں کی حالت ابتر تھی۔ قحط پھیلا ہوا تھا۔ نئے متوسط طبقے ترقی کے مواقع نہ ملنے کی وجہ سے بگڑ رہے تھے۔ قوم پرست غیر ملکی کنٹرل سے نجات چاہتے تھے۔ بے چینی میں اضافہ ہو رہا تھا۔ جس کی بڑی وجہ اقتصادی بدحالی اور ایرانی تیل پر انگریزوں کا قبضہ تھا۔ علماء خوش تھے کہ نیا شاہ ابھی اتنا طاقتور نہیں تھا کہ ان کے مطالبات کی مخالفت کر سکے۔ عاشورہ کی مجلسوں اور مرثیے پڑھنے کی اجازت دے دی گئی ایرانیوں کو حج پر جانے کی اجازت بھی مل گئی۔ خواتین برقعہ اوڑھ سکتی تھیں اس وقت مختلف نئی سیاسی پارٹیاں منظر عام پر آ گئیں۔ روس کی حامی تودے پارٹی، محمد مصدق(1967-1881) کی نیشنل فرنٹ جس کا مطالبہ ایرانی تیل قومیانہ تھا اور ایک نیا پارلیمانی گروپ فدائیان اسلام جو سیکولرازم کے حامیوں کو ڈراتے دھمکاتے تھے۔

1945 میں آیت اللہ سید مصطفیٰ کاشانی کو (جسے انگریزوں نے جنگ کے دوران قید کر دیا

تھا) ایران واپس آنے کی اجازت مل گئی اس کی گاڑی کے راستہ پر قالین بچھاتے ہوئے بڑے بڑے ہجوم اس کے استقبال کے لئے جمع ہو گئے کاشانی کے استقبال کے لئے بڑے بڑے علماء دور دور سے آئے۔ مدرسوں کے طلباء نے ہجوم در ہجوم استقبال میں حصہ لیا۔ کاشانی اس دور میں آنے والے واقعات کا تیسرا شگون تھا۔ اس کی غیر معمولی مقبولیت سے اندازہ ہو سکتا تھا کہ ایرانی کسی عام آدمی کی نسبت سیاسی معاملات میں ایک عالم کی پیروی زیادہ جوش وخروش سے کرتے ہیں۔ خمینی اور کاشانی ایک دوسرے کو اچھی طرح جانتے تھے مگر دونوں شخص بہت مختلف تھے۔ جہاں خمینی یکسوئی کے ساتھ اور نہایت منظم طریقہ سے کسی مقصد تک رسائی حاصل کرتا تھا کاشانی سے اکثر غلطیاں سرزد ہوتیں۔ کبھی تو وہ رواروی میں ایسا قدم اٹھا لیتا جس کی وجہ سے کئی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا۔ اسے نازیوں کی حمایت کی وجہ سے 1943 میں انگریزوں نے قید کر دیا تھا۔ دراصل کاشانی کی نظر میں نازیوں کی ناانصافیوں کی اتنی اہمیت نہیں تھی جتنی اہمیت اس امر کی تھی کہ شاید جرمنی انگریزوں سے نجات حاصل کرنے میں ایران کی مدد کر سکے۔ فدائیان اسلام کے ساتھ بھی کاشانی کے رابطے تھے جب انہوں نے 1949 میں شاہ کو قتل کرنے کی کوشش کی تو کاشانی جلاوطن کر دیا گیا۔ بیروت سے کاشانی نے جولائی 1949 میں تیل کو قومیانے کے حق میں فتویٰ دے کر نیشنل فرنٹ پارٹی کی حمایت جاری رکھی۔ 1950 میں کاشانی کو ایران واپس آنے کی اجازت مل گئی اور ایک بار پھر اس کا شاندار استقبال ہوا۔ مہر آباد کے ہوائی اڈے پر ہجوم اس کے آنے سے ایک شام پہلے ہی جمع ہونا شروع ہو گیا۔ مصدق جس کی نیشنلسٹ پارٹی کو تیل کے مسئلہ کی وجہ سے انتخابات میں بھاری اکثریت حاصل ہوئی تھی ممتاز علماء کے ساتھ استقبال میں شامل ہوا۔ جب کاشانی جہاز سے اترا تو ہنگامہ اتنا زیادہ تھا کہ اس کے اعزاز میں ہونے والی سرکاری تقریب منسوخ کرنا پڑی اور جب اس کا جلوس تہران میں اس کے گھر کی طرف جانا شروع ہوا تو ہجوم جوش ومسرت سے اتنا بے تاب ہوا کہ بعض اوقات اس کی گاڑی سڑک سے اوپر اٹھا لی جاتی۔ ان برسوں کا چوتھا اہم واقعہ تیل کا بحران تھا جو 1953 میں اور سنگین ہو گیا۔ جب پرشین آئل کمپنی کا حامی وزیر اعظم علی رزم آرا فدائیوں کے ہاتھوں قتل ہو گیا۔ اس کے دو روز بعد مجلس نے تیل کی صنعت قومیانے کی سفارش کی اور شاہ کے نمائندے کی بجائے مصدق وزیر اعظم بن گیا۔ ایرانی تیل قومیا لیا گیا۔ اگرچہ ہیگ کی بین

الاقوامی عدالت نے اپنے وسائل قومیانے کے سلسلہ میں ایران کے حق مین فیصلہ دیا لیکن برطانوی اور امریکی تیل کمپنیوں نے غیر سرکاری طور سے ایرانی تیل کا بائیکاٹ کر دیا۔ برطانیہ اور امریکہ میں میڈیا نے مصدق کو خطرناک متعصب، کمیونسٹ اور چور کے طور پر پیش کیا جو ایران کو روس کے حوالے کرنا چاہتا ہے (حالانکہ مصدق قوم پرست تھا جو ہر غیر ملکی طاقت کے ہاتھوں سے ایران کی نجات چاہتا تھا) تاہم مصدق ایران میں ناصر کی طرح ہیرو بن گیا جیسے ناصر نہر سویز قومیانے کے بعد ہیرو بنا تھا۔ مصدق نے شاہ کے اختیارات اپنے ہاتھوں میں لینے شروع کر دیئے۔ جب اس نے جولائی 1952 میں فوج کی کمان لینے کا مطالبہ کیا تو شاہ نے اسے برطرف کر دیا۔ مگر اس کے حق میں بڑے پیمانے پر فسادات اور مظاہرے شروع ہو گئے جس سے شاہ خطرہ محسوس کرنے لگا کہ ایرانی عوام جمہوریت کا مطالبہ کرنا چاہتے ہیں۔ مصدق کے حق میں فسادات سے لندن اور امریکہ بھی پریشان ہوئے کیونکہ وہ مصدق کی برطرفی چاہتے تھے۔ آیت اللہ کاشانی نے ان مظاہروں میں قائدانہ کردار ادا کیا۔ بھیس بدل کر گلی کوچوں اور سڑکوں پر گھومتے ہوئے انہوں نے اعلان کیا کہ وہ ظلم کے خلاف جنگ میں اپنی جان قربان کرنے کے لئے تیار ہیں۔ صرف دو دن میں شاہ نے مجبور ہو کر مصدق کو بحال کر دیا۔

یہ وہ لمحہ تھا کہ جب امریکہ ایک فیض رساں ملک کی حیثیت سے جانا جاتا تھا مگر اب ایران میں سیاسی لحاظ سے اس کا کردار مشکوک ہو گیا تھا۔ 1953 سے مصدق کی مقبولیت میں کمی آنے لگی فوج پر اسے کبھی بھی مکمل اختیار حاصل نہیں تھا۔ مگر اب تیل پر پابندی کی وجہ سے اقتصادی بحران گہرا ہو گیا تھا۔ علماء اور بازاریوں نے اس کا ساتھ چھوڑ دیا یہاں تک کہ کاشانی نے بھی وفا نہ کی۔ مصدق اعلانیہ طور پر سیکولرسٹ تھا اور اس نے تہیہ کر رکھا تھا کہ مذہب کو ذاتی معاملات کی حد میں لے آئے گا اس نے سمجھا کہ وہ اتنا طاقتور ہے کہ مجلس کو بھی برطرف کر سکتا ہے۔ مجلس کی برطرفی سے شیعہ علماء میں گھبراہٹ اور بے چینی پھیل گئی پرانے اتحادی تو اس کا ساتھ چھوڑ ہی چکے تھے مگر سوشلسٹ پارٹی تو دے نے اس کی حمایت پر کمر باندھ لی جس کی وجہ سے امریکہ میں صدر روزویلٹ کی حکومت نے ایران میں کمیونسٹوں کی بغاوت کا خطرہ محسوس کیا چنانچہ اس نے آپریشن Ajax میں امریکہ کی شمولیت کی منظوری دی۔ مصدق کی حکومت کا تختہ الٹنے کے لئے آپریشن Ajax برطانوی محکمہ جاسوسی اور سی آئی اے کی مشترکہ سازش تھی اگست 1953 میں مصدق کو سازش

کی خبر مل گئی اس انکشاف کی صورت میں شاہ اور ملکہ ملک چھوڑنے پر متفق ہو گئے اور وقت آنے پر سی آئی اے کے ایجنٹوں کی حفاظت میں واپس آ گئے۔ تین روز بعد سی آئی اے کے اشارے پر فوج کے اہم افسروں اور بعض بے حس شہریوں نے مل کر بغاوت کی اور مصدق کو اقتدار سے الگ کر دیا۔ جب اس پر فوجی عدالت میں مقدمہ چلا گیا تو اس نے بڑے شاندار طریقہ سے اپنا دفاع کیا۔ وہ موت کی سزا سے بچ گیا مگر باقی عمر نظر بندی میں گزاردی۔

1953 کی بغاوت کبھی کامیاب نہ ہوتی اگر ایران میں اس قدر بے حسی کا عالم نہ ہوتا، مگر یہ بھی سچ ہے کہ خارجی مداخلت کے بغیر بغاوت نہیں ہو سکتی تھی۔ ایرانیوں نے محسوس کیا کہ امریکہ (جسے وہ اپنا دوست سمجھتے تھے) نے انہیں دھوکہ دیا ہے اور ان کی تذلیل کی ہے۔ امریکہ اب روس اور برطانیہ کے نقش قدم پر چل رہا تھا جنہوں نے اپنے مفاد کے لئے ایران میں سازشوں اور جوڑ توڑ کے جال بچھائے تھے۔ 1954 میں یہ حقیقت اور بھی واضح ہو گئی جب ایک نیا معاہدہ تیل کے سلسلے میں ہوا جس کے ذریعے تیل کی پیداوار کا اختیار اس کی فروخت اور پچاس فیصد منافع عالمی کارٹیل(Cartel) کمپنیوں کو واپس دے دیا گیا اس حرکت سے ان ایرانیوں کو بڑی مایوسی ہوئی جو قومی مسائل میں گہری دلچسپی لیتے تھے انہوں نے بین الاقوامی عدالت کی مدد سے اپنی دولت پر اپنا اختیار حاصل کرنا چاہا مگر بین الاقوامی عدالت کے فیصلہ کا نہ احترام بھی کیا گیا۔ آیت اللہ کاشانی اس صورتحال سے سخت پریشان ہوئے۔ امریکہ کی امداد سے ایران کے چند لوگ فائدہ حاصل کر سکتے تھے امریکہ پٹیر وڈالر کی صورت میں جو کچھ ایران سے حاصل کرتا تھا اس کا ایک فیصد بھی وہ امداد کی صورت میں ایران کو نہیں دیتا تھا۔ کاشانی احتجاج کرتا تھا کہ ''امریکی نو آبادیاتی سامراجی ایرانی تیل سے اپنے مفادات حاصل کریں گے جبکہ ہماری مظلوم قوم کی آزادی اور خودمختاری کی تمام اُمیدیں خاک مین مل جائیں گی اور مغربی دنیا کے متعلق اس کی رائے مزید خراب ہو جائے گی۔''

کم از کم اس معاملے میں کاشانی کی پیش گوئی صحیح تھی جب ایرانیوں نے پلٹ کر آپریشن Ajax کی طرف دیکھا تو وہ مصدق کے ساتھ خود اس کے اپنے لوگوں کی بیوفائی بھول گئے۔ اور سمجھ گئے کہ ان پر شاہ کی آمریت مسلط کرنے میں صرف امریکہ کا ہاتھ ہے۔ 1960ء کی ابتدا میں حالات اور خراب ہو گئے جب شاہ کی حکومت مزید آمرانہ اور ظالمانہ ہو گئی۔ ایک دوہرے معیار کا

سامنا تھا امریکہ بڑے فخر کے ساتھ آزادی اور جمہوریت کے دعوے کرتا تھا مگر ایک ایسے شاہ کی پرزور حمایت کر رہا تھا جو اپنی حکومت کے خلاف عوام کو آواز اٹھانے کی اجازت نہیں دیتا تھا اور ایرانیوں کی بنیادی انسانی حقوق سے محروم کر رہا تھا۔1953 کے بعد ایران ایک ممتاز امریکی اتحادی بن گیا تھا۔ تیل کی پیداوار میں ایک اہم ملک کی حیثیت سے ایران امریکی ٹیکنالوجی اور خدمات کے لئے وسیع مارکیٹ اور میدان تھا۔ امریکی اسے اقتصادی لحاظ سے سونے کی کان سمجھتے تھے۔ اسی عرصہ میں امریکہ نے پرانے برطانوی ہتھکنڈے دہرانے شروع کر دیئے یعنی تیل کے معاملات میں سینہ زوری شاہ پر ناجائز دباؤ سفارتی مراعات کے مطالبے تجارت میں رعائتیں وغیرہ امریکی تاجروں کا روزمرہ کا معمول بن گیا۔ امریکی مشیروں نے ایران پر گویا کہ یورش کر دی اور خوب دولت لوٹی۔ ان کے اور اکثر ایرانیوں کے طرز زندگی میں نمایاں فرق تھا۔ وہ لوگوں سے الگ رہتے تھے چونکہ وہ براہ راست حکومت کے ساتھ معاہدوں کے تحت کام کرتے تھے اس لئے قدرتی طور پر حکومت کا حصہ بن گئے تھے یہی وہ خودغرضی اور تنگ نظری تھی جس کی وجہ سے ایرانی امریکہ کو شیطانی روپ میں دیکھنے لگے۔

ایران دو کیمپوں میں بٹ رہا تھا مٹھی بھر افراد جنہیں امریکیوں کے ذریعے فوائد حاصل ہوئے تھے اور اپنے حقوق سے محروم لوگوں کی وسیع اکثریت۔ مگر ایران اس میدان میں تنہا نہیں تھا بیسیوں صدی کے وسط تک ان ملکوں کے معاشرے کہ جن کی ہم بات کر رہے ہیں دو کیمپوں میں تقسیم ہو رہے تھے ایک فریق کی نظر میں نیا دور طاقت اور آزادی کا ذریعہ تھا جبکہ دوسرا فریق اسے سراسر برائی سمجھتا تھا۔ خوف، نفرت اور غیض وغضب کی کیفیت تھی۔ زیادہ عرصہ نہیں گزرا کہ بنیاد پرست جو اس غیض وغضب میں بری طرح مبتلا تھے اس فیصلہ پر پہنچے کہ سوسائیٹی سے کٹ کر الگ رہنے میں بھلائی نہیں، نہ محض جوابی کلچر کی تعمیر سے کامیابی حاصل ہو سکتی ہے بلکہ انہیں متحد ہو کر جوابی حملہ کرنا چاہیے۔

۸۔صف بندی
(1960-74)

1960 کی دہائی تک پورے مغرب اور مشرق وسطیٰ میں انقلاب کی لہر رواں تھی۔ یورپ اور امریکہ میں نئی نسل سڑکوں پر نکل آئی تھی اور اس نے اپنے بزرگوں اور ان کے خیالات کے خلاف بغاوت کر دی تھی انہوں نے مساوات اور انصاف پر مبنی ایک بہتر سسٹم کا مطالبہ کیا اور اپنی حکومتوں کی مادہ پرستی، سامراجیت اور مبالغہ آمیز قوم پرستی(Chauvinism) کے خلاف سخت احتجاج کے علاوہ قومی جنگجوں مین حصہ لینے اور یونیورسٹیوں میں پڑھنے سے انکار کر دیا۔ اس دور کی نئی نسل نے وہی کچھ کرنا شروع کر دیا جو برسوں سے بنیاد پرست کر رہے تھے۔ انہوں نے جدید قدروں سے بغاوت کرتے ہوئے ایک جوابی کلچر، ایک متبادل سوسائیٹی بنانی شروع کر دی۔ کئی لحاظ سے وہ زیادہ مذہبی طرزِ زندگی چاہتے تھے ان کے پاس اداریاتی مذہب یا توحید پرست مذاہب کی آمرانہ ساخت کے لئے وقت نہیں تھا اس کی بجائے وہ کھٹمنڈو چلے گئے یا صوفیانہ اور گیان دھیان کی مشرقی تکنیک میں تسکین تلاش کرتے۔ بعض لوگ سکون آمیز اور نشہ آور دواؤں میں خود فراموشی اور بلندیوں پر جانے کی آرزو کرتے۔ یہ مائیتھوس کے لئے تڑپ اور سائنسی ریشنلزم سے انکار تھا جو نئی مغربی آرتھوڈوکسی کے دل کی دھڑکن بن گیا۔ یہ عقلیت سے انکار نہیں تھا بلکہ اس کی انتہا پسندانہ شکل سے انکار تھا۔ بیسویں صدی کی سائنس بذات خود مختار، سنجیدہ اور بڑے منظّم اور اصولی طریقہ سے اپنی انتہاؤں اور اہلیت کے دائروں سے آگاہ تھی مگر جدیدیت کے موجودہ موڑ نے سائنس کو نظریاتی بنا دیا تھا اور حقیقت تک پہنچنے کے ہر دوسرے طریقہ سے انکار کر دیا تھا۔1960 کے عشرہ میں نئی نسل کے انقلاب کی ایک وجہ ریشنل زبان کے ناجائز غلبے اور مائیتھوس پر لوگوس کے حاوی ہونے کے خلاف احتجاج تھا۔

مگر جدیدیت کے آغاز سے ہی چونکہ مغرب نے وجدانی علم تک پہنچنے کے منظم طریقے نظر انداز کردیئے تھے اس لئے1960 کے عشرے میں روحانیت کی تلاش لاحاصل تھی مذہب کے ان پرجوش حامیوں کی پالیسیوں اور وژن میں بھی خامیاں تھیں جو ماڈرن سوسائیٹی کے ریشنلزم اور سیکولرازم کے خلاف حملے کی تیاریاں کررہے تھے۔ بنیاد پرست اپنی صفیں درست کررہے تھے انہوں نے جدیدیت اکثر جارحیت کی صورت مین دیکھی تھی۔ ماضی کے بوسیدہ اندازفکر سے آزادی نئے دور کا تقاضہ تھا۔ترقی کا جدید آئیڈیل ان سرگرمیوں مقاصد اوراداروں کا خاتمہ چاہتا تھا جو عقل کے خلاف اور گمراہ کن تھے۔ مذہبی اسٹیبلشمنٹ اور مذہبی ڈاکٹرین ان کا خصوصی نشانہ تھے۔بعض اوقات جیسا کہ سکوپس کے مقدمہ کے موقع پرآزاد خیال افراد کے معاملہ میں ہوا کہ تمسخراور مضحکہ خیزی سے ہتھیار کا کام لیا گیا۔مشرق وسطیٰ میں جہاں جدیدیت کا عمل زیادہ دشوار تھا وہاں اسے کامیاب بنانے کے لئے اسیروں کے کیمپ اور قتل وغارت گری جیسے سفاکانہ طریقوں سے کام لیا گیا۔1960 اور1970 کے عشروں تک اکثر مذہبی لوگ خفا ہوچکے تھے انہوں نے تہیہ کرلیا تھا کہ وہ لبرل اور سیکولر طبقوں کے خلاف لڑیں گے کیونکہ ان کے خیال میں انہیں نظرانداز اور کمزور کیا گیا تھا۔مگر وہ پرانے زمانے کے لوگ تھے جبکہ سیکولرازم کے خلاف جنگ میں نئے حربوں اورنئی آئیڈیالوجی سے کام لینا ضروری تھا۔

امریکی اورفرانسیسی انقلاب کے زمانے سے مغربی سیاست نظریاتی ہوچکی تھی لوگ آزادی مساوات رواداری اور سماجی انصاف کے لئے جدوجہد کررہے تھے۔مغرب کے آزادخیال حلقوں میں یہ خیال عام تھا کہ تعلیم کے ذریعے معاشرہ اور سیاست زیادہ ریشنل اور ہم آہنگ ہوجاتے ہیں۔سیکولر آئیڈیالوجی لوگوں کو جدوجہد کے لئے تیار کرنے کا اسلوب اور یقین وایمان کا ایک نیا سسٹم تھی جو سیاسی اور سماجی جدوجہد کے لئے جواز اور منطقی بنیاد(Rationale) مہیا کرتی تھی۔ زیادہ سے زیادہ لوگوں کے دل میں اترنے کے لئے ایک نظریہ سیدھے سادے انداز اور امیج میں بیان کیا گیا تھا اکثر اسے سادہ تر بنانے کے لئے عوامی طاقت اورعوام دشمن جیسے نعرے ایجاد کیے گئے تھے۔انتہائی سادہ الفاظ میں بیان ہونے والی حقیقتوں کے متعلق خیال تھا کہ ان کے ذریعے ہر بات واضح ہوگئی ہے۔نظریاتی ماہرین کا خیال تھا کہ دنیا دشوار مرحلہ میں ہے موجودہ بحران کی وجوہات تلاش کرنے کے علاوہ وہ اس بحران کے حل کا وعدہ کرتے تھے وہ لوگوں کی توجہ ایسے

دوگروہوں کی طرف دلاتے جن میں سے ایک دنیا کی تباہی کا ذمہ دار ہے اور ایک دوسرا گروپ ہے جو سب کچھ ٹھیک کردے گا۔نئی دنیا میں سیاست اشرافیہ کا اجارہ نہیں ہے اس لئے ضروری ہے کہ عوام کی حمایت حاصل کرنے کے لئے نظریہ سادہ اور سب کی سمجھ میں آنے والا ہو۔

یہ بات طے ہے کہ بعض گروہ کبھی آئیڈیالوجی کو سمجھنے کے اہل نہیں ہو سکیں گے کیونکہ ان کا ''باطل شعور''ان کے راستے کی دیوار ہے۔بعض اوقات آئیڈیالوجی ایک بند گلی کی طرح ہوتی ہے جس میں آگے بڑھنے کا راستہ نہیں ہوتا نہ ہی آئیڈیالوجی متبادل نظریئے برداشت کرتی ہے۔ مارکسی جو سرمایہ داری کو دنیا کی تمام خرابیوں کا ذریعہ سمجھتا ہے، سرمایہ داری کی خوبیاں نہیں جانتا نہ ہی سرمایہ دار، مارکسزم کی قدریں سمجھنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔نوآبادیاتی طاقتیں، ابھرتی ہوئی قوم پرستی کے تقاضوں کا اندازہ نہیں کرسکتیں جبکہ صیہونی اور عرب ایک دوسرے کا نقطہ نظر نہیں سمجھ سکتے دراصل تمام نظریئے ایک فرضی جنت کے خواب ہیں جسے حاصل کرنا ممکن نہیں۔ ویسے تو وہ اپنے انتخاب میں بڑے محتاط ہیں لیکن قومیت، شخصی آزادی یا مساوات جیسے تصورات کو مختلف نظریئے سمجھ کر اپنے لئے چن سکتے ہیں۔ چنانچہ یہ تصورات بعض اوقات ایک جیسے آئیڈیلز (نصب العین) سے ہم آہنگ ہوسکتے ہیں کیونکہ ان میں ایک ہی زمانہ کی روح موجزن ہے۔

مؤرخ ایڈمنڈ برک(97-1729)ان افراد میں سے پہلا شخص تھا جنہوں نے اندازہ کرلیا تھا کہ اگر کسی گروہ کو اسٹیبلشمنٹ کی آئیڈیالوجی (جو شاید کبھی انقلابی رہی ہو) چیلنج کرنی ہے تو انہیں جوابی انقلاب کی آئیڈیالوجی خود بنانی ہوگی۔1960اور1970کے عشروں تک بعض نہایت بے چین اور غیر مطمئن یہودیوں، عیسائیوں اور مسلمانوں کی یہی پوزیشن تھی۔ وہ جنہیں جدید اسٹیبلشمنٹ کے ریشنل خواب کہا کرتے تھے ان کے جواب میں انہیں ان تصورات کو چیلنج کرنا پڑا جنہیں وہ کبھی انقلابی سمجھتے تھے مگر اب وہ واضح طور پر آمرانہ اور گمراہ کن لگتے تھے۔وہ سب سمجھتے تھے (بعض اوقات اس کا جواز بھی موجود ہوتا تھا) کہ سیکولرسٹ اور لبرل انہیں مٹانے کے درپے ہیں۔ ایک مذہبی نظریہ تخلیق کرنے کے لئے انہیں اپنی روایات کی دیومالاؤں اور علامتوں کو نئی صورت میں اس طرح ڈھالنا پڑا کہ ان سے ایک قابل تقلید لائحہ عمل بن جائے اور لوگ اپنا مذہب بچانے پر آمادہ ہوں۔بعض مذہبی مفکرین پر عہد قدیم کی روحانیت کا گہرا اثر تھا ایسے لوگ صوفی تھے انہیں متھ اور رسوم سے غیر معمولی دلچسپی تھی جس کی وجہ سے انہیں دکھائی نہ دینے والی حقیقتوں کا گہرا شعور تھا۔

مگر ایک دشواری تھی کہ نئے دور سے پہلے متھ کو بروئے کار لانے کی خواہش کبھی بھی نہیں کی گئی اس کا یہ مصرف نہیں سوچا گیا کہ وہ کوئی لائحہ عمل واضح طور پر تشکیل دے اور اگر کبھی اسے سیاسی مفاد کی خاطر استعمال کیا گیا تو ہمیشہ تباہ کن نتائج سے دوچار ہونا پڑا۔ اب جبکہ وہ سیکولر دنیا پر جوابی حملہ کی تیاریاں کررہے تھے تو ان مذہبی متوالوں کو اپنی دیومالائیں لازمی طور پر نظریہ میں بدلنی پڑیں۔

1960 کے عشرے میں اسلام کو مصر میں مسلسل نظریاتی حملہ کا سامنا کرنا پڑا۔ ناصر کی مقبولیت اپنے عروج پر تھی اس نے کلچری انقلاب اور جسے وہ سائنسی سوشلزم کہتا تھا اس پر عمل کرنے کا حکم دیا۔ مئی 1962 کے نیشنل چارٹر میں اس نے سوشلسٹ تناظر میں تاریخ کی نئی توجیہہ کی یہ ایک ایسی آئیڈیالوجی تھی جس نے ثابت کیا کہ سرمایہ داری اور بادشاہت دونوں ناکام ہو چکے ہیں اور صرف سوشلزم ہی ترقی کا ذریعہ ہے۔

مذہب، حکومت کی نظر میں بے کار اور بوسیدہ تھا اخوان المسلمین کی تباہی کے بعد ناصر نے پرانے اسلامی نعروں کے استعمال کی کبھی پرواہ نہیں کی۔ 1961 میں حکومت نے تعلیم کے سلسلہ میں ازمنۂ وسطی کی بزدلانہ پیروی اور ازہر کے معذرت خواہانہ کمزور اور بے جان رویہ پر علماء کو سرزنش کی کیونکہ ان کی وجہ سے ازہر کو عصری تقاضوں سے ہم آہنگ کرنا ناممکن ہو گیا تھا۔ ناصر ٹھیک کہتا تھا۔ کیونکہ مصری علماء نے نئی دنیا پر اپنے ذہنوں کے دریچے بند کر لئے تھا اور ریفارم کی بدستور مزاحمت کررہے تھے۔ حکومت کو تو وہ ویسے ہی نااہل سمجھتے تھے مگر مصری معاشرے کے جدیدیت پسند بھی اپنا اثر کھورہے تھے۔ اسی طرح اخوان المسلمین کی دہشت گردی نے بھی مصری سوسائیٹی کی تباہی میں بہت بڑا کردار ادا کیا تھا۔ لگتا تھا کہ تمام مسلم اسٹیبلشمنٹ ناکارہ تھی اور جدید دنیا سے اسے کوئی واسطہ نہیں تھا۔

1960 کے عشروں کے دوران مصر اور شام کے تاریخ دانوں نے جو ناصر سے متاثر تھے نئی سیکولرسٹ آئیڈیالوجی کو نیا سنبھالا دیا۔ ان کے خیال میں اسلام قوم کی تمام برائیوں کا سبب تھا۔ اگر عرب ملکوں کو ترقی کرنی ہے تو انہیں اس سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہیے۔

شامی سکالرز کی عرسوزی کی رائے تھی کہ اس بات پر فخر کرنے کی بجائے کہ عربوں نے دنیا کو اسلام دیا مورخوں کو بادی کلچر (مثال کے طور پر تصویر کو حروف میں بدلنا) میں ان کے کارنامے پر زور دینا چاہیے۔ مذہب میں اپنے انہاک کی وجہ سے عرب یورپ سے پیچھے رہ گئے تھے کیونکہ

یورپ نے روحانی دنیا کی بجائے مادی دنیا پر توجہ دی تھی اور جدید سائنس، صنعت اور ٹیکنالوجی کو جنم دیا تھا۔ شبلی العیسامی کا کہنا تھا کہ یہ افسوس ناک بات ہے کہ مسلم مؤرخ اسلام سے پہلے عرب تہذیب کو ''جاہلیہ'' یعنی دور جہالت کہہ کر رَد کر دیں جبکہ قدیم یمن مین ان کے کلچری کارناموں کو بڑی اہمیت حاصل تھی۔ یاسین الحفیظ نے اسلامی تاریخی ذرائع کو معتبر نہیں جانا کیونکہ وہ ذرائع صرف حکمران طبقوں کے خیالات کی عکاسی کرتے تھے۔ مردہ ماضی کی غلط یادوں کو بنیاد بنا کر ان پر کسی نئی آئیڈیالوجی کی تعمیر ناممکن اور بے معنی بتائی گئی اور کہا گیا کہ مؤرخوں کو بہتر سائنسی اور جدلیاتی تاریخ نویسی کو فروغ دینا چاہیے اور اسے قدیم سوسائیٹی کا نظام بدلنے کے لئے جنگ سمجھ کر اس میں شامل ہو جانا چاہیے۔ عربوں کے جھوٹے شعور کے لئے ان کا مذہب ذمہ دار تھا مذہب نے انہیں پسماندہ رکھا۔ اس لئے ریشنل اور سائنسی ترقی کے راستے میں حائل دوسری رکاوٹوں کی طرح اسے بھی راستہ سے ہٹا دینا چاہیے۔ جہاں تک نظریہ کا تعلق تھا ان کے دلائل جانبدارانہ تھے۔ مذہب کی تصویر غلط اور غیر حقیقت پسندانہ تھی۔ جدید دنیا میں مذہب کا جو بھی مقام ہو (اور یہ بات ابھی طے نہیں تھی) ماضی کو بھلانا اور اس کے نقوش مٹانا ممکن نہیں۔ ماضی ان لوگوں کے ذہنوں میں زندہ رہنا ہے جن سے قوم بنتی ہے چاہے اس کے پرانے ادارے اور ان اداروں کے لوگ ختم کر دیئے جائیں۔

جواب میں نئے مذہبی نظریہ ساز بھی اتنے ہی سادہ لوح اور جارحیت پسند تھے۔ انہیں یقین تھا کہ وہ اپنی زندگیوں کی خاطر لڑ رہے ہیں۔ 1951 میں پاکستانی سکالر اور سیاستدان ابوالاعلیٰ مودودی (79-1903) کی تصنیفات مصر مین شائع ہونا شروع ہوگئیں۔ مودودی کو اسلام کے تباہ ہونے کا خوف تھا ان کا اندازہ تھا کہ مغرب کی زبردست قوتیں اسلام کو صفحۂ ہستی سے مٹانے کے لئے صف آرا ہو رہی ہیں۔ آزمائش کے اس مرحلہ میں مودودی کو یقین تھا کہ سچے مسلمان سیاست سے دست کش ہو کر اسے دوسروں پر نہیں چھوڑ سکتے اس لئے انہیں ایک مضبوط تنظیم قائم کر کے اس گمراہی اور لادینی کے خلاف لڑنا چاہیے۔ لوگوں کو منظّم کرنے کے لئے مودودی نے اسلام کو مدلل اور باقاعدہ طریقہ سے پیش کرنے کی کوشش کی تا کہ اس دور کے دوسرے ممتاز نظریوں کی طرح اسلام پر بھی سنجیدگی سے غور کیا جائے۔ چنانچہ ان کی کوشش تھی کہ اسلام کی تمام پیچیدہ مائتھوس اور روحانیت کو لوگوس میں بدل دیں تا کہ ایک ریشنل توجیہہ کے زور پر لوگوں کو آمادۂ عمل کیا جا سکے۔

پرانے قدامت پسند دور میں ایسی کوئی بھی کوشش کج روی سے تعبیر کی جاتی مگر اب مسلمان جدیدیت سے پہلے کے دور میں سانس نہیں لے رہے تھے اس خطرناک اور ظالم بیسویں صدی میں انہیں اپنی بقاء کے لئے اپنے خیال وعمل کو بدلنا تھا اور اپنے مذہب کو جدید بنانا تھا۔

مودودی کے نظریہ کی بنیاد دوسرے جدید مسلم مفکرین کی طرح خدا کی حاکمیت تھی۔ جدید دور نے اسے ایک چیلنج کے طور پر لیا تھا کیونکہ وہ اس کی ہر صداقت کا منکر تھا لیکن اب کہا گیا کہ خدا تنہا تمام انسانی معاملات پر قادر ہے اور وہی سب سے بڑا قانون ساز ہے۔ انسانوں کو اپنے لئے قانون بنانے کا حق نہیں نہ انہیں اپنی قسمت پر اختیار ہے۔ انسانی آزادی اور انسانی حاکمیت کے تمام تصورات پر حملہ آور ہو کر مودودی تمام سیکولر فکر کی نفی کر رہے تھے۔

''اپنی زندگی کے معنی ومقصد کا تعین ہمارا منصب نہیں نہ ہمیں اپنے دنیاوی اختیارات کی حدیں مقرر کرنی ہیں نہ کوئی اور ہمارے لئے یہ فیصلے صادر کرنے کا مجاز ہے۔ کوئی انسان، خاندان، طبقہ لوگوں کا گروہ بلکہ تمام بنی نوع انسان بھی انسان کی حاکمیت کے دعویدار نہیں ہوسکتے۔ خدائے واحد ہی حاکم ہے اور اس کے احکام اسلام کا قانون ہیں۔''

اس سے لاک کانٹ اور امریکہ کے بانی رہنما اپنی قبروں میں تڑپ گئے ہوں گے مگر واقعہ یہ ہے کہ مودودی بھی دوسرے جدید رہنماؤں کی طرح آزادی کے شیدائی تھے اور آزادی کی اسلامی دینیا پیش کر رہے تھے کیونکہ خدا ہی حاکم اعلیٰ ہے۔ کوئی فرد کسی اور انسان کے احکام ماننے پر مجبور نہیں۔ کوئی حکمران جو قرآن وسنت کے حوالہ سے خدا کی رضا کے مطابق حکومت کرنے سے انکار کرتا ہے اپنی رعایا سے اطاعت کی توقع نہیں کرسکتا۔ ایسی صورتحال میں انقلاب محض ایک حق نہیں بلکہ فرض ہے۔

چنانچہ اسلامی نظام میں ریاست، حکمران کی مرضی اور خواہشوں کی پابند نہیں۔ وہ مسلمانوں کو انسانی اقتدار کی برائیوں سے بچاتی ہے۔ اسلامی آئین کی رو سے خلیفہ کے لئے لازمی ہے کہ وہ مشاورت کے اصول پر عمل کرے اور اپنے فیصلوں میں ماتحتوں سے بھی رائے لے مگر اس سے یہ مراد نہیں کہ جمہوریت کی طرح حکومت عوام کی ہے۔ خلیفہ یا عوام کو قانون سازی کا اختیار حاصل نہیں ہے وہ صرف شریعت پر عمل کر سکتے ہیں۔ اس لئے مسلمانوں کو نوآبادیاتی طاقتوں کی طرف سے مسلط کی جانے والی مغربی طرز کی حکومتوں کا مقابلہ کرنا چاہیے کیونکہ ایسی حکومتیں خدا کے

خلاف بغاوت اوراس کے اختیار پر ڈاکہ ڈالنے کے مترادف ہیں۔اقتدار،ایک بار انسانوں کے ہاتھ آجائے تو ظلم وجوراور بدی کے دروازے کھل جاتے ہیں۔سیکولرسٹ ایک حریت پسند دین کی سمجھ نہیں رکھتے کیونکہ یہ بات کی آئیڈیالوجی کی فطرت کا حصہ ہے کہ مخالفین اس کی بصیرت حاصل نہیں کر سکتے۔ مودودی عصری تقاضوں اور اقدار سے باخبر تھے۔ انہیں آزادی اور قانون کی حکومت پر یقین تھا، وہ انہیں کرپشن اور آمریت سے بچنے کا ذریعہ سمجھتے تھے۔ انہوں نے ان تصورات کی ذرا مختلف وضاحت کی اور اسے اسلامی نام دے دیا مگر سیکولرازم کا غلط تصور رکھنے والے کسی فرد کے لئے اسے سمجھانا ممکن تھا۔

مودودی آئیڈیالوجی کی اہمیت سے بھی واقف تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ اسلام مارکسزم اور فاشزم کی طرح ایک انقلابی نظریہ ہے مگر ان میں ایک اہم فرق بھی ہے۔ نازیوں اور مارکسٹوں نے انسان غلام بنائے ہیں اسلام نے انہیں خدا کی غلامی کے سوا ہر غلامی سے آزاد کیا ہے۔ ایک ماہر نظریہ ساز کی حیثیت سے مودودی نے ہر دوسرے سسٹم میں نا قابل اصلاح خامیاں پائیں مثلاً جمہوریت، انتشار، لالچ اور ہجوم کی حکومت ہے۔ سرمایہ داری سے طبقاتی کشمکش نے فروغ پایا اور اس نے ساری دنیا مٹھی بھر بینکروں کی غلام بنادی ہے۔ کمیونزم نے انسانی پیش قدمی اور انفرادیت کا گلا دبادیا ہے۔ یہ حسب معمولی نظریاتی سہل انگاریاں تھیں۔

مودودی نے اس راہ میں پیش آنے والی دشواریوں اور ان کی تفصیلات سے صرف نظر کیا یعنی اسلامی شوریٰ عملی طور پر مغربی طرز کی جمہوریت سے کیونکر مختلف ہوگی؟ شرعی قوانین جو زرعی معاشرہ کے قوانین ہیں جدید صنعتی دنیا کی سیاسی اور اقتصادی مشکلات سے کس طرح عہدہ برآ ہوں گے؟ مودودی کا کہنا تھا کہ ایک اسلامی ریاست میں وحدانی اور مطلق العنان طرز حکومت ہوگی کیونکہ اس میں ہر چیز خدا کے تابع فرمان ہوگی مگر اپنے عمل میں وہ آمریت سے کیسے مختلف ہوگی؟ اور وہ خود مانتے ہیں کہ قرآن نے آمریت کی مذمت کی ہے۔

کسی نظریہ ساز کی طرح مودودی کوئی عالمانہ اور مشکل سے سمجھ میں آنے والا پیچیدہ نظریہ پیش نہیں کر رہے تھے بلکہ جہاد کی دعوت سے رہے تھے۔ وہ عالمی سطح پر جہاد چاہتے تھے اسے وہ اسلام کا مرکزی اصول کہتے تھے۔ کسی بڑے مسلمان مفکر نے ایسا دعویٰ پہلے کبھی نہیں کیا۔ یہ ایک نئی بات تھی۔ مودودی کی نظر میں حالات اس کا تقاضہ کرتے تھے۔ جہاد مقدس جنگ نہیں جس کے

ذریعے کافر مسلمان بنائے جائیں۔ جیسا کہ مغرب کے لوگ سمجھتے ہیں نہ وہ محض اپنے دفاع کا
ذریعہ ہے جیسا کہ عبدہٗ نے کہا مودودی نے واضح کیا کہ جہاد تمام انسانیت کی بھلائی کے لئے
انقلابی جدوجہد کے ذریعے طاقت حاصل کرنا ہے۔ یہاں پھر مودودی جنہوں نے یہ آئیڈیا
1939 میں پیش کیا مارکسزم جیسی تشدد پسند آئیڈیالوجی کے تناظر میں برابر کے شریک تھے۔ گویا
جس طرح کہ پیغمبر اسلامؐ جاہلیہ۔ اسلامی دور سے پہلے کی جاہلیت اور بربریت۔ کے خلاف لڑے
تھے اسی طرح تمام مسلمان اپنے تمام وسائل سمیت مغرب کی نئی جاہلیہ کا مقابلہ کریں۔ جہاد کی کئی
صورتیں ہیں مثلاً مضامین لکھنا، تقریرین کرنا بھی جہاد ہے مگر آخری کوشش کے طور پر مسلح جدوجہد
کے لئے تیار رہنا چاہیے۔ اس سے پہلے کبھی بھی جہاد نے سرکاری سطح پر اتنی مرکزی حیثیت حاصل
نہیں کی تھی نہ مودودی کے جنگجو نظریہ جیسی پہلے کوئی مثال ملتی ہے۔ مگر عبدہٗ، اور بنیٰ کی ان اصلاحی
کوششوں کے بعد کہ جدید مغربی تصورات آسانی سے قبول کر لئے جائیں، صورت حال اور نازک
ہوگئی تھی اب کچھ مسلمان جنگ پر تیار تھے۔ مودودی کے خیالات سے زیادہ متاثر ہونے والوں
میں سے سید قطب (66-1906) تھا جو 1953 کے اندر اخوان المسلمین میں شامل ہوا تھا۔
1954 میں ناصر نے اسے گرفتار کر کے پندرہ سال قید بامشقت کی سزا دی تھی۔ اس نے اسلام
پسندوں کے ساتھ حکومت کا ظالمانہ رویہ دیکھا تھا۔ ناصر کے کیمپوں میں اس کے تجربات نے
اسے چوکنا کر دیا اور اس کے خیالات مودودی سے باغیانہ ہوگئے۔ قطب کو ہم سنی بنیاد پرستی کا بانی
کہہ سکتے ہیں۔ کم وبیش تمام انقلابی اسلام پسند قطب کی اسی آئیڈیالوجی کا سہارا لیتے تھے جو اس
نے قید میں تشکیل دی تھی مگر وہ ہمیشہ مغربی کلچر یا کسی انتہا پسندی کے خلاف نہیں تھے۔ قطب نے
قاہرہ کے دارالعلوم کالج میں تعلیم پائی تھی جہاں وہ انگریزی ادب سے بہت متاثر ہوا۔ وہ ایک قوم
پرست اور وفد پارٹی کا کارکن بھی تھا۔ پستہ قد کمزور اور حلیم طبع ہونے کی وجہ سے وہ شعلہ ساماں
نہیں لگتا تھا مگر وہ واقعی مذہبی آدمی تھا وہ برس کی عمر میں اس نے قرآن حفظ کر لیا تھا جو زندگی بھر اس
کے لئے چراغ راہ بنا رہا۔ جوانی میں اس کا مذہب مغربی کلچر اور سیکولر سیاست کا گرم جوش ہم نشین
رہا مگر 1940 کے عشرے تک مغرب سے اس کی فریفتگی کہنا گئی۔ شمالی افریقہ اور مشرق وسطیٰ میں
برطانیہ اور فرانس کی نوآبادیاتی سرگرمیوں سے اسے بیزاری ہونے لگی جیسا کہ صیہونیت کے حق
میں مغرب کی حمایت سے اسے دکھ ہوا۔ امریکہ میں تعلیم حاصل کرنے کا ایک دور بھی اس کے لئے

بڑا مایوس کن تھا اسے امریکی کلچر کی ریشنل عملیت پسندی سے بھی پریشانی ہوئی۔ اس کلچر میں فوری افادیت کے سوا کوئی مقصد قابل توجہ نہیں اور خود پرستی کے سوا کسی انسانی جذبہ کی کوئی اہمیت نہیں۔ یہاں پوری زندگی پر مادہ پرستی چھائی ہوئی ہے۔ محنت اور پیداوار سے متعلق قوانین کے سوا کسی قانون کی گنجائش نہیں۔ اس کے بعد بھی وہ اعتدال پسند اور ریفارمر ہی رہا اس کی کوشش تھی کہ جمہوریت اور پارلیمنٹ جیسے مغربی اداروں کو اس اُمید پر اسلامی جہت دے تاکہ وہ سیکولرسٹ نظریہ کی بے اعتدالی اور زیادتی سے بچ سکیں۔

مگر جیل میں قطب کے تجربے نے اسے یقین دلا دیا کہ مذہب پسند اور سیکولرسٹ ایک ہی معاشرہ میں امن کے ساتھ نہیں رہ سکتے۔ جب وہ اپنی جیل کے آس پاس دیکھتا تو اسے اخوان کی اذیتیں اور سزائیں یاد آتیں۔ مذہب کو برطرف کر دینے سے متعلق ناصر کے ارادوں پر غور کرتا تو جاہلیہ کی جھلک ان میں نظر آتی جسے اس نے مودودی کی طرح جاہلانہ بربریت کا نام دیا تھا اور جو مذہب کی ہمیشہ دشمن ہے جس کے خلاف مسلمان محمدؐ رسول اللہ کی مثال پر عمل کرتے ہوئے (کہ انہوں نے مکہ کی جاہل سوسائٹی کے خلاف جنگ کی تھی) آخری وقت تک جنگ کرنے کے پابند ہیں۔ مودودی نے تو غیر مسلم دنیا کو جاہلی سے تعبیر کیا تھا مگر قطب اس سے بھی بہت آگے گیا۔ 1960 کے عشرے تک قطب کو یقین ہو گیا تھا کہ نام نہاد مسلم دنیا بھی جاہلیہ کی طرح ظلم اور بدی میں مبتلا ہے۔ بظاہر ایک حکمران کی حیثیت سے ناصر اسلام کا دعویٰ کرتا تھا مگر اس کے قول اور فعل کا تضاد واضح تھا۔ اس کے خیال میں ایسی حکومت کا تختہ الٹ دینا مسلمانوں کا فرض ہے اب قطب نے پیغمبرؐ اسلام کی زندگی پر نظر ڈالی تاکہ اس کی روشنی میں ایک ایسے نظریہ کی تشکیل ہو سکے جس کے ذریعے لوگ جہاد کے لئے منظم ہوں، سیکولرازم کا سیلاب روکا جائے اور معاشرہ صحیح اسلامی اقدار پر عمل کرے۔

قطب نئی دنیا کا آدمی تھا۔ اس نے ایک زوردار اور مؤثر لوگوس کی تخلیق تو کی مگر اسے دیومالا میں بھی کمال حاصل تھا۔ اس کے دل میں عقل اور سائنس کا بڑا احترام تھا مگر وہ انہیں رہنمائی کا واحد ذریعہ نہیں سمجھتا تھا۔ کئی برس جیل میں رہتے ہوئے جہاں اس نے اپنے نئے بنیاد پرستانہ نظریہ کی تخلیق کی وہاں قرآن کی بڑی شاندار تفسیر بھی لکھی جو غیر مرئی اور ناقابلِ بیان حقیقت کے بارے میں اس کے گہرے روحانی شعور پر گواہی ہے۔ اس نے لکھا ''انسانی ذہن کتنا ہی ریشنل

ہو جائے وہ مسلسل نا معلوم کے اتھاہ سمندر میں تیرتا رہتا ہے۔ تمام فلفسیانہ سائنسی نشوونما سے ایک طرح کی ترقی تو یقیناً ہوئی ہے مگر وہ کائناتی قوانین کی محض ایک جھلک ہے اور ایک وسیع سمندر میں لہروں کی طرح سطحی ہے۔ مستقل قدرتی عناصر کی طرح وہ دھارے کا رخ نہیں بدلتیں'' جہاں جدید ریشنلزم کا زور دنیاوی معاملات پر تھا، قطب اب بھی زمینی حقیقت کی تہہ تک پہنچنے کے لئے روائیتی ڈسپلن کو اہم سمجھتا تھا۔ یہ جاننے کے لئے کہ وقت اور تغیر سے آگے ان سے ماورا کیا ہے۔ یہ دیو مالائی اور لازمی ذہنیت جو دنیاوی واقعات کو کم بیش بالکل دائمی اور اصلی حقائق کی عکس ریزی سمجھتی تھی۔ قطب کی فکر کے لئے بہت اہم تھی۔ امریکہ میں اس رجحان کا نہ ہونا اس کے لئے پریشان کن تھا۔ قطب کی فکر کے لئے بہت اہم تھی۔ امریکہ میں اس رجحان کا نہ ہونا اس کے لئے پریشان کن تھا۔ جب قطب نے جدید سیکولر کلچر پر دوسرے بنیاد پرستوں کی طرح نگاہ کی تو اسے ایک دوزخ نظر آیا، ایک ایسی جگہ جو اخلاقی معنویت اور پاکیزگی سے یکسر خالی تھی۔

انسانیت، آج ایک بڑے قحبہ خانہ مین زندگی گزار رہی ہے۔ اس کے پریس، فلموں، فیشن اور حسن کے مقابلوں، ناچ گھروں، شراب خانوں اور نشریاتی مراکز پر نظر ڈالو یا ننگے جسموں کے لئے ان کی وحشیانہ بھوک، اشتعال انگیز اداؤں اور آرٹ وادب میں مریضانہ اشاروں وکنایوں پر غور کرو اور اس پر مستزاد سودخوری کا نظام جو دولت کے لئے انسان کی بھوک بھڑکاتا ہے اور اسے لوٹنے اور دولت کی سرمایہ کاری کے شرمناک ہتھکنڈے سکھاتا ہے تا کہ وہ قانون کے بھیس میں فراڈ، عیاری اور بلیک میل سے دولت حاصل کرے۔

وہ چاہتا تھا کہ مسلمان سیکولرازم کے خلاف بغاوت کریں اور جدید سوسائٹی میں روحانیت کا شعور پیدا کریں۔ قطب نے تاریخ کو ایک صوفی کی نظر سے دیکھا تھا۔ اس نے پیغمبر کی زندگی کا جائزہ جدید سائنسی مؤرخ کی طرح نہیں لیا تھا کہ بے مثال واقعات کو ماضی بعید میں رکھتے ہوئے دیکھا۔ قطب ایک ناول نگار اور ادبی نقاد بھی تھا اور جانتا تھا کہ حقیقی واقعات کا علم حاصل کرنے کے کچھ اور طریقے بھی ہیں۔ قطب کی نظر میں حضرت محمدؐ کی زندگی اب بھی ایک مثال تھی، ایک لمحہ جب بشریت اور الوہیت مل کر آگے بڑھے۔ یہ ایک مشترکہ کوشش تھی دنیا کو خدا سے قریب لانے کی بڑی علامت تھی۔ چنانچہ حضرت محمدؐ کی زندگی نے ایک ایسا آئیڈیل پیش کیا جو تاریخ اور زمان ومکان سے بلند ان سے ماوراء ہے۔ تقدیس کے مسیحی تصور کی طرح یہ انسان کو آخری اور قطعی

حقیقت سے دوچار ہونے کا موقعہ مسلسل دیتا ہے۔ رسول اللہؐ کی زندگی کے کئی پہلو ایسے سنگ میل ہیں جو انسان کی رہنمائی خدا کی طرف کرتے ہیں دور جاہلیت سے مراد عرب میں اسلام سے پہلے کا زمانہ نہیں ہے جیسا کہ مسلمانوں کی تاریخ میں بتایا گیا ہے۔ جاننا چاہیے کہ جاہلیت کا دور نہ وقت کا پیمانہ ہے نہ کسی خاص دور سے مخصوص ہے بلکہ یہ ایک صورتحال ہے جو بار بار معاشرے میں اپنے آپ کو اس وقت دہراتی ہے جب معاشرہ اسلامی طرز زندگی سے روگردانی کرتا ہے اس میں ماضی حال اور مستقبل کی کوئی قید نہیں۔ خدا کی عظمت اور حاکمیت سے انکار کی ہر کوشش جہالت سے جنم لیتی ہے۔ قوم پرستی، ریاست کو سب سے بڑھ کر اہمیت دیتی ہے۔ کیمونزم دہریت ہے اور جمہوریت میں لوگ خدا کی حاکمیت غصب کر لیتے ہیں۔ یہ سب جہالت کے مختلف مظاہر ہیں جہاں خدا کی بجائے انسان کی عبادت کی جاتی ہے۔ قطب کی رائے میں مغرب اور مصر کی جدید جاہلیہ رسول اللہؐ کے زمانہ کی 'جاہلیہ' سے بھی بدتر تھی کیونکہ اس کی بنیاد جہالت نہیں بلکہ خدا کے خلاف دانستہ بغاوت پر تھی۔ جدید دور سے پہلے کی روحانیت میں مسلم آرکی ٹائپ (مثالیت) کی تعمیر مسلمانوں کی زندگی کا مقصد بن گئی جس کی تکمیل اسلامی شعائر اور اخلاق پر سختی کے ساتھ عمل پیرا ہونے سے ہوئی۔ قطب کی رائے میں یہ اس لحاظ سے اب بھی مائتھوس تھی مگر اس بار اس نے اس کی نئی تشکیل اس طرح کی کہ متھ ایک نظریہ۔ ایک لائحہ عمل بن گئی اس کے خیال میں مدینہ میں تخلیق اور تربیت یافتہ، اولیت اور سبقت والوں کی نسل روشنی کا ایک مینار تھی جس کے خدوخال خدا نے خود سنوارے تھے ان کی تخلیق اور تربیت رسول اللہؐ نے کی تھی تا کہ یہ مثالی معاشرہ ایک ایسی نسل کا کارنامہ تھا جو انسانوں میں ایک انتخاب تھی مگر ایسا نہیں کہ وہ معجزہ دہرایا نہ جا سکے وہ انسانی ریاضت اور مشقت کا حاصل تھا اسے اب بھی کہیں بھی، ریاضت اور مشقت کے ذریعے دہرایا جا سکتا ہے۔ رسول اللہؐ کی زندگی کے ذریعے خدا نے ایک لائحہ عمل دیا ہے اس لئے وہ انسانوں کے بنائے ہوئے نظریات سے بہتر نظریہ ہے۔ خدا نے انسانوں کو بتا دیا ہے کہ صحیح معنوں میں معاشرہ کی سمت بدلنے اور اس کی اصلاح کا بس یہی ایک طریقہ ہے۔

عیسائیوں کے برعکس مسلمانوں نے ہمیشہ خدا کی جستجو، عقیدہ کی بجائے عمل سے کی ہے۔ مسلم بنیاد پرست ہمیشہ باعمل ہوتے ہیں اور امت ان کے عمل کا محور ہوتی ہے۔ مگر جب قطب نے رسول اللہ ﷺ کی زندگی کے مائتھوس کو نظریہ میں بدلا تو لازمی طور پر اس نے انہیں سہل بنایا۔

ان کے روحانی امکانات محدود کئے انہیں مختصر کیا اس نے رسول اللہؐ کی ذاتی زندگی اور اجتماعی جدوجہد کے متعلق کئی ابہام دور کر کے نئے آئیڈیالوجی کے تقاضوں سے ہم آہنگ گیا مگر اس کوشش میں اس نے اسلام کے تصور کو مسخ کر دیا۔

بیسویں صدی میں ایک ہدایت یافتہ معاشرہ بنانے کے لئے قطب نے پیغمبر کی زندگی کے چار پہلوؤں پر نظر رکھی اور کہا کہ مسلمانوں کو بھی ان چار مرحلوں سے گزرنا چاہیے۔ پہلا یہ کہ خدا نے اپنا لائحہ عمل ایک انسان کو دیا جس کا نام محمدؐ ہے اور جس نے وفادار افراد کا ایک گروہ بنایا جنہوں نے خدا کے احکام بجالانے اور مکہ کی جاہلیہ کے برعکس ایک انصاف پسند اور فلاحی معاشرہ بنانے کی قسم کھائی۔ پہلے مرحلہ میں محمدؐ نے اپنے پہلے دستے کو ملحد اسٹیبلشمنٹ سے دور رہنے کی نصیحت کی جس کا راستہ ان سے الگ تھا۔ دوسرے بنیاد پرستوں کی طرح قطب نے بھی غیر وابستگی کی حکمت عملی اہم جانی۔ پیغمبرؐ کے پروگرام سے واضح تھا کہ معاشرہ دو مخالف فریقوں میں بٹ گیا ہے۔ قطب چاہتا تھا کہ آج کے مسلمان بھی اپنے دور کی جاہلیت سے کٹ کر اپنا الگ شہر بسائیں۔ وہ مرتدوں اور منکروں کے ساتھ اچھا سلوک کریں مگر ان کے ساتھ رابطہ بہت کم ہونا چاہیے اور تعلیم جیسے اہم معاملات میں عام طور پر عدم تعاون کریں۔

جہالت کے بڑے دھارے سے اہل ایمان کی یہ بے تعلقی اس وقت شدت اختیار کر گئی جب پیغمبرؐ اسلام کی زندگی میں مکہ کی ملحد اسٹیبلشمنٹ نے مسلمانوں کی چھوٹی سی تعداد کو ظلم و ستم کا نشانہ بنانا شروع کر دیا اور بالآخر انہیں 622ء میں مکہ کے شمال کی سمت تقریباً 250 میل دور مدینہ کی طرف ہجرت پر مجبور کر دیا۔ آخر کار اہل ایمان اور کفار مکہ میں زبردست عداوت پیدا ہوگئی۔ مدینہ کے اندر اپنے پروگرام کے تیسرے مرحلہ میں رسول اللہؐ نے اسلامی ریاست قائم کی۔ یہ قدم جمانے اور اخوت اور اتحاد کا دور تھا اب مسلمانوں کو آنے والی جدوجہد کے لئے تیار ہونا تھا۔ چوتھے اور آخری مرحلہ میں مکہ کے خلاف مسلح جدوجہد کا آغاز ہوا۔ شروع میں مکہ کے تجارتی قافلوں پر چھوٹے چھاپے مارے گئے ان کے بعد مکہ کی فوج کے حملوں کا سامنا کیا گیا۔ اس معاشرے میں دو مخالف گروہوں میں مخالفت کے پیشِ نظر تشدد ناگزیر تھا جیسا کہ آج بھی مسلمانوں کی نظر میں ناگزیر ہے مگر بالآخر 630ء میں مکہ نے رضا کارانہ طور پر اپنے دروازے محمدؐ کے لئے کھول دیئے اور اسلام کی حکمرانی اور خدا کی حاکمیت تسلیم کر لی۔

قطب نے ہمیشہ اصرار کیا کہ خدا کے راستہ میں مسلح جدوجہد اسلام کو مسلط کرنے کی جابرانہ کوشش نہیں۔ مولانا مودودی کی طرح وہ بھی خدا کی حاکمیت کے اعلان کو انسانوں کی آزادی کا چارٹر سمجھتا تھا۔

''یہ انسانی خواہشات سے نجات یا دوسرے انسانوں کی غلامی سے آزادی کا عالمگیر اعلان ہے خدا کی حاکمیت کے اعلان کا مطلب، انسانی حکمرانی کے ہر تناظر، سسٹم، شکل اور حالت کے خلاف ہمہ گیر انقلاب ہے اور ہر اس صورتحال کی یکسر مخالفت ہے جس میں انسانوں کی حاکمیت قائم ہو سکے۔''

قطب کی آئیڈیالوجی بنیادی طور پر جدید تھی قطع نظر اس کے کہ اس کے خیالات میں خدا کو مرکزی مقام حاصل تھا۔ جدید نظام کو رد کرنے میں وہ کئی لحاظ سے 1960 کے عشرے کا آدمی لگتا تھا۔ پیغمبرؐ کے لائحہ عمل کی تصویر کشی میں اس نے ہر اس نکتہ کا خیال رکھا جو آئیڈیالوجی کے لئے ضروری تھا۔ یہ آئیڈیالوجی سہل اور سادہ تھی اور اس سے دشمن کی شناخت ممکن تھی۔ اس کے ذریعہ معاشرہ نئے سرے سے متحرک ہوسکتا تھا۔ کئی مسلمانوں کے لئے جو معاشرہ کے ٹوٹنے اور کج رو ہونے سے دلگیر تھے، قطب نے اپنی آئیڈیالوجی کے ذریعے نئے تصورات کے اہم پہلو اسلامی محاورہ میں بیان کئے تھے جسے وہ آسانی کے ساتھ سمجھ سکتے تھے۔ انگریزوں کی دی ہوئی آزادی، انہوں نے دیکھ لیا تھا کہ طاقت اور ترقی کا ذریعہ نہیں۔ جون 1967 کی چھ روزہ جنگ میں اسرائیلیوں کے ہاتھوں ناصر کی زبردست شکست سے ناصرازم قوم پرستی اور سوشلزم پر بھی کئی لوگوں کا اعتماد اٹھ گیا تھا۔ پورے مشرق وسطیٰ میں مذہب کی تجدید ہوئی تھی اور مسلمانوں کی ایک معقول تعداد کے لئے قطب کی آئیڈیالوجی تخلیقی تحریک کا ذریعہ بن گئی تھی۔

مسلمانوں کی نظر میں جہاد کو مرکزی درجہ دے کر قطب نے درحقیقت پیغمبرؐ اسلام کی زندگی کو مسخ کیا تھا۔ انؐ کے سیرت نگار یہ حقیقت بالکل واضح طور پر بیان کرتے ہیں کہ اگرچہ قرن اول کے مسلمانوں کو زندہ رہنے کے لئے ہتھیار اٹھانے پڑے مگر حضرت محمدؐ نے تلوار کے زور سے فتح حاصل نہیں کی تھی بلکہ فتح کی بنیاد انؐ کی تخلیقی اور امن پسندانہ حکمت عملی تھی۔ قرآن اپنے بچاؤ کے لئے جنگ کے سوا تمام جنگوں کے خلاف ہے۔ قرآن مذہبی معاملات میں طاقت کے استعمال کو سختی کے ساتھ منع کرتا ہے، قرآن سیدھی راہ پر گامزن ہر مذہب کو تسلیم اور ماضی کے بڑے پیغمبروں کی

توصیف کرتا ہے۔ اپنی وفات سے پہلے آخری مرتبہ جب حضرت محمدؐ نے مسلمانوں سے خطاب کیا تو انہیں تلقین کی کہ وہ دوسروں سے مفاہمت کے لئے اپنے مذہب سے مدد لیں کیونکہ تمام انسان بھائی بھائی ہیں۔ ''لوگو سنو، ہم نے تمہیں ایک مرد اور عورت سے پیدا کیا ہے پھر تمہاری قومیں اور قبیلے بنائے ہیں تا کہ ایک دوسرے کو پہچانو''، اپنی صفوں سے لوگوں کے اخراج اور علیحدگی کے سلسلہ میں قطب کا تصور، رواداری کی اس روح کے خلاف تھا۔ قرآن نے واضح طور پر بڑے اصرار کے ساتھ فرمایا کہ ''مذہب میں کوئی جبر نہیں'' قطب نے اس کی تاویل اس طرح کی کہ اسلام کی فتح اور مسلم ریاست کے قیام کے بعد ہی رواداری ہو سکتی ہے۔

نئی مخاصمت اس بے پناہ خوف سے پیدا ہوتی ہے جو بنیاد پرستی کی بنیاد ہے۔ قطب کو جاہلیت کے نئے دور کا تجربہ ذاتی طور پر ہوا تھا۔ ناصر اسلام کو مٹانے پر تلا ہوا لگتا تھا اور وہ اکیلا نہیں تھا۔ جب قطب نے پلٹ کر تاریخ کی طرف دیکھا تو ایک کے بعد دوسرا دشمن اسلام کی تباہی پر تیار نظر آیا۔ اس لمبی قطار میں ملحد، یہودی، عیسائی صلیبی جنگیں، منگول، کمیونسٹ، سرمایہ دار، نوآبادیاتی طاقتیں اور صیہونی سبھی موجود تھے۔ آج بھی وہ وسیع پیمانے پر اسلام کے خلاف سازش میں شامل ہیں۔ ایک پکے بنیاد پرست کی طرح قطب کو ہر جگہ ان میں اسلام کے خلاف ایک ناپاک اتحاد کا وجود محسوس ہوا۔ یہودی اور عیسائی سرمایہ داروں نے مل کر فلسطین سے عربوں کو نکالنے کی سازش کی۔ کمیونزم اور سرمایہ داری کے بانی بھی یہودی تھے۔ اسلام سے نجات حاصل کرنے کے لئے مغرب کے سرمایہ داروں اور یہودیوں نے اتاترک کی حمایت کی اور جب دوسرے مسلمان ملکوں نے ترکی کی تقلید نہ کی تو وہ ناصر کو اقتدار میں لے آئے۔ کئی ذہنی اور اعصابی بیماریوں کی طرح سازش کے اس خوف نے اصلی حقائق پر پردہ ڈال دیا تھا۔ جب انسان یہ سمجھتے ہیں کہ وہ صرف زندہ رہنے کے لئے بڑے بڑے دشمنوں سے لڑ رہے ہیں تو معقولیت اور عقل واستدلال سے ان کا رشتہ ٹوٹ جاتا ہے۔

قطب زندہ نہیں رہا۔ 1964 میں غالباً وزیر اعظم عراق کی درخواست پر اسے جیل سے رہا کر دیا گیا۔ جیل میں قید کے دوران اس کی بہنیں اس کی تحریریں جیل سے باہر لے جا کر خفیہ طور پر بانٹتی رہیں مگر رہائی کے بعد قطب کی تصنیف 'سنگ میل' شائع ہوئی۔ ایک سال بعد حکومت نے دہشت پسندوں کے ایک ایسے نیٹ ورک کا سراغ لگا لیا جو ناصر کے قتل کی سازش کر رہا تھا۔

1966 میں قطب سمیت ہزاروں اخوان گرفتار کر لئے گئے اور اسی سال ناصر کے اصرار پر قطب کو موت کی سزا دی گئی۔ قطب خود ایجی ٹیٹر بننے کی بجائے آخر وقت تک نظریہ ساز رہا۔ اس نے ہمیشہ کہا کہ اخوان صرف اپنے دفاع کی خاطر اسلحہ جمع کرتے ہیں تاکہ 1954 کے واقعات دہرائے نہ جائیں۔ شاید وہ سمجھتا تھا کہ جہاد شروع کرنے کا موقعہ ابھی نہیں آیا۔ اس سے پیشتر کہ پہلا جیش حکمت عملی اور روحانی لحاظ سے تیار ہو کر جہاد شروع کرے اسے تربیت کے تین مراحل سے گزرنا تھا۔ سارے اخوان قطب کے ہم خیال نہیں تھے ان میں سے اکثر صلح حدیبیہ اور اعتدال پسندانہ وژن سے وفادار رہے مگر جیلوں اور کیمپوں میں لوگ قطب کی تصنیفات پڑھ کر ان پر بحث کرتے تھے اور چھ روزہ جنگ کے بعد جو سازگار موسم میسر آیا تو اس میں انہوں نے کیڈر بنانا اور لوگوں کو منظم کرنا شروع کر دیا۔

ایران کے شیعی مسلمانوں نے سیکولرازم کے حملے کا ایک نیا دور دیکھا جب 1962 میں شاہ محمد رضا پہلوی نے اپنے سفید انقلاب کا اعلان کیا۔ جو ریاستی سرمایہ داری مزدور کے حصوں میں منافع کی بہتر شرح، نیم جاگیردارانہ شکل میں زمین کی ملکیت میں اصلاحات اور تعلیم وخواندگی کے اداروں پر مشتمل تھا۔ شاہ کے بعض پروجیکٹ کامیاب ہوئے، صنعتی زرعی اور سماجی پروجیکٹ متاثر کرنے والے تھے۔ 1960 کے عشرہ میں مجموعی قومی پیداوار میں شاندار اضافہ ہوا، ہرچند کہ شاہ ذاتی طور پر عورتوں کو مردوں سے کم تر سمجھتا تھا مگر اس نے ایسی اصلاحات نافذ کیں جن سے ان کی حیثیت اور تعلیمی حالت بہتر ہوئی۔ اگرچہ ان اصلاحات کا فائدہ صرف اونچے طبقوں کی خواتین کو ہوا۔ مغرب میں شاہ کی اصلاحات کا بڑی گرم جوشی سے خیر مقدم ہوا۔ مشرق وسطیٰ میں ایران ترقی اور بیداری کی علامت بن گیا۔ مصدق کے بعد شاہ نے امریکہ سے تعلقات بڑھائے، اسرائیل کی حمایت کی اس کے انعام میں غیر ملکی سرمایہ کاری ہوئی اور معیشت بحال رہی۔ مگر اس وقت بھی ہوش مند لوگ جانتے تھے کہ ان اصلاحات کی پہنچ دور تک نہیں وہ دولت مندوں کو فائدہ پہنچانے کے لئے کی گئی تھی۔ ان میں شہری آبادی کا خیال رکھا گیا مگر کسان نظر انداز کر دیئے گئے تھے۔ تیل اور قدرتی گیس سے حاصل ہونے والی دولت فوج اور نمائشی منصوبوں پر ضائع کی گئی اور اس سے خاطر خواہ فائدہ حاصل نہ کیا گیا۔ جس کے نتیجہ میں غریبوں اور دولتمندوں میں حائل خلیج اور زیادہ وسیع ہوگئی۔

زراعت میں زوال کی وجہ سے دیہی آبادی کے سیلاب نے شہروں کا رخ کیا۔1968اور 1978 کے درمیان شہری آبادی38فیصد سے 47فیصد ہوگئی۔ ان برسوں میں تہران کی آبادی تقریباً دگنی ہوگئی تھی۔ دیہی آبادکار، شہری آبادی کا باقاعدہ حصہ نہ بن سکے بلکہ شہروں کے آس پاس بدحالی اورخرابی میں زندگی بسر کرتے تھے۔ان کی روزی کے ذرائع بھی حالات اور اتفاقات کے محتاج تھے۔ کیونکہ وہ قلیوں، ٹیکسی ڈرائیوروں اور چھاپڑی والوں کی زندگی گزارتے تھے۔ تہران، نئے اور پرانے، دوحصوں میں بٹ گیا۔مغربی طرزِ زندگی کے دلدادہ اونچے اور متوسط طبقے شہر کے شمال میں واقع تجارتی علاقہ اور نئے رہائشی علاقوں میں پرانے شہر سے دور چلے گئے جہاں شراب خانے اور جہاں ناچ گھر تھے اور عورتیں یورپی لباس پہنتیں اور بے تکلفی کے ساتھ مردوں میں گھل مل جاتیں۔

چنانچہ ایران کی بڑی اکثریت انسانی جذبوں کے زبردست تلاطم کی نشانہ تھی۔ جانی پہچانی دنیا، انجانی ہوگئی تھی، وہ وہی تھی مگر پھر بھی وہ نہیں تھی، ایک دوست کی طرح جس کی شخصیت اور شباہت بیماری نے بگاڑ دی ہو۔ وہ دنیا جسے ہم جانتے ہیں جب اس سرعت سے بدلتی ہے جس طرح1960 کے عشرے میں ایران بدلا تو عورتیں اور مرد محسوس کرنے لگے کہ وہ اپنے ہی ملک میں اجنبی ہیں۔ایرانیوں کی ایک پریشان کن تعداد نے محسوس کیا کہ ان کا دل کہیں نہیں لگتا۔ عالمی طاقتوں کے ہاتھوں شکست اور ذلت کے احساس نے گویا کہ ان کا خون پی لیا تھا۔مغربی تعلیم پانے والے تھوڑے سے افراد اپنے خاندانوں اور والدین سے خفا تھے اس لئے کہ وہ دو دنیاؤں میں بٹ گئے تھے مگر انہیں کسی ایک دنیا میں بھی سکون نہیں ملتا تھا۔ زندگی اپنے معنی کھوچکی تھی۔ 1960 کے عشرے کے ادب میں بڑھتی ہوئی جدائی، گوشہ نشینی تنہائی اور منافقت کو بار بار علامتوں کے ذریعہ بیان کیا گیا ہے۔ہم عصر ایرانی نقاد فرزانہ ملانی نے60اور70 کے عشرے میں مستقل طور پر ادب میں ایسی امیجری پائی جو حفاظت، سلامتی، اسرار اور رازداری کی عکاسی نت نئے انداز میں کرتی ہے۔

دیواریں گھروں کو گھیرتی ہیں۔ برقعے عورتوں کو چھپالیتے ہیں۔تقیہ، مذہب کی حفاظت کرتا ہے۔تعارف کے ذریعے حقیقی خیالات وجذبات چھپالئے جاتے ہیں گھر، علیحدہ علیحدہ، اندرونی، بیرونی اور باطنی یعنی تین حصوں میں بٹ جاتے ہیں۔

ایرانی آپس میں ایک دوسرے سے منہ چھپارہے تھے، اپنے آپ سے بھی چھپے تھے پہلوی ریاست میں وہ اپنے آپ کومحفوظ نہیں سمجھتے تھے جولمحہ لمحہ ایک نہایت بھیانک اورخوفناک جگہ بن رہی تھی۔

شاہ نے مجلس (پارلیمنٹ) توڑ کر اپنا سفید انقلاب شروع کیا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ اپنی آمرانہ حکومت کے ذریعے مخالفوں کو کچل کر اور خاموش کر کے کامیاب ہو جائے گا اسے اپنی خفیہ پولیس 'ساوک' کی مدد حاصل تھی جسے 1957 میں امریکی سی آئی اے اور اسرائیلی موساد کی مدد سے بنایا گیا تھا۔ ساوک کے ظالمانہ حربوں سے، اس کے خوف، دہشت اور اذیت کی حکومت نے ایرانیوں میں یہ احساس پیدا کر دیا کہ وہ امریکہ اور اسرائیل کی سازش سے اپنے ہی وطن میں قیدی بنالئے گئے ہیں۔1960 کے عشرے اور 1970 کے عشرے میں دو نیم فوجی تنظیمیں قائم ہوئیں، جیسی گوریلا تنظیمیں کہ اس وقت ترقی پذیر ممالک میں ابھر رہی تھیں۔ فدائیاں خلق کے نام سے ایک ایسی ہی مارکسی تنظیم تودے پارٹی نے قائم کی نیشنل فرنٹ پارٹیز اور ایک اسلامی فوج مجاہدین خلق بھی انہیں دنوں میں بنیں۔ طاقت، ایک ایسی حکومت سے لڑنے کا ایک ہی ذریعہ تھی جس نے ہر جائز مخالفت کا راستہ روک دیا تھا اور جس کی بنیاد رضامندی کی بجائے جبر پر تھی۔

ایرانی دانش وروں نے حکومت کا مقابلہ اپنے آئیڈیاز سے کرنے کی کوشش کی وہ ملک کی المناک حالت سے دل گرفتہ تھے۔ تہران یونیورسٹی کے فلسفی احمد فرید (94-1912) نے 'غرب زدگی' ایک ترکیب ایجاد کی تاکہ ایران کی بے بسی اور کس مکش کی عکاسی ہو سکے، انہوں نے کہا ایرانی قوم میں مغرب کی آلودگی اور زہر سرائیت کر چکا ہے لازم ہے کہ وہ اپنی نئی شناخت دریافت کریں۔ یہ تھیم ایک سیکولرسٹ اور ایک زمانے میں سوشلسٹ جلال آل احمد (1969-1923) کے ہاتھوں پروان چڑھی اس نے اس کی خوب تشہیر کی یہاں تک اس کی تصنیف 'غرب زدگی' (1962) نے ایرانیوں میں ایک مسلک کی حیثیت حاصل کر لی "یہ غرب زدگی اور بے یقینی ایسی بیماری تھی جو باہر سے آئی تھی، اور جسے ایران میں پھیلنے کے لئے سازگار ماحول مل گیا تھا۔ یہ بدحالی ایک ایسی قوم کی تھی جس کا کوئی تاریخی تسلسل، روایت نہ اپنی حالت بدلنے کی خواہش تھی۔" یہ طاعون ایران کی سالمیت اس کی سیاسی آزادی اور اس کی معیشت تباہ کر سکتا تھا۔ مگر آل محمد احمد خود دو نیم تھا، وہ دوراہے پر کھڑا تھا، ایک طرف تو وہ سارتر ہائیڈ گر جیسے مغربی ادیبوں سے متاثر تھا، آزادی اور جمہوریت کے مغربی آئیڈیل اس کے لئے دل کش تھے مگر سمجھ میں نہیں آتا

تھا کہ مغرب کے یہ دلکش پودے اجنبی ایرانی زمین میں کیسے لگائے جائیں۔ اس نے مغرب کے تعلیم یافتہ ایرانیوں کے اس اذیت ناک تضاد کی بات بھی کی جو دو مخالف سمتوں میں جا رہے تھے۔ اور اگرچہ آل احمد اس مسئلہ کی ایک یادگار وضاحت بڑی فصاحت کے ساتھ کر سکتا تھا مگر اس کے پاس اس کا کوئی حل نہیں تھا۔ دکھائی دیتا ہے کہ زندگی کے آخری دنوں میں اس نے شیعی ازم کو ایسے ایرانی ادارے کے طور پر جان لیا تھا جو ایران کو حقیقی قومی شناخت کی بنیاد فراہم کر سکتا ہے اور جو مغرب کے دیئے ہوئے زخموں کا مداوا بھی ہے۔

ایرانی علماء مصری ملاؤں سے بالکل مختلف تھے اکثر جانتے تھے کہ اگر انہیں عوام کا ساتھ دینا ہے تو انہیں اپنے آپ کو اور اپنے اداروں کو جدید بنانا ہوگا۔ وہ شاہ کی آمرانہ حکومت سے بری طرح دل برداشتہ تھے جس نے بنیادی شیعی اصول توڑے تھے اور جو مذہب سے بالکل بیگانہ تھی۔ 1960 میں آیت اللہ بروجروی مرجع اعلیٰ بھی (جس نے علماء کو سیاست میں حصہ لینے سے منع کیا تھا) شاہ کے زرعی اصلاح کے بل کی مذمت کئے بغیر نہ رہ سکا۔ افسوس کی بات ہے کہ اس نے یہ مسئلہ اٹھایا کیونکہ اس سے علماء جن میں سے اکثر زمیندار تھے خود غرض اور رجعت پسند لگنے لگے۔ دراصل یہ چھوٹا سا کام کر کے بروجروی اس سے بڑے نتائج حاصل کرنا چاہتا تھا۔ زرعی اصلاح سے ملکیت کے شرعی قوانین کی خلاف ورزی ہوتی تھی، اس لئے بروجروی کو شاید یہ خوف ہو کہ اس طرح لوگوں کے وہ حقوق تلف ہوں گے جن کی ضمانت اسلامی قانون نے دی ہے۔ ایسا نہ ہو کہ ایک غلطی کئی غلطیوں کا سبب بن جائے۔ جب بروجروی اگلے سال مارچ میں فوت ہوا تو مرجع کا عہدہ خالی رہنے دیا گیا۔ علماء کے ایک حلقے نے رائے دی کہ شعیت کو اور زیادہ جمہوری ہونا چاہیے اور یہ تو حقیقت کے برعکس ہے کہ اس پیچیدہ دنیا میں ایک فرد سب سے بڑا اور اعلیٰ رہنما ہو۔ نئی قیادت کئی مرجعوں پر مشتمل ہو۔ ان میں سے ہر ایک کی اپنی ایک حیثیت اور خصوصیت ہونا لازمی ہے۔ واضح طور پر یہ جدید اور ترقی پسندانہ سوچ تھی۔ علماء کے اس گروپ میں کئی ایسے مذہبی رہنما بھی تھے جنھوں نے آنے والے انقلاب میں اہم کردار ادا کیا تھا۔ ان میں آیت اللہ سید محمد بہشتی، مرتضیٰ مطہری، علامہ محمد حسین طباطبائی، اور سیاسی انقلابی رہنما آیت اللہ محمد طالیقانی شامل تھے۔ 1960 کے موسم خزاں میں انہوں نے خطبات کا ایک سلسلہ شروع کیا اور اگلے سال مضامین میں ایک مجموعہ شائع ہوا جس میں شاہ کو نئے تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے کے طریقوں

پر بحث کی گئی تھی۔

انہیں یقین تھا کہ اسلام چونکہ مکمل طرزِ حیات ہے اس لئے علماء کو سیاست میں مداخلت پر ضرورت سے زیادہ زور نہیں دینا چاہیے۔ انہوں نے علماء کی حکومت کا خواب تو نہیں دیکھا تھا مگر جب علماء محسوس کریں کہ حکومت عوام کے مسائل سے بے تعلق ہے اور ظالمانہ حربوں پر اتر آئی ہے تو انہیں شاہ کے مقابلہ میں کھڑا ہو جانا چاہیے جیسا کہ انہوں نے تمبا کو کے بحران اور آئینی انقلاب کے موقعہ پر کیا تھا۔ انہوں نے مدرسوں کے نصاب بدلنے بھی ضروری سمجھے تا کہ فقہ کی تعلیم پر زیادہ زور نہ دیا جائے۔ انہوں نے کہا ملاؤں کو اپنے مالی وسائل کا جائزہ بھی لینا چاہیے اس وقت تک ان کی کفالت کا ذریعہ صرف چندہ تھا۔ چونکہ لوگ قدامت پرستی کی طرف مائل تھے اس لئے انہیں انصاف میں بنیادی تبدیلیاں کرنے میں تکلف تھا۔ اجتہاد کی اہمیت پر زور دیا گیا اور کہا گیا کہ شیعوں کو تجارت، جنگ اور ڈپلومیسی جیسی نئی حقیقتوں کا ادراک ہونا چاہیے اگر وہ واقعی عوام کی خدمت کرنا چاہتے ہیں۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ انہیں اپنے طلباء کی بات سننی چاہیے۔ 1960 کے عشرے کے نوجوانوں نے بہتر تعلیم پائی تھی اس لئے دقیانوسی پروپیگنڈہ انہیں متاثر نہیں کرتا تھا۔ وہ مذہب سے دور ہو رہے تھے کیونکہ شیعیت کا جو تصور انہیں دیا گیا وہ بوسیدہ اور بے جان تھا۔ ان کی اصلاحی تحریک میں مٹھی بھر علماء شامل تھے۔ اس لئے وہ عوام تک نہیں پہنچی نہ ہی حکومت پر تنقید کی کوشش کی گئی۔ اسے شیعوں کے داخلی مسائل سے دلچسپی تھی۔ اس لئے مذہبی حلقوں میں اس نے ملکی مسائل پر کھل کر بحث کی اور مزید ملاؤں کو انقلاب کے لئے پہلے سے ہی تیار کر لیا۔ مگر تمام علماء حیران رہ گئے جب ایک گمنام ملا اخبارات کا عنوان بن گیا۔

1960 کے عشرے کی ابتدا تک قم کے فیضیہ مدرسہ میں زیادہ سے زیادہ طلبا آیت اللہ خمینی کے اسلامی اخلاقیات کے کورس میں شامل ہوتے گئے۔ کلاس کے دوران وہ اپنا منبر چھوڑ کر اپنے طلباء کے ساتھ زمین پر بیٹھ جاتے اور کھلم کھلا حکومت پر تنقید کرنے لگتے۔ 1963 میں خمینی نے اچانک احتیاط کا دامن چھوڑ دیا اور اپنے منبر سے اپنی سرکاری حیثیت میں شاہ پر مسلسل زوردار حملے شروع کر دیئے۔ انہوں نے شاہ کو اسلام کے دشمن کی حیثیت میں پیش کیا۔ ایک ایسے وقت میں جبکہ حکومت کے خلاف بولنے کی جرأت کسی اور میں نہیں تھی۔ خمینی نے شاہ کے اس ظلم اور ناانصافی کے خلاف آواز بلند کی جس میں مجلس کی غیر آئینی برطرفی، اپنے مخالفین کو ظلم کے زور سے کچلنا اور

انہیں اذیتیں دینا، امریکہ کی غلامی اختیار کرنا اور اسرائیل کی حمایت کرنا جس نے فلسطینیوں کو ان کے گھروں سے نکال دیا تھا، شامل تھے۔ وہ غریبوں کی بدحالی سے خاص طور پر پریشان تھے اور کہتے تھے کہ شاہ اپنے شاندار محل سے نکلے اور تہران کے جنوب میں پھیلی جھونپڑیوں میں جا کر غریبوں کی حالت دیکھے۔ ایک موقعہ پر تو کہتے ہیں انہوں نے ایک ہاتھ میں قرآن لیا اور دوسرے ہاتھ میں 1906 کا آئین اور شاہ پر دونوں کی خلاف ورزی اور بے حرمتی کا الزام لگایا۔ ان کے خلاف کاروائی فوری اور ناگزیر سمجھی گئی۔ 22 مارچ 1963 کو چھٹے امام (جسے خلیفہ المنصور نے 765 میں زہر دیا تھا) کی شہادت کے دن ساوک کی فوج نے مدرسہ کو محاصرہ میں لے لیا اور اس پر حملہ کر دیا خمینی گرفتار ہوئے اور کئی طلبا مارے گئے اپنے حملہ کے لئے اس دن کا انتخاب شاہ کی نااہلی اور خودکشی تھی۔ خمینی کے خلاف طویل جدوجہد میں شاہ نے ہمیشہ ایسا غلط راستہ اختیار کیا جس کی وجہ سے وہ ایک ظالم حکمران اور ائمہ کا دشمن قرار پایا۔

خمینی نے ظلم کے خلاف آواز اٹھانے کے لئے یہ لمحہ کیوں چنا؟ تمام عمر وہ ملا صدرہ کی سکھائی ہوئی عرفان کی صوفیانہ ریاضتیں کرتے رہے۔ ملا صدرہ کی طرح خمینی بھی تصوف کو سیاست سے الگ نہیں سمجھتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ روحانی تبدیلی کے بغیر معاشرے کی سماجی اصلاح ممکن نہیں۔ موت سے پہلے اپنے آخری پیغام میں خمینی نے ایران کے لوگوں سے درخواست کی کہ وہ عرفان کی تعلیم حاصل کریں اور اس پر عمل جاری رکھیں کیونکہ علماء اس سے منہ موڑ رہے تھے۔ خمینی کی نظر میں مائتھوس سے وابستہ صوفیانہ جستجو کو لوگوں کی عملی سرگرمیوں کے دوش بدوش ہونا چاہیے۔ جو لوگ خمینی سے ملنے گئے انہوں نے انہیں ہمیشہ کسی روحانی کیفیت میں کھویا ہوا پایا۔ ان کی کم آمیزی اپنے باطن پر لگی ہوئی نگاہ ان کے لہجہ کا سکون اور ٹھہراؤ (جنہیں مغرب سے آنے والے حقارت سے دیکھتے تھے) شیعوں کی نظر میں ان کے سچے صوفی ہونے کی علامت تھی۔ بعض صوفی مست و بے خود کہلاتے تھے کیونکہ وہ اپنے آپ کو جذبات کی شدت کے حوالے کر دیتے تھے جو اس باطنی سفر کے دوران بعض دفعہ بے قابو ہو جاتے ہیں جبکہ ایک ہوشمند اور پرسکون صوفی جذباتی شدت اور وارفتگی سے بچنے کے لئے ضبط نفس سے کام لیتا ہے۔ ملا صدرہ نے قومی رہنما کے روحانی ارتقاء کو اس طرح بیان کیا ہے کہ اس سے پیشتر کہ وہ سیاسی کام شروع کرے سب سے پہلے اسے خدا کے حضور اپنا سر جھکانا ہے۔ خدا سے قربت کے سفر میں ظاہر ہونے والی تبدیلیوں کا ادارک کرنا

ہے اور اپنی انا کی بندشیں توڑ کر خود اپنا سراغ پانا ہے۔ اس طویل اور کٹھن سفر کے بعد ہی اسے دنیاوی معاملات کی طرف لوٹنا اور خدائی قانون نافذ کرنا ہے۔ امریکی سکالر حامد الگر کا کہنا ہے کہ جب خمینی نے شاہ کے خلاف آواز بلند کی تو وہ یہ سفر طے کر چکے تھے اور سیاست میں اپنا کردار ادا کرنے کے لئے تیار تھے۔

جیل میں چند روز گزارنے کے بعد خمینی کو رہا کر دیا گیا مگر خمینی نے جوابی حملہ کرنے میں دیر نہیں کی۔ فیضیہ مدرسہ پر ساوک کے حملہ کے چالیس روز بعد طلباء نے اس حملہ میں جان دینے والوں کا ماتم کیا ان کے چہلم کے اس موقعہ پر خمینی نے تقریر کی۔ اس حملہ کا موازنہ 1935 میں مشہد کے واقعہ سے کیا جس میں رضا شاہ کے ہاتھوں مقدس مزار کی توہین پر احتجاج کرتے ہوئے سینکڑوں افراد مارے گئے تھے۔ خمینی نے شاہ کے خلاف اپنا حملہ جاری رکھا یہاں تک کے 3 جون 1963 میں عاشورہ کے موقعہ پر خمینی نے شاہ کو کربلا کے ولن یزید کا ثانی قرار دیا۔ انہوں نے کہا کہ گذشتہ مارچ میں مدرسہ فیضیہ پر حملہ کیا گیا تو پولیس کو قرآن کے صفحات پھاڑنے کی کیا ضرورت تھی؟ اگر انہیں کوئی عالم گرفتار کرنا تھا تو 18 برس کے ایک طالب علم کو کیوں جان سے مار دیا حالانکہ اس نے تو حکومت کے خلاف کوئی گناہ نہیں کیا تھا۔ جواب تھا کہ شاہ مذہب کو مٹا دینا چاہتا ہے۔ انہوں نے شاہ سے سنبھل جانے کی درخواست کی۔

''ہمارا ملک، ہمارا اسلام خطرہ میں ہے، جو ہو رہا ہے اور جو ہونے والا ہے ہمیں اس کی فکر ہے۔ ملک کی بدحالی سے ہم پریشان ہیں خدا سے ہماری دعا ہے کہ اس کی حالت بہتر ہے۔''

دوسری صبح خمینی کو پھر گرفتار کرلیا گیا مگر اس دفعہ حالات قابو سے باہر ہوگئے جب یہ خبر پھیلی تو شیراز، مشہد، تہران اور کاشان سے ہزاروں ایرانی احتجاج کرتے ہوئے سڑکوں پر آ گئے۔ ساوک کی فوجوں کو حکم دے دیا گیا کہ وہ مظاہرین کو گولیوں سے اڑا دیں۔ لوگوں کو جمعہ کی نماز سے روکنے کے لئے تہران میں ٹینکوں نے مسجد کا محاصرہ کرلیا۔ قم، تہران اور شیراز میں ممتاز علماء نے مظاہرین کی قیادت کی جبکہ دوسروں نے حکومت کے خلاف جہاد کا اعلان کیا کچھ لوگوں نے سفید کفن پہن لئے یہ عہد کرتے ہوئے کہ وہ بھی امام حسینؑ کی طرح ظلم کے خلاف جنگ میں اپنی جان دینے کو تیار ہیں۔ عام لوگ گلیوں محلوں میں لڑے جبکہ یونیورسٹی اور مدرسوں کے طلباء نے شانہ بشانہ اس جنگ میں حصہ لیا۔ بغاوت کچلنے میں ساوک کو کئی دن لگ گئے جس سے ظاہر ہوا کہ

پرسکون سطح کی تہہ میں کتنے ہی طوفان پوشیدہ تھے۔ جب 11 جوان کو صورتحال سنبھلی تو اندازہ ہوا کہ ہزاروں ایرانی اس لڑائی میں مارے گئے ہیں۔

خود خمینی کی جان بڑی مشکل سے بچی، آیت اللہ محمد کاظم شریعت مداری (85-1904) نے ایک ممتاز مجتہد کی حیثیت سے خمینی کو بڑے آیت اللہ کے عہدہ پر ترقی دے کر ان کی جان بچالی کیونکہ اس طرح ان کی جان لینے میں حکومت کو بہت بڑے خطرہ کا سامنا تھا۔ اپنی رہائی کے بعد خمینی قوم کے ہیرو بن گئے۔ عزیمت کی علامت کے طور پر ان کی تصویر ہر جگہ نظر آتی تھی۔ انہوں نے صحیح راستہ اختیار کیا تھا اور اس نفرت کو بھی زبان دی تھی جو شاہ کے خلاف ایرانیوں کے دلوں میں سلگ رہی تھی مگر وہ بول نہیں سکتے تھے۔ بنیاد پرستوں کی طرح خمینی کی عادت تھی کہ ہر تقریر میں ایرانیوں کے خلاف یہودیوں، عیسائیوں اور سامراجیوں کی سازشوں کا ذکر کرتے۔ یہ ایک ایسا خیال تھا جسے کئی ایرانی حقیقت سمجھتے تھے جس کی بنیاد سی آئی اے اور موساد کے ساتھ ساوک کا گٹھ جوڑ تھا۔ خمینی نے ایرانیوں کو ایسی زبان دی جوان کے لئے قابل فہم تھی اور جس کے ذریعہ وہ اپنے دکھوں کی بات کر سکتے تھے۔ اگر کسی مارکسٹ یا شاہ کے آزاد خیال مخالف کی بات عام ایرانیوں کی سمجھ میں نہ آتی اور وہ انہیں متحرک کرنے میں ناکام رہتے تو کربلا کی زندہ علامت تو ہر ایرانی کے شعور کا حصہ تھی اس کی روح ان کے دل ودماغ میں بس ہوئی تھی۔ دوسرے علماء کی طرح خمینی دوراز کار عالمانہ زبان میں بات نہیں کرتے تھے ان کے مخاطب ایرانی عوام تھے اور ان کے تقریر براہ راست اور زمینی سچائیوں کی آئینہ دار ہوتی تھی۔ مغرب کے لوگ خمینی کا رشتہ زمانہ وسطیٰ سے جوڑتے تھے مگر ان کے پیغام اور ان کی آئیڈیالوجی کا بڑا حصہ ماڈرن تھا۔ مغربی سامراج سے ان کی دشمنی اور فلسطینیوں کی حمایت تیسری دنیا کی دوسری تحریکوں جیسی تھی اور ایسا ہی اپنے عوام کے ساتھ ان کا براہ راست تعلق تھا۔

خمینی نے یہیں بس نہیں کی بلکہ امریکی فوجیوں اور دوسرے مشیروں کو سفارتی مراعات دینے اور اسلحہ کے لئے شاہ کی طرف سے امریکہ کو 200 ملین ڈالر کی ادائیگی کے خلاف سخت احتجاج کیا اور ایران کو امریکی کالونی کہا۔ انہوں نے سوال کیا کہ کیا کوئی اور قوم بھی ایسی ذلت برداشت کر سکتی ہے؟ ایک امریکی ملازمہ بدترین جرم کر کے بھی سزا سے بچ سکتی تھی جبکہ ایک ایرانی سے نادانستہ طور پر بھی کسی امریکی کتے کو نقصان پہنچے تو اسے عدالت کے کٹہرے میں آنا پڑتا تھا۔

برسوں غیر ملکی ایران کی دولت لوٹ رہے ہیں تاکہ ایرانیوں کو قلاش کردیں اور ایرانی ہیں کہ مفلسی اور بھوک کی اذیتیں سہہ رہے ہیں مگر خاموش ہیں۔

''ایرانیوں کے دکھوں کا کوئی مداوانہیں۔ میں سوچتا ہوں کہ اگلے موسم سرما میں غریبوں کا کیا حال ہوگا۔ان میں سے اکثر خدانہ کرے بھوک اور سردی کے مارے مرجائیں گےلوگوں کوغریبوں کا خیال کرنا چاہیےایسی تدبیر ہو کہ انہیں پچھلے موسم سرما جیسے عذاب نہ برداشت کرنے پڑیں۔''

اس تقریر کے بعد خمینی کو جلا وطن کردیا گیا تو انہوں نے نجف میں سکونت اختیار کرلی۔ حکومت نے اب ملاؤں کی زبان بندی کا فیصلہ کرلیا اس نے اوقاف کی جائدادوں پر قبضہ کرلیا اور مدرسوں کو سرکاری تحویل میں لے لیا جس کے نتیجہ میں1960 کے عشرے کے آخر تک مذہب کے طالب علموں کی تعداد میں نمایاں کمی ہوگئی۔1970 میں آیت اللہ رضا سعیدی کواذیتیں دے کر ماردیا گیا کیونکہ اس نے ایران میں امریکی سرمایہ کاری بڑھانے کے سلسلہ میں ایک کانفرنس کی مخالفت کی تھی اور حکومت کو سامراج کا ظالم ایجنٹ کہا تھا۔قم میں ہزاروں مظاہرین سڑکوں پر آگئے اور تہران میں آیت اللہ سعیدی کی مسجد کے باہر آیت اللہ طالقانی کی تقریر سننے کے لئے بہت بڑا ہجوم جمع ہوگیا۔ اسی وقت حکومت کو ایک سرکاری اسلام ایجاد کرنے کا خیال آیا۔حکومت کی فرمانبردار ایک مذہبی فوج بنائی گئی جس میں دیہی علاقوں میں پروپیگنڈہ کے لئے سیکولر یونیورسٹیوں سے دینیات کے گریجوئٹ شامل کئے گئے تاکہ مذہبی پروپیگنڈہ کے نئے شعبہ کے ساتھ مل کر کام کریں۔

جدیدیت کے یہ نئے ملا کسانوں کو سفید انقلاب سمجھائیں گے۔خواندگی میں اضافہ کریں گے۔ پل اور ڈیم بنائیں گے اور مویشیوں کا علاج کریں گے۔ یہ حقیقی علماء کی اہمیت کو کم کرنے کی کوشش تھی شاہ شیعیت اور ایران میں تعلق ختم کرنے کے لئے بے تاب تھا۔1970 میں اس نے اسلامی کیلنڈر منسوخ کردیا۔ اگلے سال دارالحکومت میں قدیم ایرانی بادشاہت کا2500 سال مناتے ہوئے زبردست تقریبات ہوئیں۔نہ صرف یہ کہ اس واہیات مظاہرہ سے ایران کے اندر غریب اور امیر کے درمیان حائل خلیج اور وسیع ہوگئی بلکہ عوامی سطح پر حکومت کی نیت ظاہر ہوگئی کہ وہ اپنی شناخت کی بنیاد اب اسلام سے پہلے کے ورثہ کو بنانا چاہتی ہے۔

اگر ایرانیوں نے اسلام کھودیا تو وہ اپنے آپ کو کھو بیٹھیں گے، یہ پیغام نوجوان کرشماتی فلسفی

ڈاکٹر علی شریعتی(77-1933) کا تھا۔ جس کے لیکچر سننے کے لئے1960 کے عشروں کے دوران مغربی تعلیم یافتہ ایرانی جوق در جوق آتے تھے شریعتی نے کسی مدرسہ میں تعلیم نہیں پائی تھی بلکہ سوربون اور مشہد یونیورسٹی سے تعلیم حاصل کی تھی جہاں اس نے فارسی فلسفہ پر اپنی رپورٹ لکھی۔ اس نے موسینوں، ژان پال سارتر اور فرانز فینن کا مطالعہ کیا تھا۔ اسے یقین تھا کہ ایسی شیعہ آئیڈیالوجی تخلیق ہوسکتی ہے جو ایرانیوں کو ان کی جڑوں سے الگ کئے بغیر ان کی روحانی ضرورتیں پوری کرے۔ ایران آنے کے بعد اس نے تہران کے شمال میں واقع مدرسہ حسینہ میں پڑھانا شروع کیا حسینہ ایک سماجی کارکن محمد ہمایوں نے1965 میں قائم کیا تھا۔ ہمایوں نے علماء کی تقریروں سے متاثر ہوکر یہ ادارہ نوجوانوں کی تعلیم کے لئے بنایا تھا۔ ایران میں ایک حسینیہ امام حسین کی تعلیمات اور یادوں کا مرکز ہوا کرتا تھا (جو عام طور پر مسجد کے پہلو میں تھا) جو اس اُمید پر بنایا جاتا تھا کہ کربلا کا واقعہ نوجوانوں کو کلاسوں میں متاثر کرے گا اور وہ ایک بہتر معاشرہ کے لئے کوششیں کریں گے۔1967 کی جنگ کے بعد مشرق وسطیٰ میں مذہب کی طرف نئے رجحان کی طرح ایران میں بھی لوگ مذہب کی جانب مائل ہورہے تھے۔1968 تک آیت اللہ مظہری یہ لکھ سکتا تھا کہ حسینیہ کا شکریہ ہمارے تعلیم یافتہ نوجوان مذہب کے خلاف نفرت اور بیزاری کے دور سے گزر کر اب اسے اتنی توجہ دے رہے ہیں جو بیان سے باہر ہے۔ کسی لیکچرار نے شریعتی کی طرح طلباء کو متاثر نہیں کیا۔ دوپہر کے کھانے کے دوران یا کام کے بعد طلباء اسے سننے کے لئے ٹوٹ پڑتے۔ اس کے جذبے اور زوردار لہجہ سے متاثر ہوتے۔ شریعتی انہی جیسا لباس پہنتا تھا ان کے کلچری تذبذب اور بے یقینی میں برابر کا شریک تھا بعض طلباء تو اسے اپنا بڑا بھائی سمجھتے تھے۔

شریعتی ایک تخلیقی دانش ور تھا مگر اسے مذہب سے بھی لگاؤ تھا۔ پیغمبرؐ اور امامؑ اس کی زندگی کا محور تھے اور انہیں کے لئے اس کی زندگی وقف تھی۔ وہ صحیح معنوں میں صوفی تھا شیعی تاریخ کے واقعات محض ساتویں صدی کے تاریخی واقعات نہیں تھے بلکہ تاریخ اور وقت کی قید سے آزاد حقیقتیں تھیں جو ہر زمانے میں انسان کی رہنما اور دوست تھیں۔ اس کا کہنا تھا کہ مخفی امام مسیح کی طرح غائب نہیں ہوا وہ اب بھی دنیا میں موجود ہے مگر مخفی ہے۔ شیعہ اسے اس تاجر یا اس بھکاری میں دیکھ سکتے ہیں وہ اپنے ظہور کا منتظر ہے شیعہ زندگی بھر اس کے قدموں کی آہٹ سننے کے لئے تیار ہیں اور ظلم کے خلاف جہاد کے لئے اس کی آواز پر لبیک کہیں۔ شیعہ روزمرہ کے ان حالات

وواقعات پر نظر رکھیں جنہوں نے انہیں گھیر رکھا ہے تا کہ اپنے باطن کی ایک جھلک دیکھ سکیں اس لئے کہ روحانیت کوئی الگ دنیا نہیں اس لئے مذہب کو سیاست سے جدا کرنا ممکن نہیں جیسا کہ حکومت کوشش کر رہی ہے۔ انسان دوزخی مخلوق ہیں ان کا وجود روحانی ہے اور مادی بھی ہے انہیں مائیتھوس کی طرح لوگوس کی بھی ضرورت ہے ہر طرز حکومت کی ایک ماورائی سمت ہونی چاہیے یہی امامت کی اعلیٰ روح ہے اور علامت کے طور پر یہ ایک یاددہانی ہے کہ امام کے بغیر معاشرہ قائم نہیں رہ سکتا کیونکہ امام روحانی اور دنیاوی دونوں معاملات میں رہنمائی کرتا ہے۔ مذہب اور سیاست میں جدائی اسلام کے بنیادی اصول توحید کی خلاف ورزی ہے جس کی مدد سے مسلمان ایک ہوکر خدا کی وحدت پر گواہی دیتے ہیں۔

توحید مغرب کے دلدادہ ایرانیوں کی تنہائی کا مداوا بھی ہے۔ شریعتی عرفان ذات پر زور دیتا تھا جبکہ یونانیوں کی خصوصیت فلسفہ اور رومنوں کی پہچان عسکریت تھی۔ ایران کا اولین اور بنیادی کردار مذہب اور اسلام سے عبارت تھا اگر مغرب اپنے ریشنلزم اپنے تجربہ اور مشاہدہ کے ذریعے حال کو سمجھنا چاہتا ہے 'جو ہے' اسے جاننے کی خواہش کرتا ہے تو مشرق 'جو نہیں ہے جسے ہونا ہے' اس کی جستجو میں سرگرداں ہے۔ اگر ایرانی مغربی آئیڈیل کے زیادہ قریب ہوں تو اپنی شناخت کھو بیٹھیں گے۔ شاہ کی طرح پرانے کلچر پر اترانے کی بجائے اپنے آپ کو اپنے شیعی ورثہ کا اہل ثابت کرنا چاہیے مگر یہ ایک سطحی اور بے جان عمل نہ ہو بلکہ ضروری ہے کہ مسلمانوں کے مذہبی شعائر کی سطح، ریشنلزم کی سطح سے بھی زیادہ گہری ہو۔ حج پر اپنی شاندار رپورٹ میں شریعتی نے کعبہ اور حج کی نئی توجیہہ کی جو قدامت کی مکمل تجسیم ہے تا کہ جدیدیت کی اس تیزی سے بدلتی ہوئی دنیا میں مسلمانوں کو ان کا شعور حاصل ہو۔

شریعتی کی تصنیف کے مطابق حج خدا کی سمت سفر کا ذریعہ ہے جو ملا صدرا کے باطنی سفر سے مختلف نہیں۔ تصوف ہر آدمی کے بس کی بات نہیں اس کے لئے خاص ذہن اور مزاج کی ضرورت ہے مگر حج ہر مسلمان عورت اور مرد کی پہنچ میں ہے۔ زندگی میں ایک بار حج کرنا اکثر مسلمانوں کی نظر میں ان کی زندگی کا رخ بدلنا ہے اسے ایک نئی جہت دینا ہے۔ زائرین کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنی الجھنیں اور تنہائیاں پیچھے چھوڑ آئیں۔ کعبہ کے گرد سات طواف کرتے ہوئے بے اندازہ ہجوم میں کچلے جانے اور دبنے سے زائر اپنے آپ کو چھوٹی سی ندی سمجھنے لگتا ہے جسے دریا میں

جا کر شامل ہونا ہے۔

''ہجوم کا دباؤ تمہیں اس طرح بھینچتا ہے کہ تمہیں نئی شکل، نئی زندگی ملتی ہے۔ اب تم لوگوں میں شمار ہوتے ہو اب تم ایک زندہ انسان ہو، خدا کے گرد طواف بہت جلدی تم خود ہی بھول جاؤ گے۔''

امت کے ساتھ یکجان ہونے سے خود پسندی دم توڑ دیتی ہے اور ایک نیا مقام حاصل ہوتا ہے۔ عرفات کے میدان میں شب بیداری کے دوران زائرین اپنے سینے روحانی علم کے لئے کھول دیتے ہیں اب انہیں واپس دنیا میں قدم رکھنا ہے اور خدا کے دشمنوں سے لڑنا ہے۔ (جہاد جس کی نمائندہ منیٰ کے تین ستونوں پر سنگ باری ہے) تب حاجی اس روحانی شعور کے ساتھ دنیا کی طرف واپس آتا ہے جو انصاف پسند معاشرہ کی تخلیق کے لئے ناگزیر ہے اور جس کی تخلیق ہر مسلمان پر لازم ہے۔ اس میں ریشنل کوشش اور اسے معنی دینے کا انحصار اس روحانیت پر ہے جو متھ اور مسلک سے بنتی ہے۔

شریعتی کی نظر میں اسلام عمل کا تقاضہ کرتا ہے۔ وقت سے ماوراوہ حقیقتیں جو شیعہ زندگی کا حاصل ہیں انہیں آج کے میدان میں اترنا ہے کربلا کے میدان میں امام حسین کی مثال دنیا کے تمام مظلوم اور راندۂ خلق لوگوں کو متاثر کرتی ہے کہ وہ ہمت نہ ہاریں۔ شریعتی ان 'چپ' علماء سے برگشتہ تھا جنہوں نے اپنے آپ کو مدرسوں کی عافیت میں قید کر لیا تھا اور اسلام کو محض ایک ذاتی معاملہ بنا کر اسے مسخ کر دیا تھا۔ ''مخفی ہونے کا دور، جمود اور بے حسی کا دور نہیں اگر شیعہ حسین کے راستہ پر چلتے ہوئے ظلم کے خلاف تیسری دنیا کے مظلوموں کی مدد اور حمایت کریں تو مخفی امام ظاہر ہونے پر مجبور ہو جائے گا۔'' مگر علماء نے نوجوانوں کے مذہبی جذبات مجروح کر کے انہیں مغرب کی آغوش میں دھکیل دیا تھا وہ اسلام کو خالص لفظی معنوں اور سیدھے سپاٹ لفظوں میں تلاش کرتے تھے جبکہ شیعہ ازم کا جینیئس اور اس کی عظمت اس کی علامت پرستی ہے۔ اسی سے مسلمانوں نے ہر راضی حقیقت میں اس کی نشانیاں تلاش کرنی سیکھیں جو نظر نہیں آتا۔ شیعوں کی اصلاح ضروری ہے علی اور حسین کا شیعی ازم 'صفوی شیعی ازم' کے ہاتھوں مٹ چکا ہے ایک زندہ اور متحرک مذہب ذاتی معاملہ بنا کر بے اثر کر دیا گیا ہے جبکہ مخفی امام کے غائب ہونے کے معنی یہ ہیں کہ پیغمبرؐ اور ائمہ کا کام لوگوں کو سونپ دیا گیا ہے چنانچہ اخفاء کا دور جمہوریت کا عہد ہے۔ عام لوگ مجتہدوں کی غلامی سے آزاد ہو جائیں اور ان کی تقلید نہ کریں کیونکہ ان کی تقلید صفوی شیعیت کا

تقاضا ہے ہر مسلمان صرف خدا کے سامنے جھکے اور اپنی زندگی کا آپ ہی ذمہ دار ہو۔ اس کے علاوہ جو ہے وہ بت پرستی ہے اسلام کو بگاڑنا ہے اور اسے چند بے روح رسموں اور بے جان شعائر کا مجموعہ بنانا ہے۔ لوگ اپنے رہنماؤں کا انتخاب خود کریں شوریٰ کے اصول کے مطابق باہمی مشورہ سے فیصلے ہوں ملائیت کا دور ختم ہونا چاہیے علماء کی بجائے دانشور، روشن فکر امت کے نئے رہنما ہوں۔''

شریعتی نے صفوی شریعت کی اصولی ڈاکٹرین کے ساتھ انصاف نہیں کیا تھا وہ ایک خالص ضرورت کی پیداوار تھے اگر چہ وہ ہمیشہ متنازعہ رہے مگر وہ جدید دور سے پہلے کے ان اصولوں کی بات کرتے تھے جن کے تحت فرد کے لئے ضرورت سے زیادہ آزادی کی اجازت نہیں مگر دنیا بدل چکی تھی مغرب سے متاثر ایرانی جن کے سامنے خود مختاری اور فکری آزادی کے مغربی آئیڈیل تھے اپنے بزرگوں کی طرح مجتہدوں کے احکام کے سامنے سر نہیں جھکا سکتے تھے۔ قدامت پرستی نے لوگوں کو معاشرے کی حدوں کی سمجھ اور حالات بدلنے کی بجائے انہیں برداشت کرنا سکھایا تھا۔ حسین کی متھ، اس کی مثال سماجی انصاف کا جذبہ زندہ رکھا مگر اسی کی مثال اور ائمہ کی کہانی سے صاف ظاہر تھا کہ سماجی انصاف کے عظیم تصور پر عمل کرنا ایک ایسی دنیا میں کتنا ناممکن ہے جو کسی بڑی تبدیلی کی روادار نہیں مگر جدید دور پر اس کا اطلاق نہیں ہو سکتا تھا۔ ایرانی دنیا کو بڑی تیزی کے ساتھ بدلتے ہوئے دیکھ رہے تھے اس لئے وہ اپنی پرانی رسوم اور علامتوں پر پہلے کی طرح عمل نہیں کر سکتے تھے۔ شریعتی شیعہ مسلک کی نئی تشکیل میں مصروف تھا تا کہ وہ گہری اور بڑی تبدیلیوں کی اس دنیا میں مسلمانوں کی مدد کر سکے۔

شریعتی کی رائے میں اسلام زیادہ متحرک اور انقلابی مذہب ہے اس کی ٹرمینالوجی (اصطلاحات) ہی ترقی پسندانہ شدت کی مظہر ہے مغرب نے لفظ پالیٹکس (Politics) یونانی 'Polis' 'شہر' سے لیا ہے یعنی ایک جامد انتظامی یونٹ۔ مگر اسلام میں اسے 'سیاست' کا نام دیا جاتا ہے جس کے معنی ہیں 'منہ زور گھوڑا قابو کرنا' یعنی زوردار عمل کے ذریعہ طبعی کمال سامنے لانا۔ عربی تراکیب امہ اور امام کا ماخذ ''ام'' ہے یعنی 'چلنے کا فیصلہ' چنانچہ امام ایسا ماڈل ہے جو نئی سمتوں میں لے جاتا ہے۔ اجتہاد (آزادی فکر) نئی تجدید اور نئی تعمیر کے لئے مسلسل فکری کاوش ہے جو چند علماء کا استحقاق نہیں بلکہ ہر مسلمان کا فرض ہے۔ 'امہ' سے مراد محض افراد کا ہجوم نہیں بلکہ بامقصد اور

دائمی انقلاب پر آمادہ لوگ ہیں۔ مسلمانوں کے لئے ہجرت کا مفہوم تبدیلی اور جڑوں سے اکھڑنے کے لئے تیار رہنا ہے تاکہ زندگی کے نئے رجحانات سے شناسائی ہو۔ انتظار (مخفی امام کی واپسی کا انتظار) بھی آنے والی تبدیلی کا مسلسل انتظار اور ''سٹیٹسکو'' (کہ حالات جیسے ہیں ویسے ہی رہیں) کا انکار ہے۔ یہ انسان کو راستے کے انتخاب کا ذمہ دار قرار دیتا ہے سچائی کا راستہ بنی نوع انسان کا راستہ، کٹھن اور دشوار ہے۔ حضرت علی کا شیعہ ازم مسلمانوں کو مجبور کرتا ہے کہ وہ ظالم کے سامنے کھڑے ہوں اس کی طاقت کو ماننے سے انکار کریں۔ حکومت اس قسم کی باتوں کی اجازت نہیں دے سکتی تھی۔ شریعتی گرفتار کر لیا گیا اسے اذیتیں دی گئیں اور جیل بھیج دیا گیا۔ ایران سے چلے جانے کی اجازت سے پہلے اس نے وطن میں ہی باطنی جلاوطنی کا ایک دور دیکھا۔ اس کے والد نے بتایا کہ انہی دنوں اس نے شریعتی کو رات کے وقت روتے سنا جیسے وہ اپنی موت سے پہلے پیمبرؐ اور حضرت علیؓ کو رخصت کر رہا تھا۔ 1977 میں شریعتی کی موت ساوک کے ایجنٹوں کے ہاتھوں لندن میں ہوئی۔ شریعتی نے تعلیم یافتہ اور مغرب زدہ نوجوانوں کو اسلامی انقلاب کے لئے تیار کیا 1970 کے عشرہ میں وہ دانش وروں میں ایک مرکزی شخصیت تھا جیسے 1960 کے عشرہ میں آل احمد کو یہ مقام حاصل تھا۔ 1978 کے انقلاب سے پہلے جلوسوں میں خمینی کی تصویر کے ساتھ اس کی تصویر بھی لائی جاتی تھی۔

تاہم ایرانیوں کی اکثریت رہنمائی کے لئے خمینی کی طرف دیکھتی تھی۔ عراق میں اپنی جلاوطنی کے دوران انہیں شاہ کی مخالفت کے اظہار کی آزادی قم کی نسبت زیادہ تھی۔ ان کی کتابیں اور ٹیپ کی ہوئی تقریریں ایران میں سمگل ہو کر آتی تھیں ان کے فتووں بالخصوص جس فتوے میں کہا گیا تھا کہ حکومت کو اسلام سے کوئی نسبت نہیں کیلنڈر کی تبدیلی کے بعد اسے بڑی اہمیت دی گئی 1971 میں خمینی کی ایک بڑی اہم کتاب ''اسلامی حکومت'' شائع ہوئی جس میں علماء کی حکومت کا شیعی تصور پیش کیا گیا ہے۔ اس کا تھیس خیال افروز اور انقلابی تھا۔ صدیوں سے شیعہ امام کی عدم موجودگی میں ہر حکومت کو برا کہتے آئے تھے اور علماء کا اقتدار میں آنا کبھی مناسب نہیں سمجھا تھا مگر اسلامی حکومت میں خمینی نے یہ دلیل دی کہ خدا کی حاکمیت کے تحفظ کے لئے علماء حکومت پر قبضہ کر لیں۔ اگر ایک فقیہہ یا اسلامی فقہ کا ماہر انتظامی اور سیاسی اداروں کا نظام سنبھال لے تو وہ یقین دلا سکتا ہے کہ شریعت صحیح معنوں میں نافذ ہوگی اگرچہ فقیہہ، پیغمبرؐ اور ائمہ کی سطح اور درجہ پر نہیں

ہیں مگر شرعی قانون سے ان کی واقفیت کے معنی ہیں کہ انہیں بھی پیغمبرؐ اور ائمہ جیسا اختیار حاصل ہوگا کیونکہ قانون بنانے والا تو خدا ہے نہ کہ پارلیمنٹ جہاں قانون سازی انسانوں کے پاس ہے ایک اسمبلی ایسی ہونی چاہیے جو روزمرہ زندگی کے ہر شعبہ میں شریعت نافذ کرے۔

خمینی جانتے تھے کہ ان کی دلیل متنازعہ ہے اور شیعوں کے بنیادی عقیدہ کے لئے ایک چیلنج ہے مگر قطب کی طرح انہیں یقین تھا کہ موجودہ ہنگامی حالات میں اس تبدیلی کا جواز موجود ہے۔ شریعتی کی طرح انہیں اُمید نہیں تھی کہ مذہب ایک عرصہ تک ذاتی معاملہ بنا رہے گا۔ انہوں نے کہا ''پیغمبر اسلام حضرت علیؓ اور امام حسین روحانی رہنما ہونے کے علاوہ سیاسی رہنما بھی تھے اور اپنے دور کی بت پرستی اور ظلم کے خلاف انہوں نے زبردست جدوجہد کی تھی۔ ''مذہب ذاتی یقین نہیں بلکہ ایک روّیہ کا نام ہے جو انسان کو باعمل ہونے پر مجبور کرتا ہے۔''

''اسلام ان سرفروش افراد کا مذہب ہے جن کا کومٹمنٹ انصاف اور ایمان ہے یہ ان کا مذہب ہے جنہیں خودمختاری اور آزادی کی تلاش ہے یہ ان کا سکول ہے جو سامراج کے خلاف لڑتے ہیں۔''

شریعتی کی طرح خمینی بھی یہ ثابت کرنے کی کوشش میں تھے کہ اسلام ازمنہ وسطیٰ کا مذہب نہیں وہ ہمیشہ ان اقدار کا علمبردار رہا ہے جن کے متعلق مغرب کا خیال ہے کہ اس نے ایجاد کی ہیں۔ مگر اسلام سامراج کے ہاتھوں کمزور ہوا ہے لوگ مغربی طرز پر مذہب کو سیاست سے الگ کرنا چاہتے ہیں جس سے اسلام کو نقصان پہنچا ہے۔ ''اسلام لوگوں میں اجنبی کی طرح رہتا ہے اگر اسلام اپنی اصلی صورت میں پیش کیا جائے تو لوگ اسے دیکھ کر حیران ہو جائیں'' ایرانی باشندے روحانی بیماری میں مبتلا ہیں ہم اپنی شناخت بالکل بھلا چکے ہیں اور مغربی شناخت اپنا لی ہے۔ ایرانی نہیں جانتے کہ انہوں نے اپنے آپ کو بیچ دیا ہے اجنبی تصورات کے غلام بن گئے ہیں۔ اس تنہائی کا علاج اسلامی قوانین پر مبنی معاشرہ ہے۔ اسلامی قوانین نہ صرف مغرب سے درآمد قوانین سے زیادہ ایرانیوں کی فطرت سے ہم آہنگ ہیں بلکہ ان کا مقدس ورثہ ہیں۔ اگر ایرانی خدائی نظام کے تحت زندہ رہیں گے اور ملکی قانون سے مجبور ہو کر خدا کی رضا کے مطابق زندگی بسر کریں گے تو وہ خود اور ان کی زندگی کے معنی بدل جائیں گے اسلامی ڈسپلن، عبادات اور شعائر ان کے اندر اسلامی روح پیدا کر دیں گے جو انسانیت کا خواب ہے۔ خمینی کی نظر میں مذہب کسی مسلک کا رسمی

اقرار نہیں بلکہ ایک رویہ، ایک طرز زندگی ہے جو آزادی اور یگانگت کے لئے انقلابی جدوجہد سے عبارت ہے۔

ایسا مذہب انقلابی تھا کیونکہ اس کے ذریعے مغربی فکر کی اجارہ داری کے خلاف بغاوت ہوئی تھی۔ امکان تھا کہ مغربی فکر سے تعلق رکھنے والا کوئی شخص خمینی کی ولایتِ فقیہہ (علماء کی حکومت) کی تھیوری کی جابرانہ اور شرانگیز سمجھے مگر ایرانیوں کو جس ماڈرن حکومت کا تجربہ ہوا تھا اس نے انہیں وہ آزادی ہرگز نہیں دلائی تھی جو یورپ اور امریکہ میں معمول کی بات سمجھی جاتی ہے۔ خمینی اپنی مثال کے ذریعے پہلوی بادشاہت کا متبادل شیعہ آئیڈیل پیش کر رہے تھے وہ ایک صوفی کی حیثیت سے جانے جاتے تھے ضروری تھا کہ اپنی ذات میں وجدانی علم وہ اس طرح سمیٹیں کہ ائمہ کے علم کے مطابق نہ سہی مگر اس سے مشابہ لگیں۔ امام حسین کی طرح انہوں نے بھی بددیانت اور ظالم حکمران کو للکارا تھا ائمہ کی طرح انہیں بھی ایک ظالم حکمران نے قید کیا تھا اور ان کی جان موت سے بمشکل بچی تھی۔ بعض ائمہ کی طرح انہیں بھی جلاوطن کیا گیا تھا اور ان سے وہ سب کچھ چھین لیا گیا جو ان کی جائز ملکیت میں تھا۔ اب نجف میں حضرت علی کے مزار کے پہلو میں رہتے ہوئے خمینی مخفی امام کی طرح لگنے لگے تھے اس طرح کہ وہاں کے لوگ انہیں مل نہیں سکتے تھے پھر بھی وہ دور بیٹھے ان کی رہنمائی کر رہے تھے اور ایک دن انہیں واپس آنا تھا۔ کہتے ہیں۔ کہ خمینی نے خواب میں دیکھا کہ جلاوطنی کے باوجود ان کی موت قم میں آئی ہے مغرب کے لوگوں کے لئے یہ سمجھنا مشکل ہو گیا تھا کہ خمینی جن میں ایک سیاسی لیڈر کی طرح کوئی کشش، کوئی کرشمہ نہیں وہ ایرانی عوام میں اتنا جوش وولولہ، اتنا ایثار پیدا کرنے میں کیونکر کامیاب ہوئے۔ اگر وہ شیعہ مسلک کے متعلق زیادہ جانتے تو ان کی حیرت یقیناً کم ہو جاتی۔

جب خمینی نے اسلامی حکومت لکھی تو شاید انہیں یہ خیال نہیں تھا کہ انقلاب آنے والا ہے ان کا خیال تھا کہ ایران میں ولایت فقیہہ کے آنے میں دوسو برس لگ جائیں گے۔ خمینی ان دنوں اپنی تھیوری کی عملی صورت کی بجائے اپنے مذہبی آئیڈیل میں زیادہ دلچسپی لے رہے تھے۔ 1972 میں 'اسلامی حکومت' کی اشاعت کے ایک سال بعد خمینی نے 'جہاد اکبر' کے عنوان سے ایک مقالہ لکھا جس نے متنازعہ 'ولایت فقیہہ' کے لئے تصوف سے جواز مہیا کیا۔ مقالے کے عنوان کا تعلق ایک حدیث سے تھا جس کے مطابق پیغمبر اسلامؐ نے جنگ سے گھر واپس آتے

ہوئے فرمایا تھا کہ ''ہم جہادِاصغر سے جہاد اکبر کی طرف لوٹ رہے ہیں۔''اس سے خمینی کے اس خیال کو تصدیق ہوگئی کہ سیاسی لڑائیوں کی اہمیت معاشرہ میں روحانی تبدیلیاں لانے سے کم ہے شریعتی کی طرح انہیں بھی یقین تھا کہ ایران میں روحانیت کی تجدید کے بغیر سیاسی مسائل حل نہیں ہوسکتے۔

اپنے 1972 کے مقالے میں خمینی نے کہا تھا کہ فقیہہ صوفیا کی طرح ملاصدرہ کی بتائی ہوئی صوفیانہ جستجو میں لگ جاتے ہیں وہ ائمہ کی طرح معصومیت کا مقام حاصل کر لیتے ہیں۔اس کے معنی بہرحال یہ نہیں کہ فقیہہ ،امام کا ہمسر بن جاتا ہے بلکہ جس طرح صوفی خدا کے رستے پر چلتے ہوئے اپنی انا سے رہائی حاصل کر لیتا ہے فقیہہ کو بھی جہالت کے حجاب دور کرنا ہوں گے۔ دنیاداری اور خواہشات کی غلامی ترک کرنی ہے۔اس طرح وہ گناہ کی ترغیب سے رہائی پائے گا۔خدا پر انسان کا یقین ہوا سے اپنے دل کی آنکھوں سے صاف اس طرح دیکھے جیسے وہ سورج دیکھتا ہے تو اس سے گناہ کا سرزد ہونا ممکن نہیں۔ائمہ کا علم ان کے لئے خدا کا خصوصی عطیہ تھا مگر اپنے عام روحانی عمل کے ذریعہ انہوں نے اسے حاصل بھی کیا تھا چنانچہ فقیہہ جو اسلامی قانون کا ماہر ہو اور تصوف کے ذریعے جس نے نئی زندگی پائی ہو اس کے لئے یہ ناممکن نہیں کہ وہ خدا کے رستہ پر لوگوں کی رہنمائی کرے۔ یہ بات ایک بار پھر یاد دلانی ضروری ہے کہ 1972 میں کوئی نہیں جانتا تھا بلکہ خمینی بھی نہیں جانتے تھے کہ اسلامی انقلاب کے ذریعہ شاہ کو برطرف کرنا ممکن ہوگا۔خمینی اب ستر برس کے تھے انہوں نے سوچا ہوگا کہ حکمران فقیہہ بننے کا تو کوئی امکان نہیں۔اسلامی حکومت اور جہاد اکبر دونوں میں خمینی یہ جاننے کی کوشش کر رہے تھے کہ مائتھالوجی اور شیعوں کے تصوف میں کیونکر مطابقت لائی جائے کہ صدیوں پرانی روایت ختم ہو اور ایک عالم کی حکومت ایران میں قائم ہو سکے ابھی انہیں دیکھنا تھا کہ اس مائیتھوس نے عملی طور پر کیا کردار ادا کیا۔

اسرائیل میں یہودی بنیاد پرستی کی ایک نئی شکل نے متھ کو پہلے ہی ایک سیاسی حقیقت میں بدل دیا تھا۔اس کی جڑیں مذہبی صیہونیت میں تھیں جو یہودی ریاست سے پہلے فلسطین میں سیکولر صیہونیت کے سائے میں بڑھی تھیں۔ یہ مذہبی صیہونی نئے آرتھوڈوکس تھے شروع سے ہی انہوں نے سوشلسٹ کیمون کے ساتھ ساتھ اپنی بستی بنانی شروع کر دی تھی۔ ہیریڈم کے برعکس اس چھوٹے سے مذہبی یہودیوں کے گروپ کو صیہونیت اور آرتھوڈوکسی میں غیر مطابقت نظر نہیں آتی

تھی۔ وہ انجیل کی توجیہہ لفظی معنوں میں کرتے تھے یہ کہ خدا نے تورات میں وعدہ کیا ہے کہ زمین ابراہیم کے وارثوں کو دی جائے گی۔ چنانچہ فلسطین پر یہودیوں کو قانونی حق حاصل ہو گیا۔ اس کے علاوہ Eretz (ارض) اسرائیل میں دیاڈسپورا (جلاوطنی) کے مقابلے میں یہودی زیادہ باقاعدگی کے ساتھ قانون کی تعمیل کر سکیں گے۔ گیٹو میں صاف ظاہر ہے کہ زراعت، حکومت وسیاست سے متعلق قوانین اور زمین کے متعلق کئی احکامات کی تعمیل نہیں ہو سکتی تھی۔ جس کے نتیجہ میں دیاڈسپورا کی یہودیت ٹوٹ کر بکھر گئی۔ اب اپنے وطن میں یہودی بالآخر تورات پر پھر پورا عمل کر سکیں گے۔ جیسا کہ صیہونی آرتھوڈوکسی کے پائنیر پنچپس روزن بلتھ نے وضاحت کی ''ہم مکمل تورات کو اس کے تصورات اور احکام کے ساتھ قبول کرتے ہیں۔ پرانی آرتھوڈوکسی نے تورات کے چھوٹے حصوں پر گھر میں سینی گاگ میں یا زندگی کے بعض پہلوؤں کے بارے میں عمل کیا ہم تورات پر ہمیشہ اور ہر جگہ عمل چاہتے ہیں اور فرد کی نجی زندگی اور عوامی زندگی میں اس کے قوانین کی بالادستی چاہتے ہیں۔''

اس نے کہا'' جدیدیت کے ساتھ تضاد تو کیا ہمارا قانون جدیدیت کو مکمل کرے گا۔ دنیا دیکھے گی کہ یہودی ایک ایسا سماجی نظام تخلیق کر سکتے ہیں جو واقعی ترقی پسندانہ ہو کیونکہ اس کی منصوبہ بندی خدا نے کی ہے۔ تکمیل کی ایک خواہش تھی جو ہمیشہ مذہبی صیہونیت کی خصوصیت بنی رہے۔ جلاوطنی کی صعوبتوں کے بعد یہ زخموں کے اندمال کا ایک طریقہ تھا مگر سیکولر صیہونیوں کے ریشنلزم کے خلاف یہ ایک بغاوت بھی تھی جنھوں نے ان مذہبی آبادکاروں کو اہمیت نہیں دی تھی اور جنھوں نے ان کی ارض اسرائیل میں تورات والی ریاست کے قیام کی آرزو کو انتشار انگیز اور قابلِ نفرت سمجھا تھا۔ مذہبی صیہونیوں کو اپنے باغی ہونے کا مکمل شعور تھا۔ جب انہوں نے 1929 میں اپنی یوتھ موومنٹ Akiva Bnei (اکیوا کے بیٹے) بنائی تو انہوں نے دوسری صدی کے عظیم صوفی اور سکالر ربی اکیوا کو اپنا آئیڈیل بنایا جس نے روم کے خلاف یہودی ریاست کی حمایت کی تھی۔ سیکولر صیہونی بھی باغی تھے مگر ان کی بغاوت مذہبی یہودیت کے خلاف تھی اب بنی اکیوا نے سوچا کہ انہیں بغاوت کے خلاف بغاوت کرنی ہے۔ ان سیکولر نوجوانوں کے خیالات کے خلاف بغاوت جو یہودیت اور یہودی روایت کے دشمن ہیں۔ وہ خدا کے لئے جنگ کر رہے تھے۔ کلچری اور سیاسی زندگی میں سے خدا کو خارج کرنے کی بجائے ان کی خواہش تھی کہ مذہب ان کی سیکولر

ریاست کی زندگی کے ہر کونے پر ہر وقت چھایا رہے۔ انہوں نے سیکولر ریاست کی طرف سے صیہونیت پر مکمل قبضہ کرنے کی ہر کوشش ناکام بنادی وہ چھوٹی سی اقلیت تھے مگر سیکولرازم کے ریشنل نظریہ کے خلاف ایک چھوٹا سا انقلاب لانے میں کامیاب رہے۔

انہیں اپنے سکولوں اور اداروں کی ضرورت تھی۔1940 کے عشرے میں موشے زوی نیریا نے مذہبی صیہونی لڑکوں اور لڑکیوں کے لئے اشرافیہ بورڈ سکول قائم کرنے کا سلسلہ شروع کیا۔ ان یشیوا ہائی سکولوں میں تعلیمی معیار اونچا تھا طلباء تورات کے ساتھ سیکولر مضامین بھی پڑھتے تھے۔ ہیزیڈم کے برعکس یہ نئے آرتھوڈوکس مذہبی صیہونی یہ نہیں سمجھتے تھے کہ انہیں جدید دنیا کی بڑی معاشرتی لہروں سے کٹ کر رہنا ہے۔ انہیں یقین تھا کہ یہودیت کی وسعت ہر غیر یہودی سائنس کو سمیٹ سکتی ہے۔ انہوں نے تورات کی تعلیم پر بھی پوری توجہ دی بلکہ ہیریدی یشیوا کے گریجوئٹ تورات اور تلمود کی تعلیم دینے کے لئے ملازم رکھے یشیوا ہائی سکولوں میں اب بھی مائتھوس اور لوگوس کی تعلیم جاری تھی۔ تورات کے ذریعے خدا کے ساتھ ایک صوفیانہ تعلق قائم ہوتا تھا، زندگی کو معنی مل جاتے تھے اگرچہ اس کی افادی حیثیت کوئی نہیں تھی۔ جیسا کہ ربی یہوشوا یوگل نے بیان کیا کہ ''طلباء روزی کمانے کے لئے تورات نہیں پڑھتے نہ اس سے سیاسی معاشی اور فوجی فائدے حاصل کرتے ہیں'' بلکہ تورات کی تعلیم صرف تورات کے لئے ہونی چاہیے۔ سیکولر مضامین کے لوگوس کی طرح اس کی کوئی عملی افادیت تو نہیں مگر یہ انسان کی زندگی کا مقصد ہے بہرحال اسرائیلی ریاست کے بعد نوجوان مذہبی صیہونیوں کے لئے تورات کا پڑھنا کافی نہیں تھا۔1950 کے عشرے میں پرانے طلباء کے لئے یشیوا مدرسے بنائے گئے جو اسرائیلی حکومت کے ساتھ خصوصی انتظام کے تحت مذہبی نوجوانوں کو موقعہ دیتے کہ وہ اپنی قومی خدمت تورات کی تعلیم سے ہم آہنگ کریں۔ چنانچہ مذہبی صیہونیوں نے اپنے لئے زندگی کا ایک الگ راستہ بنالیا مگر اسرائیلی ریاست کے ابتدائی برسوں میں بعض نوجوان شناخت کے بحران سے دوچار ہوئے۔ وہ دو دنیاؤں میں بٹے ہوئے تھے سیکولر لوگوں کی نظر میں وہ اتنے صیہونی نہیں تھے کہ ان کے کام پہلے سیکولر آبادکاروں کی کامیابیوں کا مقابلہ کرسکیں جنہوں نے اسرائیلی ریاست بنائی۔ اسی طرح وہ ہیزیڈیم کی رائے میں اتنے آرتھوڈوکس نہیں تھے کہ تورات میں ہیزیڈم کی مہارت کا سامنا کرسکیں۔1950 کے عشرے کے آغاز میں اس بحران سے نوجوانوں کی ایک اور بغاوت نے جنم

لیا۔ چودہ برس کے لڑکوں پر مشتمل ایک چھوٹے سے حلقے نے (جوایک یشیوا میں پڑھتے تھے) ہیزیڈم کی طرح بڑی پابند اور سخت مذہبی زندگی بسر کرنی شروع کردی۔ وہ سادہ لباس، غیر مخلوط تعلیم ،فضول تفریحات اور یاوہ گوئی سے گریز پرزور دینے لگے اور بدعنوان لوگوں کے اعتراف اور جرم وسزا پر مبنی سسٹم میں ایک دوسرے کی زندگیوں کا محاسبہ کرنے لگے۔ وہ 'دہکتے انگارے' کہلاتے تھے۔ ایک مذہبی بستی کی تعمیران کا خواب تھا جس کے وسط میں ایک یشیوا مدرسہ ہو جہاں عورتیں اور مرد دن رات ہیزیڈم کی طرح تورات پڑھتے رہیں۔ عورتوں کا درجہ الٹرا آرتھوڈوکس کی طرز پر کم ہر مگر لوگوس کی مدد سے انہیں کھیتی باڑی کے قابل سمجھا جائے۔ مذہبی صیہونی حلقوں میں انہیں اشرافیہ کی حیثیت حاصل ہوگئی مگر ان کا خیال تھا کہ ہیزیڈم اور مس نگڈم (Misnagdim) کی طرح ان کی آرتھوڈوکسی بھی ادھوری رہ جائے گی اگر انہیں دعا دینے اور رہنمائی کے لئے کوئی ربی نہ ملا۔ 1950 کے عشرے کے آخر میں وہ ربی زوی یہودہ کک ربی ابراہیم کک کے بیٹے کے ہاتھ لگ گئے جس کی تصنیف پر چھٹے باب میں بات ہوئی تھی۔

جب تک 'دہکتے انگارے' زوی یہودہ کا پتہ چلائیں وہ ستر برس کا ہو چکا تھا اور عام طور پر اسے باپ کی نسبت بہت کم اہمیت دی جاتی تھی وہ شمالی یروشلم میں مرکز ہاراف یشیوا کا پرنسپل تھا جسے اس کے والد نے قائم کیا مگر جہاں اب گھٹتے گھٹتے چند طالب علم رہ گئے تھے۔ چھوٹے کک کے خیالات نے انہیں فوراً متاثر کیا کیونکہ وہ ابراہیم کک سے بھی بہت آگے گیا مگر اس نے بڑے کک کے پیچیدہ جدلیاتی وژن کو اتنا آسان بنادیا کہ وہ ماڈرن آئیڈیالوجی کی ایک باقاعدہ شکل میں بدل گیا جہاں بڑے کک نے سیکولر صیہونیت میں ایک خدائی مقدس تلاش کیا تھا۔ ربی یہودہ کا ایمان تھا کہ اسرائیل کی سیکولر ریاست خدا کی بادشاہت ہے اور اس کا ہر ذرہ پاک ہے۔

ہر یہودی جو اسرائیل میں آتا ہے ہر درخت جو یہاں لگایا گیا ہے ہر سپاہی جو اسرائیلی فوج میں شامل ہوتا ہے، نجات کے راستے میں ایک اور قدم ہے۔

جہاں ہیزیڈم نے طلباء کو آزادی کے دن پریڈ دیکھنے سے منع کیا تھا چھوٹے کک نے اصرار کیا کہ فوج مقدس ہے اس لئے اس کی پریڈ دیکھنا مذہبی فرضہ ہے۔ سپاہی بھی تورات کے علماء کی طرح راستی پر ہیں ان کے ہتھیار عبادت کے لباس کی طرح پاک ہیں۔ صیہونیت آسمانی معاملہ ہے اسرائیلی ریاست، ہماری پاک اور سربلند ریاست خدائی وجود ہے۔

بڑا ﮐﮏ نہیں چاہتا تھا کہ یہودی سیاست میں حصہ لیں مگر چھوٹا ﮐﮏ سمجھتا تھا کہ مسیحائی عہد شروع ہو چکا ہے اور سیاست میں حصہ لینا کبالسٹ کے صوفیانہ سفر کی طرح ہے اور پاکیزگی کی بلندیوں پر پہنچ جاتا ہے۔ تقدس کا تصور اس کی فکر کا لازمی جز و تھا زمین، لوگ اور تورات تینوں ناقابل تقسیم تکون ہیں ایک سے انحراف تینوں سے انحراف ہے۔ جب تک یہودی، اسرائیل کی ساری زمین پر آباد نہ ہو جائیں (جیسا کہ انجیل میں آیا ہے) کوئی نجات نہیں، ساری زمین جس میں عربوں کی زمین بھی شامل ہے اسے بھی اسرائیل نے قبضہ میں لانا اس وقت سب سے بڑا مذہبی فرض ہے۔ مگر جب1950 کے عشرے کے آخر میں Gahale 'دہکتے انگارے' ﮐﮏ سے ملے تو یہ مقصد حاصل ہونے کی بہت کم امید تھی1948 کی اسرائیلی سرحدوں میں صرف گلیلی، اور ساحلی میدان شامل تھے۔ اردن کے مغربی کنارے کی انجیلی زمین اردن کی، ہاشمی سلطنت میں تھی مگر ﮐﮏ پر اعتماد تھا ''ہر بات پہلے سے طے شدہ پروگرام کے مطابق ہو رہی ہے۔ ہٹلر کے مظالم نے بھی نجات قریب تر کر دی ہے کیونکہ اس سے مجبور ہو کر یہودیوں نے دیاڈسپورا میں رہنا ترک کیا اور اپنی زمین میں آ کر آباد ہوئے یہودی اجنبی زمینوں کی کثافتوں میں اس شدت سے الجھے ہیں کہ آخری وقت آئے تو انہیں بڑی خونریزی کے ذریعے وہاں سے نکالنا ہوگا۔'' ﮐﮏ نے ایک ہولوکاسٹ ڈے کی تقریب کے دوران1973 میں اپنی تقریر میں کہا ''ان تاریخی واقعات کے پیچھے خدائی ہاتھ ہے جس نے تورات اور ہر تقدیس کو نیا جنم دیا ہے تاریخ نے خدا کا سامنا، کائنات کے مالک کا سامنا کرنے کا موقع دیا ہے۔''

متھ کو حقیقت میں بدلنے کا مرحلہ بالآخر طے ہوا۔ جدید دنیا سے پہلے مائتھالوجی اور سیاست الگ الگ تھے ملک کی تعمیر جنگی مہمات، زراعت اور معیشت لوگوس کے ریشنل ڈسپلن کے ذیل میں آتے تھے۔ متھ نے یہ سرگرمیاں مناسب حد میں رکھیں اور انہیں معنیٰ دیئے۔ متھ ان کی اصلاح بھی کر سکتی تھی اور دوستی و ہمدردی جیسی قدروں کی یاد عورتوں اور مردوں کے دلوں میں تازہ کر سکتی تھی جو عقل و خرد کے افادیت پسند پہلوؤں سے ماوراء ہیں۔ ایک ارضی حقیقت سماوی علامت بن سکتی ہے۔ وہ خود کبھی پاک نہیں رہی اس لئے اپنے سے ماوراء کی سمت اشارہ کرتی ہے جہاں عقل کا گزر نہیں۔ مگر ﮐﮏ نے ان امتیازات کی پروا نہیں کی اور جو تخلیق کیا اسے بعض لوگ شاید بت پرستی کہیں۔ کیا کوئی فوج مقدس ہو سکتی ہے۔ جبکہ وہ اکثر وحشیانہ حرکات پر مجبور ہوتی ہے۔

اکثر وہ مجرم کے ساتھ معصوم کی گردن بھی اڑا دیتی ہے۔ تاریخی لحاظ سے مسیحائیت نے لوگوں کو کو دسٹیٹس کو(Status Quo) کے خلاف ابھارا مگر کک نے اس سے اسرائیلی پالیسیوں کی حمایت کا کام لیا۔ اس نے کہا ایسی ذہنیت سے انسانی قدروں کی خلاف ورزی اور انتشار کا عمل شروع ہوتا ہے۔ کک نے اسرائیل کو مقدس اور اس کی علاقائی سرحدوں کو سب سے افضل قرار تو دیا مگر اس طرح اس نے بیسویں صدی میں قوم پرستی کے نام پر بعض بدترین مظالم کی بنیاد رکھ دی۔ بڑے کک کا وہ رواداران تصور فراموش کر دیا گیا جو دوسرے مذاہب اور سیکولر دنیا تک پہنچ چکا تھا۔ جونیئر کک عیسائیوں اور عربوں کی نفرت میں جل رہا تھا جو اسرائیلی عزائم کی راہ میں حائل تھے۔ سینئیر کک کے نظریہ میں یہ خوبی تھی کہ اس کی روشنی میں متھ اور عقل میں یگانگت تھی اگر چہ دونوں جدا تھے، یہ خطرناک بات تھی کہ جونیئر کک دونوں کو ایک ہی لاٹھی سے ہانکے۔

تاہم Gahalet کا یہ نظریہ نہیں تھا۔ ربی کک کے نظریہ نے صیہونیت کو ایک مذہب بنا دیا تھا۔ انہیں بس اسی کی تلاش تھی۔ وہ مرکز ہاراف کے کل وقتی طالب علم بن گئے۔ اور یہ گمنام یشیوا اسرائیل کے نقشہ پر لے آئے۔ انہوں نے کک کو ایک طرح سے یہودی یورپ بنا دیا جس کے احکام غلطیوں سے پاک اور قابل تعمیل تھے۔ مندرجہ ذیل نوجوان کک کا کیڈر (مستقل کارکن) اور نئی بنیاد پرست صیہونیت کے لیڈر بن گئے۔ Moshe Levinger, Yaakov Ariel, Shlomo Aviner, Han Drukman, Dovilor,Zolman Melamad, Arraham Shapita and Eliezer Weldman.

1960 کے عشرے میں انہوں نے سیکولر ریاست کو اپنی مذہبی قوت کا یقین دلانے اور لوگوں کو ایک بار پھر خدا کے رستہ پر لانے کا منصوبہ بنایا۔ سینئر کک کے مذہب اور سیکولرازم کے جدلیاتی ملاپ کی بجائے جونیر کک کو توقع تھی کہ مذہب فوری طور پر سیکولرازم کی جگہ لے گا۔

اپنی ساری گرم جوشی کے باوجود Gahalet منصوبہ بندی کے سوا کچھ نہ کر سکے مگر 1967 تاریخ کا ایک نیا موڑ سامنے آیا۔ 1967 میں یوم آزادی کے موقعہ پر چھ روزہ جنگ سے تین ہفتے پہلے مرکز ہاراف میں ربی کک حسب معمول اپنا وعظ دے رہا تھا۔ اچانک اس نے ایک دلدوز چیخ ماری اور کچھ ایسے الفاظ بولے جن سے اس کی تقریر کی روانی رک گئی۔ ہمارا ہیبر ون کہاں ہے؟ اور Shechem, Jericho اور Anatolt-1948 میں ہماری ریاست سے کاٹ

لئے گئے جبکہ ہم زخمی اور معذور تھے۔ تین ہفتوں کے بعد اسرائیلی فوج نے ان انجیلی شہروں پر قبضہ کرلیا۔ جو پہلے عربوں کے علاقے تھے اور ربی کک کے پیروؤں کو یقین ہوگیا کہ اس نے یہ پیش گوئی خدا کے اشارے پر کی تھی۔ اس مختصر جنگ کے خاتمہ پر اسرائیل نے مصر کا غزہ، اردن کا مغربی کنارہ اور شام کی جولان کی پہاڑیاں فتح کرلیں مقدس شہر یروشلم، جو1948 سے اسرائیل اور اردن میں بٹا ہوا تھا اب اسرائیل نے لے لیا اور اسے مستقبل طور پر اپنا دارالحکومت بنالیا۔ ایک بار پھر یہودی مغربی دیوار پر عبادت کرسکتے تھے۔ سارے ملک پر نشاط ومسرت کی کیفیت طاری ہوگئی۔ جنگ سے پہلے اسرائیلی اپنے ریڈیو پر ناصر کی قسمیں سنتے تھے کہ وہ انہیں سمندر میں پھینک دے گا مگر اب وہ اپنی توقع کے خلاف ان مقامات پر قابض تھے جو یہودی تاریخ کی نظر میں مقدس تھیں سیکولرازم کے کئی کٹر حامیوں نے اس جنگ کو مذہبی جنگ قرار دیا جو انہیں حضرت موسیٰ کے بحیرہ احمر عبور کرنے کی یاد دلاتی ہے۔

مگر کک کے پیروؤں کے لئے جنگ اور بھی اہم تھی وہ اس بات کا فیصلہ کن ثبوت تھی کہ نجات کا مرحلہ آنے ہی والا ہے اور خدا تاریخ کو آگے بڑھا رہا ہے تا کہ وہ اپنے آخری انجام کو پہنچے۔ مسیحا کے نہ آنے سے مشتعل نوجوانوں کو کوئی فکر لاحق نہیں ہوئی ان کے خیالات نئے تھے اور وہ مسیحا کو ایک فرد کی بجائے ایک عمل میں دیکھنے کے لئے تیار تھے۔ نہ وہ اس سے پریشان تھے کہ جنگ کے معجزے کی بالکل فطری توجیہہ موجود ہے۔ اسرائیلی فتح کی وجہ اسرائیلی دفاعی فوج کی شاندار صلاحیت اور عرب نوجوان کی نااہلیت تھی۔ بارھویں صدی کے فلسفی Maimonides نے پیش گوئی کی تھی کی نجات کے ساتھ مافوق فطرت کا کوئی تعلق نہیں ہوگا۔ جن حصوں میں کائناتی اسرار اور عالمی امن کا ذکر تھا ان کا تعلق اس دنیا سے نہیں بلکہ آنے والی دنیا سے ہے۔ اس فتح نے کک کے ساتھیوں کو آمادہ کرلیا کہ اب جمع ہونے اور صفیں درست کرنے کا وقت ہے۔

فتح کے چند ماہ بعد ربیوں اور طلباء نے مرکز میں ایک کانفرنس منعقد کی جس، میں لیبر حکومت کے اس منصوبہ کو ناکام بنانے کی تدابیر سوچی گئیں جس کے ذریعے عرب ہمسایوں کے ساتھ پرامن تعلقات کی خاطر بعض نئے مقبوضہ عرب علاقے خالی کردینے ضروری سمجھے گئے۔ کک کے ساتھی تو ایک انچ مفتوحہ زمین بھی واپس کرنے کو بدی کی فتح سمجھتے تھے اور وہ یہ دیکھ کر حیران ہوئے کہ سیکولرسٹ بھی ان کے اتحادی بن گئے ہیں جنگ کے تھوڑے عرصہ بعد ہی ممتاز اسرائیلی

شاعروں، پروفیسروں، ریٹائرڈ سیاستدان اورفوجی افسروں نے دی لینڈ آف اسرائیل موومنٹ بنالی تاکہ حکومت کوکسی قسم کی بھی علاقائی رعایت دینے اورمقبوضہ علاقوں کے انخلاء سے روکا جاسکے۔آنے والے دنوں میں اس تحریک نے کک گروپ کی آئیڈیالوجی کی اسی تشکیل میں مدد کی جوپبلک کومتاثر کرنے کےعلاوہ ان کی اخلاقی اورمعاشی مدد کرسکے۔

اپریل1968 میں موشے لیونگر، ایک چھوٹے سے کک گروپ اور ان کے خاندانوں کو یہودی تہوار'پاس ادور' منانے ہیبرون لے گیا۔ہیبرون وہی شہر ہے جس کے متعلق خیال کیا جاتا ہے کہ وہاں ابراہیم، اسحٰق اور یعقوب دفن ہیں چونکہ مسلمان بھی ان یہودی بزرگوں کوپیغمبر مانتے ہیں اس لئے ہیبرون ان کے لئے بھی مقدس شہر ہے۔خدا کے دوست ابراہیم کے ساتھ اس کی مقدس وابستگی کی وجہ سے صدیوں سے فلسطینی اس شہرکو''الخلیل'' کہتے تھے مگر ہیبرون سے بعض تلخ یادیں بھی وابستہ ہیں۔24 اگست1929 کوفلسطین کے اندرصیہونیوں اورعربوں میں تنازعہ کے دوران59 یہودی ہیبرون میں مارے گئے۔لیونگراوراس کے ساتھی پارک ہوٹل میں سویٹزرلینڈ کے سیاحوں کے بہانے ٹھہرے مگر جب'پاس اوور' ختم ہوگیا تو وہاں وہ دھرنا مارکر بیٹھ گئے اور ہوٹل خالی کرنے سے انکارکردیا۔اس سے اسرائیلی حکومت پریشان ہوئی کیونکہ یہ جنیوا کنوینشن کی خلاف ورزی تھی۔اقوام متحدہ اسرائیل سے مفتوحہ علاقے خالی کردینے کا مطالبہ کررہی تھی مگر کک گروپ کے افراد نے لیبرحلقوں کوان کے آبادکاروں کی یاددلائی چنانچہ حکومت ان کے اخراج میں تذبذب کی شکار ہوگئی۔

کک گروپ نے فوراً بزرگوں کے غار پر قبضہ کرلیا جسے اسرائیل کی فوجی حکومت نے چھ روزہ جنگ کے بعداس لئے کھولا تھا کہ یہودی،عربوں کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کے بغیر وہاں عبادت کرسکیں۔مگر یہودی آبادکاراسے کافی نہیں سمجھتے تھے اس لئے انہوں نے اورزیادہ وقت اورجگہ کا مطالبہ کردیا۔ ہرجمعہ کے روز وہ وہاں سے بروقت چلے جانے سے انکارکردیتے حالانکہ مسلمانوں کو وقت کی پابندی کے ساتھ ہرجمعہ کی نماز اداکرنا ہوتی تھی۔کبھی وہ ہال خالی کردیتے مگر اس مقدس یادگار میں داخلہ کا راستہ بندکردیتے تاکہ مسلمان عبادت کے لئے اندر نہ آسکیں۔کبھی شراب کی محفل جما کرشراب پینی شروع کردیتے یہ جانتے ہوئے کہ مسلمان ان کی اس حرکت سے مشتعل ہوں گے، یوم آزادی1968 کے موقعہ پراس مقدس غار پر اسرائیلی پرچم لہرادیا گیا

حالانکہ حکومت نے اس سے منع کر رکھا تھا۔ تعلقات بد سے بدتر ہوتے گئے۔ ایک روز کسی فلسطینی نے یہودیوں پر ایک دستی بم پھینک دیا۔ اسرائیلی حکومت نے آبادکاروں کے لئے ہیبرون کے باہر الگ ایک بستی بنا دی جس کی حفاظت کے لئے فوج مقرر کی گئی۔ لیونگر نے اس بستی کا نام 'کریات اربع' رکھا (جو انجیل میں ہیبرون کا نام ہے) اور اب یہ انتہا پسند، پرتشدد اور اشتعال انگیز صیہونی بنیاد پرستوں کا اڈہ بن گیا۔ 1972 تک کریات اربع ایک چھوٹا قصبہ تھا جس کی آبادی پانچ ہزار آبادکاروں پر مشتمل تھی کک کے ماننے والوں کے لئے یہ قصبہ مقدس جنگ میں فتح کا نمائندہ تھا جو جنگ کہ اسرائیلی سرحدیں دھکیل کر دشمنوں کے علاقہ میں لے گئی اور خدا کے لئے مقدس زمین کا اہم علاقہ آزاد کرالیا۔

اس کے علاوہ کک کے لوگوں کو بہت کم کامیابی حاصل ہوئی۔ نجات کا عمل رکتا ہوا دکھائی دیتا تھا۔ لیبر حکومت نے مقبوضہ علاقوں کا الحاق نہیں کیا تھا۔ اگرچہ مقبوضہ علاقوں میں فوجی اڈے بنا لئے تھے لیکن امن کی خاطر علاقوں کے تبادلہ کی باتیں ہو رہی تھیں۔

1967 کی فتح نے اسرائیل میں اطمینان کی فضا پیدا کر دی تھی جو 1973 میں جولان اور سینائی پر مصر اور شام کے اچانک حملہ سے ختم ہوگئی۔ اس مرتبہ عرب فوجوں نے بہت بہتر کارکردگی کا ثبوت دیا تھا انہیں بڑی مشکل سے پیچھے دھکیلا گیا اسرائیلی پریشان تھے اور سارے ملک میں مایوسی اور شک کا ماحول پیدا ہوگیا اسرائیل پر بے خبری میں حملہ ہوا تھا اور یہ تقریباً شکست نظریاتی زوال کا نتیجہ سمجھی گئی کک کے حامی اس رائے سے متفق تھے کہ 1967 میں خدا نے اپنی رضا ظاہر کر دی تھی مگر اس فتح سے فائدہ اٹھانے کی بجائے اور عرب علاقوں پر قبضہ جمانے کی بجائے اسرائیلی حکومت کو غیروں بالخصوص امریکہ کی ناراضگی کی فکر لگ گئی۔ اب یہ جنگ خدا کی سزا اور ایک یاد دہانی تھی کہ مذہبی یہودیوں کو قوم کی مدد کرنی چاہیے۔ ایک کک ربی نے سیکولر اسرائیل کا موازنہ اس سپاہی سے کیا جو ایک شاندار جنگ لڑنے کے بعد صحراؤں میں کھو گیا۔ اب مذہب پرست یہودی جنہوں نے مذہب کا دامن کبھی نہیں چھوڑا اس کی جگہ لیں گے اور اس کا مشن جاری رکھیں گے۔

چھ روزہ جنگ نے کک نظریہ کی تصدیق تو کر دی تھی مگر 1973 کی جنگ سے پہلے ان کی تحریک نے زور نہیں پکڑا۔ کک ربی یہودہ امیتل نے اپنے ایک مضمون میں نئی انتہا پسندی

کا اظہار کیا امیتل کے مضمون میں مٹ جانے کا وہ زبردست خوف ہے جو کم وبیش ہر بنیاد پرست تحریک کے دل میں گھر کر گیا ہے۔ اکتوبر کے حملہ نے تمام اسرائیلیوں کو مشرق وسطیٰ میں اپنی تنہائی کا احساس دلا دیا اور یہ کہ وہ دشمنوں میں گھرے ہوئے ہیں جن کا مقصد ان کا ملک تباہ کرنا ہے۔ اب امیتل نے اعلان کیا کہ ''پرانی صیہونی پالیسی ناکام ہوگئی ہے۔ سیکولر ریاست سے یہودیوں کے مسائل حل نہیں ہوئے یہود دشمنی عروج پر ہے۔ اسرائیلی ریاست دنیا کی واحد ریاست ہے جسے بربادی کا سامنا ہے۔ کوئی ایسی صورت نہیں کہ دوسری قوموں کی طرح یہودی نارمل ہوں جیسا کہ سیکولر صیہونیوں کا خیال تھا۔ مگر ایک اور صیہونیت بھی تھی جس کی تبلیغ ربی زوی یہودہ کک کرتا تھا جس نے بتایا کہ نجات کا عمل بہت آگے بڑھ چکا ہے جنگ کو یہودیوں کے لئے عذاب سمجھنے کی بجائے اسے تطہیر کا عمل سمجھا جائے۔ سیکولر یہودی جن کی افسوس ناک ادھوری صیہونیت قوم کو تباہی کے دہانے پر لے آئی ہے یہ کوشش کر چکے ہیں کہ یہودیت کو ریشنلزم اور جدید مغرب کے جمہوری کلچر کے ساتھ ملا کر ایک کر دیں یہ اجنبی اثر زائل ہونا چاہیے۔''

امیتل ایک ایسی تھیوری پیش کر رہا تھا جو مصر وایران سے ابھرنے والی بنیاد پرستی سے بہت حد تک مشابہ تھی۔ 1973 کی جنگ کے ذریعہ خدا نے یہودیوں سنبھل جانے کا موقعہ دیا تھا فتح کے نشہ میں مدہوش اسرائیل کو سچی قدروں کی یاد دہانی تھی اس طرح یہ مغربی تہذیب کے خلاف مقدس جنگ اور مسیحائی عمل کا حصہ تھی مگر ہوا کا رخ بدل گیا تھا۔ امیتل کو یقین تھا کہ ملحد بھی اپنی آخری جنگ لڑ رہے ہیں۔ یہودی ریاست کی تجدید اور وسعت سے واضح ہو چکا ہے کہ خدا کو دنیا پر اختیار حاصل ہے اور یہ کہ اسرائیل نے دشمن طاقتوں کو شکست دی ہے۔ اسرائیل نے زمین فتح کر لی ہے صرف یہ کام ہونا باقی ہے کہ مغربی سیکولرازم کا شائبہ بھی اسرائیلی ذہنوں پر باقی نہ رہے اور وہ اپنے مذہب کی طرف لوٹ آئیں۔ جنگ نے سیکولرازم کی موت کی خبر دی تھی کک کے حامی اب جدوجہد میں حصہ لینے کے لئے سیاسی طور پر تیار تھے مغرب کے خلاف جدوجہد کہ اس نے عربوں کے خلاف اسرائیلی توسیع پسندی کا راستہ روک رکھا ہے اور سیکولرازم کے خلاف جدوجہد کہ جسے مغرب نے اسرائیل پر مسلط کیا ہے۔

کچھ ایسی ہی تیاری امریکہ کے پروٹیسٹنٹ بنیاد پرست بھی کر رہے تھے 1960 کے عشرے کے انتشار کے بعد یوتھ کلچر اور اس کے ساتھ جنسی انقلاب، ہم جنس پرستوں، سیاہ فام لوگوں اور

عورتوں کے لئے مساوی حقوق نے گویا کہ سوسائٹی کی بنیادیں ہلا دی تھیں۔ اکثر افراد کو یقین تھا کہ اس طوفان اور مشرق وسطیٰ کے اضطراب کے صرف یہی معنی ہو سکتے ہیں کہ سکون کے لمحے قریب ہیں انقلاب کے بعد امریکی پروٹیسٹنٹ دو متحارب فریقوں میں بٹ گئے تھے تقریباً چالیس برس سے وہ بنیاد پرست اپنی الگ دنیا بنا رہے تھے جو سیکولرسٹس کے جدید تصورات اور آزاد خیال عیسائیوں کے عقائد، دونوں کے خلاف تھے۔ وہ اپنے آپ کو اجنبی سمجھتے تھے لیکن درحقیقت وہ امریکنوں کی ایک بڑی اکثریت کے نمائندہ تھے جو مشرقی سیکولر اسٹیبلیشمنٹ کی کلچری اجارہ داری کے خلاف تھے اور جن کے لئے قدامت پسند بنیاد پرستوں کے ساتھ نباہ کرنا آسان تھا۔ ابھی انہوں نے کوئی سیاسی تحریک شروع نہیں کی تھی مگر 1970 کے عشرے کے آخر تک اس کے امکان ظاہر ہونے لگے اور بنیاد پرستوں کو اپنی طاقت کا احساس بھی ہونے لگا۔ 1979 میں جب بنیاد پرست قومی منظر پر واپس آئے تو جارج گیلپ کے نیشنل پول (رائے شماری) سے پتہ چلا کہ ہر تین میں سے ایک بالغ امریکی کو محسوس ہوا ہے کہ اس نے نئے سرے سے مذہب اختیار کیا ہے، پچاس فیصد نے انجیل کو غلطیوں سے پاک قرار دیا اور 80 فیصد نے عیسیٰ کو خدا کا روپ کہا۔ رائے شماری سے یہ بھی پتہ چلا کہ Evangelical عیسائیوں کے 1300 ریڈیو اور ٹیلی ویژن سٹیشن ہیں جن کے سامعین اور ناظرین کی تعداد 130 ملین اور منافع 500 ملین سے لے کر کئی بلین ڈالر ہے۔ ایک ممتاز بنیاد پرست کی حیثیت سے پیٹ رابرٹس نے 1980 کے انتخاب میں اعلان کیا کہ ''یہ ملک چلانے کے لئے ہمارے پاس کافی ووٹ ہیں۔''

1960 اور 1970 کے عشروں میں نیٹ ورک کی نئی وسعت اور رابرٹس کے اعتماد کی تین وجوہات تھیں۔ پہلی وجہ جنوب کی ترقی تھی۔ اس وقت تک بنیاد پرستی بڑے شمالی شہروں کی پیداوار تھی۔ جنوب بدستور زرعی تھا۔ آزاد خیال عیسائیوں کو گرجوں میں بہت کم رسوخ حاصل ہوا تھا اس لئے وہاں نئے خیالات کا سامنا کرنے کے لئے بنیاد پرستوں کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ لیکن 1960 کے عشرے میں جنوب بھی جدید ہونے لگا۔ شمال سے لوگوں کا سیلاب آ رہا تھا اور وہاں تیل کی صنعت اور دوسرے پروجیکٹس میں ملازمتوں کی تلاش میں تھے۔ جنوب میں بھی صنعتی اور شہری زندگی کے پھیلنے کا عمل اسی تیزی سے شروع ہوا جیسا کہ سو سال پہلے شمال میں ہوا تھا۔ 1930 میں جنوب کے دو تہائی باشندے دیہات میں رہتے تھے جبکہ 1960 میں ان کی تعداد نصف سے بھی

کم ہوگئی۔اب جنوب قومی سطح پرنئی اہمیت حاصل کررہا تھا۔سول وار کے بعد جمی کارٹر1976 میں امریکہ کا پہلا صدر منتخب ہوا جس کا تعلق جنوب تھا۔1980 میں کیلی فورنیا کے گورنر رونالڈ ریگن نے اس کی جگہ لی۔اگر چہ جنوب کے باشندے اپنی نئی اہمیت سے خوش تھے مگر اس نے ان کی دنیا بدل دی۔آبادکار جدید اور لبرل خیالات اپنے ساتھ لائے تھے وہ عقیدے اور قدریں جواب تک صحیح سمجھی جاتی تھیں اب ان کے دفاع کی نوبت آ گئی۔بپٹسٹ اور پریسبیرین فرقے بالخصوص قدامت پسند پروٹیسٹنٹ بنیاد پرستی کے لئے بالکل تیار تھے جیسے ان کے شمالی ہم مذہب،صدی کے آغاز میں اسی طرح اور انہی وجوہات کی بناء پر تیار تھے۔ نئے جنوب کے لوگ جو اپنے آپ کو معاشرہ سے الگ اور تنہا محسوس کرتے تھے دراصل وہ نئے آبادکار تھے جو دیہات چھوڑ کر تیزی سے پھیلتے ہوئے شہروں میں آ گئے تھے۔ ان میں سے کئی لوگوں نے اپنے بچے کالجوں اور یونیورسٹیوں میں بھیجنے شروع کئے تھے جہاں انہیں سن ساٹھ کے لبرل ازم کا سامنا کرنا ہوتا تھا وہ یہ بھی دیکھتے کہ ان کے اکثر ساتھی طلباء مذہب پر اپنا یقین کھو رہے ہیں۔ایسے طلباء کے والدین پریشان اور فکر مند تھے شمال سے آنے والے بعض خیالات کی وجہ سے گرجوں کے حالات اور بھی خراب ہو گئے تھے۔لوگ زیادہ سے زیادہ بنیاد پرست یا الیکٹرک گرجوں سے رجوع کر رہے تھے۔بااثر نئے Televangelists نے دور میں اپنی قسمتیں بنالیں۔بنیاد پرست جنوبی کنارے کے ساتھ پیٹ رابرٹس کے کرسچین براڈ کاسٹنگ نیٹ ورک اور انتہائی مقبول ''700 کلب'' کے پاس رہتے تھے اس کے بعد ورجینیا کے مقام آتے ہیں جہاں جیری فالویل نے1956 میں اپنی ٹیلی ویژن منسٹری شروع کی تھی Charlotte شمالی کیرولائنا میں جم اور Tommi Faye Bakket کی منسٹری تھی۔انجیل بیلٹ جنوبی کیلی فورنیا میں ختم ہوتی ہے ایک ایسا علاقہ جو سماجی اور سیاسی قدامت پسندی کی طویل روایات کا حامل ہے۔

کئی روایت پسندوں کے بنیاد پرست بن جانے کی دوسری وجہ امریکہ میں دوسری عالمی جنگ کے بعد ریاستی طاقت میں بے تحاشہ اضافہ تھا۔ انقلاب کے زمانے سے امریکیوں کو مرکزیت پسند حکومت پر بھروسہ نہیں رہا تھا۔وہ سیکولرسٹ اسٹیبلیشمنٹ سے بیزاری ظاہر کرنے کے لئے اکثر مذہب کا سہارا لیا کرتے تھے۔بنیاد پرست سپریم کورٹ کے اس فیصلہ پر برافروختہ تھے جس کے ذریعے پبلک سکولوں میں مذہبی تعلیم پر پابندی اس وجہ سے عائد کر دی گئی تھی کہ اس طرح

جیفرسن کے اس فرمان کی خلاف ورزی ہوتی تھی جس کے ذریعہ اس نے مذہب کو سیاست سے الگ رکھنے پر زور دیا تھا۔ سیکولرسٹ جج اس نتیجہ پر پہنچے تھے کہ ریاست کا یہ اقدام غیر آئینی ہے کہ وہ سکولوں میں مذہبی تعلیم کی حوصلہ افزائی کرے۔ چاہے یہ تعلیم رضا کارانہ غیر فرقہ ورانہ اور چندہ سے پاک ہو۔ اس سلسلہ میں احکامات 1848، 1952 اور 1962 میں جاری ہوئے تھے۔ سپریم کورٹ نے مذہبی کلاز کی پہلی ترمیم کا حوالہ دیتے ہوئے انجیل کی تلاوت بھی پبلک سکولوں میں روک دی۔ 1970 کے عشرے میں عدالت نے کئی فیصلے کئے جن کی رو سے ہر ایسے قانون کی تنسیخ کا اعلان کیا گیا جو (ا) مذہب کے کاز کو فروغ دے (۲) اگر اس کا نتیجہ (نیت سے قطع نظر) مذہب کی ترقی ہو اور آخری (۳) اگر وہ حکومت کو مذہبی معاملات میں الجھائے۔ عدالت امریکی کلچر کے اس بنیادی رجحان کی نمائندگی کر رہی تھی جو کسی طور بھی مذہب کے خلاف نہیں مگر جس کا اصرار ہے کہ مذہب 'ذاتی معاملہ' کی حد کے اندر رہے۔

یہ فیصلے سیکولرازم کے حق میں تھے مگر ان کا موازنہ ناصر یا شاہ کی مذہب کو بے اثر کرنے والی جارحانہ کوششوں سے نہیں کیا جا سکتا۔ پھر بھی بنیاد پرست اور ایونجیلیکل عیسائی دونوں ہی اس سے برافروختہ تھے وہ نہیں مانتے تھے کہ مذہب کو اس طرح محدود اور محصور کرنا جائز ہے، جبکہ عیسائیت کے تقاضے لامحدود ہیں جنہیں بالا دستی حاصل ہونی چاہیے۔ انہیں یہ بات بھی ناگوار تھی کہ عدالت مذہبی آزادی کے اصول کو اتنی وسعت دے کہ اس کا اطلاق عیسائیت کے علاوہ دوسرے مذاہب پر بھی ہو نہ وہ ججوں کے اس فیصلے سے خوش تھے کہ تمام مذاہب کی سطح ایک ہے اور وہ یکساں طور پر قابلِ احترام ہیں۔ اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ بنیاد پرستوں کا مذہب غلط ہے۔ مذہب کو ذاتی زندگی تک محدود رکھنے کا فیصلہ بھی بنیاد پرستوں کے لئے اشتعال انگیز تھا خصوصاً جب اس کا موازنہ پرائیویٹ زندگی میں عدالت کی بڑھتی ہوئی مداخلت سے کیا جاتا تھا جب انٹرنل ریونیو سروس نے اس بناء پر بعض بنیاد پرست کالجوں سے ٹیکس کے استثنٰی کی سہولت واپس لینے کی دھمکی دی کہ ان کالجوں کے قواعد پبلک پالیسی کے خلاف ہیں تو اسے لبرل سوسائٹی کی طرف سے اعلان جنگ سمجھا گیا۔ پتہ چلا کہ صرف بنیاد چلا کہ صرف بنیاد پرستوں کو ہی اپنے مذہب کے اصولوں پر عمل کی آزادی نہیں تھی۔ 1970 میں سپریم کورٹ نے گولسبورو کرسچین سکول (شمالی کیرولائنا) کے خلاف آئی آر ایس کے فیصلہ کی تصدیق کر دی تھی کیونکہ وہ سیام فام امریکیوں کو داخلہ نہیں دیتا تھا۔ اسی

طرح باب جونز یونیورسٹی جو علیحدگی پسند تو نہیں تھی مگر جس نے یونیورسٹی میں بین نسلی معاشقوں پر یہ کہہ کر پابندی عائد کر دی کہ انجیل میں ان کی ممانعت ہے۔

1925 میں سکوپس کے مقدمہ کی طرح یہ قومی اقدار کے درمیان ایک اور تصادم تھا دونوں فریق سمجھتے تھے کہ وہ حق پر ہیں۔ جبکہ قوم کے اتحاد میں دراڑ پڑ رہی تھی۔1960 اور 1970 کے عشروں میں جب ریاست نے پبلک علاقہ کے متعلق اپنا تصور پھیلایا تو نہایت قدامت پسند عیسائی جو جدید معاشرہ کے کنارے پر تھے انہوں نے اسے سیکولرسٹ جارحیت کا نام دیا۔ وہ سمجھتے تھے کہ وہ ہارورڈ مین ہٹن اور واشنگٹن کی نوآبادی ہیں۔ ان کا تجربہ بھی مشرق وسطیٰ کے ان ملکوں سے مختلف نہیں تھا جو سمجھتے تھے کہ ایک اجنبی طاقت نے انہیں غلام بنالیا ہے۔ خواتین کو ملازمت کے مساوی حقوق دینے کے سلسلہ میں ایک آئینی ترمیم انجیل کے اس حکم کے سامنے گرد ہو کر رہ گئی کہ عورت کی جگہ گھر میں ہے۔ قانون کے ذریعہ بچوں کو جسمانی سزا دینے کا عمل محدود کر دیا گیا اگرچہ انجیل میں واضح طور پر کہا گیا ہے کہ اس طریقہ سے بچوں کو نظم وضبط میں لانا باپ کا فرض ہے۔ ہم جنس پرستوں کو شہری اور آزادی اظہار کا حق دیا گیا اسقاط کو قانونی حیثیت دے دی گئی اصلاحات جو لبرل حلقوں کو سان فرانسسکو، بوسٹن یا ییل (Yale) میں منصفانہ اور اخلاقی لگیں وہ ارکنساس اور الاباما کے مذہبی قدامت پسندوں کی نظر میں گناہ تھیں۔ جب وہ یاد کرتے کہ 1920 کے عشرے میں دو تہائی ریاستوں نے امتناع شراب کے حق میں ووٹ دئے تھے مگر اب پورے شمالی امریکہ میں لوگ نشے والی اشیاء کا استعمال جائز قرار دینے کے حق میں مہم چلا رہے ہیں تو انہیں یقین ہو جاتا کہ امریکہ شیطان کے جال میں پھنس رہا ہے۔

ایک اور ہنگامہ کھڑا ہو گیا۔ لوگ محسوس کرنے لگے کہ اصلی مذہب تباہ کیا جا رہا ہے۔ اگر عیسائیوں نے مقابلہ نہ کیا تو اگلی نسل تک اہل ایمان کا نام ونشان مٹ جائے گا۔1970 کے عشرے کے دوران اکثر والدین اپنے بچوں کو پبلک سکولوں سے نکال کر سچین اسٹیبلیشمنٹ کے اسکولوں میں لے گئے جہاں انہیں مسیحی قدروں کے مطابق تعلیم دی جا سکتی تھی۔ کردار کے نمونے بتائے جاتے تھے اور تمام تعلیم انجیل کے مطابق دی جاتی تھی۔1965 اور 1983 کے درمیان ایونجلیکلا سکولوں میں داخلے چھ گناہ بڑھ گئے جبکہ ایک لاکھ بنیاد پرست بچے گھروں میں پڑھتے تھے۔ دی انڈیپنڈنٹ کرسچین سکول موومنٹ نے اپنی صفیں درست کرنا شروع کر دیں۔ اس وقت

تک بنیاد پرست سکول الگ الگ اور منتشر تھے مگر 1970 سے انہوں نے انشورنس پیکج ، استادوں کی تقرری جیسے تعلیمی مسائل پر قانون سازی کا جائزہ لینے کے لئے ایسوسی ایشن قائم کرنی شروع کیں جن کی تعداد بڑھتی چلی گئی۔ 1990 کے عشرے تک امریکن ایسوسی ایشن آف کرسچین سکولز کی 1360 شاخیں قائم ہو چکی تھیں جبکہ ایسوسی ایشن آف کرسچین سکولز انٹرنیشنل کی 1930 شاخیں تھیں۔ دوسرے سکولوں کالجوں اور تعلیمی اداروں کی طرح ہم نے سوچا ہے کہ پاکیزہ تعلیم سخت ضروری ہے۔ جہاں ہر چیز حب الوطنی، تاریخ، تاریخ، اخلاقیات۔ سیاست اور اقتصادیات کو مسیحی تناظر میں دیکھا جا سکے تعلیم کی طرح روحانی اور اخلاقی تربیت بھی نہایت اہم ہے سکولوں کے لئے ایسے سچے اور ریڈیکل مسیحی پیدا کرنا بڑی نازک ذمہ داری ہے جو امریکہ میں زندگی کو سیکولر بنانے کی کوششوں کا مقابلہ کر سکیں۔ انہوں نے امریکہ کی مسیحی تاریخ کا مطالعہ کیا اور مثلاً واشنگٹن اور ابراہیم لنکن جیسی شخصیتوں کے مذہبی خیالات کا جائزہ لیا صرف یہ پڑھا کہ فلسفہ اور ادب، انجیل سے خاصے متفق ہیں اور انجیل کی گھریلو قدروں پر زور دیا۔

جیسا کہ ہم جانتے ہیں کہ لوگوں کو جمع کرنے، انہیں منظم کرنے کے لئے ضروری ہے کہ ایک آئیڈیالوجی موجود ہو۔ 1960-1970 کے عشرہ میں پروٹیسٹنٹ بنیاد پرست نظریہ سازوں نے دشمن کو سیکولر انسان دوستی کا نام دیا۔ مسلمانوں اور کک کے حامیوں کے برعکس جو اسے مغرب کا سیکولر کلچر کہہ کر اس کی مذمت کرتے تھے امریکی پروٹسٹنٹ جو بڑے وطن پرست تھے انہیں مشکل صورتحال کا سامنا تھا کیونکہ انہیں داخلی دشمن سے لڑنا تھا۔ برسوں تک سیکولر انسان دوستی بنیاد پرستوں کے لئے ایک ایسی ترکیب بنی رہی کہ جس کے ذریعہ وہ ہر ناپسندیدہ عقیدہ یا نظریہ کی مخالفت کرتے تھے۔ مثال کے طور پر بنیاد پرستوں کے "Pro Family Forum" نے سیکولر انسان دوستی کی وضاحت اس طرح کی ہے کہ وہ انجیل اور مسیح کی صداقت اور خدا کی خدائی کی منکر ہے۔

☆ وہ روح کے وجود، جنت وجہنم اور حیات بعد الموت کی منکر ہے۔ ☆ وہ انجیل کے تصور تخلیق کی منکر ہے۔ ☆ اس کا یقین ہے کہ قطعی اور فیصلہ کن حقیقت کوئی نہیں، کوئی سچ نہیں، کوئی جھوٹ نہیں اور یہ کہ اخلاقی قدریں خود ساختہ ہیں اور موقعہ کی مناسبت سے ان میں ترمیم ممکن ہے۔ اپنا کام کرو اس طرح کہ تمہاری وجہ سے کسی کو نقصان نہ پہنچے۔ ☆ مرد اور عورت کے کردار اور کام میں تمیز نہ کی جائے۔ ☆ ہر لحاظ سے جنسی آزادی ہو۔ ☆ اسقاطِ اور خودکشی کا حق حاصل ہو۔ ☆ غریبی

دور کر کے مساوات لانے میں امریکی دولت کی مساوی تقسیم کو جائز سمجھتی ہے۔ ☆ ماحول توانائی اور اس کی حدود پر اختیار کرنا چاہتی ہے۔ ☆ امریکی حب الوطنی کی بجائے کھلی مارکیٹ، تخفیف اسلحہ اور ایک عالمی ریاست کے اشتراکی تصور کی تکمیل چاہتی ہے۔

یہ فرد جرم جو اگرچہ امریکی ہیومنسٹ سوسائٹی(1933-1973) (معمولی شہریت کی حامل ایک تنظیم) کے پہلے اور دوسرے مینی فیسٹو کی مدد سے تیار کی گئی 1960 کے آس پاس موجود آزاد خیال طبقہ کے ذہنی رجحان کی شاید کسی حد تک صحیح نمائندگی تو کرتی ہے۔ مگر اکثر نظریات کی طرح یہ بھی لبرل ازم کے سطحی جائزے اور اس کی تضحیک پر مبنی ہے۔ تمام ایسے لبرل دہریے نہیں ہیں جو مرد وزن میں برابری اور دولت کی مساویانہ تقسیم چاہتے ہیں۔ کھلنڈرے لبرل بھی جنسی بے راہ روی کی حمایت نہیں کرتے۔ نہ وہ جھوٹ اور سچ کے ہونے سے انکار کرتے ہیں بلکہ وہ چاہتے ہیں کہ ماضی کی اخلاقی پابندیوں میں ترمیم کی کوئی صورت ہو کہ مختلف قومی ریاستیں ایک لڑی میں پروئی جا سکیں۔ جیسے اقوام متحدہ اور یورپی یونین جیسی تنظیمیں قائم ہوئی ہیں۔ اس کا مقصد ایک عالمی اشتراکی ریاست قائم کرنا بھی نہیں مگر اس فہرست سے عیاں ہے کہ جن اقدار کو لبرل عیسائی اور سیکولرسٹ نیکی (جیسے غریبوں اور ماحول کی بہتری وغیرہ) سمجھتے تھے بنیاد پرست انہیں برائی کہتے ہیں لگتا ہے کہ اس وقت امریکہ میں بھی اسرائیل اور ایران کی طرح دو مختلف قومیں آباد ہیں۔ جدید معاشرہ اس شدت کے ساتھ فریقین میں تقسیم ہوا کہ مخالف کیمپ کے لوگوں کے لئے ایک دوسرے کا نکتہ نظر سمجھنا مشکل ہو گیا۔ ذیلی کلچر اتنے تنہا اور علیحدگی پسند ہیں کہ کسی مسئلہ کے موجود ہونے کا احساس ہی اکثر لوگوں کو نہیں ہوتا۔

مگر پروٹیسٹنٹ بنیاد پرستوں نے سیکولر انسان دوستی کے اس بیان کو مذاق نہین سمجھا بلکہ اسے ایک مخالف مذہب کی حیثیت میں دیکھا جس کا اپنا مسلک مقاصد اور الگ تنظیم ہے۔ اپنے اس نقطۂ نظر کے لئے حمایت انہوں نے سپریم کورٹ کے ایک فیصلے Tareasox Watkins 1961 سے لی جس میں سیکولر انسان دوستی کو دنیا کے ان بڑے مذاہب مین شمار کیا گیا تھا جو خدا کی ہستی پر ایمان لانے کا سبق نہیں دیتے جیسے بدھ ازم، تاؤ ازم اور اخلاقی کلچر ہیں۔ بنیاد پرست اسے بعد میں سیکولر انسان دوستی کی اقدار اور مقاصد پر پابندی لگانے کے لئے استعمال کرتے کہ ان پر حکومت یا قانون ساز کوئی عمل نہ کریں اور انہیں قدامت پسند پروٹیسٹنٹ ازم کی طرح خلاف

قانون قرار دیا جائے۔

بہرحال یہ سمجھنا غلط ہوگا کہ سیکولر انسان دوستی کے متعلق بنیاد پرستوں کی گہری فکر اور دلچسپی کا مقصد محض لبرل ازم کی مذمت ہے جبکہ حقیقت یہ ہے کہ سیکولر انسان دوستی اور اس سے متعلق تمام قدریں اور مقاصد بنیاد پرستوں کو شدید خوف میں مبتلا کر دیتی ہیں وہ اسے بدی کی قوتوں کی سازش سمجھتے ہیں۔ ایک ممتاز بنیاد پرست فکر Tim Layaye کے الفاظ میں سیکولر انسان دوستی خدا دشمن، اخلاق دشمن، امریکہ دشمن اور ضبط نفس کے خلاف ہے۔ سیکولر انسان دوستی کے پیچھے ایک چھوٹا سا کیڈر ہے جسے حکومت، پبلک سکولوں ٹیلی ویژن نیٹ ورک پر اختیار حاصل ہے اس لئے کہ وہ عیسائیت اور امریکی فیملی کو تباہ کریں گے۔ ہیومنسٹ (انسان دوست) سینیٹرز، کانگریس کے ممبر اور کابینہ کے وزراء کی تعداد چھ سو تھی جبکہ امریکن سول لبرٹیز یونین میں ان کی تعداد 2,75,000 کے لگ بھگ تھی دی نیشنل آرگنائزیشن فار ویمن، ٹریڈ یونینز، کارینگی، فورڈ اور راک فیلر فاؤنڈیشنز اور تمام کالج اور یونیورسٹیاں بھی ہیومنسٹ تھیں۔ پچاس فیصد اراکین پارلیمنٹ سیکولر ہیومن ازم کے مذہب سے وابستہ تھے۔ امریکہ کہ جس جمہوریہ کی بنیاد انجیل پر تھی اب سیکولر ریاست بن چکا تھا ایسی بربادی جس کی وجہ جان وائٹ ہیڈ (پریذیڈنٹ آف دی کنز رویٹو رتھ فورڈ انسٹی ٹیوٹ) کے مطابق امریکی آئین کی پہلی ترمیم کی غلط تعبیر تھی۔ جیفرسن کی Wall of Separation (جدائی کی دیوار) کا مقصد مذہب کو ریاست سے محفوظ کرنا تھا نہ کہ اس کے برعکس ہونا تھا۔ مگر اب ہیومنسٹ ججوں نے ریاست کو قابل پرستش بنا دیا ہے ''ریاست سیکولر سمجھی جاتی ہے جبکہ ریاست مذہبی ہے کیونکہ اس کا بنیادی مقصد خود ریاست کا دوام ہے۔'' سیکولر ہیومن ازم، خدا کی حاکمیت کے خلاف بغاوت کے مترادف ہے اور ریاست کی پرستش محض بت پرستی ہے۔

صرف یہی نہیں کہ اس سازش نے امریکی معاشرہ کو اپنا نشانہ بنایا بلکہ وہ ساری دنیا میں پھیل گئی۔ بنیاد پرست مصنف پیٹ ورکس کے الفاظ میں سیکولر ہیومنسٹ نے بہت بڑی سازش تیار کی ہے جو بڑی تیزی کے ساتھ ایک نئے عالمی نظام کی صورت اختیار کر رہی ہے۔ ایک وسیع عالمی ریاست، جو دنیا کو غلامی کی سطح پر گرا دے گی۔ دوسرے بنیاد پرستوں کی طرح بروکس بھی دشمن کو ہر جگہ موجود پاتا تھا جو ایک عرصہ سے اپنے مقصد کی تلاش میں سرگرداں تھا وہ اسے سوویت یونین، وال سٹریٹ، صیہونیت، عالمی بنک، عالمی مالیاتی فنڈ اور فیڈرل ریزرو سسٹم میں مصروف عمل دیکھتا

تھا۔ رتھس چائلڈز، راک فیلر، کسنجر، برزنسکی، شاہ اور توریجوس (سابق پانامی ڈکٹیٹر) اس عالمی سازش میں شریک ہیں۔ سیکولر ہیومن ازم کا یہ خوف اتنا ہی خلاف عقل اور اتنا ہی نا قابل علاج تھا جتنی کہ وہ مریضانہ ذہنیتیں جن کا مشاہدہ ہم کر چکے ہیں اور جو سب ایک ہی خوف۔ مٹ جانے کے خوف کی پیداوار ہیں۔ پروٹیسٹنٹ بنیاد پرستوں کی رائے میں ماڈرن سوسائٹی عام طور پر اور امریکی سوسائٹی خاص طور پر اسلامی سوسائٹی جیسی ہی ظالم ہے۔ فرینکی شیفر کی رائے میں مغرب ایک الیکٹرانک سیاہ دور میں داخل ہونے والا ہے جہاں نئی ٹیکنالوجی سے مسلح کفر والحاد کے نت نئے امڈتے ہوئے سیلاب ہیں جو مذہب انسانیت کی آخری امید بھی اپنے ساتھ بہا کر لے جا رہے ہیں۔ ہم جب مغرب کے مسیحی انسان کی یادیں پیچھے چھوڑتے ہوئے آگے بڑھتے ہیں تو ہمیں گہری مایوسی کا احساس ہوتا ہے۔ تاریکی اور مایوسی کا ایک گہرا اور پر آشوب سمندر ہے اور ہم ہیں۔ یہودی اور مسلمان بنیاد پرستوں کی طرح، امریکی پروٹیسٹنٹ بھی محسوس کرتے تھے کہ ان کی پشت دیوار سے لگی ہوئی ہے اور انہیں زندہ رہنے کے لئے لڑنا ہوگا۔

جس طرح سید قطب کی نئے 'جاہلی' شہر کی تعریف لبرل مسلمانوں کی سمجھ میں نہیں آتی تھی اسی طرح امریکہ کی جو تصویر پروٹیسٹنٹ بنیاد پرست بنا رہے تھے وہ اس تصویر سے بالکل مختلف تھی جو اکثر لبرل عیسائیوں کے ذہن میں تھی۔ بنیاد پرستوں کو یقین تھا کہ امریکہ خدا کا اپنا ملک ہے۔ مگر ان اقدار کی پرواہ نہیں کرتے تھے جو دوسرے امریکنوں کو عزیز تھیں جب امریکی تاریخ کے متعلق لکھتے تھے تو تقریباً سبھی پلٹ کر بڑی اداسی کے ساتھ Puritan Pilgrim Fathers کو دیکھتے مگر ان کی صرف ایسی باتوں کی تعریف کرتے جن میں لبرل عیسائیوں کو کوئی دلچسپی نہیں تھی نیوانگلینڈ میں پیورٹن کس قسم کا معاشرہ بنانا چاہتے تھے Plymouth Rock Faoundaion کے رس والٹن نے پوچھا ''کیا جمہوری معاشرہ؟'' ''نہیں ہرگز نہیں۔'' پرانے امریکی ایسا کوئی آئیڈیا اس نئی دنیا کے لئے نہیں لائے۔ نہ پیورٹینز کے پاس آزادی کے لئے اتنا وقت تھا۔ انہیں ''چرچ اور ریاست میں اچھی حکومت'' کی خواہش تھی کیونکہ اس کی وجہ سے دوسرے لوگ مجبور ہو کر اچھا راستہ اختیار کریں گے نہ وہ انقلاب کو جمہوری عمل سمجھتے تھے۔ امریکی پروٹیسٹنٹ بنیاد پرست یہودیوں اور مسلمانوں کی طرح جمہوریت کو ایک جیسے شک کی نظر سے دیکھتے تھے اور ان کے شک کی وجہ بھی ایک ہی تھی۔ امریکی جمہوریہ کے بانی رہنما پاٹ رابرٹس کے

مطابق کالونینی انجیلی آئیڈیل سے متاثر تھے جس کی وجہ سے امریکی انقلاب نے روسی یا فرانسیسی انقلاب کے راستے اختیار نہیں کیئے۔امریکی انقلابیوں کا عوامی راج سے کوئی واسطہ نہیں تھا وہ ایک ایسی جمہوریہ چاہتے تھے جس میں اکثریت کی رائے اور برابری کے حقوق پر انجیل کے قوانین کا کنٹرول ہو۔ بانی رہنما یقیناً ایسی خالص اور براہ راست جمہوریت نہیں چاہتے تھے جس میں اکثریت من مانی کرے۔کسی مسلمان بنیاد پرست کی طرح وہ کسی ایسی حکومت کے تصور ہی سے گھبراجاتے جوملک میں اپنے قوانین نافذ کرے۔آئین اس کا اہل نہیں کہ وہ خدا کے قوانین سے گریز کر کے اپنے قانون بنائے بلکہ بنیادی قانون نافذ کرے جس حد تک بھی وہ قانون انسان کی سمجھ میں آئے۔

امریکیوں کے ماضی کا یہ پہلو اس پہلو سے بہت مختلف ہے جو لبرل اسٹیبلشمنٹ نے پیش کیا ہے بنیاد پرستوں کی تاریخ مخالف کلچر کی پیداوار ہے تاکہ امریکہ کو واپس صحیح راستہ پر لایا جائے سب نے امریکہ کو ایک بلند مقام سے گرتے ہوئے دیکھا ہے۔سپریم کورٹ کے فیصلے سماجی اصلاحات اور اسقاط کی قانونی حیثیت سے آزادی کے نام پر سیکولرازم کو تقویت ملی مگر 1970 کے عشرے کے آخر تک بنیاد پرستوں نے محسوس کرنا شروع کردیا کہ حالات کی ابتری کا کچھ الزام تو انہیں بھی قبول کرنا چاہیے۔سکوپس کے مقدمہ کے بعد انہوں نے ہمت ہاردی تھی اور الگ تھلگ ہوکر سیکولر ہیومنسٹ کو کھل کھیلنے کی اجازت دے دی۔اب انہوں نے سیاسی سرگرمیوں میں حصہ لینے کا ارادہ کرلیا تھا۔1970 کے شروع میں Tim Lahiya نے کبھی نہیں کہا تھا کہ بنیاد پرست سیاست میں حصہ لیں مگر دہائی کے آخر تک اسے یقین ہوگیا تھا کہ ہیومنسٹ چند برسوں میں امریکہ کو تباہ کردیں گے اگر مسیحی پچھلی تین دہائیوں کی نسبت سے زیادہ اخلاق و کردار کی خاطر سرگرم عمل نہ جائے۔

بنیاد پرستوں کے سیاست سے الگ رہنے کا ایک سبب ان کا Premilliennialism بھی تھا چونکہ تباہی دنیا کا مقدر ہے اس لئے اس کی اصلاح کی ہر کوشش بے کار ہے مگر اب اس معاملہ میں بھی ان کا رویہ بدل گیا تھا۔1970 میں پال لنڈسے نے اپنی تصنیف The Late Great Planet Earth شائع کی اس میں پرانے قبل ہزاریہ Premillennal آئیڈیا کو کاٹ چھانٹ کر نئے زوردار انداز میں پیش کیا گیا لنڈسے کو آخری دنوں میں امریکہ کا کوئی خصوصی کردار نظر

نہیں آیا۔ اس کا کہنا تھا کہ موجودہ حالات میں عیسائیوں کو آنے والے انجام کی علامتوں کو نشان دہی تک محدود رہنا چاہیے مگر 1970 کے آخر تک وہ Tim Lahaye کی طرح اپنا ذہن بدل چکا تھا۔ 1980 کے عشرے میں اس نے Countdown to Armageddon کے اندر کہا کہ اگر امریکہ اپنے حواس بجا رکھے تو وہ پورے ہزاریہ کے دوران عالمی طاقت بنا رہے گا۔

''اس کا مطلب ہے کہ ہمیں ایک شہری ہونے اور خدا کے گھرانے کا رکن ہونے کی حیثیت سے اپنی ذمہ داریاں پوری کرنی چاہئیں ہمیں ایسے افسر چننے چاہئیں جو حکومت کرتے ہوئے انجیل کی اخلاقیات پر قائم رہیں نہ صرف یہ بلکہ اپنی داخلی اور خارجی پالیسیوں میں ہمارے ملک اور ہمارے طرزِ حیات کا خیال رکھیں۔''

بنیاد پرست فوراً تیار ہو گئے انہیں لڑنے کے لئے دشمن مل گیا ان کے سامنے امریکہ کا ایسا تصور تھا جو لبرل عیسائیوں کے تصور سے بہت ہی مختلف تھا۔ اب انہیں یقین ہو گیا کہ اپنے تمام خدشوں سے قطع نظر وہ اتنے طاقتور ہیں کہ اپنی لڑائی جیت سکیں۔

1970 کے عشرے کے آخر تک پروٹیسٹنٹ بنیاد پرستوں کو امریکہ میں اعلیٰ حیثیت اور خود اعتمادی حاصل ہو گئی۔ یہ ان کے منظم ہونے کی تیسری وجہ تھی اب وہ سکوپس مقدمہ کے ہارے ہوئے منتشر اور قلاش لوگ نہیں تھے۔ جس خوشحالی نے لبرل سوسائٹی کی کامیابی کے امکان پیدا کر دیئے تھے اب وہ بنیاد پرستوں کے لئے بھی پرکشش ہو گئی تھی جنوب کی نئی اہمیت اور بنیاد پرستی کے عروج کی وجہ سے اکثر لوگوں کو یقین ہو گیا کہ اب وہ اسٹیبلشمنٹ کو چیلنج کر سکتے ہیں۔ وہ جانتے تھے کہ 1960 میں اہم لبرل فرقوں میں رکن سازی کا زور ٹوٹ چکا تھا جبکہ ایونجلیکل چرچوں میں یہ تعداد بڑھ چکی تھی۔ ٹیلی وینجلزم عیسائیت کے کاروبار میں اور زیادہ مہارت حاصل کر چکا تھا انہیں اس کے ذریعے خدا (جسے زندگی کے ہر شعبہ سے خارج کر دیا گیا تھا) کے ہونے کا ڈرامائی اور واضح احساس ہوا تھا جب وہ ٹیلی ویژن پر پینٹی کوسٹلسٹ مبلغ اورل رابرٹس کو معذوروں اور بیماروں کا علاج کرتے ہوئے دیکھتے تو خدائی قوتوں کی کارآفرینی سے متاثر ہوتے جب وہ بھاری بھرکم جمی سویگریٹ کو رومن کیتھلکوں، ہم جنس پرستوں اور سپریم کورٹ کو گالیاں بکتے ہوئے سنتے تو انہیں احساس ہوتا کہ کوئی تو ہے جو ہمارے خیالات کو زبان دے رہا ہے۔ جب انہوں نے اس بھاری رقم کے متعلق سنا جو رابرٹسن اور بیکرز ہر ہفتے اپنے پروگراموں میں جمع کر لیتے تو بنیاد پرست

قائل ہو گئے کہ خدا ہی معیشت کے مسائل کا حل بھی ہے۔ عیسائیوں کو پانے کے لئے کچھ دینا بھی چاہیے رابرٹس کے مطابق خدا کی سلطنت میں کوئی معاشی بحران، کوئی کمی نہیں۔ اس کی تصدیق ٹاپ ٹین کرسچین ٹیلی ویژن نیٹ ورک کی بے مثال کامیابی سے ہوتی ہے جو ہر سال ایک بلین ڈالر سے زیادہ خرچ کرتے ہیں ایک ہزار سے زیادہ لوگوں کو ملازمتیں دیتے ہیں اور شاندار پروفیشنل پروڈکشنز کے خالق ہیں۔

بیری فالویل، اس وقت کی نمایاں شخصیت تھی اندازہ لگایا گیا کہ 1960 اور 1970 کے عشروں کے دوران امریکہ کے ہر دس میں سے چار گھرانے ورجینیا اور لنچ برگ میں اس کے اسٹیشن لگاتے ہیں۔ 1956 میں جب پادری کی حیثیت سے اس نے اپنا کام شروع کیا تو اس کے ساتھ مٹھی بھر اراکین تھے اس نے ایک سوڈا فیکٹری کو اپنا ٹھکانہ بنایا جو اس وقت استعمال میں نہیں تھی۔ تین برسوں میں اس کے وعظ میں شرکت کرنے والوں کی تعداد تین گنا بڑھ گئی اور 1988 تک تھامس روڈ بیپٹسٹ چرچ میں 18000 اراکین اور 60 پاسٹر (غیر مقلد پادری) شامل ہو گئے۔ چرچ کی کل آمدنی چھ کروڑ ڈالر سالانہ سے زیادہ تھی اور اس کی مذہبی تقریبات 392 ٹیلی ویژن چینل اور 600 ریڈیو اسٹیشنوں سے نشر ہوتی تھیں۔ ایک صحیح بنیاد پرست کی حیثیت سے فالویل ایک الگ اور خودنگر دنیا بسانا چاہتا تھا لنچ برگ میں اس نے انجیل کی تعلیمات پر مبنی ایک سکول بنایا تھا۔ 1976 تک لبرٹی بیپٹیسٹ کالج میں 1500 طالب علم پڑھ رہے تھے فالویل نے شرابیوں کے علاج نرسنگ ہوم اور اسقاط کلینک کے متبادل کے طور پر لے پالک ادارہ قائم کیا تھا۔ فالویل سیکولر ہیومن ازم کا اثر کم کرنے کے لئے ایک متبادل معاشرہ بنا رہا تھا پہلے تو وہ چاہتا تھا کہ لبرٹی کالج ایک عالمی معیار کی یونیورسٹی بن جائے۔ 1920 میں باب جونز کی یورنیورسٹی قائم ہونے کے زمانہ سے اب تک بنیاد پرستی بدل چکی تھی معاشرہ سے علیحدگی اب کافی نہیں سمجھی جاتی تھی۔ دوسرے بنیاد پرست استادوں کی طرح فالویل آنے والے زمانہ کے لئے ایک کیڈر تیار کر رہا تھا یعنی نوجوانوں کی ایک روحانی فوج جو زندگی کا ساتھ دے اخلاق کی حامی ہو اور امریکہ پر جان نچھاور کرے۔

باب جونز تو کرسچین سکولوں کے لئے ٹیچروں کی تربیت کی غرض سے سیکولر دنیا سے دور ہو گیا تھا جبکہ فالویل سیکولر اسٹیبلشمنٹ کا سامنا کرنا چاہتا تھا۔ لبرٹی کالج نوجوانوں کو زندگی کے ہر شعبے

کی تربیت دے گا۔ وہ معاشرہ کو تباہ ہونے سے بچالیں گے مگر اس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ بنیاد پرستی کے سامنے سر جھکا دیں اور مذہب کے تمام اصولوں کی پابندی کریں۔ باب جونز کے برعکس فالویل کی ایک تعلیمی حیثیت بھی تھی جو غیر بنیاد پرست طلباء کے لئے کشش کا سبب بنی ان کے والدین یونیورسٹی کے سنجیدہ ماحول اور تعلیمی معیار سے مطمئن تھے۔ فالویل اعتدال کی راہ پر چلا تھا۔ ایک طرف تو لبرٹی نے1960اور70 کے عشروں کے لبرل آرٹ کالجوں کا متبادل مہیا کیا اور دوسری طرف بعض بائبل کالجوں کے معمولی معیار کی تقلید کی اپنے اصولوں پر زور دیتے ہوئے یونیورسٹی سماجی اور فکری مسائل پر کھلی بحث کی دعوت دیتی تھی اس سے طلباء سیکولرازم کے میدان میں ہی سیکولرازم کا سامنا کرتے تھے جس سے اس کی نئی تسخیر کے راستے کھل جاتے۔

فالویل حملہ کرنے کی منصوبہ بندی کر رہا تھا مگر یہ منصوبہ بندی بالکل نئے انداز کی تھی۔ کالج، چرچ اور ریڈیو اسٹیشن میں اس کا اثر ورسوخ، ایک گم شدہ اور دم توڑتی ہوئی دنیا تک پہنچنے کی کوشش تھی اس کے ریڈیو پروگراموں میں کوئی مضحکہ خیز باتیں نہیں تھیں پروگرام Old Time Gospel Hour میں رابرٹسن سوگیرٹ اور بیکرز کی طول کلامی سے گریز کیا جاتا تھا مذہب کی طرح فالویل براڈ کاسٹنگ میں بھی اصلیت پسند تھا اس کی تقریریں(Services) بالکل ویسی ہی نشر کی جاتی تھیں جیسی کہ ریکارڈ ہوتی تھیں۔ ان میں کیمرہ ٹرک کا کوئی عنصر ہوتا تھا نہ کسی قسم کی کلیاں پھندے ٹانکے جاتے تھے۔ لنچ برگ، ڈسپلن، سرمایہ داری اور کالون کی اخلاقیات کا حامی تھا جبکہ کالویل نے نئے شاپنگ سینٹر کی طرح اپنی دنیا سجائی تھی جہاں ہر عنوان کی سروس اور ان کے مجموعے دستیاب تھے جیسا کہ المرٹاؤنز نے بتایا کہ فالویل سمجھتا تھا کہ وہ اسی طرح لوگوں کے دل جیت سکتا ہے۔ فالویل کا خیال تھا کہ ایک ہی چرچ میں کئی پادریوں کی مشترکہ نمائندگی سے عوام کو انجیل کی طرف راغب نہیں کیا جاسکتا مگر یہی کام انفرادی سطح پر بہتر طور سے سرانجام دیا جاسکتا ہے۔1960اور1970 کے دوران تھامس روڈ یہ ثابت کرتا ہوا لگتا تھا کہ سرمایہ دارانہ نظام کی مسلسل ترقی اور توسیع میں خدائی رضا شامل ہے۔ جب سیکولرازم کے حامیوں کو1980 کے عشرے میں دائیں بازو کی طرف سے نئی تحریک کی ضرورت محسوس ہوئی تو ان کی نظر انتخاب فالویل پر پڑی وہ ماڈرن سرمایہ دارانہ معاشرے کے تقاضے خوب سمجھتا تھا اور برابری کی سطح پر اس کا سامنا کرسکتا تھا۔

مگر فالویل کی سخت گیری کی وجہ سے اس کے حامی بنیاد پرست بھی اس سے خوف زدہ تھے۔

رابرٹسن، لاہے یا فالویل سے اس اُمید پر بحث کرنے کی کوئی فائدہ نہیں تھا کہ انہیں سیکولر ہیومن ازم کی کسی سازش کے نہ ہونے کے بارے میں قائل کیا جاسکے گا یہودی اور مسلمان بنیاد پرستوں کے ساتھ مشترک ان کا یہ مٹ جانے اور تباہ ہونے کا خوف ان کی مہم میں تیزی اور یقین کا اضافہ کرتا تھا۔ جدید معاشرے نے مادی اور اخلاقی اعتبار سے بہت کچھ حاصل کرلیا تھا اسے اپنی راست بازی پر یقین کا حق حاصل تھا۔ یورپ اور امریکہ میں کم سے کم آزادی اور رواداری کی وجہ سے انسان سکھ کا سانس لے سکتا تھا مگر بنیاد پرستوں کو یہ نظر نہیں آتا تھا اس لئے نہیں کہ وہ گم کردہ راہ تھے بلکہ اس لئے کہ وہ جدیدیت کو اپنی عزیز ترین اقدار پر ایک حملہ سمجھتے تھے جس کی وجہ سے ان کی ہستی خطرہ میں پڑ گئی تھی۔1970 کے عشرے کے آخر تک یہودی، عیسائی اور مسلمان روایت پسند، جوابی جنگ کے لئے تیار ہو چکے تھے۔

حملہ
(1974-79)

بنیاد پرستوں کے حملہ سے اکثر سیکولرسٹ حیران رہ گئے دراصل انہوں نے سمجھ لیا تھا کہ مذہب پھر کبھی سیاست میں کوئی اہم کردار ادا نہیں کر سکے گا مگر 1970 کے آخر میں مذہب کا ہنگامہ خیز مظاہرہ ہوا(79-1978) میں دنیا نے حیرانی سے دیکھا کہ ایک غیر معروف ایرانی آیت اللہ نے محمد رضا شاہ پہلوی کی اس حکومت کو تہہ و بالا کر دیا جو مشرق وسطیٰ کی مضبوط ترین اور ترقی پسند حکومتوں میں سے ایک سمجھی جاتی تھی۔اسی وقت جبکہ مصر کے صدر انوارالسادات کی امن کوششوں، اسرائیل کو تسلیم کرنے اور مغرب سے دوستی کی خواہش کو تحسین سے دیکھا گیا لوگوں نے محسوس کیا کہ نوجوان مصری مذہب سے رجوع کر رہے ہیں۔ وہ اسلامی لباس پہن رہے تھے جدیدیت کی آزادی سے بیزار تھے اور ان میں سے اکثر یونیورسٹیوں پر قبضہ کرنے میں لگے ہوئے تھے۔ امریکہ میں جیری فالویل نے 1979 میں 'مورل اتھارٹی' کی بنیاد رکھی اور پروٹیسٹنٹ بنیاد پرستوں کو سیاست میں شریک ہونے کے لئے کہا ان پر زور دیا کہ وہ ریاست اور وفاقی قانون سازی کو چیلنج کریں کہ جو سیکولر ہیومن ازم ایجنڈے کی حمایت پر کمر بستہ ہیں۔

مذہب کی اس طرح اچانک مقبولیت سے سیکولر اسٹیبلشمنٹ کو صدمہ بھی ہوا اور وہ اسے بے راہ روی بھی سمجھتے تھے۔کسی ایسے جدید نظریہ کو اپنانے کی بجائے کہ جو کامیاب ثابت ہو چکا تھا ان روایت پسندوں نے الہامی کتابوں، اصولوں اور قوانین کے حوالے دیئے جو بیسویں صدی کی سیاست کے لئے اجنبی تھے۔ان کی ابتدائی کامیابی کی وضاحت تو شاید نہیں ہو سکتی مگر ان خطوط پر ایک جدید ریاست چلانا ناممکن تھا۔ بنیاد پرست، ماضی کی سمت واپسی میں مصروف دکھائی دیتے تھے اس کے علاوہ ان پالیسیوں کی حمایت اور ان کے لئے گرم جوشی توہین آمیز تھی۔ وہ امریکی اور

یورپین جنھوں نے سوچ لیا تھا کہ مذہب کا دور ختم ہوا اب یہ دیکھنے پر مجبور تھے کہ پرانے مذاہب نہ صرف اب بھی لوگوں میں اطاعت کے والہانہ جذبات بیدار کر سکتے ہیں بلکہ لاکھوں یہودی عیسائی اور مسلمان اس سیکولر لبرل کلچر سے نفرت کرتے ہیں جس پر انہیں اتنا فخر ہے۔

ہم جان چکے ہیں کہ بنیاد پرستی کا آغاز اچانک تھا نہ حیرت انگیز۔ برسوں سے زیادہ قدامت پسند مذہبی لوگ کچھ دوسری وجوہات کی بناء پر حکومتوں کے جبر، اہانت بلکہ اذیت کا نشانہ بنے ہوئے تھے اور ان کے خلاف غصہ میں کھول رہے تھے ان میں سے اکثر حلقوں نے جدید معاشرہ سے کنارہ کر لیا تا کہ اصلی مذہب کو محفوظ کر سکیں انہیں یقین تھا کہ بعض حکومتیں انہیں صفحۂ ہستی سے مٹا دینے کے درپے ہیں چنانچہ انہوں نے ایسے نظریات وضع کئے جن کے ذریعے وہ لوگوں کو بقاء کی جنگ کے لئے جمع کر سکیں۔ ایسی سماجی قوتوں میں گھرے ہونے کی وجہ سے جو یا تو مذہب سے بیگانہ تھیں یا مذہب کے خلاف تھیں ان میں ایک محصور ذہنیت پیدا ہو گئی تھی جو آسانی کے ساتھ جارحیت میں بدل سکتی تھی۔ 1970 کے عشرے کے وسط تک صحیح موقعہ آ چکا تھا سب میں اپنی طاقت کا احساس تھا اور جانتے تھے کہ بحران دہلیز پر ہے اور یہ کہ انہیں اپنی تاریخ کے ایک نادر لمحہ کا سامنا ہے۔ اس سے پہلے کہ دنیا انہیں بدلے وہ دنیا کو بدلنا چاہتے تھے ان کے خیال میں تاریخ نے ایک ہلاکت خیز موڑ کاٹا تھا۔ وہ اب ایسے معاشروں میں بسے ہوئے تھے جنھوں نے خدا کو زندگی سے خارج کر دیا تھا۔

''سیکولرسٹس اپنی متکبرانہ خود اعتمادی سے توبہ کریں جس نے ہر چیز کو انسان کا کارنامہ بنا دیا ہے اور خدا کی حاکمیت پر ایمان لائیں۔''

سیکولرسٹ حلقے بہت حد تک اس مذہبی ردِعمل سے بے خبر تھے۔ مختلف معاشرے اس طرح مخالف گروپوں میں بٹ گئے تھے کہ امریکہ میں لبرل یا ایران جیسے مغرب زدہ سیکولرسٹ ملک میں اس مذہبی مخالف کلچر کو کم اہمیت دی گئی جو برسوں سے پھیل رہا تھا۔ ان کا یہ خیال غلط تھا کہ اس مذہبی جارحیت کا تعلق پرانی دنیا سے ہے جبکہ یہ مذہب کی نئی صورتوں میں سے ایک صورت تھی جو اکثر جدت پسند اور صدیوں پرانی روایتوں کو غرق آب کرنے کے لئے تیار تھی۔ ویسے تو تینوں مذاہب کے بنیاد پرستوں نے جدیدیت رد کر دی تھی مگر وہ جدید تصورات سے متاثر بھی ہوئے تھے لیکن ابھی تک انہیں بہت کچھ سیکھنا تھا۔ یہ ابتدائی حملے بنیاد پرستوں کے فاتحانہ دنوں کے نمائندہ تھے مگر

جیسا کہ ہم آگے چل کر دیکھیں گے مذہبی جوش وجذبہ سے معمور ایک تحریک کے لئے اپنی سالمیت قائم رکھنی بہت مشکل ہے جب وہ ایک بار جدید سیاست کی ریشنل اور عملیت پسند دنیا میں قدم رکھ لے۔ ظلم کے خلاف انقلاب بھی خود ظلم بن سکتا ہے۔ جدیدیت کی برائیاں ختم کر کے ایک متحدہ ریاست قائم کرنے کی کوشش کا نتیجہ مطلق العنان ریاست بھی ہوسکتی ہے۔ بنیاد پرستی کے دیومالائی، مسیحائی اور صوفیانہ مظاہر کو سیاسی لوگوس میں بدلنا خطرناک تھا مگر بنیاد پرستوں کو برسوں پر پھیلے ہوئے اس ظلم اور ذلت کا احساس تھا جو ان سے پہلے واقع ہو چکے تھے اور یہ کہ واقعی خدا کے لئے دنیا کی نئی تسخیر کریں گے۔

ایرانی انقلاب پہلا واقعہ تھا جس کی وجہ سے دنیا نے پہلے بار بنیاد پرستی کی طرف توجہ کی مگر یہ پہلی تحریک نہیں تھی جسے دنیائے سیاست میں کامیابی حاصل ہوئی۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ 1973 کی جنگ کے بعد اسرائیل میں کک کے پیروکاروں کو یقین ہو گیا تھا کہ یہودی بدی کی قوتوں کے خلاف مصروف جنگ ہیں۔ کک نے وارننگ دی تھی کی نجات کا وقت قریب ہے لیکن حکومت اگر مسیحائی عمل میں رکاوٹیں ڈالے تو پھر خود انہیں عملی قدم اٹھانا چاہیے اس بات پر وہ کسی حد تک حیران تھے کہ انہین ایسے سیکولرسٹ مل گئے تھے جو کسی طور بھی ربی کک کے نظریات سے متفق نہیں تھے مگر مقبوضہ علاقہ سے انخلاء کے مخالف تھے۔ آرمی چیف آف سٹاف، رافل ایٹن یا نوکلیئر فزسٹ یووال نیمن جیسے لوگ مذہبی صیہونیوں کے ساتھ اس ایشو پر تعاون کے لئے تیار تھے کہ مقبوضہ علاقے اسرائیل کے پاس ہی رہیں۔ فروری 1974 میں ربیوں کے ایک گروپ، نوجوان سیکولرسٹ کلسٹ اور دیگر مذہبی صیہونی جو آئی ڈی ایف میں رہ چکے تھے اور جنہوں نے جنگ میں حصہ لیا تھا سب نے مل کر (Gush Emurium) مذہبی بلاک کے نام سے ایک گروپ بنایا۔

کچھ عرصہ بعد انہوں نے ایک پوزیشن پیپر مرتب کیا جس میں انہوں نے اپنے مقاصد بیان کئے۔ گش ایک جماعت نہیں بنے گی جو اسمبلیوں میں اقتدار کے لئے لڑتی رہے بلکہ اس کی حیثیت ایک پریشر گروپ کی ہوگی۔ یہودی عوام کو بیدار کرے کہ وہ صیہونی نظریات کے مکمل نفاذ کی کوشش اس احساس کے ساتھ کریں کہ صیہونی نظریات اسرائیل کے یہودی ورثہ کی دین ہیں اور یہ کہ ان کا مقصد اسرائیل بلکہ تمام دنیا کی نجات ہے۔ آغاز میں تو صیہونیوں نے مذہب کو نظرانداز کر دیا تھا مگر گش نے اپنی تحریک کی جڑیں یہودیت میں ہونے پر زور دیا۔ گش کے

سیکولرسٹ اراکین نے تو نجات کو سیاسی معنوں میں لیا مگر مذہبی اراکین جو ربی کک سے متاثر تھے انہیں یقین تھا کہ مسیحائی نجات کا عمل شروع ہو چکا ہے اور جب تک یہودی تمام اسرائیل پر قبضہ پر نہ کرلیں، وہاں بس نہ جائیں، دنیا میں امن ممکن نہیں۔

شروع ہی سے گش کا وجود سیکولر اسرائیل کے لئے چیلنج تھا۔ پوزیشن پیپر میں پرانی صیہونیت کی ناکامیاں واضح طور پر نمایاں تھیں اگرچہ یہودیوں کو اپنی بقاء کے لئے کٹھن جدوجہد سے سابقہ پڑا تھا۔

''صیہونیت کے مقاصد حاصل کرنے میں ہمیں شکست اور ناکامی کا سامنا ہے اس ناکامی کی چار وجوہات ہیں مسلسل تصادم کی وجہ سے مایوسی اور اکتاہٹ، چیلنج کی کمی، مفاد پرستی اور مذہبی جوش میں کمی۔''

گش کے مذہبی اراکین کی نظر میں ذہنی کمزوری ایک نازک مرحلہ میں تھی یہودیت سے کٹ کر صیہونیت کے کوئی معنی نہیں تھے۔ ایک ہی وقت جبکہ کک پسند عربوں کے مفتوحہ علاقے تسخیر کرنے کی فکر میں تھے وہ سیکولر اسرائیل سے جنگ میں بھی مصروف تھے وہ تہیہ کئے ہوئے تھے کہ پرانے سوشلسٹ اور نیشنلسٹ موضوعات کا مقام تورات کو دیں جبکہ لیبر صیہونی اس کوشش میں تھے کہ یہودی نارمل طرز حیات اپنائیں اور دوسری قوموں کی طرح ہو جائیں۔ گش اسرائیلیوں کی انفرادیت پر زور دیتے تھے کیونکہ یہودی ان کے خیال میں خدا کا خاص انتخاب ہیں۔ وہ بنیادی طور پر دوسری قوموں سے مختلف ہیں اور ایک ہی جیسے قوانین وقواعد کے ماتحت نہیں ہیں۔ انجیل نے واضح کر دیا تھا کہ اسرائیل ایک خاص قسم کی قوم ہیں اور دوسری قوموں سے الگ ہیں۔ صیہونیت کی کوشش تو جدید مغرب کے لبرل ہیومن ازم کو جذب کرنا تھا مگر گش کی نظر میں یہودیت اور مغربی کلچر دو متضاد حقیقتیں ہیں جن کا ملاپ ممکن نہیں تھا اس لئے ککسٹ کی نظر میں سیکولر صیہونیت کی کامیابی کا کوئی امکان نہیں تھا۔ ان کا کام صیہونیت کو پھر مذہب سے ملانا، ماضی کی غلطیاں دور کرنا اور تاریخ کو صحیح کرنا تھا۔

'یوم کپر' (1973) جنگ کی تباہی سے ظاہر ہو گیا تھا کہ نجات کا عمل تیز کرنے کے لئے فوری قدم اٹھانا ضروری تھا جسے جھوٹی سیکولر صیہونیت نے روک دیا تھا۔ گش کو پوری طرح پھیلنے میں ایک سال لگ گیا تھا مگر آخر کار اس نے اپنے اراکین کو ایک مکمل طرزِ حیات دیا۔ گانا بجانا، پہننا،

پڑھنا، ڈاکٹر، علاج، بچوں کے نام، یہاں تک کہ بولنا بھی ایک خاص اسٹائل میں تھا۔ چند برسوں میں گش نے ایک مخالف کلچر پیدا کرلیا جس نے اس کے اراکین کو اس قابل کیا کہ وہ بنیاد پرستوں کی طرح بروقت سیکولر اسرائیل سے الگ ہوجائیں۔ مذہبی اراکین نے ایک حد تک جارحانہ انداز میں تورات پر عمل اور اپنی دین داری کی نمائش کی۔ ریاست کے ابتدائی برسوں میں سیکولر اسرائیلیوں نے روائیتی ٹوپیوں (Skullcaps) کا مذاق اڑایا تھا اب مذہبی کارکنوں نے ایک بنی ہوئی ٹوپی متعارف کرائی جو ایک مذہبی نشان بن گئی۔ گش کا کیڈر اپنے آپ کو لیبر حلقوں سے زیادہ صیہونی اور یہودی سمجھتا تھا وہ اپنا تعلق صرف حضرت داؤد جیسے قدیم جنگ آزماؤں سے نہیں جوڑتے تھے بلکہ تھیوڈر ہرزل، بن گورین جیسے صیہونی ہیروان کے آئیڈیل تھے۔

جبکہ گش کے سیکولر اور مذہبی اراکین اپنی تنظیم کے اسٹیبلشمنٹ میں مصروف ہوگئے تو موشے لیونگر کی سرپرستی میں کلکسٹ کے ایک گروپ نے مغربی کنارے پر ایک عرب قصبہ نابلوس کے قریب واقع ریلوے ڈپو میں ایک نیوکلیس بنانے کی کوشش کی یہ جگہ یہودی کے لئے مقدس تھی۔ نابلوس انجیلی شہر Shechem کی جگہ پر آباد تھا۔ آبادکار چاہتے تھے کہ اسے پاک کریں کیونکہ فلسطینیوں کے وہاں رہنے کی وجہ سے وہ ناپاک ہوگیا تھا۔ انہوں نے اپنی بستی کا نام Elon Moreh رکھا جو کہ شہر کا ایک اور انجیلی نام تھا اور اپنے ریلوے ڈپو کو مذہبی مدرسے کے لئے وقف کیا۔ انہوں نے گش میں شامل ہونے پر بھی رضامندی ظاہر کی۔ چونکہ بستی کا قیام غیرقانونی تھا اس لئے حکومت نے آبادکاروں کو وہاں سے ہٹانے کی کوشش کی مگر گش نے اقوام متحدہ کے اعلانات پر عمل کرنے کی کوئی ضرورت محسوس نہ کی۔ اس لئے کہ یہودی دوسری اقوام کے قوانین کے پابند نہ تھے۔ اسرائیل میں آبادکاروں کو کافی حمایت حاصل ہوئی مگر حکومت کمزور اور متذبذب تھی۔ اپریل 1975 میں موشے لیونگر نے بیس ہزار یہودیوں کی مغربی کنارے میں داخلہ کی قیادت کی Elon Moreh میں اپنے خیمہ سے جسے اس نے ''سچوئیشن روم'' کا نام دیا تھا اس نے اسرائیلی وزیر دفاع شمعون پیریز سے مذاکرات کئے۔ اسی دوران IDF کے سپاہیوں کے ساتھ ان کی جھڑپ ہوئی گولی تو نہیں چلی مگر پتھر لڑھکائے گئے اور رائفلوں کے بٹ مارے گئے۔ آخرکار پیریز نے خود آکر لیونگر کے خیمے میں اس کے ساتھ بات کی اس میٹنگ کے بعد ربی ماتمی انداز میں اپنی سفید قمیص پھاڑتا ہوا طوفان کی طرح خیمے سے باہر آیا۔ انتخابات سر پر تھے اور پیریز

کو مذہبی ووٹ کھودینے کا ڈر تھا اس نے ہار مان لی اور دسمبر 1975 میں وہ قریبی فوجی کیمپ میں تیس آبادکاروں کے ٹھہرنے پر رضامند ہوگیا۔ فاتحانہ انداز میں لیونگر کا جلوس نکالا گیا جس میں نوجوانوں نے اسے اپنے کاندھوں پر اٹھایا ہوا تھا۔ ایک دبلا پتلا لہراتی ہوئی داڑھی اور موٹے چشموں کے ساتھ کندھے پر ہر وقت بندوق لٹکائے ہوئے لیونگر ایک نئی قسم کا یہودی ہیرو بن گیا۔ سیکولرسٹ بھی اس کے حامی ہوگئے۔ ''لیونگر صیہونیت کی واپسی کی علامت ہے۔'' مشہور دہشت گرد گیولا کوہن Geula Cohen نے کہا ''وہ ایک شمع کی طرح جوڈیا اور سماریا (مغربی کنارے کے انجیلی نام) میں روشن ہے۔ وہ صیہونی انقلاب کا قائد ہے۔'' ایلون مورہیہ کا نام اب پھر کیدامم رکھ دیا گیا۔ یہ مقام ہانوکاح کے دنوں میں جب یروشلم کی آزادی کا جشن منایا جاتا تھا ہوا تھا، آزادی Maccabecs نے 164BCE میں Seleucids سے حاصل کی تھی۔ گش کی مائتھالوجی میں یہ نیا بیج ہانوکاح خدا کی فتح بن گیا۔ یہ تخلیقی لمحہ تھا، دھارے کا رخ بدل گیا تھا سیکولر صیہونیت کو خدا کی رضا کے سامنے مجبور ہوکر جھکنا پڑا لیونگر نے تاریخ کو صحیح سمت دے دی تھی۔

77-1974 گش کا سنہرا دور تھا۔ اس کے اراکین لیکچر دیتے ہوئے اور مردوں اور عورتوں کو بھرتی کرتے ہوئے ملک کا دورہ کرتے۔ بھرتی میں سیکولر اور غیر سیکولر کی تمیز نہیں تھی مقصد یہ تھا کہ مقبوضہ عرب علاقوں میں لوگ بسنے پر تیار ہوں۔ گش کی شاخیں تمام ملک میں کھول دی گئیں۔ اس کے کیڈر نے سارے مغربی کنارے میں یہودیوں کو آباد کرنے کا بہت بڑا منصوبہ بنایا۔ ان کا مقصد ہزاروں یہودیوں اور آمد کر کے انہیں مضبوط اور سٹریجک پہاڑی مقامات پر آباد کرنا تھا۔ علاقہ کے جغرافیائی اور آبادکاری کے ماہرین سے مشورے کئے گئے۔ منصوبہ بندی اور پروپیگنڈہ کے لئے افراد چنے گئے انتظامی ادارے قائم ہوئے۔ ان میں سے ایک میٹ مرتزئی (Mate Mirtazi) تھا جو آبادکاری کے آپریشن منظم کیا کرتا اکثر لیونگر کی قیادت میں قبضہ گروپ رات کی تاریکی میں چھپ کر اپنے ٹوٹے پھوٹے ٹریلر مغربی کنارے کی پہاڑیاں اجاڑنے اور برباد کرنے کے لئے لے جاتے تھے۔ جب فوج ان سے وہ علاقہ خالی کرانے پہنچتی تو دائیں بازو کی جماعتیں پارلیمنٹ میں لیبر حکومت پر یہودیوں کے ساتھ بالکل انگریزوں جیسا (اسرائیلی ریاست سے پہلے کا) سلوک کرنے کا الزام لگاتیں۔ یہ چال کامیاب رہی اب اسرائیلی حکومت کا کردار ظالموں

جیسا تھا بس گش کے آباد کار تھے جو اسرائیلیوں کے شاندار ماضی کی واحد مثال تھے۔

ان برسوں میں گش صرف تین بستیاں بسانے میں کامیاب ہوئے۔ تاہم اسرائیلی وزیر اعظم رابن بعد جنگ کے اس عرصہ میں مصر اور شام کے ساتھ مصالحانہ رویہ اختیار کرنے کے لئے بے چین تھا۔ وہ عربوں کے مقبوضہ علاقوں کے متعلق معمولی رعائتیں دینے کے لئے تیار تھا۔ اس نے دائیں بازو اور گش کے مشترکہ دباؤ کا مقابلہ جاری رکھا مگر گش نے بڑی بڑی ریلیاں اور جلوس منظّم کرتے ہوئے اپنی پروپیگنڈہ مہم جاری رکھی۔ 1975 میں مذہبی اور سیکولر صیہونیوں پر مشتمل ہجوم، تورات کے سکرول اٹھائے ناچتا گاتا ہنگامے کرتا ہوا مقبوضہ علاقوں میں گھوم گیا۔ 1976 میں یوم آزادی پر تقریباً بیس ہزار مسلح یہودیوں نے سماریا کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک مارچ کرتے ہوئے ویسٹ بنک پکنک منائی۔ اشتعال انگیز مظاہرے اور جلوس ایسے وقت نکالے جاتے جب کوئی نئی بستی بنائی جاتی تھی یا کوئی غیر قانونی دھرنا (ایڑیوں کے زور پر بیٹھنا) ہوتا۔ ان حرکتوں سے بعض اسرائیلیوں کو یہ حوصلہ ہوا کہ وہ مقبوضہ عرب علاقوں کو یہودی مال ہی سمجھیں اور ان میں بس جانے کو قسم کی برائی خیال نہ کریں۔

گش عملیت پسند اور چالاک تھے انہیں وسائل کی کمی بھی نہیں تھی دہریئے اور سیکولرسٹ بھی ان سے متاثر تھے مگر اس کے آرتھوڈوکس ممبروں کی نظر میں گش بنیادی طور پر ایک مذہبی تحریک تھی ربی کک سے انہیں کبالسٹ دینداری ورثہ میں ملی تھی جس کا مقصد یہودیوں کی زمین پر آبادی بنانا اور اس کی مقدس سرحدوں میں توسیع کرتے ہوئے دشمنوں کی سرحدیں پیچھے دھکیل دینا تھا۔ ایسی آبادی عیسائیوں میں Sacrament کہلائے گی۔ باطنی جمال کی ظاہری علامت، جو دنیا میں خدا کی موجودگی کا تصور ایک نئے اور زیادہ اثر آفرین طریقہ سے عام کرتی ہے۔ اسے ہی اوریا، تکن کہتا تھا، بحالی کا عمل، جو ایک دن دنیا کو بدل دے گا۔ (Hikes) طویل پیدل سفر، مارچ، فوج سے لڑائیاں غیر قانونی (Squats) دھرنے، مراسم کی ایسی شکل تھی جس سے نجات کا احساس پیدا ہوتا تھا۔ برسوں تک سیکولر آبادکاروں اور عالم وفاضل ہیزیڈم کے مقابلے میں حقیر محسوس کرنے کے بعد کک کے پیروکاروں نے اچانک محسوس کیا کہ وہ توجہ کا مرکز ہیں اور ایک کائناتی جنگ کی فرنٹ لائن ہیں۔ نجات کا عمل تیز کرتے ہوئے وہ خود کائنات کے بنیادی روم سے ہم آہنگ پاتے۔ لوگوں نے دیکھا کہ جب وہ آنکھیں بھینچتے ہوئے آگے پیچھے لہراتے، ان کے چہرے اینٹھے

ہوئے، کرب کی حالت میں ہوتے اور وہ اونچی آواز میں واویلا کرتے تھے۔ یہ سب کبالائیوں کے مطابق Kawwanah کی نشانیاں تھیں یعنی کسی حکم پر عمل کرتے ہوئے گہرے انہاک کی کوشش جس کے ذریعے یہودی رسم کی بنیادی معنویت اس کی علاماتی شکل کے ذریعے دیکھ سکتا ہے Kawwanah کے ساتھ ہونے والی عبادت نہ صرف عبادت گزار کو خدا کے قریب لاتی ہے بلکہ اس عدم توازن کو دور کرتی ہے جس کی وجہ سے عام دنیا روحانی دنیا سے الگ ہو جاتی ہے۔ گش کے کارکن نہ صرف عبادت کی حالت میں یہ کیف محسوس کرتے بلکہ سیاسی سرگرمیوں کے دوران بھی ان کی یہی کیفیت ہوتی تھی۔ نئی بستی کے افتتاح پر ایک بڑے ہجوم کے سامنے ربی کک کا وعظ اس کے رونے کا نظارہ ایک الہام تھا اسی طرح جب قبضہ گروپ کے افراد شالوں میں لپٹے ہوئے چیختے چلاتے لہولہان انگلیوں کے ساتھ زمین سے چمٹے ہوئے ہوتے تو فوج رملہ کی ایک پہاڑی سے ان کی مشکوک حرکات پر نظر رکھتی۔ یہ صرف سیاسی لمحات نہیں تھے۔ گش کے کارکنوں کو یقین تھا کہ انہوں نے ان واقعات کے زمینی خول میں سے خدائی ڈرامہ حقیقت کی گہرائیوں تک دیکھا تھا چنانچہ سیاست، عبادت (avodah) بن گئی۔ سینی گاگ کے اندر عبادت میں شریک ہونے سے پہلے ایک یہودی رسم کے مطابق غسل کرتا ہے (جسے مکوہ mikveh کہتے ہیں) اسی طرح گش کے ربیوں نے اعلان کیا ''کہ سیاست کے گٹر (کثافت) میں اترنے سے پہلے ہمیں mikveh کے ذریعے اپنے آپ کو پاک کر لینا چاہیے کیونکہ یہ تورات کے اسرار میں کھو جانے کے مترادف ہے۔'' اس انکشاف سے گش کی منافقت اس کا دوغلہ پن ظاہر ہوتا ہے۔ سیاست مقدس ہے مگر جیسا کہ سینئر کک نے پہلے کہا تھا کہ وہ ایک گٹر بھی ہے۔ 1967 سے کک پسندوں نے تاریخی واقعات کے کئی صدمے برداشت کئے تھے جنہیں سینئر کک روشنی کی لپک کہتا تھا مگر وہ سیاسی مشکلات اور ناکامیوں سے بھی باخبر تھے۔ اسرائیلی فتوحات کو معجزوں کا درجہ دیا جاتا تھا مگر لوگ جانتے تھے کہ یہ معجزے جدید ٹیکنالوجی اور فوجی مہارت کی وجہ سے ہوئے ہیں۔

کک پسند دراصل حرمت اور بے حرمتی سے اچھی طرح آگاہ تھے خدا کے لئے ان کی تڑپ کی وجہ دنیاوی حقیقت سے روگردانی تھی اور سیاست میں ابہام انتہا پسندی اور کٹڑ پن تھا اسی لئے ان کی عبادت اور اکٹوازم میں بھی اذیت اور مصیبت کا اظہار ہوتا تھا ان کا مقصد تمام زندگی بلکہ اس کے معمولی بے وقعت اور اخلاق سوز پہلوؤں کو بھی تقدیس کی چھتر چھاؤں تلے لانا تھا۔ جب

کہ ہیز یڈم اسی کام میں کیف اور مسرت محسوس کرتے تھے۔ گش کے یہی لمحات غم وغصے کے زہر میں بجھے ہوتے تھے۔ ''وہ نئے عہد کی عورتیں اور مرد ہیں خدا بہت دور ہے اور بے دینی سے اوپر اٹھنا اور بھی مشکل ہے جبکہ اکثر لوگ سمجھتے ہیں کہ بس یہی کچھ ہے جو میسر ہے۔'' گش کے کارکنوں نے اپنے ذہنی خلل سے نجات کے لئے عربوں سے ان کی زمین چھیننے کی کوشش کی انہین اپنے گھر چھوڑ کر اور اسرائیل کی سرحدوں سے پرے کھوئی ہوئی زمین کو اپنی نو آبادی بنانے سے قرار آیا۔ اسرائیل واپس جانا اپنی ذہنی کیفیت بحال کرنے کی کوشش تھی۔ ایسی روحانیت میں کئی دشواریاں ہیں جو معاشرہ کی نئی تسخیر پر مبنی اور اس کے قہر وغضب پر مشتمل ہو۔ 1977 میں اسرائیل کی تاریخ میں پہلی بار عام انتخابات کے اندر لیبر پارٹی کو شکست ہوئی اور بیگن کی قیادت میں دائیں بازو کی Likud پارٹی اقتدار میں آئی۔ بیگن نے ہمیشہ دریائے اردن کی دونوں اطراف پر یہودی ریاست بنانے کی حمایت کی تھی۔ اس لئے انتخابات میں اس کی کامیابی میں خدا کی رضا شامل سمجھی گئی۔ انتخابات کے تھوڑے عرصہ بعد ہی یہ بات اس وقت واضح ہوگئی جب بیگن ربی کک سے ملنے گیا اور اس کے قدموں پر جھکا ''مجھے لگا کہ میرا دل میرے سینہ میں پھٹنے لگا ہے'' ڈینیل بن سمن نے کچھ عرصہ بعد بتایا ''اس سے بڑا ثبوت کیا ہوسکتا تھا کہ کک کے خواب دراصل حقیقت تھے۔'' کک لیونگر کا پرزور حامی تھا وہ گش کو اپنے پیارے بچے کہہ کر خوش ہوتا تھا اور اپنی انتہا پسندانہ پالیسیوں کی وضاحت کرتے ہوئے انجیلی امیجری کا سہارا لیتا تھا۔

انتخابات کے بعد لیکو وحکومت نے مقبوضہ علاقوں میں وسیع پیمانہ پر آبادکاری شروع کردی۔ اسرائیلی لینڈ کمیشن کے نئے انچارج ایریل شیرون نے مغربی کنارے پر بیس برسوں میں دس لاکھ یہودی آباد کرنے کا ارادہ ظاہر کیا۔ 1981 کے وسط تک حکومت نے 400 ملین ڈالر مقبوضہ علاقوں میں خرچ کئے اور بیس آبادیاں بنائیں، جن میں تقریباً 18,500 یہودی رہنے لگے۔ اگست 1984 تک تقریباً 113 سرکاری آبادیاں مگربی کنارے پر تھیں جن میں چھ قصبے بھی تھے۔ 46,000 جنگجو آبادکاروں میں گھرے ہونے کی وجہ سے عرف خوف زدہ تھے اور ان میں سے بعض عربوں نے تشدد کا راستہ اختیار کیا۔ یہ فضا گش کے لئے بہت سازگار تھی جنہیں سرکاری حمایت بدستور حاصل تھی۔ 1978 میں ریفل ایٹن نے مگربی کنارے پر واقع ہر آبادی کو اس علاقہ کی سیکورٹی کا ذمہ دار بنایا اور ریگولر فوجی یونٹوں سے سینکڑوں آبادکار فارغ کردیئے کہ وہ اپنے علاقہ

کی حفاظت کریں۔ انہیں علی درجہ کے ہتھیار دیئے گئے اور بہت سا فوجی ساز وسامان مہیا کیا گیا۔ مارچ 1979 میں حکومت نے ٹیکس لگانے اور لوگوں کو ملازم رکھنے کے لئے پانچ علاقائی کونسلیں مغربی کنارہ پر بنائیں۔ گش ارا کین کا کردار عام طور پر بہت اہم تھا اگرچہ اب وہ صرف بیس آباد کار مہیا کرتے تھے۔ دراصل وہ سرکاری افسر بن گئے تھے حکومت کے ساتھ تعلقات بے شک دوستانہ ہوں مگر برسوں سے اس کے ساتھ گش کی محاذ آرائی نے گش کو بدظن کر دیا تھا۔ انتخابات میں لیکوئڈ کی کامیابی کے بعد اس کے ارا کین نے اپنی سرگرمیاں منظّم کرنے کے لئے ''آزمانہ'' (معاہدہ) قائم کی اور گش نو آبادیوں کا کونسل موشے یحشا کو بنایا کہ انہیں کچھ آزادی حاصل ہو۔

گش کی بدظنی حق بجانب تھی کیونکہ لیکود کے ساتھ ہنی مون مختصر تھا۔ 20 نومبر 1977 کو مصر کے انوار السادات نے امن کے مذاکرات شروع کرنے کے لئے یروشلم کا تاریخی سفر کیا۔ اگلے سال بیگن اور سادات نے کیمپ ڈیوڈ معاہدے پر دستخط کئے۔ 1967 میں فتح کیا جانے والا جزیرہ نما سینائی، اسرائیل نے مصر کو واپس کر دیا اس کے عوض مصر نے اسرائیلی ریاست تسلیم کر لی اور مشترکہ سرحدوں پر سیکورٹی کی ضمانت دی۔ اس معاہدے کا مقصد امن کی بنیاد تلاش کرنا اور اردن مصر اسرائیل اور فلسطینی عوام کے نمائندوں کے درمیان مغربی کنارے اور غزہ کے مستقبل کے متعلق مذاکرات تھے دونوں کے نقطۂ نظر سے کیمپ ڈیوڈ ایک حقیقت پسندانہ معاہدہ تھا مصر نے اپنا اہم علاقہ واپس حاصل کر لیا اور اسرائیل کو ایک حد تک امن نصیب ہوا۔ سنائی ''مقدس سرزمین'' نہیں تھی وہ انجیل کی موعودہ سرزمین کی سرحدوں سے باہر تھی بیگن مغربی کنارہ عربوں کو واپس دینے کے لئے کبھی تیار نہیں تھا کہ امن کی بنیاد زیر بحث لانے کی نوبت نہیں آئے گی کیونکہ کسی اور عرب ملک نے اس کی حمایت نہیں کی تھی۔ کیمپ ڈیوڈ معاہدے پر دستخط ہوتے ہی بیگن نے مغربی کنارے پر بیس نئی یہودی بستیاں بنانے کا اعلان کر دیا۔

مگر اس سے گش ایمونم اور اسرائیلی دائیں بازو کے مذہبی صیہونی خوش نہ ہوئے۔ اکتوبر 1979 کو نئی تہیاہ (تجدید) پارٹی ربی کک کی دعاؤں کے ساتھ وجود میں آئی۔ پارٹی کا مقصد کیمپ ڈیوڈ کی مخالفت اور مزید رعایات کا راستہ روکنا تھا اس سیاسی جماعت میں مذہبی اور سیکولر صیہونی دونوں یکجا ہوگئے اور مل کر کام کرنے لگے۔ 1981 میں کنکسٹ اور Gahlet کے سابق رکن ہیم ڈرکمین نے موراشہ Morasha (ورثہ) کے نام سے پارٹی بنائی تاکہ مغربی کنارے پر اور زیادہ

یہودی بستیاں بنانے پر زور دیا جائے۔ گش کی نظر میں کیمپ ڈیوڈ سے امن کا کوئی تعلق نہیں تھا۔ ان کی رائے میں تاریخ اور ماخذ کے لحاظ سے (Shalom) امن اور (Shlemat) مکمل کا مطلب امن ہے جو صرف اسرائیل کی علاقائی سالمیت اور اس کی تمام زمین کے تحفظ سے حاصل ہوسکتا ہے۔ اس پر کوئی سمجھوتہ ممکن نہیں۔ گش کے کے ربی الیذ روالڈمین کا کہنا تھا کہ اسرائیل بدی کے خلاف جنگ مین مصروف ہے جس جنگ پر ساری دنیا کی قسمت کا دارومدار ہے۔ صرف اسرائیل کی نجات نہیں بلکہ ساری دنیا کی نجات ضروری ہے مگر دنیا کی نجات اسرائیل کی نجات کی محتاج ہے۔ اس سے تمام دنیا ہمارے اخلاق، روحانیت اور کلچر سے متاثر ہوتی ہے۔ اسرائیلی کی پوری سرزمین میں رہنے والوں کی طرف سے بنی نوع انسان پر رحمت نازل ہوگی۔

مگر یہ دیومالائی فرمان ایک ایسی دنیا میں نافذ کرنا ممکن نہیں جو سیکولر اور پرگمیٹک (عملیت پسند) اصولوں پر قائم ہے۔ بیگن کی چرب زبانی کتنی ہی انتہا پسندانہ ہو مگر اس کی یہ خواہش نہیں تھی کہ ماٹھوس سیاست کی عملی لوگوں میں دخل دے۔ ابتدا ہی سے اہلیت اور قابلیت ماڈرن دنیا کا تقاضہ تھا۔ سخت ترین اصولوں میں بھی عملی سیاسی پالیسیوں اور تقاضوں کی وجہ سے لچک آگئی تھی۔ بیگن کو امریکہ کے ساتھ خوشگوار تعلقات رکھنے پڑے کیونکہ امریکہ امن کا خواہشمند تھا۔

ان بنیاد پرستوں کے لئے یہ دنیا ہمیشہ ایک مسئلہ بنی رہے گی جو اس جدید سیاسی دنیا میں خدا کے لئے لڑنے کی کوشش کرتے ہیں۔ گش ایمونیم نے ان برسوں میں کچھ کامیابیاں حاصل کیں۔ 1978 میں ایک فرانسیسی گریجویٹ Shlomo Avinor نے (Ateret Cohnm) 'ربیوں کا سرتاج' مدرسہ (Yeshiva) کی بنیاد مشرقی یروشلم میں مسلمانوں کے علاقہ میں رکھی اور پر یشیوا ٹمپل ماؤنٹ پر پھیلا ہوا تھا جہاں اب قبۃ الصخرہ اسلامی دنیا کا تیسرا مقدس مقام ہے۔

یشیوا کا مقصد آمد کی تیاریاں اور قدیم جگہ پر معبد کی تعمیر تھی۔ چونکہ وہاں یہودی کے ایک نئے معبد کی تعمیر کا مطلب ہی مسلمانوں کے ایک اہم ترین مقدس مقام کی بربادی تھی۔ اس لئے یہ ارادہ اشتعال انگیز تھا صرف یہی نہیں بلکہ ایٹرٹ کوہینم نے بھی پرانے یروشلم میں یہودیوں کی نئی بستی بنانے کا منصوبہ شروع کردیا جس پر اسرائیل نے 1969 میں بین الاقوامی کمیونٹی کی مرضی کے خلاف قبضہ کرلیا تھا۔ یشیوا نے چوری چھپے پرانی عبادت گاہوں کی دوبارہ تعمیر کے لئے مسلمانوں کے علاقہ میں عربوں سے ان کی جائیداد خریدنی شروع کردی تاکہ یروشلم کے عرب علاقہ میں

یہودی مضبوطی کے ساتھ اپنے قدم جماعتیں۔ ان برسوں میں دوسری کامیابی1979 میں ہوئی جب گ ش ایمونیم نے اسرائیلی سپریم کورٹ کے ایک فیصلہ کو چیلنج کر دیا جس کی رو سے نابلوس کے جنوب مشرق ایلن موریہہ میں ان کی نئی آبادی کو منہدم ہوتا تھا۔ گش نے سول وار اور بھوک ہڑتال کی دھمکی دی۔ آخر جنوری1980 میں پارلیمنٹ نے ایک خصوصی کمیٹی بنائی تا کہ موجودہ یہودی آبادیوں کے تحفظ اور سپریم کورٹ کی عائد کردہ پابندیوں کا خیال کرتے ہوئے نئے مواقع پیدا کرنے کا جائزہ لیا جائے۔ پندرہ مئی کو گورنمنٹ نے ایک پنج سالہ منصوبہ کا اعلان کیا کہ مغربی کنارے پر59 نئی یہودی بستیاں بنائی جائیں۔

مگر کامیابی کی ان اکادکا مثالوں کے باوجود گش ایمونیم کے سنہرے دن ختم ہو گئے تھے اسرائیلی عوام نئے امن سے خوش تھے۔1982 میں گش کو ایک زبردست شکست ہوئی۔کیمپ ڈیوڈ معاہدہ کی تعمیل کرتے ہوئے اسرائیل نے یامٹ کے نام سے ایک قصبہ خالی کر دیا جسے سینائی کے ساحل پر لیبر حکومت نے تعمیر کیا تھا۔ موشے لیونگر نے اعلان کیا کہ ''صیہونیت کو امن کی بیماری لگ گئی ہے۔'' اس نے مغربی کنارے کے ہزاروں آبادکار ساتھ لئے اور انہیں واپس یامٹ لے گیا جہاں انہوں نے خالی گھروں میں کیمپ لگا دیئے یہ بڑا خطرناک قدم تھا۔ لیونگر نے آبادکاروں کو روم کے خلاف یہودیوں کی جنگجوں کی یاد دلائی جن میں960 عورتوں، مردوں اور بچوں نے قلعہ مسادہ میں خودکشی کر لی تھی۔ مگر رومی فوجوں سے ہار نہیں مانی۔ گیش کے ربیوں نے دو بڑے اسرائیلی ربیوں نے مشورہ کیا جنہوں نے شہادت کے خلاف فیصلہ دیا اور ایک بار پھر ربی لیونگر نے ماتم میں اپنے کپڑے پھاڑ دیئے۔ جب آئی، ڈی، ایف، آبادکاروں کو وہاں سے ہٹانے کے لئے پہنچی تو یہودیوں کے خون کا ایک قطرہ بھی نہ بہا مگر گش نے تصادم کی تیاری کر لی تھی اور ایک لمحہ کے لئے مذہبی اسرائیلی اور سیکولر اسرائیلی ایک دوسرے کے خلاف صف آرا ہو گئے۔

یامٹ میں یہ آخری مقابلہ شاید ایک نادانستہ چال تھی تا کہ ایک سنگین حقیقت سے انکار کیا جا سکے۔ عظیم بیداری (The Great Awakening) جس کی کک پسندوں کو بڑی توقع تھی اس کا کہیں پتہ نہ تھا یا شاید نجات بھی قریب نہیں تھی۔ وہ ریاست کیونکر مقدس ہو سکتی ہے جو اپنے مقبوضہ علاقوں میں ایسی بزدلانہ رعائتیں دے۔ گش کے مذہبی اراکین آمد مسیح کے بارے میں پراُمید ہونے کی بجائے بددل ہو رہے تھے۔ ایسی حالت میں وہ اور بھی خطرناک ہتھکنڈوں پر

اتر سکتے تھے۔ اپنی زبردست کوششوں کے باوجود گش خدا کی سیاست کو اس حقیقی دنیا میں رواج نہ دے سکے۔ سینائی سے واپسی کے کچھ دیر پہلے کک مر گیا جس سے گش کے اندر محرومی کا احساس اور بڑھ گیا۔ کوئی ایک فرد اس کے غیر متنازعہ جانشین کے طور پر نہ ابھر سکا اور تحریک منتشر ہو گئی۔

مذہبی حلقوں کی طرف سے کیمپ ڈیوڈ کی مخالفت کا سامنا کرنے میں بیگن تنہا نہیں تھا۔ مصر میں انوار السادات کو بھی ایسی ہی مخالفت کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ امن کے سلسلہ میں سادات کی پہل نے اسے مغرب میں محبوب شخصیت بنا دیا۔ اگرچہ کئی حلقوں میں امن کو تحسین کی نظروں سے دیکھا گیا مگر مصری اپنے صدر کے متعلق تذبذب میں تھے۔ چھ روزہ جنگ کی تباہیوں کے باوجود ناصر اکثر لوگوں کو بہت محنت تھی۔ سادات کو یہ محبت کبھی میسر نہ ہوئی۔ سیاسی طور پر اس کی اہمیت کم تھی یہاں تک کہ 1971 میں جب وہ پہلی دفعہ اقتدار میں آیا تو اسے اپنی حکومت کے خلاف ناکام بغاوت کا سامنا کرنا پڑا 1973 کی جنگ میں ایک حد تک کامیابی نے سادات کو اپنی حیثیت منوانے میں بری مدد دی۔ میدان جنگ میں اپنی صلاحیت منوانے اور عربوں کا اعتماد بحال کرنے کے بعد وہ اس قابل ہوا کہ لوگوں کو امن کی حمایت پر آمادہ کرے تاکہ مصر کے حالات بہتر ہوں اور مغرب سے خوشگوار تعلقات قائم ہو سکیں۔

1967 کی شکست کے بعد ناصر قوم پرستی سے کسی حد تک دور ہو گیا تھا۔ اس نے امریکہ کے ساتھ تعلقات بحال کرنے کی کوششیں بھی شروع کر دی تھیں۔ اس نے مشرق وسطیٰ کے مذہبی رجحان کا اندازہ کر لیا تھا اور اگرچہ اخوان جیل ہی میں رہے، ناصر نے ایک بار پھر اپنی تقریروں میں مذہبی حوالے دینے شروع کر دیئے۔ سادات کے دور میں ان رجحانات کو مزید تقویت ملی۔ اس نے 1972 میں 1500 وہ روسی مشیر ملازمت سے فارغ کر دیئے جن کی تقرریاں ناصر نے کی تھیں اور 1973 جنگ کے بعد مصر کو عالمی سرمایہ دار مارکیٹ میں لانے کے لئے نئی حکمت عملی مرتب کی جسے اس نے ''انفتاح'' یعنی کھلا دروازہ کا نام دیا۔ تاہم سادات ماہر اقتصادیات نہیں تھا اور مصر کے معاشی مسائل اس کی دکھتی ہوئی رگ تھی پھر بھی انفتاح کے ذریعے ان کی شدت میں کچھ کمی آئی۔ انفتاح نے غیر ملکوں پر مصر کے دروازے کھول دیئے۔ غیر ملکی کرنسی آنے اور غیر ملکی درآمد کا سلسلہ شروع ہو گیا ٹیکس میں سہولتوں کی وجہ سے غیر ملکی سرمایہ کار بھی متوجہ ہوئے اور مصر یقیناً امریکہ کے قریب ہو گیا، 'کھلے دروازہ' نے ابھرتی ہوئی بورژوازی کو بھی تھوڑا سا فائدہ پہنچایا اور چند مصریوں نے بہت

سی دولت کمالی مگر غالب اکثریت مصائب میں مبتلا رہی۔ظاہر ہے کہ مصری تجارت غیر ملکی کمپی ٹیشن کا سامنا نہیں کرسکتی تھی۔اشرافیہ کی کرپشن اور ذاتی نمود ونمائش کے لئے اسراف نے نفرت اور بے چینی پھیلا دی۔نوجوان خاص طور پر جداور تنہا تھےان میں سے 4 فیصد ہی کسی اچھی ملازمت کی توقع کر سکتے تھے۔ باقی مجبور ہوکر معمولی معاوضہ پر غیر سرکاری اور ذاتی نوعیت کی عارضی ملازمتوں پر اکتفا کرتے ان میں سے بھی اکثر نوجوان آٹا اور نمک کی خاطر فالتو اوقات مین ڈرائیور یا پلمبر وغیرہ کا کام کرتے۔اچھی رہائش نا قابل برداشت حد تک مہنگی ہونے کی وجہ سے نوجوان جوڑے برسوں شادی کاانتظار کرتے محنت ومشقت سے ان کی معاشی حالت ذار سنبھلے تو گھر بسائیں۔ترک وطن ان کی واحداُمید تھی۔ہزاروں مصری اپنے گھر چھوڑ کر تیل پیدا کرنے والی ریاستوں میں جا کر ملازمتیں کرتے تھے جہاں انہیں اچھی تنخواہ مل جاتی تو وہ وطن میں مقیم اپنے خاندانوں کے اخراجات کے کفیل ہو سکتے تھے۔کسان بھی اس دوڑ میں شامل ہو گئے وہ خلیج میں ملازمتیں کر کے گھر بنانے اور ٹریکٹر خریدنے کے لئے پیسہ جمع کر لیتے تو وطن واپس آتے۔انفتاح نے مغرب کوسادات کا گرویدہ بنادیا مگر اس سے اکثر مصری وطن سے بے وطن ہو گئے۔

امریکی بزنس اور کلچر پھیلا تو مصر اکثر مصریوں کو پرایا لگنے لگا سادات بھی لوگوں سے دور رہنے لگا اس نے اور اس کی بیوی جہان نے مغربی طرز زندگی اپنالیا تھا۔وہ اکثر غیر ملکی شخصیتوں اور فلمی اداکاروں کی آؤ بھگت میں مصروف نظر آتے۔کہاجاتا ہے کہ شراب بھی پیتے تھے اور بڑے عیش و آرام سے ایسے ریسٹ ہاؤسوں میں زندگی بسر کرتے تھے جن کی آرائش پر غریبوں کی اذیت ناک زندگی فراموش کر کے لاکھوں ڈالر خرچ کئے جاتے تھے۔اس سے سادات کا مذہبی امیج مجروح ہوا۔ سنیوں کی روایت میں ایک اچھے حکمران کے لئے حکم ہے کہ وہ اپنے آپ لوگوں سے الگ نہ سمجھے، سادگی اور کفایت سے زندگی گزارے اور خیال رکھے کہ معاشرہ میں دولت کی تقسیم منصفانہ ہو۔اپنے آپ کو'دیندار صدر' کہلانا خود کو ملک کے نئے ذہنی موڈ سے ہم آہنگ کرنا تھا۔ پیشانی پر گہرا محراب لئے مسجد میں اپنی تصویریں اتروانے سے سادات کا مقصد اپنے آپ کو پانچ وقت کا نمازی ظاہر کرنا تھا گویا کہ مسلمانوں کو دعوت دیتی تھی کہ وہ اس کے قول وفعل کے تضاد کا جائزہ لیں۔

پھر بھی مذہب کے بارے میں سادات کا رویہ ظاہری لحاظ سے اچھا تھا وہ اپنی حکومت کو ناصر کی حکومت سے مختلف دکھانا چاہتا تھا۔محمد علی کے زمانہ سے مصریوں نے نئی دنیا میں قدم رکھنے

اور اپنے لئے مناسب مقام حاصل کرنے کی کوشش بار بار کی تھی۔ انہوں نے مغرب کی نقالی کی۔ مغربی پالیسیاں اور نظریات اپنائے، آزادی کے لئے جدوجہد کی اور اپنا کلچر جدید مغربی خطوط پر لانا چاہا مگر ان کی کوئی کوشش کامیاب نہیں ہوئی۔ ایرانیوں کی طرح اکثر مصری سمجھتے تھے کہ یہ وقت اپنے آپ کو پہچاننے اور ایک جدید مگر امتیازی اسلامی شناخت کے پیدا ہونے کا ہے۔ سادات اس صورتحال سے فائدہ حاصل کرنا چاہتا تھا۔ وہ کوشش کر رہا تھا کہ اسلام مغربی انداز اختیار کر کے ریاست کا مطیع ہو جائے۔ ناصر نے تو اسلام پسندوں کی گوشمالی کی تھی مگر سادات نے انہیں رہا کیا۔ 1971 اور 1975 کے درمیان وہ ان اخوان کو بتدریج رہا کرتا رہا جو جیلوں اور کیمپوں میں قید تھے مذہبی گروہوں کے خلاف ناصر کے سخت قوانین میں اس نے نرمی پیدا کی اور انہیں اجتماع کے علاوہ تبلیغ و اشاعت کی اجازت دی۔ ایک سیاسی جماعت کی حیثیت سے اخوان المسلمین کو ایک بار اور قدم جمانے کی آزادی نہیں ملی تھی مگر وہ تبلیغ کر سکتے تھے اور ان کا جریدہ الدعوۃ بھی شائع ہوسکتا تھا مساجد کی تعمیر پر زور تھا نشریات میں اسلامی موضوعات کو زیادہ وقت دیا جانے لگا تھا۔ سادات مذہبی طلباء کو شہہ دیتا تھا کہ وہ آگے بڑھیں اور ناصر کے حامیوں اور اشتراکیوں سے یونیورسٹیوں کا کنٹرول چھین لیں۔ ناصر نے مذہب کو دبانے کی کوشش کی تھی اور یہ بھی جان لیا تھا کہ اس کا الٹا اثر ہوا ہے۔ یعنی اس کے نتیجہ میں قطب کی سفاک مذہبیت نے جنم لیا تھا۔ اب سادات مذہب کو اپنے ڈھب پر لا کر اس سے اپنا مفاد حاصل کرنے کی کوشش کر رہا تھا اس کا اندازہ بھی افسوسناک حد تک غلط ثابت ہونا تھا۔ ابتدا میں تو سادات کی حکمت عملی کامیاب نظر آتی تھی۔ لگتا تھا کہ اخوان المسلمین نے اپنا سبق سیکھ لیا ہے۔ جیل سے رہائی پانے والے لیڈروں کی پرانی نسل تشدد اور سید قطب سے انحراف کا تہیہ کئے ہوئے تھی۔ وہ حسن البنیٰ کی پالیسیوں میں اصلاح چاہتے تھے۔ اخوان المسلمین ملک پر اسلامی قانون کی حکمرانی پر امن اور آئینی ذرائع سے دیکھنے کے خواہش مند تھے۔ اگرچہ اخوان المسلمین اب بھی قرون اوّل کی تجدید کا دعویٰ کرتے تھے مگر ان کی تنظیم اپنی اپروچ کے لحاظ سے یکسر بدل چکی تھی۔ کہا جاتا ہے حسن البنیٰ سے پہلے اس کی تنظیم کے دائرہ اثر میں بورژوازی کے وہ اراکین شامل تھے جنہوں نے سادات کے 'کھلا دروازہ' کے ذریعے کھل کر دولت جمع کی تھی۔ وہ خوشحال اور آسودہ تھے اس لئے حکومت کا ساتھ دینے پر آمادہ تھے۔ 'نئے اخوان' کو اس اکثریت کی کوئی پرواہ نہیں تھی جو سادات کے مصر سے کٹ کر الگ

تھلگ ہوکر زندگی کی سختیوں اور محرومیوں کا سامنا کررہی تھی۔کوئی اپوزیشن نہ ہونے کی وجہ سے حکومت سے دل برداشتہ لوگ کسی نئے انتہا پسندانہ رستہ کی تلاش کرنے لگے۔

مگر نئے اخوان بھی جلد ہی سادات کی پالیسیوں کے خلاف ہوگئے ہر مہینے ان کا ترجمان 'الدعوۃ' (جس کی اشاعت تقریباً 78ہزار تھی) اسلام کے چار دشمنوں کے خلاف خبریں شائع کرتا تھا۔مغربی عیسائیت (الصلیبیہ) اور اس کے سامراجی عزائم،کمیونزم اور سیکولرازم (اتاترک کی مثال) اور صیہونیت۔باقی تینوں دشمنوں کی سازش میں یہودیوں کو بڑھ چڑھ کر شریک سمجھا گیا۔الدعوۃ میں شائع ہونے والے مضامین قرآن کی ان آیات کا حوالہ دیتے جن میں ان یہودیوں کا ذکر ہے کہ جنہوں نے مدینہ میں پیغمبر اسلامؐ کے خلاف بغاوت کی تھی مگر ان آیات کی بات نہ کرتے جو یہودی مذہب کے حق میں ہیں۔''الدعوۃ' کی یہود دشمنی کا تعلق کہنے کو تو دور نبویؐ سے تھا مگر دراصل وہ نئی اسلامی اختراع تھی جو اسلامی ذرائع کی بجائے، Protocol of the Elders Zion پر مبنی تھی اس لئے نئے اخوان کے لئے ناممکن ہوگیا کہ وہ کیمپ ڈیوڈ کے بعد بھی سادات کے حامی بنے رہیں۔1978 میں 'الدعوۃ' سال بھر حکومت کی اسلامی حیثیت کو مشکوک بتاتا رہا مئی 1981 کے شمارے میں سرورق پر قبۃ الصخرہ کو زنجیروں میں جکڑا ہوا دکھایا گیا۔

سادات کے دورہ یروشلم کے تاریخی موقعہ پر ایک اور انتہا پسند مسلم فرقہ منظر عام پر آیا۔اس کے لیڈروں پر محمد الدھابی ایک ممتاز دینی عالم اور سابق سرکاری وزیر کے قتل کا مقدمہ چل رہا تھا۔مصر کے مسلمان یہ سن کر حیران رہ گئے کہ ان نوجوانوں کی نظر میں اسلام خلفائے راشدین کے زمانے ہی سے روبہ زوال ہے اس وقت سے ہی اسلام کی ترقی میں رکاوٹیں حائل ہیں اور یہ کہ صدر اور مذہبی اسٹیبلشمنٹ سبکے سب جاہلیہ کا حصہ ہیں اس فرقہ نے اعلان کیا کہ یہ جاہلانہ معاشرہ تباہ کرکے اس کے کھنڈروں پر قرآن اور سنت پر مبنی صحیح مسلم معاشرہ کی تعمیر کی جائے۔خدا نے اس فرقہ کے بانی شکری مصطفیٰ کو یہ کام سپرد کیا ہے کہ وہ قانون بنائے اور مسلمانوں کو واپس صراطِ مستقیم پر لے آئے۔

شکری کو1965 میں ناصر کی حکومت نے گرفتار کرکے جیل بھیج دیا تھا اس وقت اس کی عمر 23برس تھی اور وہ اخوان کا لٹریچر بانٹ رہا تھا۔اس معمولی جرم کی پاداش میں اس نے چھ سال ناصر کی جیل میں گزارے اس عرصہ میں وہ مودودی اور قطب کا مطالعہ کرتا رہا اخوان کے

اکثر نوجوان اراکین کی طرح وہ ان کے خیالات سے متاثر تھا۔ جیل مین یہ انتہا پسند علیحدگی اور تنہائی کے سلسلہ میں قطب کے احکام پر سختی سے عمل کرتے وہ جیل کے دوسرے قیدیوں اور بزرگ واعتدال پسند اخوان سے انہیں جاہل قرار دے کر دور رہتے بعض اراکین نے اپنے خیالات مخفی رکھنے کا فیصلہ کیا تھا۔ قطب کو خیال تھا کہ جہالت کے خلاف جہاد شروع کرنے میں اس کے کیڈر کو وقت لگے گا کیونکہ پہلے انہیں اپنی تربیت کے تین مرحلوں سے گزر کر اپنے آپ کو جہاد کے لئے تیار کرنا ہے۔ چنانچہ بعض نوعمر انتہا پسند مانتے تھے کہ وہ اس وقت کمزور ہیں اور موجودہ حالات میں بداعمال کو چیلنج کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہیں۔ فی الحال وہ نارمل زندگی گزاریں گے اور مناسب وقت آنے پر حکومت کو ٹوکیں گے۔ شکری بہرحال اس گرم جوش گروہ سے متعلق تھا جو مکمل علیحدگی (مفصلہ کاملہ) کی تلقین کرتا تھا کیونکہ وہ سمجھتے تھے کہ ان کے فرقے میں نہ شامل ہونے والے کافر ہیں اور اہل ایمان کو ان سے دور رہنا چاہیے۔ وہ دوسرے قیدیوں کے ساتھ بات نہ کرتے اور ان کے ساتھ اکثر دست وگریبان رہتے۔

16 اکتوبر 1971 کو جب شکری ابوزبل کیمپ سے رہا ہوا تو اس نے ایک جماعت مسلم سوسائٹی بنائی جس کے اراکین اپنے آپ کو قطب کا وین گارڈ یعنی پہلا دستہ سمجھتے۔ انہوں نے قطب کے مشن کی تکمیل کے لئے خود کو وقف کر دیا تھا۔ سو جہاد کی تیاری کے لئے وہ معاشرہ کے بڑے حصہ سے الگ ہو گئے تھے۔ انہوں نے مساجد میں عبادت کرنے سے انکار دیا اور مذہبی اور سیکولر اسٹیبلشمنٹ دونوں کے خلاف کفر کا فتویٰ صادر کر دیا۔ اس کے لئے بعض اراکین شکری کے قصبہ ایشیوت کے آس پاس غاروں اور ریگستانوں کو طرف چلے گئے۔ بعض بڑے شہروں کے اردگرد نہایت مفلس اور محروم آبادیوں کے مقابل واقع شاندار کمروں میں رہنے لگے جہاں انہوں نے اپنے خیال میں صحیح اسلامی زندگی بسر کرنے کی کوشش کی۔ 1976 تک مسلم سوسائٹی کے مردوزن اراکین کی تعداد دو ہزار ہوگئی جنہیں یقین تھا کہ خدا نے انہیں موجودہ 'جاہلیہ' کے کھنڈروں پر ایک سچی امت کی تعمیر کے لئے چنا ہے۔ ان کی تقدیر خدا کے ہاتھ میں ہے۔ انہوں نے پہل کر دی ہے۔ باقی سب کچھ خدا کرے گا۔ پولیس نے سوسائٹی پر کڑی نظر رکھی مگر انہیں بے ضرر خبطی سمجھ کر نظرانداز کر دیا۔ اگر سادات اور اس کے مشیران نوجوان شوریدہ سر بنیاد پرستوں کی زندگیوں پر نظر ڈالنے کی زحمت گوارہ کرتے تو دیکھ سکتے تھے کہ یہ مسلم گروہ 'کھلا دروازہ' پالیسی کا

افسوسناک نتیجہ اور جدید مصر کا تاریک ترین پہلو ہے۔

مصر کی تمام سوسائٹی کو کافر قرار دینا شکری کی انتہا پسندی تو ہوسکتی ہے مگر یہ بات بالکل بے بنیاد نہیں تھی۔ سادات کے دور میں کتنی ہی مسجدیں بنائی گئی ہوں مگر جس قوم کی دولت مٹھی بھر اشرافیہ کے ہاتھوں میں ہو اور اس کی بڑی اکثریت مایوس کن غربت میں مبتلا ہو اس کا اسلام سے کوئی واسطہ نہیں ہوسکتا۔ ان مجبور و محروم مصریوں کی حالت زار کا اندازہ اس ہجرت سے بھی ہوسکتا ہے جو انہوں نے شہروں کے بے رحم اور ستم کش مضافات میں ڈیرے ڈالنے کے لئے اختیار کی۔ انہیں احساس تھا کہ مصر میں ان کے لئے کوئی جگہ نہیں اور وہ اپنے ہی وطن میں جلاوطن ہوگئے ہیں۔ سوسائٹی کے گروپ ان نوجوانوں کی نگرانی میں تھے جنہیں شکری نے دوسرے نوجوانوں کی طرح خلیج کی ریاستوں میں بھیجا تھا سوسائٹی کے کئی اراکین نے یونیورسٹی تعلیم حاصل کی تھی مگر شکری کا کہنا تھا کہ سیکولر تعلیم وقت ضائع کرنے کے مترادف ہے۔ مسلمانوں کو قرآن کے سوا کسی تعلیم کی ضرورت نہیں۔ یہ ایک اور قسم کی انتہا پسندی تھی مگر اس میں کچھ سچائی بھی تھی۔ کئی مصری جو تعلیم 1970 کے عشرے میں حاصل کر رہے تھے وہ ان کے لئے بالکل بے مصرف تھی۔ صرف یہ نہیں کہ تعلیم اور تعلیم کے طریقے ناقص تھے بلکہ یونیورسٹی ڈگری اس بات کی ضمانت نہیں تھی کہ گریجویٹ کوئی اچھی ملازمت بھی حاصل کر سکے گا۔ دوسرے ملکوں میں ایک گھریلو ملازمہ بھی مصر کے ایک اسٹنٹ یونیورسٹی پروفیسر سے زیادہ روپیہ کمار ہی تھی۔

جب تک سوسائٹی کھل کر سامنے نہیں آئی حکومت اسے نظرانداز کرتی رہی مگر 1977 میں شکری اپنے خول سے باہر آیا۔ نومبر 1976 میں مخالف اسلامی گروپوں نے سوسائٹی کے بعض ممبر ورغلا کر اپنے ساتھ ملا لئے۔ شکری کی نظر میں منحرف ہونے والے اراکین مرتد اور واجب القتل تھے۔ شکری کے آدمیوں نے ان پر کئی حملے کئے جس کے نتیجہ میں سوسائٹی کے چودہ ممبر ارادہ قتل کے جرم میں گرفتار کر لئے گئے۔ شکری فوراً تصادم پر تیار ہوگیا۔ 1977 کے پہلے چھ مہینوں میں اس نے اپنے ساتھیوں کی رہائی کے لئے مہم شروع کی۔ اخبارات میں مضامین لکھے اور ریڈیو ٹیلی وژن کا تعاون اس سلسلہ میں حاصل کرنے کی کوشش کی جب یہ پرامن ذرائع ناکام ہوگئے تو شکری نے تشدد کا راستہ اختیار کیا۔ 7 جولائی کو اس نے محمد الذھبی کو اغوا کیا جس نے سوسائٹی کو بدعتی قرار دیتے ہوئے اس کے خلاف پمفلٹ لکھا تھا۔ اغوا کے دوسرے دن شکری نے نیویارک،

پیرس اور لندن کے علاوہ مصری اخبارات میں ایک اعلامیہ شائع کرایا جس کے ذریعے اس نے اپنے ساتھیوں کی فوری رہائی اور سوسائٹی کے خلاف میڈیا کے منفی روّیہ پر معذرت کا مطالبہ اور حکومت کی خفیہ ایجنسیوں اور قانونی نظام کی تفتیش کے لئے درخواست کی۔ اس کا تو کوئی سوال ہی نہیں تھا کہ سادات اپنی خفیہ پولیس کے ہتھکنڈے زیر بحث لانے کی اجازت دے۔ شکری کو اس حکومت کا صحیح اندازہ بالکل نہیں تھا جس سے وہ لڑ رہا تھا۔ چندروز بعد جب ذہبی کی لاش ملی تو شکری اور اس کے سینکڑوں ساتھی گرفتار کر لئے گئے۔ مقدمہ کے بعد شکری اور اس کی سوسائٹی کے پانچ ممتاز رہنماؤں کو موت کی سزا دی گئی۔ اخبارات نے اس فرقہ کو 'تکفیر وہجرت' کا نام دیا۔ بنیاد پرست نظریئے کی طرح یہ سوسائٹی بھی بے بسی، کمزوری اور طیش کی پیداوار تھی۔ مگر شکری کا واقعہ ہمیں یاددلاتا ہے کہ ایسی تحریکوں کو ہمیشہ مجنونانہ کہہ کر رَد کر دینا صحیح نہیں۔ شکری بے شک افسوسناک حدتک غلطی پر ہو یا توازن سے محروم ہولیکن اس نے ایک ایسا مخالف کلچر پیدا کیا تھا جو سادات کے جدید مصر کے تاریک پہلو کا عکس تھا۔ وہ جدید مصر جس کا مغرب میں بہت چرچا تھا۔ اس نے ایک مسخ شدہ مبالغہ آمیز شکل میں سب کچھ ظاہر کر دیا جو دراصل ہو رہا تھا اور اس تنہائی کی نشان دہی بھی کر دی جو اپنے وطن میں رہتے ہوئے بے شمار مصریوں کا مقدر بن گئی تھی اور وہ محسوس کرتے تھے کہ ان کا وطن اب ان کا وطن نہیں۔

اسلامی طلباء کی تنظیم جماعت الاسلامیہ کامیاب اور حوصلہ مند تھی سادات کے دورِصدارت میں اسے یونیورسٹیوں پر اقتدار حاصل تھا۔ شکری کی سوسائٹی کی طرح جماعت بھی اپنے آپ کو سید قطب کا ہراول دستہ سمجھتی تھی مگر اس نے معاشرہ سے اپنا رشتہ نہیں توڑا تھا بلکہ ایک ایسے معاشرہ میں اسلامی ہونے کی حیثیت سے اپنی جگہ بنانے کی کوشش کی جوان کی ضروریات سے بے بہرہ تھا۔ مصر کی یونیورسٹیاں، آکسفورڈ، ہارورڈ یا سوربعدن کی طرح نہیں تھیں۔ وہ طلباء کے بے پناہ ہجوم، افسوسناک حدتک ناکافی سہولتوں اور اپنی بے مہری سے پہچانی جاتی تھی۔ 1970 اور 1977 کے درمیان طلباء کی تعداد دولاکھ سے تقریباً پانچ لاکھ ہوگئی۔ طلباء کا ہجوم اور زیادہ بڑھنے سے ایک نشست پر دو اور کہیں تین طالب علم سکڑ کر بیٹھنے لگے۔ لیکچر ہالوں اور لیبارٹریوں میں اتنا ہجوم ہوتا کہ کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی خاص طور پر جب مائیکروفون اکثر توڑ دیئے جاتے تھے۔ طالبات کی حالت زار کا اندازہ کرنا اور بھی مشکل ہے۔ ان میں سے اکثر کا تعلق روایت پسند گھرانوں سے

تھا۔ انہیں بسوں میں یا یونیورسٹی کے ہالوں اور کمروں میں لڑکوں کے ساتھ دھکم پیل میں بڑی خجالت محسوس ہوتی۔ تعلیم کے معنی بے سوچے سمجھے رٹنا تھا۔ امتحان میں کامیابی کے لئے پروفیسروں کے بتائے ہوئے نوٹ رٹنے اور ان کے لیکچر اگلنا لازمی تھا۔ سماجی علوم، قانون اور انسانی علوم کوڑا کچرا سمجھے جاتے تھے اور انہیں تقریباً منسوخ کر دیا گیا تھا۔ قابلِ طلباء کی ذاتی پسند کچھ بھی ہو انہیں طب، دواسازی، انجینئرنگ اور اقتصادیات کو مضامین کے طور پر لینے پر مجبور کیا جاتا ورنہ انہیں بدترین پروفیسروں سے پڑھنا پڑتا تاکہ گریجوئیشن کے بعد انہیں ملازمت ملنے کے مواقع اور کم ہو جائیں۔ اس ماحول میں معاشرہ یا بنی نوع انسان کے متعلق سوچنے کی تربیت طلباء کو نہیں دی جاتی تھی بلکہ توقع کی جاتی تھی کہ جو پڑھایا گیا ہے طلباء اسے بے چون و چرا ہضم کریں۔ ماڈرن کلچر سے ان کی واقفیت محض سطحی تھی اس لئے ان کے مذہبی عقائد و شعائر نے اس سے کوئی اثر قبول نہیں کیا۔

جماعت نے چند کتابیں اور پمفلٹ شائع کئے مگر اسلام الدین العریان کا 'الدعوۃ' کے لئے ایک مقالہ (1980) اہم آئیڈیاز کی نشان دہی کرتا ہے۔ سید قطب ان کی انسپریشن کا ذریعہ تھا۔ جماعت کو یقین تھا کہ روسی اور مغربی نظریات رَد کرنے اور اسلام کی طرف لوٹنے کا وقت ہے۔ مصراب بھی کفار کے اختیار میں ہے۔ صحیح معنوں میں آزادی ممکن نہیں اگر مذہبی بیداری عام نہ ہو۔ جماعت خیالات و تصورات پر بحث کرنے تک محدود رہی بلکہ اپنے حالات کے مطابق اسلام کو تخلیقی اور عملی طور پر بروئے کار لائی۔ 1973 میں طلباء نے بڑی یونیورسٹیوں میں سمر کیمپ لگانے شروع کئے جہاں وہ قرآن پڑھتے رات کو اکٹھے نماز ادا کرتے اسلام کے سنہری دور سیرت رسولؐ اور خلفائے راشدین کے متعلق تقریریں سنتے۔ دن کے وقت کھیل اور دفاعی تربیت حاصل کرتے۔ چند ہفتوں کے لئے طلباء بالکل اسلامی ماحول میں کھیلتے، سوچتے اور زندگی بسر کرتے ایک طرح یہ معاشرہ کے بڑے دھارے سے الگ ایک ایسی دنیا کی سمت عارضی ہجرت تھی جہاں وہ قرآن کی تعلیمات پر عمل کر سکتے تھے اور اپنی زندگی پر اس کے اثر کا اندازہ خود ہی لگا سکتے تھے۔ وہ قرآنی تعلیمات کے ماحول میں زندہ رہنا سیکھ جاتے تھے۔ کیمپوں نے انہیں حکومت کے غیر اسلامی نظام کے مقابلے میں اسلامی یوٹوپیا (مثالی حکومت) کے خواب دکھائے مختلف سطحوں پر لوگ جدیدیت کے تلخ اور ناکام تجربہ پر بحث کرتے جس سے امریکہ اور یورپ کا بھلا بے شک

ہوا ہو مگر جس سے مصر کے صرف دولت مندوں نے فائدہ حاصل کیا۔

جب وہ یونیورسٹی واپس آتے تو طلباء کیمپوں کا تجربہ یونیورسٹی میں دہرانے کی کوشش کیا کرتے۔ انہوں نے طالبات کے لئے ایک منی بس سروس شروع کی تا کہ وہ پبلک ٹرانسپورٹ کی اذیتوں سے بچ سکیں۔ لیکچر ہال میں کچھ ایسی ہی وجوہات کی بناء پر وہ طالبات اور طلباء کی الگ قطاریں بنانے اور اسلامی لباس پہننے پر زور دیتے۔ ایک روایت پسند معاشرے میں لمبے لمبے پردہ والے برقعے زیادہ مناسب تھے جو مغربی انداز کی ملاقاتوں اور رومان کے روادار نہیں تھے اور جہاں (معاشی وجوہات کی بناء پر شادی بس کی بات نہیں تھی) مصری نوجوانوں کی جنسی بھوک ایک بہت بڑا مسئلہ تھی۔ جماعت نے مسجدوں میں تعلیمی سیشن بھی شروع کئے جہاں طلباء اس طرح خموشی سے مطالعہ کر سکتے تھے جو ہوسٹل کے ہجوم اور ہنگاموں میں کسی طور پر ممکن نہیں تھا۔ یہ پالیسیاں کامیاب رہیں۔ کوئی طالبہ برقعہ پہنے یا محض خجالت سے بچنے کے لئے خواتین کی الگ قطار میں کھڑی ہو جائے تو اسے فوراً یہ احساس ہوتا تھا کہ حکومت اس کی بھلائی سے زیادہ جماعتی کیڈر کی بھلائی میں دلچسپی لیتی ہے۔ یکسوئی کے لئے اپنی قیام گاہ کا آرام اور سہولت چھوڑ کر مسجد میں جا کر لکھنا پڑھنا ایک چھوٹی سی ہجرت کی علامت تھی جس سے طلباء میں یہ احساس پیدا ہوتا تھا کہ اسلامی فضا ان کے لئے کہیں زیادہ بہتر ہے۔ اکثر طلباء جدید دور سے پہلے کے روایت پسند دیہی معاشرے سے آتے تھے۔ صرف یہ نہیں کہ یونیورسٹی میں جدیدیت کا تجربہ ان کے لئے پریشانی اور اجنبیت لئے ہوئے تھا بلکہ انہیں کوئی دوسرے ایسے فکری جواز مہیا نہیں کئے جاتے تھے کہ وہ اپنی معمولی تعلیم کے دوران حکومت پر تنقید کر سکیں۔ ان میں سے اکثر یہ سمجھتے تھے کہ اس دنیا میں صرف اسلام تمام مسائل کا واحد حل ہے۔

مغربی دانش وروں کو پردے کی واپسی سے خاص طور پر مایوسی ہوئی کیونکہ وہ لارڈ کرومر کے دنوں سے اسے مسلمانوں کی پس ماندگی کی علامت سمجھتے تھے مگر وہ مسلم عورتیں ایسا نہیں سمجھتی تھیں جنہوں نے عملی وجوہات کی بناء پر اسے رضا کارانہ طور پر اختیار کیا تھا اور اس لئے بھی کہ اس طرح وہ مغربی شناخت کے اجنبی دائرے سے باہر نکل جائیں۔ پردہ، اپنے آپ کو پہچاننے کی علامت تھی جس کے لئے اسلام پسند نو آبادیاتی دور کے بعد اتنی شدت کے ساتھ کوشاں تھے آخر مغربی لباس بھی تو کوئی ایسی مقدس شئے نہیں تھی۔ یہ خواہش کہ تمام عورتیں اسے پہنیں، اسلام پسندوں کی

تاویل اور اختراع ہے جو اس ذہنیت کی غماز ہے کہ مغرب کی ہر بات کی تقلید ایک مجبوری سمجھی جائے ان برسوں میں برقعہ پوش عورت اسلامی خودشناسی کی علامت اور مغربی کلچر کی اجارہ داری کی تردید بن گئی۔ پردہ مغرب کی جنسی بے راہ روی کے خلاف اس کی ڈھال تھی۔ جہاں مغرب کے مرد اور عورتیں انسانی جسم کو ورزش اور کھیل کود کے ذریعے انسانی کنٹرول میں لانا چاہتے ہیں اور اپنے جسموں کو ماہ وسال کے اثرات سے محفوظ رکھنے کی کوشش کرتے ہوئے زندگی سے لپٹے ہوئے ہیں وہاں پردہ دار اسلامی جسم خموشی سے اعلان کرتا ہے کہ وہ خدا کی رضا کے ماتحت ہے اور اس دنیا کے لئے نہیں بلکہ اس دنیا سے بلند اور ماوراء ہے۔ مغرب میں عورتیں اور مرد اکثر اپنے بیش قیمت لباس اور خوبصورتی کے ساتھ ترشے ہوئے جسموں کی نمائش لہرالہرا کر بڑے فخر کے ساتھ کرتے ہیں جبکہ کم وبیش ایسے ہی کپڑوں میں ملبوس مسلمانوں کے پردہ دار جسم اسلامی وژن کی مساوات اور یکسانیت کے مظہر ہیں اسی انداز سے وہ مغرب کی شخصیت پرستی اور انفرادیت پرستی پر اجتماعیت کے قرآنی آئیڈیل کو ترجیح دیتے ہیں۔ اسی انداز سے شکری کی پنچائیتوں کی طرح اسلامی عورت نئے زمانہ کے تاریک پہلوؤں کی خاموش نقاد ہے۔

جس عورت نے اسلامی لباس پہننے کا فیصلہ کیا ضروری نہیں کہ اس نے جدیدیت سے پہلے کے نسوانی دورغلامی کو دہرایا ہو۔ 1982 کے ایک سروے کے مطابق پردہ دار خواتین، مغربی لباس پہننے والی خواتین سے زیادہ قدامت پسند تھیں اسلام پسندوں کی ایک بہت بڑی تعداد جنس کے مسئلہ پر ترقی پسندانہ خیالات کی حامل تھی۔ 93 فیصد بے پردہ عورتوں کے مقابلے میں 88 فیصد باپردہ عورتوں نے نسوانی تعلیم کے حق میں رائے دی۔ 88 فیصد باپردہ عورتوں نے گھروں سے باہر کام کو ضروری قرار دیا جب کہ 77 فیصد باپردہ عورتوں کی خواہش گریجویشن کے بعد ملازمت کرنے کی تھی اس کے برعکس پردہ دار عورتوں کی رائے بالترتیب 95 اور 85 فیصد تھی۔ دوسرے مسائل پر فرق اس سے بھی زیادہ تھا مگر باپردہ عورتوں کی اکثریت (53 فیصد) اب بھی چاہتی تھی کہ مردوں اور عورتوں کی سیاسی ذمہ داریاں اور حقوق یکساں ہوں اور یہ کہ عورتیں ملک کے اندر اعلیٰ ترین عہدہ پر فائز ہونے کی اہل ہوں (63 فیصد) صرف 38 فیصد باپردہ عورتون نے شادی میں مردوں اور عورتوں کی برابری کے حق میں رائے دی جب کہ 66 فیصد باپردہ عورتوں نے شادی میں مردوں اور عورتوں کی برابری کے حق میں رائے دی جبکہ 66 فیصد بے پردہ عورتوں نے اس برابری کی حمایت

کی۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ باپردہ اور بے پردہ عورتوں دونوں کی اکثریت (67فیصد باپردہ) (52.7فیصد بے پردہ) نے شریعت کو ملک کا قانون بنانے کی ضرورت پر زور دیا۔

یہ سچ ہے کہ جدید دور سے پہلے ہر قانون کی طرح ،شریعت بھی عورت کو ایک ثانوی اور کمتر حیثیت دیتی ہے مگر جیسا کہ لیلیٰ احمد نے Women and Gender میں لکھا ہے کہ کئی مسلمان ریفارمروں کی طرح یہ عورتیں بھی الازہر کے ازمنۂ وسطیٰ کے فقہہ کی بجائے قرآن وسنت کے سچے اسلام کی شیدائی ہیں۔ان کا ایمان ہے کہ سچا اسلام عورتوں سمیت سب کے لئے انصاف اور مساوات کا حکم دیتا ہے مگر احمد کا کہنا ہے کہ اس سے عورتیں پدری نظام کی بندش قبول کرنے پر آمادہ' ہوسکتی ہیں اور یہ کہ جب بھی اسلامی حکومت اقتدار میں آتی ہے تو عورتوں کی حالت عام طور پر اور خراب ہو جاتی ہے۔ جب حالات ٹھیک نہ ہوں تو مردوں کو ان کی بیویوں پر اور زیادہ اختیار دے کر بے چینی کا رفع کرنا آسان ہوتا ہے۔ پھر بھی یہ حقیقت اپنی جگہ موجود رہتی ہے کہ اسلامی لباس ہمیشہ نسوانی غلامی کا مظہر نہیں۔ترک سکالر نیلوفر گول کا کہنا ہے کہ باپردہ عورتیں اکثر جنگجو بے باک اور اعلیٰ تعلیم یافتہ ہوتی ہیں۔کئی باپردہ عورتوں نے بنیاد پرستی کی تحریک میں سرگرم اور دلیرانہ حصہ لیا ہے۔

احمد نے یہ بھی بتایا ہے کہ مصر میں اسلامی لباس پہننا ماضی کی طرف واپس جانا نہیں۔اس لباس میں کوئی روایتی بات نہیں تھی جو مصر کی عورتیں 1970اور1980 کے عشروں میں پہنتی رہیں وہ مغربی سٹائل سے مشابہہ ایک نیا فیشن تھا (لمبی بانہوں اور سکرٹ کے علاوہ،اس چغہ یا لبادے کی بجائے جو ان کی دادیاں پہنتی تھیں) درحقیقت وہ نئی سوسائٹی میں ڈھلنے کی ایک صورت تھی ان برسوں میں زیادہ سے زیادہ عورتوں نے اعلیٰ تعلیم حاصل کرنی شروع کی۔ یونیورسٹیوں میں اسلامی لباس پہننے والی عورتوں میں کثیر تعداد ان عورتوں کی تھی جو اپنے خاندانوں میں پہلی بار بنیادی تعلیم سے آگے بڑھتی تھیں ان کا تعلق اکثر دیہی علاقوں سے تھا۔اس لئے ان کا لباس ان کپڑوں کی نسبت ماڈرن سمجھا جاتا تھا۔ جو ان کے خاندان میں پہنے جاتے تھے۔ جب انہوں نے بڑے شہروں کی ہوش ربا جدیدیت کا سامنا کیا،ان کی بین الاقوامیت، اسراف،عدم مساوات،تشدد اور بے پناہ ہجوم،تو وہ آسانی کے ساتھ مرعوب ہو گئے۔ان کے لباس سے ان کی ترقی اور زندگی میں پیش قدمی تو ظاہر ہوتی تھی مگر وہ لباس کسی حد تک ان کے پرانے ملبوسات کا تسلسل بھی تھا۔اسلامی شناخت اور اس کے ساتھ ان کی اجتماعیت نے ان پر یہ کٹھن مرحلہ آسان کر دیا۔ہم ماضی میں دیکھ

چکے ہیں کہ مذہب نے لوگوں کے لئے رسمی طرز زندگی، اور نظریہ سے زیادہ جدید طرزِ حیات میں بدلنا آسان کیا ہے۔ مردوں اور عورتوں کا اسلامی لباس، کوئی ایسی ہی حکمت عملی ہوسکتی ہے۔

تبدیلیوں کے تمام مرحلے اذیت ناک ہوتے ہیں۔1970 کے عشرے میں مصر کی اسلامی تحریکوں میں سے جماعت کا روّیہ ہی کم جارحانہ تھا مگر ملی ٹنٹ رہنماؤں میں بعض ایسے بھی تھے جو کسی موقعہ پر یونیورسٹی پر قبضہ کرنے کے لئے قوت بازو سے کام لیتے تھے۔ بالائی مصر کی نئ منیا یونیورسٹی میں جماعت الاسلامیہ کے متعلق پیٹرک گیفنی نے ایک مطالعہ کیا۔ وہاں طلباء ابھی پوری طرح منظّم نہیں تھے۔ وہ اسلامی حلقوں میں خصوصی مقامات مثلاً بلیٹن بورڈ، کیفیٹیریا اور سایہ دار میدان وغیرہ بناتے۔1977ء تک مخالفین کو ڈرا دھمکا اور خاموش کرکے اسلام پسندوں نے سٹوڈنٹ یونین پر قبضہ کرلیا۔ انہوں نے آرٹ اور تعلیم کے کالجوں کی مشترکہ زمین پر ایک مسجد بنالی جہاں طلباء کو کلاسوں کے درمیان جمع ہونا پڑتا تھا۔ انہوں نے نماز کے لئے دریاں وغیرہ بچھا کر اس جگہ پر قبضہ کرلیا، نماز کے لئے لاؤڈ سپیکر کا استعمال شروع ہوگیا اور باریش نوجوان قرآن پڑھتے ہوئے ہر وقت وہاں موجود رہتے۔

سیکولر زمین پر یہ غاصبانہ قبضہ اسلام کی تعمیر نو اور مغرب زدہ ذہنوں پر اس کا اثر ڈالنے کی ایک بھدی کوشش تھی۔ منیا کے اسلام پسند مغربی تہذیب کی عالم گیر وسعت کے منکر تھے اور اب نقشہ بدلنے کی کوشش کرر ہے تھے۔ اسلامی لباس اختیار کرنے کی طرح ایک عام جگہ کو مسجد میں بدل دینا سیکولر طرز زندگی کے خلاف بغاوت تھی۔ وہ تقریباً ایک سو سال تک دوسری ترقی پذیر قوموں کی طرح تاریخ بنانے اور جدید معاشرہ قائم کرنے میں ناکام رہے تھے۔ اب وہ کچھ کرکے دکھانا چاہتے تھے چاہے وہ کتنی ہی چھوٹی سطح پر ہو۔ وہ مغربی نقطۂ نظر کی مرکزیت کے خلاف احتجاج کرر ہے تھے اور اپنے نقطۂ نظر کی تشہیر ایک بار پھر چاہتے تھے۔ شہری حقوق یا نسل پرست نسائی یا ماحولیاتی تحریکوں کی طرح وہ اپنی حیثیت منوانے پر تلے ہوئے تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ صنعتی جدیدیت نے انہیں کچل دیا ہے۔ ان کا مقصد مقامی اہمیت، گلوبل سوسائٹی کے خلاف اُجاگر کرنا تھا جسے مغرب نے مسلط کیا تھا۔ جدید دور کے بعد کی دوسری تحریکوں کی طرح یہ نو آبادیات اور مغرب کی مرکزی حیثیت ختم کرنے کا علاماتی عمل تھا۔ اس حقیقت کا اظہار تھا کہ انسانیت کے سامنے اور امکانات بھی ہیں۔ جونہی سادات نے مغرب کے ساتھ قریبی تعلقات اور اسرائیل

کے ساتھ امن قائم کیا، حکومت کے ساتھ لڑائی ناگزیر ہوگئی۔ منیا میں طلباء کا تشدد بڑھ گیا۔ انہوں نے گرجے تباہ کر دیئے ان طلباء پر حملے کئے جنھوں نے اسلامی لباس پہننے سے انکار کیا اور فروری 1979 میں ایک ہفتہ تک میونسپل کارپوریشن کی عمارت پر قبضہ کئے رکھا۔ جب پولیس نے ان کی ایک مسجد پر تالا لگا دیا تو انہوں نے ایک اہم سڑک پر ٹریفک روک کر جمعہ کی نماز ادا کی۔ اس کے بعد انہوں نے یونیورسٹی شہر میں طلباء کے رہائشی بلاک پر قبضہ کیا اور تیس عیسائی طلباء یرغمال بنا لئے دو روز بعد ایک ہزار فوجی بغاوت کچلنے کے لئے آئے۔

1977 تک سادات نے جماعت الاسلامیہ کی حمایت کی تھی مگر منیا کے واقعات نے اس کا ارادہ بدل دیا۔ 14 اپریل 1979 کو اس نے منیا اور ایسیوٹ میں تقریر کی اور کہا حکومت، مذہب کا یہ ناجائز استعمال مزید برداشت نہیں کرے گی۔ جون میں مصری طلباء کی جنرل یونین پر پابندی لگا دی گئی اور اس کے اثاثے منجمد کر دیئے گئے مگر جماعت کا اس طرح منظر سے غائب ہونا ممکن نہیں تھا۔ انہوں نے رمضان میں روزہ افطار کرنے کے بعد بڑے شہروں میں جلوس نکالے۔ قاہرہ میں صدارتی محل 'عابدین' کے باہر پچاس ہزار مسلمان نماز کے لئے جمع ہوئے تا کہ سادات کو یاد دلائیں کہ اسے خدا کے قانون کے مطابق حکومت کرنی چاہیے۔ ممتاز اخوان یوسف الکرادادی لوگوں سے خطاب کرنے لئے آیا۔ اس نے سادات (جو ان دنوں رامس دوم کی ممی محفوظ کرنے میں دلچسپی لے رہا تھا) کو مخاطب کر کے کہا۔ ''مصر مسلمان ملک ہے فرعونوں کی زمین نہیں جماعت الاسلامیہ کے نوجوان اس کے صحیح نمائندے ہیں نہ کہ اہرام، تھیٹر اور فلمیں ہیں۔'' مصر مسلمان ملک ہے فرعونوں کی زمین نہیں جماعت الاسلامیہ کے نوجوان اس کے صحیح نمائندے ہیں نہ کہ اہرام، تھیٹر اور فلمیں ہیں۔'' مصر کی عورتیں پردہ دار عورتیں ہیں جو خدا کے احکام بجالاتی ہیں۔ مصری وہ نوجوان ہیں جو اپنی داڑھیاں بڑھاتے ہیں۔ یہ الازہر کی زمین ہے۔''

لوگوں کو کچلنے اور ان کی آواز دبانے کے اپنے نتائج ہوتے ہیں۔ اسلام پسند طلباء نے اب یونیورسٹیوں کو اسلامی قلعے بنانے کے لئے اپنی کوششیں دوچند کر دیں۔ تھیٹروں اور سینماؤں پر اور زیادہ حملے ہونے لگے عیسائیوں اور بے پردہ عورتوں کی بھی شامت آ گئی۔ طلباء نے اپنا پیغام یونیورسٹی کے باہر پھیلانا شروع کر دیا۔ اب حکومت اور سیکولرازم کے خلاف کھلی جنگ تھی۔ جماعت کو دوبارہ منظّم ہونے کی اجازت نہیں دی گئی۔ اس لئے اس کے اکثر ممبر نئے اور زیادہ تشدد

پسند خفیہ گروہوں میں شامل ہو گئے۔

یہ تمام واقعات ایرانی انقلابی کے پس منظر میں ہوئے جبکہ سادات مغرب کے قریب ہونے کی کوشش میں شاہ ایران سے اپنی دوستی کا حوالہ بڑے فخر سے دیا کرتا تھا۔ مصر میں اسلامی ملی ٹینٹ انقلابیوں پر ناز کرتے تھے جو شاہ کا تختہ الٹ رہے تھے۔79-1978 کا ایران انقلابی تاریخ کا نیا موڑ تھا ساری دنیا کے ہزاروں مسلمانوں کے لئے تحریک کا ذریعہ تھا جو برسوں سے محسوس کر رہے تھے کہ ان کا مذہب دشمنوں کے نرغے میں ہے۔ خمینی کی کامیابی نے ثابت کر دیا کہ اسلام کا مقدر تباہی نہیں، یہ زبردست سیکولر طاقتوں کا مقابلہ کر سکتا ہے اور جیت سکتا ہے مگر اس انقلاب سے مغرب میں اکثر لوگوں پر مایوسی اور دہشت طاری ہو گئی۔ ایسا لگا کہ سفا کی تہذیب پر غالب آ گئی ہے۔ سیکولر حلقوں کی رائے میں خمینی اور ایران وہ تمام غلطیاں کریں گے جو ہو سکتی ہیں کیونکہ انقلاب سے وہ تمام نفرت آشکار ہو گئی جو مغرب کے خلاف عام طور پر اور امریکہ کے خلاف خاص طور پر ایرانیوں کے دل میں تھی۔

1970 کے عشرے میں ایران زوروں پر تھا۔ امریکی سرمایہ کاروں اور ایرانی اشرافیہ دونوں نے سفید انقلاب کے بعد تجارت اور صنعتوں سے جی بھر کر دولت کمائی۔ تہران کا امریکی سفارت خانہ جاسوسی کا مرکز ہونے سے زیادہ (جیسا کہ انقلابیوں نے الزام لگایا) دلالی کا مرکز تھا جس کا مقصد دولت مند امریکیوں کا رابطہ دولت مند ایرانیوں سے کرانا تھا۔ اس صورت حال سے پھر سارا فائدہ اشرافیہ نے حاصل کیا۔ ملک مالدار ہو گیا تھا مگر لوگ غریب ہو گئے تھے۔ اوپر کے طبقوں میں دولت کی ریل پیل اور بے تحاشہ کرپشن تھی جبکہ بورژوازی (شہری متوسط طبقہ) اور شہری غریب طبقہ مفلسی اور محرومی کے شکار تھے۔74-1973 میں تیل کی قیمت بڑھنے سے افراط زر میں زبردست اضافہ ہوا کیونکہ سرمایہ کاری کی سہولت بڑے بڑے دولت مندوں کے سوا کسی کے لئے نہیں تھی۔ دس لاکھ افراد بے روزگار تھے۔ غیر ملکی سامان کے آنے سے چھوٹے تاجر تباہ ہو گئے اور 1977 تک افراط زر دولتمندوں پر بھی اثر انداز ہونے لگی۔ بے چینی اور مایوسی کی اس فضا میں دو گوریلا تنظیمیں سرگرم عمل ہو گئیں اور امریکہ کے فوجیوں اور مشیروں کو قتل کرنا شروع کر دیا۔ امریکہ سے ترک وطن کر کے آنے والوں کے خلاف سخت نفرت پیدا ہو گئی تھی کیونکہ وہ ایران کی بحرانی صورتحال سے ناجائز فائدہ اٹھا رہے تھے۔ اس عرصہ میں شاہ کی حکومت اور زیادہ ظالمانہ اور

آمرانہ ہوگئی۔

اکثر مخلص ایرانیوں نے علماء کی طرف اُمید بھری نظروں سے دیکھا۔ علماء نے مختلف طریقوں سے بحران کو حل کرنے کو کوشش کی۔قم میں آیت اللہ شریعت مداری ایک نہایت ممتاز مجتہد نے حکومت کے ساتھ محاذ آرائی کی مخالف کی اگر چہ وہ1906 کے آئین کو بحال ہوتا ہوا دیکھنے کے لئے بے چین تھے۔آیت اللہ طالیقانی جو آئین پر سختی سے عمل کرنے کے مطالبہ اور حکومت کی زیادتیوں کے خلاف احتجاج کی بناء پر کئی دفعہ جیل جاچکے تھے۔ انہوں نے مہدی بازرگان اور بنی صدر جیسے مصلحین کے ساتھ بھی کام کیا تھا جو ایران کو اسلامی ری پبلک (جمہوریہ) تو بنانا چاہتے تھے مگر ملاؤں کی حکومت کے خلاف تھے۔ طالیقانی نہیں چاہتا تھا کہ علماء کو حکومت میں مراعاتی کردار حاصل ہو یقیناً انہیں خمینی کے ولایت فقیہہ (طلسماتی فقیہہ کی حکومت) کے تصور سے اتفاق نہیں تھا مگر خمینی بدستور حکومت کی شدید اور غیر متزلزل مخالف کی علامت تھا۔جون 1975 میں مدرسہ فیضیہ کے طلباء نے خمینی کی گرفتاری1963 کا دن مناتے ہوئے مظاہرہ کیا۔ پولیس آنسو گیس استعمال کرتے ہوئے عمارت میں داخل ہوگئی اور ایک طالب علم کو چھت سے گرا کر ماردیا۔حکومت نے مدرسہ بند کردیا مگر اس مدرسہ کے ویران اور خاموش درودیوار مذہب کی مخالفت اور احتجاج کے خلاف اشتعال کی علامت بن گئے اور شاہ امام حسین کے قاتل یزید کی مثال بن گیا۔1977 کے آغاز میں حکومت اشتعال کی علامت بن گئے اور شاہ امام حسین کے قاتل یزید کی مثال بن گیا۔1977 کے آغاز میں حکومت کا روّیہ نسبتاً بہتر ہوگیا اور ایسا لگا کہ عوام کے دباؤ کے سامنے جھک گئی ہے گزشتہ سال جمی کارٹر امریکہ کا صدر منتخب ہوا تھا انسانی حقوق کے لئے اس کی مہم اور ایران کی عدالتوں اور جیلوں کے متعلق ایجنسی انٹرنیشنل کی مخالفانہ رپورٹ نے شاہ کو شاید مجبور کیا ہو کہ وہ بے چینی کو کم کرنے کو کوشش کرے مگر حقیقی تبدیلی بہت کم ہوئی۔سنسر شپ کے قوانین نرم کئے گئے تو مارکیٹ میں ادب کا سیلاب آ گیا جس سے معاشرہ کے ہر حصہ میں مایوسی کا اظہار ہوتا تھا۔طلباء یونیورسٹیوں میں حکومت کی مداخلت کی وجہ سے غضبناک تھے، کسان زرعی درآمدات کے خلاف احتجاج کرتے تھے جس کی وجہ سے دیہات میں غربت اور بڑھ گئی تھی، تاجر افراط زر اور کرپشن سے خوف زدہ تھے وکلاء سپریم کورٹ کی اہمیت کم کرنے کے فیصلے کے خلاف احتجاج کرتے تھے مگر انقلاب کے آثار کہیں نہیں تھے۔ایران کے اکثر علماء نے شریعت مداری کی

تقلید کی اور خموشی کا رستہ اختیار کیا۔ یہ ملا نہیں بلکہ ایران کے لکھاری تھے جنھوں نے 1977 میں حکومت کے خلاف زبردست احتجاج کیا۔ 10 اکتوبر سے 19 اکتوبر تک تہران کے گوئٹے انسٹی ٹیوٹ میں تقریباً ساٹھ ممتاز ایرانی شعراء اور لکھاریوں نے لوگوں کے سامنے اپنی تحریریں اور کلام پیش کیا مگر ساوک نے مداخلت نہیں کی اس کے باوجود کہ تمام تحریریں حکومت کے خلاف تھیں۔ شاید حکومت پرامن احتجاج کے ساتھ زندہ رہنا سیکھ رہی تھی۔

مگر یہ دور زیادہ عرصہ نہیں رہا۔ ایسی ادبی میٹنگوں کے تھوڑے ہی عرصہ بعد شاہ نے محسوس کیا کہ معاملات ہاتھ سے نکل رہے ہیں۔ حکومت کے مخالفین ایک بڑی تعداد میں گرفتار کر لئے گئے اور 3 نومبر 1977 کو خمینی کا بیٹا مصطفیٰ عراق کے اندر مشکوک حالات میں مر گیا۔ اس کی موت میں ساوک کے ایجنٹوں کا ہاتھ تھا۔ شاہ نے ایک بار پھر یزید کا کردار ادا کیا۔ خمینی اب جلاوطن مخفی امام جیسا لگنے لگا تھا۔ امام حسین کی طرح اس کا بیٹا بھی ایک ظالم حکمران کے ہاتھوں مارا گیا۔ تمام ایران میں لوگ روائتی انداز میں مصطفیٰ کی موت پر سینہ کوبی اور گریہ کرنے لگے۔ تہران میں پولیس نے ماتمیوں پر حملہ کر دیا۔ تہران میں ہونے والی ادبی اور شعری مجالس میں 16,15 اور 25 نومبر کو مزید گرفتاریاں اور مار پیٹ ہوئی۔ مگر عام بغاوت کی اب بھی کوئی صورت نہ تھی۔ نجف میں خمینی جو مصطفیٰ کو اپنی آنکھوں کا نور کہتا تھا خاموش بیٹھا تھا۔

اس دوران میں 13 نومبر 1977 کو رضا شاہ، صدر جمی کارٹر سے بات کرنے کے لئے امریکہ روانہ ہو گیا۔ ہر روز امریکی یونیورسٹیوں میں تعلیم پانے والے ایرانی طالب علم ہجوم در ہجوم شاہ کے خلاف نعرہ بازی کے لئے وائٹ ہاؤس کے باہر جمع ہو جاتے۔ ایک رسمی ڈنر کے موقعہ پر کارٹر نے امریکہ اور ایران کے مابین خصوصی تعلقات کی اہمیت پر بڑی جذباتی تقریر کی جس میں اس نے ایران کو دنیا کے ہنگامہ خیز کونے میں استحکام کے ایک جزیرے کا نام دیا۔ 31 دسمبر کارٹر بھارت جاتے ہوئے تہران رکا جہاں اس نے ایک بار پھر ایرانی حکومت کے حق میں اپنی گرمجوشی کا مظاہرہ کیا۔ آخر تک کارٹر شاہ پر اپنے اعتماد کی بات کرتا رہا۔ کارٹر ایران میں محرم کے مقدس مہینہ میں آیا جبکہ کربلا کا المیہ ہر ذہن پر چھایا ہوا تھا۔ اس سال لوگ خمینی کے متعلق بھی سوچ رہے تھے شاہ نے چہلم کے روائتی ماتم پر بھی پابندی لگائی تھی جو عام طور پر ہر موت کے بعد چالیس دن تک کیا جاتا تھا۔ مصطفیٰ کے معاملہ میں شاہ نے اس کی اجازت نہیں دی۔ کارٹر نے اس نازک لمحہ میں

ایران آ کر شاہ کی حمایت کرتے ہوئے بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ اپنے لیے 'بڑے شیطان' کا رول چن لیا۔

امریکیوں کو یہ جان کر بڑا صدمہ ہوا کہ انقلاب میں اور انقلاب کے بعد انہیں شیطانی قوم کہا گیا۔ وہ امریکی بھی اس بات سے خفا تھے جو 1953 میں مصدق کی حکومت کا تختہ الٹنے کے سلسلہ میں سی آئی اے کی سازش سے واقف تھے اور جانتے تھے کہ اکثر ایرانی وہ زخم ابھی تک نہیں بھولے۔ امریکی پالیسی چاہے غلط ہو مگر وہ اس کی حقدار نہیں تھی۔ اس بات سے اس یقین کو تقویت ملی کہ ایران کے تمام انقلابی متعصب، ہسٹیریائی اور توازن سے محروم ہیں۔ مغرب کے اکثر لوگ شیطان کے امیج کو غلط سمجھتے ہیں عیسائیت میں شیطان بدی کا زبردست مجسمہ ہے مگر اسلام میں وہ بہت حد تک قابو میں رہتا ہے بلکہ قرآن نے یہ اشارہ بھی کیا ہے کہ یوم آخرت کے موقعہ پر اسے معاف کر دیا جائے گا۔ خدا کی رحمت اور بخشش پر قرآن کو اتنا بھروسہ ہے۔

امریکہ کو برا شیطان کہنے والے ایرانیوں کا یہ مطلب نہیں کہ امریکہ اہلیسانہ انداز میں برا ہے بلکہ ان کا مطلب اس سے کہیں زیادہ نپا تلا ہے۔ شیعہ مسلک میں شیطان ایک مضحکہ خیز تخلیق ہے جو ان دیکھی دنیا کی روحانی قدروں کو سمجھنے سے قاصر ہے۔ ایک کہانی میں تو وہ خدا سے اپنے مقابلہ میں انسان کی برتری کا گلہ کرتا ہے مگر معمولی چیزوں پر ٹال دیا جاتا ہے۔ پیغمبروں کی بجائے وہ قسمت کا حال بتانے والوں میں خوش رہتا ہے اس کا ٹھکانہ بازار اور دوسرے پبلک مقامات ہیں۔ اسے خدا کی بجائے شراب اور عورت کی تلاش رہتی ہے۔ وہ ظاہر کی دنیا میں کھویا ہوا ہے وہ دیکھ نہیں سکتا کہ زندگی کے زیادہ گہرے اور اہم پہلو بھی ہیں۔ کئی ایرانیوں کی نظر میں امریکہ بڑا شیطان بڑی معمولی چیزوں میں دلچسپی لیتا ہے۔ شراب خانوں، ناچ گھروں اور مغرب کے سیکولر خیالات میں مدہوش شمالی تہران ان امریکی تصورات کی پیداوار تھا جن کے ذریعے باطن کے وہ حقائق جان بوجھ کر نظر انداز کر دیئے جاتے ہیں جو زندگی میں معنی پیدا کرنے کی ایک ہی صورت ہے۔ اس کے علاوہ امریکہ یعنی بڑا شیطان، شاہ کو بہکا کر اسلام کی سچی قدروں سے دور لے گیا اور اسے سیکولرازم کی سطحی زندگی کا راستہ دکھایا۔

ایرانی شیعیت دو بڑے جذبوں سے عبارت ہے: سماجی انصاف اور الغائب (جو نظر نہ آئے)۔ جہاں مغرب کے لوگوں نے صدیوں میں ایک ریشنل انداز نظر پیدا کیا جس کی مرکز

حسیات کو نظر آنے والی مادی دنیا تھی، وہاں ایرانی شیعوں نے جدید دور سے پہلے کی قوموں کی طرح مسلک اور متھ کی مدد سے باطن کا شعور پیدا کیا۔ سفید انقلاب کے دوران بجلی، ٹیلی ویژن اور ٹرانسپورٹ ایرانیوں کو میسر تھی مگر ملک میں مذہب کی تجدید سے ظاہر ہوا کہ اکثر لوگوں کی رائے میں یہ ظاہری کامیابیاں کافی نہیں تھیں۔ جدیدیت کا عمل بہت تیز اور سطحی تھا۔ لاتعداد ایرانیوں کے دل میں اب بھی باطن کی تڑپ تھی جس کے بغیر وہ سمجھتے تھے کہ ان کی زندگی کی نہ کوئی قدر ہے نہ معنویت۔ جیسا کہ بشریات کے امریکی ماہر ولیم بیمین نے کہا ہے کہ جو ایرانی یہ سمجھتا ہے کہ وہ مادی دنیا کی دلدل میں پھنس کر رہ گیا ہے تو محسوس کرتا ہے کہ وہ اپنی روح گنوا بیٹھا ہے۔ ایرانی معاشرے میں سچی باطنی زندگی کی کوشش اب بھی سب سے اعلیٰ قدر تھی یہاں تک کہ کسی کی تعریف کرنی ہو تو کہا جاتا ہے کہ اس کا ظاہر و باطن ایک ہے۔ روحانیت کے اعلیٰ ترین شعور کے بغیر اکثر ایرانی گم کردہ راہ لگتے ہیں۔ سفید انقلاب کے دور میں کئی ایرانی سمجھتے تھے کہ ان کے مغرب زدہ معاشرہ میں مادہ پرستی اشیائے صرف کی بھرمار، تفریح کے اجنبی ذرائع اور غیر ملکی قدروں کے مسلط ہونے سے زہر پھیل گیا ہے اس کے علاوہ امریکہ کی زور دار حمایت کے ساتھ شاہ اسلام کو تباہ کرنے کا تہیہ کئے ہوئے ہے۔ جو قوم کی روحانیت کا واحد ذریعہ ہے۔ اس نے خمینی کو جلاوطن کیا ہے۔ فیضیہ مدرسہ بند کر دیا ہے۔ علماء کی توہین اور ان کی آمدنی بند کی ہے اور دینی طلباء کو قتل کیا ہے۔ ایرانی انقلاب محض سیاسی انقلاب نہیں تھا۔ یہ سچ ہے کہ شاہ کی ظالم اور آمرانہ حکومت اور معاشی بحران دو بڑی وجوہات تھیں ان کے بغیر بغاوت ممکن نہیں تھی۔ کئی سیکولرسٹ ایرانیوں نے جنہیں اس روحانی بیماری کا تجربہ نہیں ہوا تھا شاہ سے نجات حاصل کرنے کے لئے علماء کی حمایت شروع کر دی۔ ان کی مدد کے بغیر انقلاب کامیاب نہ ہوتا مگر یہ بغاوت سیکولرازم کے خلاف بھی تھی جس نے مذہب کو زندگی سے خارج کر دیا تھا اور جس کے متعلق کئی عام ایرانی بھی محسوس کرتے تھے کہ سیکولرازم ان کی مرضی کے خلاف ان پر مسلط کیا گیا ہے۔ بڑے شیطان کے طور پر امریکہ کے بیان میں اس کا اظہار بڑے تفصیلی انداز میں کیا گیا تھا۔ صحیح یا غلط اکثر لوگوں کا خیال تھا کہ اگر امریکہ شاہ کی حمایت نہ کرتا تو شاہ کا رویّہ مختلف ہوتا۔ انہیں پتہ تھا کہ امریکیوں کو اپنے سیکولر نظام حکومت پر فخر ہے۔ جس میں مذہب کو ریاست سے الگ کیا گیا ہے۔ انہیں معلوم تھا کہ مغرب میں کئی لوگ ''ظاہر'' پر فوکس کرنا ضروری اور قابل تعریف سمجھتے تھے۔ اس کا نتیجہ شمالی ایران

کی نشاط انگیز مگر کھوکھلی اور بنجر راتیں تھیں۔ ایرانی یہ بھی جانتے تھے کہ بے شمار امریکی مذہب کے شیدائی ہیں مگر ان کا مذہب بے معنی تھا کیونکہ جمی کارٹر کا ظاہر اور باطن ایک نہیں تھا۔ ان کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ امریکی صدر ایک ایسے حاکم کی حمایت کیونکر جاری رکھ سکتا ہے جو اپنے ہی لوگوں کو قتل کرتا ہے ''ہمیں اُمید نہیں تھی کہ کارٹر شاہ کی حمایت کرے گا کیونکہ وہ مذہبی آدمی ہے اور اس نے انسانی حقوق کے تحفظ کا نعرہ لگایا ہے۔'' آیت اللہ حسین منتظری نے انقلاب کے بعد اپنے ایک انٹرویو میں کہا۔ ''کارٹر ایک سچے عیسائی کی حیثیت سے شاہ کی حمایت کیسے کرسکتا ہے۔'' کارٹر نے نئے سال کے موقعہ پر محرم کے مقدس مہینہ میں حکومت کی حوصلہ افزائی کے لئے شاہ سے ملاقات کی۔ اگر وہ کوشش بھی کرتا تو کارٹر اپنے آپ کو اس سے بہتر طور پر ولن کے کردار کے لئے کاسٹ نہیں کرواسکتا تھا۔ اگلے ہنگامہ خیز سال میں امریکہ ایران کے روحانی معاشی اور سیاسی مسائل کا ذمہ دار لگنے لگا۔ کوچہ وبازار کے در و دیوار پر کارٹر کو یزید کا اور شاہ کو شمر ہمسر لکھا گیا۔ مختلف مقامات پر ڈرائینگ کے ذریعے خمینی کو موسیٰ، شاہ کو فرعون اور کارٹر کو وہ بت بنا کر دکھایا گیا جسے فرعون یعنی شاہ پوجتا تھا۔ یہ خیال عام تھا کہ شاہ کو کارٹر نے کرپٹ کیا ہے اور خمینی اب موجودہ ناپاک آمریت کا اسلامی بدل قرار پایا تھا۔

1978 میں محرم کے اختتام پر شاہ نے ایک بار پھر اپنے آپ کو شیعوں کا دشمن ثابت کیا۔ 8 جنوری کو ایک نیم سرکاری اخبار ''اطلاعات'' نے خمینی کے خلاف ایک توہین آمیز مضمون چھاپا۔ جس میں خمینی کو طالع آزما اور نوآبادیت کا ایجنٹ لکھا' اس نے عیاشی کی زندگی بسر کی انگریزوں کا جاسوس ہے اور اب بھی انگریزوں کا تنخواہ دار ہے جو سفید انقلاب کو ناکام بنانا چاہتے ہیں، اخبار نے بڑے وثوق سے لکھا۔ خمینی پر یہ شرانگیز حملہ شاہ کی خطرناک غلطی تھی۔ اگلے دن چار ہزار طالبِ علم قم کی سڑکوں پر آ گئے انہوں نے 1906 کے آئین کی بحالی، آزادی اظہار، سیاسی قیدیوں کی رہائی، فیضیہ مدرسہ کو دوبارہ کھولنے اور خمینی کی ایران واپسی کا مطالبہ کیا مگر اس کے جواب میں انہیں قتل عام کا سامنا کرنا پڑا۔ پولیس نے نہتے مظاہرین پر گولی چلادی، علماء کے مطابق 75 طالب علم مارے گئے (اگرچہ پولیس نے ہلاک ہونے والے مظاہرین کی تعداد دس بتائی)۔ 1963 کے فسادات کے بعد ایران میں یہ سب سے خونریز دن تھا اور شاہ کے انجام کا آغاز تھا۔ ولیم بیمین کا کہنا ہے کہ ایرانی بہت کچھ برداشت کرسکتے ہیں مگر بدعہدی کا صرف ایک واقعہ ذاتی،

کاروباری اور سیاسی تعلقات میں نا قابل عبور خلیج حائل کرسکتا ہے۔ایک دفعہ ایسا ہوجائے تو پھر واپسی کے لئے کوئی راستہ نہیں ملتا لاکھوں عام ایرانیوں کی نظر میں شاہ اس جرم کا مرتکب اس وقت ہوا جب اس نے قم میں ساوک کو مظاہرین پر گولی چلانے کا حکم دیا۔ ایرانی عوام نے بھی تشدد کا جواب تشدد سے دیا اور انقلاب شروع ہو گیا۔

دانش وروں، لکھاریوں وکلاء اور تاجروں نے شاہ کی مخالفت میں بھر پور کردار ادا کیا۔مگر جنوری میں شیعوں پر ظالمانہ حملہ کے بعد اپوزیشن کی قیادت علماء کے ہاتھوں میں چلی گئی۔شیعوں کے قتل کا واقعہ اتنا لرزہ خیز تھا کہ اس نے آیت اللہ شریعت مداری کو بھی ہلا کر رکھ دیا۔ انہوں نے اپنا سکوت توڑا اور بڑے سخت الفاظ میں اس واقعہ کی مذمت کی۔اس سے ملک بھر میں علماء کو اشارہ مل گیا۔کوئی منصوبہ بندی نہیں ہوئی نہ پہلے کوئی انتظام ہوا تھا۔نجف سے خمینی نے کوئی حکمت عملی بھی نہیں بتائی وہ تو اسے لمحے بغاوت کی غائبانہ تحریک بن گئے تھے جب اطلاعات میں ان کے خلاف مضمون آیا تھا۔تمام جدوجہد کا محور کسی احتجاج کرنے والے کی موت کے بعد اس کے چہلم کی رسم تھی۔ سارے چہلم حکومت کے خلاف احتجاج بن گئے جن کے دوران مزید لوگ مارے جاتے اور مزید چہلموں کا نیا سلسلہ شروع ہوجاتا۔ انقلاب نے نہ رکنے والی رفتار پکڑلی۔ ہر مظاہرے کے درمیان چالیس دن کا وقفہ لیڈروں کو اپنا پیغام پھیلانے کی مہلت دے دیتا اور لوگ کسی بڑی منصوبہ بندی یا تشہیر کے بغیر، صحیح وقت پر مظاہرے کے لئے جمع ہوجاتے۔

قم میں قتل وخون ریزی کے چالیس روز بعد 18 فروری کو علماء اور تاجروں کی قیادت میں ماتمیوں کے جلوس ایران کے بڑی شہروں کی سڑکوں پر آگئے۔ طالبات، جنہوں نے اپنے آپ کو حکومت سے الگ اور بے تعلق ظاہر کرنے کے لئے برقعے پہن رکھے تھے اور چادروں میں ملبوس عورتیں جلوسوں کی قیادت اکثر کیا کرتیں گویا کہ پولیس کو چیلنج کرتی تھیں کہ گولی سیدھی ان پر چلائی جائے۔ پولیس نے گولی چلائی اور مزید لوگ شہید ہو گئے۔تبریز میں تصادم بہت شدید تھا۔ جہاں غالباً ایک سو ماتمی مارے گئے اور چھ سو گرفتار ہوئے۔نوجوان جلوس سے الگ ہو کر سینماؤں، بنکوں اور شراب خانوں (بڑے شیطان کی نشانیاں) پر حملہ آور ہونے کے لئے شہر میں پھیل گئے مگر انہوں نے لوگوں پر حملہ نہیں کیا۔ چالیس روز بعد،30 مارچ کو ماتمی ایک دفعہ پھر سڑکوں پر آگئے اور اس دفعہ انہیں تبریز کے شہیدوں کا سوگ منانا تھا۔اس موقعہ پر تقریباً ایک سو ماتمی مسجد

سے نکلتے ہی یزد میں مارے گئے۔ 8 مئی کو یزد کے شہیدوں کی یاد میں نئے جلوس نکالے گئے جیلیں سیاسی قیدیوں سے بھر گئیں۔ شہیدوں کی تعداد سے اس حکومت کے ظلم کا اندازہ ہوتا ہے جو اپنے ہی لوگوں کی دشمن بن گئی تھی۔

اب بغاوت آخری مرحلہ میں داخل ہو رہی تھی۔ مظاہرین نے جو پلے کارڈ اٹھا رکھے تھے ان پر 'ہر جگہ کربلا ہے' اور 'ہر دن عاشورہ ہے' لکھا ہوا تھا عیسائیت کی طرح 'شہید' کے معنی گواہ سمجھے جاتے تھے اور یہی لفظ مظاہروں میں جان دینے والوں کے لئے استعمال ہوتا تھا۔ جان دینے والے ظلم کے خلاف جدوجہد کے گواہ تھے (جیسا کہ امام حسین نے ظلم کا مقابلہ کیا تھا) اور ان دیکھی دنیا کی روحانی قدروں کے امین تھے جنہیں حکومت نے پامال کرنے کا تہیہ کیا ہوا تھا۔ لوگ انقلاب کو انفرادی اور اجتماعی سطح پر تزکیۂ نفس اور خود شناسی کا ذریعہ سمجھتے تھے یہ انقلاب، مذہب کو محض سیاسی مقاصد کے لئے استعمال نہیں کرتا تھا۔ یہ شیعہ مائیتھالوجی تھی جس نے اس انقلاب کو ایک سمت اور معنی دیئے۔ غریب اور بے پڑھے لکھے لوگ اسی کی وجہ سے متحرک ہوئے ورنہ کوئی سیکولر نظریہ تو انہیں اپنی جگہ سے ہلا بھی نہیں سکتا تھا۔

جون، جولائی میں شاہ نے کثیر الجماعتی سسٹم بحال کرنے اور آزادانہ انتخابات کا وعدہ کرتے ہوئے کچھ رعائتیں دیں۔ ان مہینوں میں مظاہرے نسبتاً کم ہوئے عام طور پر خاموشی چھائی رہی اور مغرب کے سیکولرسٹ اور دانش ور (جنہوں نے اب تک ماتمی جلوسوں میں کوئی حصہ نہیں لیا تھا۔ صرف زبانی جمع خرچ سے مظاہرین کی حمایت کی تھی) یہ سمجھے کہ جنگ جیت لی ہے مگر 19 اگست 1953 میں پہلوی سلطنت کی بحالی کے دن آبادان میں ریکس سینما کو آگ لگادی گئی تھی جس سے 400 افراد ہلاک ہوگئے تھے۔ اس کی ذمہ داری ساوک پر عائد ہوئی دس ہزار ماتمیوں نے ''شاہ مردہ باد'' اور ''اسے آگ لگاؤ'' کے نعرے بلند کرتے ہوئے جنازے میں حصہ لیا۔ ایرانی طلباء نے واشنگٹن، لاس اینجلز اور ہیگ میں زبردست مظاہرے کئے۔ شاہ نے کچھ اور رعایات دیں، مجلس میں بحث کی کچھ اور آزادی ملی اور امن مظاہروں پر سے پابندی اٹھالی گئی۔ چند رقص گاہیں بند کردی گئیں اور اسلامی کیلنڈر بحال ہوگیا۔

مگر بہت دیر ہوچکی تھی۔ رمضان کے آخری ہفتہ میں جب مسلمان مسجدوں میں شب بیداری کرتے ہیں چودہ ایرانی شہروں میں مظاہرے ہوئے جن میں پچاس اور ایک سو کے

درمیان لوگ مارے گئے۔ 4 ستمبر رمضان کے آخری دن، تہران میں بہت بڑا پرامن مظاہرہ ہوا۔ مظاہرین نے سڑکوں پر سجدہ ریز ہوکر دعائیں مانگیں اور پھول سپاہیوں کی نذر کئے۔ پہلی دفعہ ایسا ہوا کہ فوج اور پولیس نے مظاہرین پر گولی نہیں چلائی۔ اس موقعہ پر ایک انتہائی اہم واقعہ یہ ہوا کہ متوسط طبقوں نے مظاہروں میں شامل ہونا شروع کر دیا۔ لوگوں کا ایک چھوٹا سا گروہ رہائشی علاقوں سے ''آزادی'' اور اسلامی حکومت کے نعرے لگاتا ہوا گزارا۔ سات دسمبر کو لاتعداد لوگوں نے شمالی تہران سے خمینی اور شریعتی کی بڑی بڑی تصویروں کے ساتھ پارلیمنٹ کی عمارت تک مارچ کیا۔ وہ پہلوی حکومت کے خلاف اور اسلامی حکومت کے حق میں نعرے لگا رہے تھے۔ شریعتی، بازرگان اور بنی صدر نے مغرب کے تعلیم یافتہ اشرافیہ کو اسلامی حکومت کے امکان کے لئے تیار کر لیا تھا۔ اگر چہ ان کے خیالات خمینی کے خیالات سے مختلف تھے۔ متوسط طبقہ کے ان لبرل افراد نے دیکھ لیا تھا کہ خمینی کو اگر اس روٹ سطح پر جو حمایت حاصل ہوئی وہ انہیں کبھی نصیب نہیں ہوئی اس لئے وہ شاہ سے نجات حاصل کرنے کے لئے خمینی کا ساتھ دینے پر تیار تھا۔ سیکولر حکومت، ایران میں تباہ کن ثابت ہوئی تھی اب وہ کوئی مختلف راستہ اختیار کرنا چاہتے تھے۔

ایک بار جب متوسط طبقوں نے اس کا ساتھ چھوڑ دیا تو شاہ کا کھیل ختم ہوگیا اور اس خطرہ کا احساس بھی اسے ہوگیا ہوگا۔ 8 ستمبر بروز جمعہ صبح چھ بجے مارشل لاء نافذ کر دیا گیا اور تمام بڑے اجتماعات پر پابندی لگا دی گئی مگر بیس ہزار مظاہرین جو پہلے ہی جالہ سکوئر میں اس صبح جمع ہونا شروع ہوگئے تھے اور جنہیں پراُمن جلوس نکالنا تھا انہیں مارشل لاء کی خبر نہیں تھی۔ اس لئے انہوں نے جب منتشر ہونے سے انکار کیا تو فوج نے گولی چلا دی۔ جس سے نوسو افراد مارے گئے۔ اس خونریزی سے غضب ناک ہوکر لوگ سڑکوں پر نکل آئے، رکاوٹیں کھڑی کرنی اور عمارتوں کو آگ لگانی شروع کر دی جبکہ فوج نے ٹینکوں سے ان پر فائرنگ کی۔ دس دسمبر بروز اتوار صبح آٹھ بجے کیمپ ڈیوڈ سے صدر کارٹر نے شاہ کو فون کر کے اپنی حمایت کا یقین دلایا اور چند گھنٹوں بعد وائٹ ہاؤس نے ٹیلی فون پر ہونے والی اس گفتگو کی تصدیق کر دی۔ ایران اور امریکہ میں خصوصی تعلقات کی اہمیت پر زور دیا اور کہا کہ صدر کو جالہ سکوئر میں ضائع شدہ جانوں کا افسوس ہے مگر اسے توقع ہے کہ شاہ نے سیاسی آزادی کا جو عمل شروع کیا تھا وہ جاری رہے گا۔

مگر اس قتل وخوں ریزی کے بعد بڑا شیطان بھی شاہ کو بچا نہ سکا۔ تیل کے مزدوروں نے

ہڑتال کر دی اور اکتوبر کے آخر تک تیل کی پیداوار پہلے 28 فیصد رہ گئی۔ گوریلا گروپ پھر سرگرم عمل ہو گئے انہوں نے فوجی افسروں اور سرکاری وزیروں پر حملے شروع کر دیئے۔ چار نومبر کو طلباء نے تہران یونیورسٹی کے گیٹ پر نصب شاہ کا مجسمہ گرا دیا۔ پانچ نومبر کو بازار بند رہے اور طلباء نے برطانوی سفارت خانے، امریکہ کی کئی فضائی کمپنیوں کے دفاتر، سینماؤں اور شراب کی دکانوں پر حملہ کر دیا اس دفعہ فوج نے مداخلت نہیں کی۔

اس وقت تک عراق نے ایران کے دباؤ میں آ کر خمینی کو نجف سے نکال دیا تو اس نے پیرس میں سکونت اختیار کی۔ یہاں اس سے ملنے کے لئے نیشنل فرنٹ کے وفد آتے رہے۔ جنہوں نے اعلان کیا کہ خمینی اور وہ دونوں 1906 کا آئین بحال کرنا چاہتے ہیں۔ دو دسمبر کو محرم جونہی آیا خمینی نے ہدایات دیں کہ امام حسین کی یاد میں حسب معمول جلوس نکالنے کی بجائے لوگوں کو حکومت کے خلاف مظاہرے کرنے چاہئیں۔ محرم کی مقدس تقریبات اپنے عروج پر پہنچ گئیں۔ محرم کی پہلی تین راتوں کو شہادت کے لئے اپنی تیاری ظاہر کرنے کے لئے مردوں نے کفن پہنے اور کرفیو کی خلاف ورزی کرتے ہوئے سڑکوں پر آ گئے۔ بعض لوگ چھتوں سے لاؤڈ سپیکر کے ذریعہ شاہ کے خلاف نعرے لگاتے رہے۔ بی بی سی نے دعویٰ کیا کہ صرف ان چند دنوں میں سات سو افراد پولیس اور فوج کے ہاتھوں مارے گئے۔ آٹھ دسمبر کو جنوبی تہران کے قبرستان بہشت زہرا میں چھ ہزار افراد جمع ہوئے جہاں بہت سے انقلابی شہدا دفن تھے۔ اور شاہ مردہ باد کے نعرے لگاتے رہے۔ اصفہان میں بیس ہزار افراد نے سڑکوں پر مارچ کیا اور پھر بنکوں، سینماؤں اور امریکی ماہرین کے رہائشی بلاک پر حملہ کیا۔ عاشورہ کے موقعہ پر آیت اللہ طالیقانی نے جو حال ہی میں جیل سے رہا ہوا تھا۔ ایک عظیم الشان پرامن مارچ کی قیادت کی جو تہران کی سڑکوں پر چھ گھنٹے گھومتا رہا جس میں چار چار کی قطاروں میں خاموشی کے ساتھ چلتے ہوئے لاکھوں ایرانیوں نے حصہ لیا۔ تبریز، قم، اصفہان اور مشہد میں بھی پرامن مظاہرے ہوئے۔

تہران میں خود عاشورہ کے دن اس سے بھی بڑا مارچ ہوا جو آٹھ گھنٹے جاری رہا اور جس میں تقریباً بیس لاکھ ایرانیوں نے حصہ لیا۔ مظاہرین نے سبز، سرخ اور سیاہ علم اٹھا رکھے تھے جو بالترتیب اسلام، شہادت اور شیعہ کی علامت تھے۔ کہیں کہیں بینر بھی تھے جن پر تحریر تھا کہ ہم ایران کے ڈکٹیٹر کا قتل کر دیں گے۔ ''ہم ایران میں یانکی طاقت تباہ کر دیں گے''۔ ایران کے لوگ اس

طرح پہلے کبھی متحد نہیں ہوئے تھے جیسے اب متحد ہوئے اس لئے یقین تھا کہ وہ پہلوی حکومت سے جلد نجات حاصل کر لیں گے۔ کئی لوگ محسوس کرتے تھے کہ وہ خود امام حسین کے زیر قیادت ہیں۔ مظاہرے کے اختتام پر ایک قرارداد منظور ہوئی جس کے ذریعے خمینی کو دعوت دی گئی کہ وہ ایران کا نیا لیڈر بن جائے اور ایرانیوں سے کہا گیا کہ وہ شاہ کا تختہ الٹنے تک شانے سے نہ ملائے متحد رہیں۔

تین دن بعد فوج نے شاہ کی حمایت میں مظاہرے کروانے کی کوشش کی۔ فوج اور انقلابیوں میں تصادم زیادہ شدید ہو گئے۔ شاہ نے حالات کو سنبھالا دینے کی آخری کوشش کی۔ اس نے ایک جانے پہچانے لبرل شاہ پور بختیار کو آئینی حکومت بنانے کے لئے کہا۔ شاہ نے وعدہ کیا کہ وہ ساوک کو منتشر کر دے گا سیاسی قیدی بھی رہا ہو جائیں گے اور اپنی خارجہ اور اقتصادی پالیسی میں بنیادی تبدیلیاں کرے گا مگر شاہ کے اس وعدہ میں بہت دیر ہو گئی تھی شاہ نے پہلے بھی حالات کے دباؤ میں آ کر بہت سے وعدے کئے تھے۔ 30 دسمبر کو قم کے شہیدوں کی تصویریں پھاڑی گئیں تو ان کے ساتھ تصادم میں بارہ شہری مارے گئے۔ فوراً ہی لوگ جمع ہو گئے اور سپاہیوں کی طرف بڑھنے لگے ان کی رہنمائی ایسے نوجوان کر رہے تھے جو اپنی جانیں قربان کرنے کے لئے تیار تھے۔ فوج پیچھے ہٹنے لگی۔ سپاہی لوگوں کو دور رکھنے کے لئے زمین پر گولیاں چلاتے رہے۔ اگلے دن لاکھوں لوگ ظلم کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے سڑکوں پر آ گئے۔

جنوری کے وسط تک کھیل ختم ہو چکا تھا۔ وزیر اعظم بختیار نے ایران سے شاہ کے جانے کا اہتمام کیا اور شاہ نے ندامت سے بچنے کے لئے اسے عارضی کہا۔ شاہی خاندان مصر روانہ ہو گیا، جہاں سادات نے انہیں پناہ دی۔ انقلاب کی رفتار روکنے کے لئے بختیار نے سیاسی قیدیوں کی رہائی کا حکم دیا، ساوک کو منتشر کیا۔ جنوبی افریقہ اسرائیل کو تیل دینا بند کیا، غیر ملکی معاہدوں پر نظر ثانی اور فوج کے اخراجات میں کمی کا وعدہ کیا مگر یہ سب کچھ بہت دیر سے ہوا۔ لوگ اس شخص کی واپسی کا مطالبہ کر رہے تھے جسے وہ اپنا امام کہتے تھے۔ یکم فروری 1979 کو بختیار خمینی کو واپسی کی اجازت دینے پر مجبور ہو گیا۔ تہران میں خمینی کی آمد ان علاماتی واقعات میں سے تھی جن سے ہمیشہ کے لئے دنیا بدل جاتی ہے۔ ایران اور ایران سے باہر کے آزاد خیال سیکولرسٹ اسے ایک تاریک لمحہ کہتے تھے جس میں توہمات نے ریشنلزم پر فتح پائی مگر اکثر مسلمانوں کی نظر میں (چاہے وہ سنی

ہوں کہ شیعہ) جوایک طویل عرصہ سے اسلام کی تباہی سے خوف زدہ تھے۔ یہ ایک تابناک واقعہ تھا۔ بعض ایرانی شیعہ خمینی کی واپسی ایک معجزہ سمجھتے تھے۔ چنانچہ اسے لازمی طور پر غائب امام کی دیومالائی واپسی کے ساتھ تشبیہہ دی گئی۔ جونہی ان کی گاڑی تہران کی سڑکوں سے گزری ہجوم نے امام خمینی کے نعرے لگائے۔ انہیں یقین تھا کہ انصاف پر مبنی ایک نیا دور شروع ہوگیا ہے۔ آیت اللہ شریعت مداری جیسے سینئر مجتہد لفظ امام کے اس استعمال پر ناخوش تھے۔ چنانچہ سرکاری طور پر سختی کے ساتھ کہہ دیا گیا کہ خمینی غائب امام نہیں۔ مگر سرکاری لائن کچھ بھی ہو لاکھوں ایرانی عوام کے لئے خمینی آخری دم تک امام تھے۔ ان کی زندگی اور ان کی کہانی اس بات کی واضح شہادت ہے کہ خدا موجود ہے اور تاریخ کے اندر متحرک ہے۔ انقلاب کی طرح خمینی نے قدیم متھ کو بھی زندہ حقیقت بنادیا۔

خمینی کی واپسی سے فوراً پہلے طہٰ حجازی نے ایک نظم شائع کی اور اس کے ذریعہ اکثر ایرانیوں کے جذبات کی ترجمانی کی ''امام کی واپسی کا دن'' عالمگیر اخوت کی خبر دیتا ہے جب کوئی جھوٹ نہیں بولے گا۔ لوگ گھروں اور دروازوں کو چوروں کے ڈر سے تالے نہیں لگائیں گے اور ہر شخص اپنے کھانے میں دوسرے کو شریک کرے گا۔

خمینی اس حدیث کا حوالہ اکثر دیا کرتے تھے جس میں پیغمبر اسلامؐ نے جنگ سے واپسی پر اعلان کیا تھا کہ وہ جہاد اصغر سے واپس جہاد اکبر کی طرف آئے ہیں۔ جسمانی اور سیاسی جنت اتنی مشکل اہم اور کٹھن نہیں جتنی کہ تسخیر ذات اور معاشرہ میں انصاف اور سچی اسلامی قدروں کے نفاذ کی جدوجہد ہے۔ جب وہ تہران واپس آئے تو انہوں نے ضرور سوچا ہوگا کہ جہاد اصغر تو اب ختم ہوگیا اور اس سے کہیں زیادہ مشکل اور محنت طلب جہاد اکبر شروع ہونے کو ہے۔

امریکہ کے اندر 1970 کے عشرے کے دوران بنیاد پرستی کی تجدید بہت کم ڈرامائی تھی۔ امریکی پروٹیسٹنٹ اتنا انتہائی قدم اٹھانے کی ضرورت نہیں سمجھتے تھے وہ یہودیوں کی طرح آشوب اور نسل کشی کی یادوں میں کھوئے ہوئے نہیں تھے نہ وہ مسلمانوں کی طرح سیاسی اور معاشی ظلم کا نشانہ تھے۔ وہ جدید سیکولر کلچر سے اپنے آپ کو الگ تھلگ محسوس کرتے تھے مگر ان کے لیڈر کم از کم خوشحال اور کامیاب تھے بعد ازاں یہی بات ان کے مسائل میں سے ایک مسئلہ بن گئی۔ اپنے اس یقین کے باوجود کہ وہ اجنبی تھے، پروٹیسٹنٹ بنیاد پرست امریکہ کو اپنا گھر سمجھتے تھے کیونکہ وہاں

انہیں گھر جیسی سہولتیں میسر تھیں۔ امریکہ میں جمہوریت مضبوطی کے ساتھ قدم جما چکی تھی اور وہ آزادی کے ساتھ کسی انتقامی کاروائی کے خوف کے بغیر اپنے خیالات کا اظہار کر سکتے تھے اور جمہوری اداروں کو اپنے مقاصد کے لئے استعمال کر سکتے تھے۔ پھر بھی 1970 کے عشرے کے آخر تک جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں کہ بنیاد پرستوں نے محسوس کرنا شروع کر دیا تھا کہ معاشرہ سے گریز کی (جیسا کہ تقریباً پچاس سال سے ان کی پالیسی تھی) بجائے انہیں سیاسی لحاظ سے سرگرم ہونا چاہیے۔ وہ سمجھتے تھے کہ وہ اپنے اثر رسوخ سے کام لے سکتے ہیں اور امریکہ کو واپس سیدھی راہ پر لا سکتے ہیں۔ یہ بات صاف ہو چکی تھی کہ ایک مضبوط ایونجلیکل حلقہ کو خاندان یا اقدار، اسقاط اور مذہبی تعلیم جیسے مسائل پر جمع کیا جا سکتا تھا۔ پرانے خدشات موجود تھے لیکن نیا اعتماد بھی پیدا ہو چکا تھا۔

اس تجدید شدہ بنیاد پرستی کی علامت مورل میجارٹی تھی جو فالویل کی قیادت میں 1979 میں قائم ہوئی۔ اس گروپ کی اصلی انسپریشن (تحریک) خود بنیاد پرستوں کی طرف سے نہیں آئی بلکہ اس کے قیام کی ذمہ داری دائیں بازو کے تین پروفیشنل آرگنائزرز پر ہے جو پہلے بھی کئی پولیٹیکل ایکشن کمیٹیوں کے بانی تھے۔ رچرڈ وگنیری، ہاورڈ فلپس اور پال ویہرج ری پبلکن پارٹی سے مایوس ہو گئے تھے اور رونلڈ ریگن سے بھی الگ ہو گئے تھے جس نے اپنے صدارتی الیکشن میں لبرل رچرڈ شویکر کو اپنا انتخابی ساتھی چنا تھا۔ دفاع اور اقتصادی معاملات میں حکومت کی مداخلت جیسے مسائل پر قدامت پرستانہ نقطۂ نظر رکھتے ہوئے وہ ایک نئی قدامت پسند اکثریت منظّم کرنا چاہتے تھے جو مورل اور سوشل لبرل ازم کی مخالفت کر سکے اس طرح وہ 1960 کے عشرے کے دوران امریکہ کی پبلک زندگی میں داخل ہو گئے انہوں نے ایونجیلیکل اور بنیاد پرست احتجاجیوں کی قوت کا اندازہ کیا اور جیری فالویل کو اپنی ضرورتوں کے مطابق پایا۔ اس کے پاس پہلے ہی ایک بہت بڑا بنا بنایا حلقہ تھا جو اس کے مذہبی اجتماعات لبرٹی کالج اور اس کے ٹی وی ناظرین پر مشتمل تھا۔ دوسرے بنیاد پرست جو مورل میجارٹی میں ممتاز تھے جیسے ٹم لاہئے اور گریگ ڈکسن۔ انہوں نے بھی سپر چرچ بنائے تھے اور کافی حد تک خود مختار تھے انہیں کی کسی فرقہ کی طرف سے سرزنش کا خوف نہیں تھا وہ تقریباً سب کے سب بپٹسٹ تھے اور بپٹسٹ فیلوشپ کے اراکین تھے۔

مورل میجارٹی نے اپنے آپ کو بنیاد پرستوں تک محدود نہیں رکھا تھا۔ ان کے لیڈران

لوگوں کے ساتھ بھی تعاون کے حق میں تھے جو اخلاقی اور سیاسی معاملات میں ان کے ہم خیال تھے اس طرح وہ امریکہ کے تمام قدامت پسندوں کے لئے ایک فورم بنانا چاہتے تھے۔ اگر کسی نئے گروپ کو کوئی اہمیت حاصل کرنی تھی تو اسے ہم خیال کیتھولک ، پینٹی کوسٹلٹس ، مورمونز، یہودیوں اور سیکولرسٹ کی حمایت چاہیے تھی کیونکہ امریکہ کی صرف میں فیصد آبادی ایونجیلیکل پروٹیسٹنٹ پر مشتمل تھی۔ پہلی بار عملی تقاضوں کی وجہ سے بنیاد پرستوں نے اپنی علیحدگی پسندی بالائے طاق رکھی، اپنی دنیا سے باہر آئے اور جدید دور کی اجتماعی زندگی سے رشتہ جوڑا، فالویل، ڈکسن اور باب پلفگٹن بنیاد پرست تھے مگر پال ویرچ یہودی تھا جبکہ ہاورڈ فلپس اور رچرڈ وگیزی کیتھولک تھے۔ مختلف خیال کے لوگوں کی وجہ سے انہیں کسی حد تک عیسائی بنیاد پرستوں کی حمایت سے محروم ہونا پڑا، مثلاً باب جونز دوم نے فالویل کو امریکہ میں نہایت خطرناک شخص قرار دیا مگر دراصل مورل میجارٹی کو نمایاں حمایت پروٹیسٹنٹ حلقوں سے ہی ملی۔ گراس روٹ حمایت کا مرکز جنوب تھا جب کہ پروٹیسٹنٹ حلقوں سے باہر تحریک کو برائے نام حمایت حاصل تھی۔ قدامت پسند کیتھولک اسقاط، ہم جنس پرستی اور آزاد سکولوں کے لئے ٹیکس میں تخفیف کے مسئلوں پر مورل میجارٹی سے متفق ہو سکتے تھے مگر ان میں کئی ایسے بھی تھے جو رومن کیتھولک ازم کے خلاف بنیاد پرستوں کی روایتی نفرت نہیں بھولے تھے اس انداز سے یہودی سیاہ فام بیپٹسٹ اور پینٹی کوسٹلسٹ تحریک کے بعض ممتاز لیڈروں کی نسل پرستی کی وجہ سے ان کی نفرت کا شکار تھے سینیٹر جیسی ہیلمز، مثال کے طور پر انسانی حقوق کی تحریک کا کھلا دشمن تھا۔

مورل میجارٹی کا پیغام نیا نہیں تھا۔ وہ لبرل اسٹیبلشمنٹ کے خلاف اعلان جنگ کر رہی تھی اور امریکہ کے مستقبل کی لڑائی لڑ رہی تھی۔ اس کے اراکین چاہتے تھے کہ امریکہ کی تہذیب مذہبی ہو اور اس کی پالیسی بائبل کی تعلیمات کے مطابق ہو فی الحال امریکہ زوال پذیر تھا۔ دوسری عالمی جنگ کے بعد ایک سیکولرسٹ اشرافیہ سیاسی اور کلچرل زندگی پر چھایا ہوا تھا۔ یہ لبرل، جیری فالویل کے مطابق غیر اخلاقی اقلیت تھی۔ قدامت پسند اپنے آپ کو رجعت پسند اور کمزور گروپ نہ سمجھیں درحقیقت وہ اکثریت میں ہیں اور نہیں روائیتی قدروں کے تحفظ کے لئے لڑنا چاہیے۔ ''ہم لاکھوں کی تعداد میں ہیں اور وہ صرف مٹھی بھر ہیں۔ ٹم لاہے کا کہنا تھا۔ ملک چلانے کے لئے ہمارے پاس پروٹسٹنٹ اور کیتھولک حلقوں کے کافی ووٹ ہیں۔'' پیٹ رابنسن نے کہا ''جب

لوگ کہیں گے کہ ہم تنگ آ گئے ہیں تو ہم حکومت سنبھال لیں گے۔'' 1970 کے عشرے کے آخر اور 1980 کے شروع میں بعض بنیاد پرست پرانی ہزار یہ والی قنوطیت پسندی کو بدل رہے تھے۔ ''ساری دنیا تباہ ہونی ہے مگر عیسائیوں کا فرض ہے کہ اسے خوشی کی نوید دیں، انجیل کی تعلیم اس طرح پھیلائیں کہ زیادہ سے زیادہ لوگوں کو اس سے فیض حاصل ہو۔ اگر عیسائیوں نے ہمت کی تو امریکہ کو تباہی سے بچایا جا سکتا ہے۔'' کیا ہمارے ملک کے لئے کوئی امید ہے؟ فالویل نے اولڈ ٹائم گوسپیل آور میں یہ سوال 1980 میں اُٹھایا۔''

''اور میرا خیال ہے کہ اُمید واقعی موجود ہے کیونکہ ہم خدا پر بھروسہ کرتے ہیں اور اس کی عبادت کرتے ہیں ہم عیسائی غیر قانونی اسقاط کے خلاف لڑے ہیں جو قتل کے مترادف ہے۔ ہم عریانی کے خلاف ہیں، منشیات کے دشمن ہیں۔ ہم امریکہ میں روائتی خاندان کے ٹوٹنے کی مخالفت کرتے ہیں۔ ہم جنسوں کی شادیاں ناپسند کرتے ہیں۔ ہم قومی دفاع کے لئے کمربستہ ہیں تا کہ یہ ملک سلامت رہے اور ہمارے بچے اسے اسی طرح جانیں جیسا کہ ہم جانتے ہیں۔ پوری اُمید ہے کہ خدا امریکہ پر ایک بار اور مہربان ہوگا۔''

'دی نیو کرسچین رائٹ'' میں شامل ہو کر بنیاد پرست پچاس برس کی خاموشی کے بعد جارحیت پر اتر آئے۔ حمایت تو شاید ہی کسی بات کی کرتے ہوں مگر مخالفت پر ہمیشہ کمربستہ رہتے تھے۔ اس میں سبھی تو شامل نہیں ہوتے تھے اور نہ ہی اس میں مورل میجارٹی کی مرضی کا دخل تھا مگر یہ نئے ملی ٹنٹ عیسائی اسقاط منشیات اور عیش ونشاط کے خلاف تھے۔ وہ روس کے ساتھ کسی مصالحت کے حق میں بھی نہیں تھے کیونکہ وہ اسے شیطانی سلطنت سمجھتے تھے۔ ٹیلی وینجلسٹ روبنسن کی رائے میں حضرت عیسیٰ کی واپسی سے پہلے امن کی کوئی بھی تلقین کفر ہے۔ یہ خدا کے حکم کے خلاف ہے۔ یہ دجالیت ہے۔ مورل میجارٹی اور کرسچین رائٹ کا ایجنڈا انکار اور استرداد پر مبنی تھا۔ آنے والی بدی کے خلاف ایک جہاد تھا جس سے امریکہ کو خطرہ تھا۔

بدی کے حالات کی روشنی میں جنسیت پر زور معنی خیز تھا۔ کرسچین رائٹ بھی عورتوں کے معاملے میں اسلامی بنیاد پرستوں کی طرح فکر مند تھے بلکہ وہ اس معاملہ میں زیادہ خوف زدہ تھے عورتوں کی تحریک آزادی سے بنیاد پرست عورتیں اور مرد ایک ہی جیسے خائف تھے۔ Phyllis Shalafli مورل میجارٹی کے ایک رومن کیتھولک لیڈر کی نظر میں ''نسائیت ایک بیماری ہے۔ دنیا

کی تمام برائیوں کی جڑ ہے۔ جب سے حوا نے خدا کی نافرمانی کی اور اپنی آزادی چاہی تب سے نسائیت دنیا میں گناہ لے کر آئی ہے اور اپنے ساتھ خوف، بیماری، درد، غصہ، نفرت، تشدد اور ہر قسم کی بدصورتی بھی لائی ہے'' مجوزہ مساوی حقوق کی ترمیم زیادہ ٹیکس وصول کرنا راہباؤں کی مرکزیت بھی شامل ہے۔ Bevrlay Lahaye کی رائے میں ''نسائیت بیماری سے بڑھ کر بیماری ہے'' مارکیٹ اور ہیومنسٹ تعلیمات پر مبنی یہ موت کا فلسفہ ہے اس کے حامی خودکشی کے مرتکب ہیں اور ایک پوری تہذیب کو موت سے ہمکنار کر رہے ہیں اب یہ عیسائی عورتوں کا فرض ہے کہ وہ اپنے شوہروں کی حیثیت بحال کریں اور ایک بار پھر اپنے آپ کو نسوانی ایثار کے اصولوں سے شناسا کریں۔ یہ ان کا فرض ہے کہ اکیسویں صدی میں تہذیب اور انسانیت کی مدد سے ہمارے معاشرے کو تباہی سے بچائیں۔ نسائیت کی ان برائیوں کے ساتھ آمیزش جو ایک عرصہ سے بنیاد پرستوں کو ڈرا رہی تھیں، سازش کے متعلق ان کے خوف کا ثبوت ہے وہ اپنے معاشرے کی سلامتی بلکہ اس کا احیاء بھی عورتوں کی روائتی حیثیت سے مشروط سمجھتے تھے۔

اکثر فرقوں کے پروٹیسٹنٹ بنیاد پرست اور عیسائی قدامت پسند سیکرلر ہیومن ازم کی برائیوں کے سامنے اپنے آپ کو بے بس محسوس کرتے تھے۔ وہ مردوں میں نامردی کے رجحان سے بہت پریشان تھے۔ پہلے مردوں کی نسبت آج کل کے مردوں کو اپنی مردانگی پر بہت کم اعتماد ہے۔ ٹم اور بیورلے نے "The Art of Marriage" اور "The Beauti of Sexual Love" (1976) جنس پر اپنے مقبول ترین رسالے میں لکھا ''مرد نامرد ہیں، جنسی لحاظ سے معذور ہیں انہیں اپنی بیویوں کو مطمئن کرنے کی فکر رہتی ہے یا دوسرے مردوں کے ساتھ اپنی جنسی صلاحیت کا موازنہ کرتے رہتے ہیں۔ اس کی وجہ عورتوں میں اپنی حقوق کا نیا احساس اور اس کا اظہار ہے بنیاد پرست عورتیں بھی اس کلچرل وائرس سے محفوظ نہیں جس کے نتیجہ میں مرد ہیجڑے بن رہے ہیں یا خصی ہو رہے ہیں۔ یہ خوف ہی ہم جنس پرستی سے بنیاد پرستوں کی نفرت کی اصل وجہ ہے جسے وہ نسائیت کی طرح وباء اور امریکہ کے زوال کا سبب سمجھتے ہیں۔ ''یہ بدترین قسم کی گمراہی ہے۔'' جیمز رابنسن نے کہا جو اپنے ٹیلی وژن پروگراموں کے ذریعہ ہم جنس پرستی پر اپنے سفاکانہ حملوں کے لئے مشہور تھا۔ یہ خدا سے دشمنی ہے اس کے حکم کے خلاف ورزی ہے معاشرے اور فطرت کے خلاف ہے۔ اسے سوچنے یا بیان کرنے سے گھن آتی ہے۔'' ہم جنس پرستی کو بچوں کے ساتھ جنسی

تعلق کا ہمسر سمجھنے میں بنیاد پرست یک زبان تھے۔ انہیں یہ بھی یقین تھا کہ یہ ان ناکام گھرانوں کی گمراہی کا نتیجہ ہے جو سیکولر ہیومن ازم کا شکار ہوئے ہیں۔ خاندانی قدروں کے موضوع پر لکھنے والے بنیاد پرست متفق تھے کہ امریکہ کو مردوں بلکہ صحیح مردوں کی ضرورت ہے۔ مزے کی بات ہے کہ بعض بنیاد پرستوں نے وہ خصوصیات فراموش کر دی تھیں جنہیں وہ عیسائیت کی نامردانہ خصوصیات یعنی اس کا ہجڑا پن کہتے تھے جس کی وجہ سے وہ نسوانی انداز کا مذہب بن گیا ہے جیسے، معافی، نرمی اور رحم دلی پر ہر حال میں زور دیا جاتا ہے مگر ''عیسیٰ نامرد نہیں تھا۔'' لوئیس کول نے کہا ''وہ شیطان کو شکست دینے والا، بلاؤں کو دفع کرنے والا، فطرت پر حکومت اور منافقوں پر لعنت بھیجنے والا بے خوف لیڈر تھا۔'' وہ بے رحم ہو سکتا تھا، عیسائیوں کو بھی نڈر اور بہادر ہونا چاہیے۔ ٹم نے اپنی کتاب "Battle for Family" میں لکھا ''انہیں سیاسی لحاظ سے باعمل ہونا چاہیے۔ ایک ملی ٹینٹ اور مردانہ اور عیسائیت کی خواہش سے اسلحہ کے متعلق قانون سازی کے خلاف مورل میجارٹی کے اشتعال کی وضاحت ہوتی ہے یہ بھی ایک راست باز متحرک اور آمادہ پیکار مردانگی کی تجدید کے سلسلہ میں ان کی کوشش کا ایک حصہ تھا۔

نیو کرسچین رائٹ کی سرگرمیاں بنیاد پرستوں کے خوف سے پیدا ہوئیں بنیاد پرست اپنے آپ کو بے بس اور کمتر سمجھتے تھے۔ ان کا نظریہ نہیں بدلا تھا مگر اب انہوں نے ارادہ کر لیا تھا کہ وہ اپنے ہم خیال جمع کریں گے (جنہیں برسوں تک انہوں نے معاشرے سے دور رہنے کا حکم دیا تھا) اور انہیں سیاسی زندگی میں بھرپور حصہ لینے کے لئے کہیں گے۔ مورل میجارٹی کے نیٹ ورک نے دوسری سیاسی تحریکوں کی طرح کام کرنا شروع کر دیا۔ ان کا اہم کام یہ اطمینان کرنا تھا کہ ان کے ممبروں نے اپنے ووٹ بنوا لئے ہیں انہیں ووٹ ڈالنے کا صحیح طریقہ سکھانا اور پولنگ سٹیشن پر پہنچانا تھا۔ وہ سیاسی سرگرمیوں میں حصہ لینے کی اہمیت واضح کرنے کے لئے جلسے کرتے اور لوگوں کو نیوز لیٹر بنانے اور ووٹ حاصل کرنے کی تربیت دیتے۔ وہ انہیں میڈیا میں رسوخ پیدا کرنے کے طریقے سکھاتے۔

عیسائیوں کو الیکشن لڑنے کے لئے کہا جاتا چاہے وہ کتنی ہی مقامی اور نچلی سطح کے ہوں۔ لبرل اور سیکولرسٹ پبلک زندگی میں ان کی زوردار موجودگی سے رفتہ رفتہ واقف ہوئے۔ دوسری دہائی میں ملی ٹینٹ عیسائیوں نے بڑے بڑے اداروں پر قبضہ کرنا شروع کر دیا۔ 1986 میں بوب

رابن نے امریکہ کا صدر بننے کی کوشش بھی کی۔ عیسائی بعض سیاستدانوں کے لئے دردسر بن گئے تھے۔ برسوں سے پبلک ایکشن کمیٹیاں انتخابات میں ان اُمیدواروں پر پابندیاں لگاتی تھیں جن کی پالیسیاں ان کے خیال میں ناپسندیدہ تھیں وہ رپورٹ کارڈ جاری کرتی تھیں تاکہ پبلک کو ان کے خیالات کا پتہ چل جائے۔ اب عیسائی لوگ ان اُمیدواروں کے خلاف ہو گئے جنہوں نے ان کی مرضی کے خلاف اسلحہ کے قوانین، اسقاط کے ہسپتالوں کی امداد یا مساوی حقوق ترمیم کے سلسلہ میں ووٹ دیئے تھے۔ دفاع، سکولوں میں دعا یا عیش ونشاط کے بارے میں غلط رائے رکھنے کا مطلب خاندان دشمن، امریکہ دشمن اور خدا دشمن ہونا ہے۔

شروع میں تو بنیاد پرست افراد اناڑی ثابت ہوئے مگر رفتہ رفتہ انہوں نے نیا سیاسی کھیل کھیلنا سیکھ لیا۔ وہ وعظ اور ٹیلی ویژن پروگراموں میں حصہ لینے لگے مگر انہوں نے ایک حد تک سیاسی داؤ پیچ بھی سیکھ لئے ان کا اہم کارنامہ، مساوی حقوق ترمیم کا راستہ روکنا تھا۔ ضروری تھا کہ 38 ریاستیں ترمیم کے حق میں ووٹ دیں تاکہ دو تہائی اکثریت حاصل ہو اور 1973 تک 30 ریاستوں نے اس کے حق میں ووٹ دیئے۔ Phyin Shchlafly اور مقامی کرسچین رائٹ کے کارکنوں نے ترمیم کا راستہ روک دیا۔ نبیراسکا، ٹینی سی، کینٹکی، انڈیانا اور جنوبی ڈکوٹا سب نے اپنا گزشتہ فیصلہ بدل دیا ورنہ مورل میجارٹی تو سکولوں میں دعا اور اسقاط جیسے مسائل پر بھی وفاقی یا ریاستی قانون نہ بدل سکی۔ ارکنساس اور لاؤزمینیا بل اس یقین دہانی پر پاس ہوئے کہ سکول کے نصاب میں انجیل کی لفظی تعلیم کو ڈارون کے نظریۂ ارتقاء کے مساوی وقت دیا جائے گا۔ اس صورتحال سے کرسچین رائٹ پریشان نہیں ہوئے۔ انہوں نے بتایا کہ ان کا اصل مقصد کانگرس کے دونوں ایوانوں میں ایک الٹرا اقدامت پسند اکثریت منظّم کرنی ہے۔ ایک بار یہ مقصد حاصل ہو جائے تو ان کی مطلوبہ اصلاحات خود بخود نافذ ہو جائیں گی۔

یہ لکھتے ہوئے مورل میجارٹی کے ذریعے اس قسم کے سیاسی عمل شروع ہونے کے بیس برس بعد اس کی دوررس کامیابی کا اندازکرنا آسان نہیں۔ اس کی شہادت موجود ہے کہ زیادہ مخلص عیسائی پہلے سے زیادہ ووٹ دیتے ہیں بالخصوص جنوب میں مگر اس قسم کی منفی مہم سے بعض اوقات غلط نتائج نکلتے ہیں جب کرسچین رائٹ کی حامی Linda Charaz نے 1986 مین میری لینڈ کے مڈٹرم انتخابات میں اپنی مخالف لبرل اُمیدوار کو کمیونسٹ، قاتلہ اور ہم جنس پرست کہا ممکن ہے کہ اس کی

شکست کی یہ وجہ بھی ہو۔99-1998 میں بنیاد پرستوں اور دوسرے قدامت پسندوں کی یہ ناکام کوشش ثابت ہوئی کہ مونیکا لیونسکی کے ساتھ جنسی تعلقات اور اس کے بعد جھوٹا حلف اٹھانے کے سلسلہ میں صدر بل کلنٹن پر الزام لگائیں۔ اس منظر سے صدر کلنٹن کو اپنے جنسی کردار اور اپنے خلاف سیاسی یاوہ گوئی کے متعلق کھل کر بات کرنا پڑی بے پناہ گھن اور نفرت پیدا ہوئی اور شاید لبرل حلقوں کی طرف سے ان کا ردِعمل صدر کلنٹن کے حق میں ہوا۔

اس کے باوجود سیکنڈل کے عروج پر صدر کلنٹن نے ضروری سمجھا کہ بریک فاسٹ میٹنگ میں امریکہ کے مذہبی رہنماؤں سے بات کرے اور آنسو بھری آنکھوں سے اپنے گناہ کا اعتراف کرے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ سیاستدان مذہبی لوگوں کے قدامت پسندانہ خیالات کو اب سیکولرسٹ کی طرح نفرت سے بھی دیکھ سکتے۔ بیسوی صدی کے آخر تک امریکہ میں مذہب ایک ایسی طاقت بن چکا تھا جسے نظرانداز نہیں کیا جاسکتا تھا۔ امریکہ اس دور سے بہت آگے نکل آیا تھا جب بانی رہنماؤں نے سیکولر انسان دوستی کو ترجیح دی تھی۔ انقلاب کے زمانے سے امریکہ پر پروٹیسٹنٹ مذہب کو لبرل اسٹیبلشمنٹ رویہ اور پالیسیوں کے خلاف بطور احتجاج استعمال کرتے تھے۔ جیری فالویل، پاٹ رابرنسن جیسے بنیاد پرستوں اور کرسچین رائٹ کے اراکین کی یہ مہم اس ذہنیت کی مظہر تھی جو بیسوی صدی کے آخر میں پروان چڑھی۔ ان کوششوں کے نتیجہ میں امریکہ کی سیاسی زندگی میں مذہب فرانس اور برطانیہ کی نسبت بڑا کردار ادا کرتا ہے۔ جہاں ایک سیاستدان مذہب کے متعلق جذباتی انداز بیان سے اپنی ساکھ بگاڑ لیتا ہے۔

قومی سیاست سے قطع نظر یہ بھی سچ ہے کہ 1970 اور 1980 کے عشروں میں کرسچین رائٹ کو بعض بڑی کامیابیاں مقامی سطح پر حاصل ہوئیں۔1874 میں مثال کے طور پر ایلس مور، مغربی ورجینیا کی کناوا کاؤنٹی کے ایک وزیر کی بیوی نے درسی کتابوں میں سیکولر ہیومن ازم کے ذریعے منافقانہ زاویہ لگانے کے خلاف مہم شروع کی اس زاویہ کا مفہوم تھا کہ انجیل متھ ہے۔ عیسائیت کو منافقت اور دہریت کو ذہانت سے ملایا گیا۔ عیسائیوں نے اپنے بچے اسکولوں سے اٹھالئے۔ مور نے ماہرین پر بے اعتمادی کی پرانی امریکی پروٹیسٹنٹ روایت کا مظاہرہ۔ ''کناوہ کاؤنٹی کے اسکول کون چلائے'' وہ لوگ جو یہاں رہتے ہیں یا تعلیمی ماہرین، ایڈمنسٹریٹرز دوسری جگہوں کے لوگ جو ہمیں بتاتے ہیں کہ ہمارے بچوں کے لئے کیا اچھا ہے۔ جنوری 1982 میں

سینٹ ڈیوڈاری زونا کے مقامی عیسائی ناول نگار ولیم گولڈنگ، جان سٹین بیک، جوزف کانریڈ اور مارک ٹوین کی کتابوں پر اپنے اسکولوں میں پابندی لگانے میں کامیاب ہوگئے۔1981 میں میل اورنورما گیبلر نے ٹیکساس کے اسکولوں میں خدا کو واپس لانے کی مہم شروع کردی۔ انہوں نے موجودہ لبرل انداز پر اعتراض کیا جسے ان میں پایا جاسکتا ہے۔

وہ سوالات جن سے طلباء خود نتائج اخذ کر سکتے ہیں، ممنوع قرار پائے جسے عیسائیت کے سوا دوسرے مذاہب کے متعلق بیانات جن کی تاویل فری انٹر پرائز سسٹم کے خلاف ہوتی ہے۔ بیانات کی تاویل جس کے ذریعے سوشلسٹ اور کمیونسٹ ملکوں کے مثبت پہلوؤں پر روشنی ڈالی جاتی ہے (مثلاً روس کس اناج کی پیداوار میں دنیا بھر سے آگے ہے) گریز کے علاوہ جنسی تعلیم کا کوئی پہلو، ایسے بیانات جن میں سیاہ فام لوگوں، مقامی امریکی انڈین، میکسیکو کے امریکیوں کے کارناموں کو نمایاں کیا جاتا ہے۔ بیانات جن میں امریکی غلاموں کے ساتھ ہمدردی یاان کے آقاؤں کی مخالفت ہے۔ نظریۂ ارتقاء کی حمایت میں بیانات جب تک کہ نظریۂ تخلیق کی وضاحت کے لئے مساوی جگہ نہ دی جائے۔ عدالت نے گیبلرز کے خلاف فیصلہ دیا مگر ناشر ٹیکساس کی بڑی مارکیٹ (جہاں سے حکومت تمام سکولوں کے لئے درسی کتابیں منتخب کرتی ہے) کے نقصان کے امکان سے اس قدر ڈرے ہوئے تھے کہ انہوں نے خود ہی کتابوں میں تبدیلیاں کرلیں۔

مہم کے سربراہوں نے بنیاد پرستوں کی ماڈرن کلچر کے متعلق وہ تمام پریشانیاں ظاہر کردیں جو ایک عرصہ سے انہیں ہراساں کررہی تھیں۔ ماہرین کا خوف، نوآبادیت کا خوف، بے یقینی، غیرملکی اثرات، سائنس اور جنس کا خوف۔ انہوں نے نیو کرسچین رائٹ کے پروٹیسٹنٹ اثرات کے ذریعے سمت بدلنی بھی ظاہر کردی انہوں نے کہا امریکہ کو سفید فام اور پروٹیسٹنٹ ہوتا ہے۔ مسلمان اور یہودی جنگجوؤں کی طرح مورل میجارٹی کے عیسائی بھی اپنے مذہب کی سرحدیں وسیع کرنے کے لئے لڑ رہے تھے تاکہ سیکولرازم کا راستہ روک سکیں اور خدا کی حاکمیت بحال کرسکیں۔ ممکن ہے کہ ان کی کامیابیاں معمولی اور غیراہم نظر آئیں مگر کرسچین رائٹ سیاست کے مروجہ آداب اور طریقے سیکھ چکے تھے۔ دی لبرل آرگنائزیشن پیپل فار دی امریکن وے (جنہوں نے ٹیکساس کے مقدمہ میں گیبلرز کا مقابلہ کیا تھا) نے بتایا کہ قدامت پسندوں نے اسی قسم کی آویزش میں 124 میں سے 34 مرتبہ کامیابی حاصل کی ہے۔ لبرل حلقوں نے اپنی تنظیمیں بنانی شروع کردیں اور جوابی حملہ کیا۔

چنانچہ ترقی کی رفتار کم ہوگئی اس سے ان بنیاد پرستوں کو فکر لاحق ہوئی جو سمجھتے تھے کہ وقت ہاتھوں سے نکلا جارہا ہے جب کہ تباہی دہلیز پر ہے۔اور یہ کہ ایک قادر مطلق خدا راست بازوں کا سہارا بن کر تاریخ کے اندر سرگرم عمل ہے۔بعض بنیاد پرستوں کو شک تھا کہ ان کے لیڈر بکاؤ مال ہیں۔مثال کے طور پر اسقاط کو بالکل ختم کرنے کا مطالبہ کرنے کی بجائے فالویل نے زیادہ عملی طریقہ اختیار کرتے ہوئے اس کے لئے سہولتیں محدود کرنے کے لئے کہا۔اسی طرح اپنے صدارتی انتخاب کی مہم میں پاٹ رابرٹس نے بڑے فرقوں کے متعلق بڑی نرمی سے بات کی حالانکہ بنیاد پرست آرتھوڈوکسی کا مطالبہ تھا کہ جب بھی موقعہ ملے مرتد چرچ پر شدت سے حملہ کیا جائے۔

پروٹیسٹنٹ عیسائیوں کی بیداری کے ابتدائی برسوں میں فالویل اور ابرٹسن نے جان لیا کہ سمجھوتہ جدید سیاست کا تقاضا ہے۔جمہوری دنیا میں قطعی اور بے لچک پالیسیاں کامیاب نہیں ہوسکتیں۔یہاں طاقت کی جنگ میں سودے بازی بھی ہوتی ہے اور مخالف کے لئے کچھ جگہ خالی بھی چھوڑنی پڑتی ہے مگر مذہبی نقطۂ نظر کے لوگوں کے لئے ایسا کرنا مشکل ہے کیونکہ وہ بعض اصولوں کو ناقابل شکست سمجھتے ہیں نہ ہی ان پر کسی قسم کی سودے بازی کرتے ہیں سیکولر سیاست میں جہاں بنیاد پرست مقابلہ پر مجبور ہیں (چاہے وہ پسند کریں نہ کریں) ایسی کوئی چیز مقدس نہیں۔کسی حد تک کامیابی حاصل کرنے کے لئے فالویل اور رابرٹس نے ان دشمنوں کو رعائتیں دیں جنہیں وہ شیطان سمجھتے تھے۔جدید سیاست میں آ کر بنیاد پرستوں نے دیکھا کہ وہ صرف شیطان کی صحبت نہیں بلکہ خود بھی ان برائیوں سے متاثر ہیں۔جنہیں مٹانے کے لئے وہ سیاست میں آئے تھے۔یہ مشکل ان کی مشکلات میں صرف ایک مشکل تھی۔اس صدی کے آخری دو عشروں میں بنیاد پرست جس طریقے سے بعض مسائل حل کرنے پر مجبور ہوئے اس کا مطلب بذاتِ خود مذہب کی شکست ہے۔

شکست؟

(1979-99)

بنیاد پرستوں کی تسخیر نو سے ظاہر ہوگیا تھا کہ مذہب کی آب وتاب، اس کا جلال و جمال ابھی باقی ہے۔ بنیاد پرست مذہب کو تاریکیوں سے نکال کر لائے تھے اور انہوں نے ثابت کر دیا تھا کہ جدید معاشرہ کے ایک بہت بڑے حصہ میں اس کی پذیرائی ہوسکتی ہے ان کی کامیابیوں نے سیکولر سٹوں کو پریشان کر دیا۔ یہ روشن خیالی کے دور کا کمزور اور نمائشی مذہب نہیں تھا۔ اس نے جدیدیت کی کئی اہم قدریں رد کر دی تھیں۔ 1970 کے عشرے میں ان کے حملہ نے معاشرہ کو دونیم کر دیا تھا۔ بیسویں صدی کے آخر تک یہ واضح ہوگیا تھا کہ سیکولرسٹ اور مذہبی طبقوں میں اور زیادہ دوری آچکی ہے۔ وہ ایک دوسرے کی زبان نہیں بول سکتے نہ ایک دوسرے کا وژن آپس میں بانٹ سکتے ہیں۔

ریشنل نقطۂ نظر سے بنیاد پرستی ایک تباہی تھی مگر چونکہ وہ بنیاد پرستوں کے خیال میں سائنسی ریشنلزم کی ناروا اجارہ داری کے خلاف بغاوت تھی اس لئے حیرانی کا سبب نہیں تھی۔ ہم ان بنیاد پرست جماعتوں کو مذہبی تحریک کیسے سمجھیں؟ جدید دور اور اس کے بعد جس مخصوص چیلنج کا سامنا مذہب کو ہے۔ بنیاد پرست ہمیں اس کے متعلق کیا بتا سکتے ہیں۔ کہیں بنیاد پرستوں کی فتوحات درحقیقت مذہب کی شکست نہ ہو اور اب کیا بنیاد پرستی کا خطرہ ٹل گیا ہے؟

ایران میں اسلامی انقلاب ان کے لئے خصوصی طور پر پریشانی کا باعث تھا جو اب بھی روشن خیالی کے اصولوں پر کاربند تھے۔ انقلاب ہمیشہ سیکولر ہوتے ہیں۔ وہ عام طور پر اس وقت برپا

ہوتے ہیں جب عام لوگوں میں اپنی عزت اور وقار کا نیا احساس پیدا ہوتا ہے اور جب وہ مذہب کی دیومالائی دنیا سے رہائی چاہتے ہیں۔ جیسا کہ حنا ارندی نے اپنی مشہور تصنیف On Revolution (1963) میں لکھا ہے کہ ''جسے ہم انقلاب کہتے ہیں درحقیقت وہ ایک عبوری دور ہوتا ہے جس سے ایک نئی سیکولر دنیا جنم لیتی ہے۔'' ایک مذہبی ریاست میں انقلاب برپا ہونا بالکل عجیب بات ہے۔ ایرانی انقلاب کے فوراً بعد خمینی کی حکومت قائم رہنے کی کوئی توقع نہیں تھی۔ اسلامی انقلاب کے تصور میں ہی ماڈرن اسلامی حکومت کے آئیڈیا کی طرح تضاد تھا۔

مگر مغرب کو اس حقیقت کا سامنا کرنا پڑا کہ ایرانی عوام اسلامی حکومت چاہتے تھے۔ وہ اعتدال پسند جن کے ظاہر ہونے کی امریکہ اور یورپ میں بڑے اعتماد کے ساتھ اُمید کی جارہی تھی ''پاگل ملاؤں'' کو نکال باہر کرنے کے لئے نہ آئے اور وہ قوم پرست جو ایران میں سیکولر جمہوری ری پبلک قائم کرنا چاہتے تھے انہوں نے دیکھا کہ انقلاب کے بعد وہ اقلیت میں رہ گئے ہیں۔ ایسا کوئی معاہدہ نہیں تھا کہ اسلامی حکومت کی شکل کیا ہو مگر مغرب کے تعلیم یافتہ دانش ور، شریعتی کے پیروکار عام لوگوں کی حکومت چاہتے تھے جس پر ملاؤں کا اثر کم ہو۔ خمینی کا وزیراعظم مہدی بازرگان 1906 کے آئین کی بحالی (بادشاہت کے بغیر) چاہتا تھا اور مجتہدین کی ایک کونسل بھی جس کے پاس غیر اسلامی پارلیمانی قوانین کو ویٹو (منسوخ) کرنے کی طاقت ہو۔ قم مدرسہ خمینی کی ولادت فقیہہ کے حق میں تھا مگر آیت اللہ شریعت مداری اور آیت اللہ طالیقانی دونوں تصوف سے متاثر علماء کی اس حکمرانی کے خلاف تھے جو صدیوں پرانی شیعہ روایت کی صریح خلاف ورزی تھی۔ ایسے طرز حکومت میں انہوں نے کئی خطرات مضمر دیکھے۔ اکتوبر 1979 تک صورت حال کافی الجھ گئی تھی۔ بازرگان اور شریعت مداری نے آئین کے اس ڈرافٹ پر اعتراض کئے جو خمینی کے شاگردوں نے تیار کیا تھا اور جس کے ذریعے ایک فقیہہ (خمینی) کو مکمل اختیارات دیئے گئے تھے جو مسلح افواج کی کمان کے علاوہ وزیراعظم کو عارضی طور پر برطرف بھی کرسکتا تھا۔ آئین میں ایک منتخب صدر پارلیمنٹ (کابینہ) اور بارہ اراکین پر مشتمل گارڈین کی کونسل (جو شریعت کے خلاف قوانین کو ویٹو کرسکے) کے لئے گنجائش موجود تھی۔

آئین کے مسوّدے کی شدید مخالفت تھی۔ بائیں بازو کی گوریلا تحریکیں ایران کی نسلی اقلیت اور مسلم پیپلز ری پبلکن پارٹی (آیت اللہ شریعت مداری) سب سختی کے ساتھ اس کے خلاف

تھے۔لبرل اور مغربی تعلیم یافتہ متوسط طبقے نئی حکومت کی اسلامی انتہا پسندی سے دل گرفتہ تھے انہیں ایسا لگا کہ وہ سابق شاہ کے ظلم سے نجات حاصل کرنے کے لئے اتنی بہادری کے ساتھ گویا اس لئے لڑے تھے کہ اب اسلامی جبرواستبداد کا نشانہ بنیں۔انہوں نے دیکھا کہ آئین کے مسودے میں اخبارات کی آزادی اور سیاسی اظہار رائے کی آزادی (جس کے لئے لبرل، پہلوی حکومت سے لڑے تھے) کی ضمانت اس شرط پر دی گئی کہ وہ اسلامی قانون کے خلاف نہ ہوں وزیراعظم بازرگان خصوصی طور پر بے باک شخص تھا۔وہ خمینی پر حملہ کرنے میں محتاط تھا مگر سختی کے ساتھ ان پر تنقید کرتا تھا۔انہیں وہ اسلامی انقلابی پارٹی میں رجعت پسند ملائیت کا نام دیتا تھا جو مجوزہ آئینی شقوں کے ذمہ دار تھے جن سے اسلامی انقلاب کا مقصد ہی فوت ہوجاتا تھا۔

خمینی کو بحران کا سامنا تھا۔تین دسمبر کو مسودہ آئین پر قومی ریفرنڈم میں لوگوں کو ووٹ دینا تھا۔لگتا تھا کہ ولایت فقیہہ کو واضح شکست ہوگی۔اب تک خمینی عملیت پسند رہے تھے۔پہلوی حکومت کا تختہ الٹنے کے لئے انہوں نے بائیں بازو، اسلام پسندوں، دانش وروں، لبرل حلقوں اور قوم پرستوں کا مشترکہ تعاون بڑی چابکدستی سے حاصل کیا تھا مگر 1979 کے آخر تک واضح ہوگیا تھا کہ متضاد مقاصد کا حامل یہ گروپ ٹوٹ کر بکھرنے کو ہے اور انقلاب کا مستقبل (جیسا کہ خود انہوں نے کہا) خطرے میں پڑ گیا ہے۔اس موقعہ پر امریکہ نادانستہ طور پر ان کی مدد کو آیا۔

امریکہ کو شیطان کہہ کر اس کی مذمت کرنے کے باوجود نئی اسلامی جمہوریہ اور امریکہ کے درمیان تعلقات بہت محتاط لیکن ٹھیک ٹھاک تھے۔14 فروری 1979 کو خمینی کی ایران واپسی کے تھوڑے عرصہ بعد طلباء نے تہران میں امریکی سفارت خانہ پر حملہ کردیا اور اس پر قبضہ کرنے کی کوشش کی مگر خمینی اور بازرگان نے فوراً طلباء کو وہاں سے نکلوادیا۔اس کے باوجود خمینی نے کبھی بڑے شیطان پر بھروسہ نہیں کیا۔انہیں یقین نہیں آتا تھا کہ امریکہ کسی جدوجہد کے بغیر ایران میں اپنے مفادات سے دستبردار ہوجائے گا۔بنیاد پرست لیڈروں سے منسوب مخصوص شک کی وجہ سے خمینی سمجھتے تھے کہ امریکہ صحیح وقت کے انتظار مین ہے۔بالآخر وہ سازش کے ذریعہ نئی اسلامی حکومت کا تختہ الٹنے کی کوشش اسی طرح کرے گا جس طرح اس نے 1953 میں سازش کے ذریعہ مصدق کی حکومت کا خاتمہ کیا تھا۔جب بائیس اکتوبر 1979 کو شاہ سرطان کے علاج کے لئے نیویارک گیا تو خمینی کا شک یقین میں بدل گیا۔امریکہ کو اس کے اپنے مشیروں اور تہران نے

خبردار کیا تھا کہ وہ سابق شاہ کو امریکہ میں علاج کی اجازت نہ دے مگر کارٹر سمجھتا تھا کہ اسے ایک سابق وفادار اتحادی کو انسانی خدمت سے محروم نہیں کرنا چاہیے۔

بڑے شیطان کے خلاف خمینی کے لہجہ میں یکا یک تیزی آ گئی انہوں نے مطالبہ کیا کہ محمد رضا شاہ پہلوی کو سزا کے لئے ایران بھیجا جائے اور اپنی حکومت سے ان تمام لوگوں کو نکال دینے کا حکم دیا جو پچھلی حکومت کے وفادار تھے۔ انہوں نے اعلان کیا کہ اسلامی ایران میں اب بھی غدار موجود ہیں جن کا رابطہ مغرب سے ہے۔ انہیں ملک سے نکال دینا چاہیے۔ یہ سمجھنے کے لئے کسی جینئس کی ضرورت نہیں تھی کہ خمینی کے اس حملہ کا اصلی نشانہ وزیراعظم بازرگان اور آئین کے مسودے کے تمام مخالف تھے۔ یکم نومبر کو الجزائر کی تقریبات آزادی میں حصہ لینے کو بازرگان روانہ ہوا جہاں کارٹر کے نیشنل سیکورٹی ایڈوائزر برزنسکی کے ساتھ ہاتھ ملاتے ہوئے اس کی تصویر اتاری گئی جس کی وجہ سے اسلامی انقلابی پارٹی میں بازرگان کے مخالفوں نے اسے امریکی ایجنٹ قرار دیا۔ اس اشتعال انگیز ماحول میں چار نومبر کو تقریباً چار ہزار طلباء نے تہران میں امریکی سفارت خانے پر حملہ کر دیا اور نوے افراد کو یرغمال بنالیا۔ پہلے تو یہ سمجھا گیا کہ خمینی انہیں فوراً رہا کرالیں اور پہلے کی طرح طلباء کو وہاں سے چلے جانے کے لئے کہیں گے لیکن ایسا نہیں ہوا۔ آج تک یہ واضح نہیں ہوسکا کہ کیا طلباء کے سفارت خانے میں داخل ہونے کے فیصلہ کا خمینی کو پہلے سے پتہ تھا۔ بہرحال تین دن تک انہوں نے اس سلسلے میں کوئی قدم نہیں اٹھایا مگر جب بازرگان نے دیکھا کہ سفارت خانہ کے محاصرہ کے سلسلہ میں اسے خمینی کی امداد حاصل نہیں تو اسے اپنی سیاسی اہمیت کا اندازہ ہوگیا۔ چنانچہ 6 نومبر کو اس نے اور سیکرٹری خارجہ ابراہیم یزدی نے استعفیٰ دے دیا۔ طلباء یہ سمجھے تھے کہ ان کا محاصرہ چند روز تک جاری رہے گا مگر یہ دیکھ کر خود انہیں بڑی حیرت ہوئی کہ ان کی وجہ سے ایران اور امریکہ کے درمیان ایک نئی محاذ آرائی شروع ہوگئی۔ طلباء کو خمینی اور اسلامی انقلابی جمہوریہ کی مدد حاصل ہوگئی۔ یرغمالیوں کے بحران کی عالمی سطح پر تشہیر سے خمینی کو ایک نئی اہمیت ملی اگرچہ یرغمالی عورتیں اور سیاہ فام میرین گارڈز پہلے رہا کر دیے گئے۔ باقی 52 امریکی سفارتکار 444 دن محصور رہ کر ایرانی انتہا پسندی کی تصویر بن گئے۔

خمینی کے لئے یرغمالی ایک نعمت سے کم نہیں تھے۔ ''بڑے شیطان'' ایک بیرونی دشمن پر توجہ مرکوز کر کے اور ان کے محاصرے اور امریکہ سے نفرت نے داخلی بے چینی کے دور میں ایرانیوں کو

خمینی کے پیچھے متحد کر دیا۔ بازرگان کے جانے سے آئین کے مسودے کا ایک بے باک مخالف منظر سے ہٹ گیا اور اپوزیشن کمزور ہوگئی۔ اس طرح دسمبر کے ریفرنڈم میں نیا آئین اکثریت کے ساتھ پاس ہوگیا۔ خمینی نے یرغمالیوں کے بحران کو محض اپنی داخلی صورت حال کے حوالے سے دیکھا جیسا کہ انہوں نے اپنے نئے وزیر اعظم بنی صدر سے اس کی وضاحت کی:

''اس محاصرے سے کئی فوائد حاصل ہوئے ہیں امریکی، اسلامی جمہوریہ کو مضبوط ہوتے ہوئے نہیں دیکھ سکتے، یرغمالیوں کے ذریعے ہم اپنے داخلی مقاصد پورے کر سکتے ہیں۔ پھر انہیں رہا کر دیں گے۔ اس سے ہمارے لوگ متحد ہوئے ہیں۔ ہمارے دشمن ہمارے خلاف قدم اٹھانے کی جرأت نہیں کر سکتے۔ ہم آئین کو کسی مشکل کے بغیر لوگوں کی رائے دہی کے لئے ان کے سامنے پیش کر سکتے ہیں جب ہم اپنے مقاصد پورے کر لیں گے یرغمالیوں کو رہا کر دیں گے۔''

خمینی کی آتش بیانی سے قطع نظر یہ پالیسی اسلامی مانتھوس کی مظہر نہیں تھی بلکہ عملیت پسند لوگوں کا حصہ تھی۔ اس کے باوجود اس بحران نے خود خمینی کی تصویر بدل دی تھی۔ ایک عملی سیاست دان رہنے کی بجائے وہ مغربی سامراج کے خلاف جدوجہد میں (اپنی نظر میں) امت کے لیڈر بن گئے تھے۔ لفظ ''انقلاب'' نے ان کی تقریر میں ایک مقدس قدر کا درجہ حاصل کر لیا تھا۔ صرف وہی دنیا کی ایک طاقتور سامراجی طاقت کے مقابلہ میں کھڑے ہو سکتے تھے اور اس کی طاقت کا عجز نمایاں کر سکتے تھے اس وقت ایران اور اسلام کے خلاف اس بحران سے قدرتی طور پر پیدا ہونے والی نفرت نے خمینی کو انقلاب کی پائیداری کا احساس دلایا۔ ویسے بھی خمینی کو خارجی اور داخلی دشمنوں سے خطرہ تھا۔ مئی کے آخر اور وسط جولائی کے درمیان حکومت کے خلاف بغاوت کی چار مختلف سازشوں کا انکشاف ہوا اور سال کے آخر تک سیکولر گوریلوں اور خمینی کے انقلابی گارڈز کے مابین مستقل لڑائیاں ہوتی رہیں۔ ان دنوں خوف اور کنفیوژن میں اور اضافہ ہوا جب تمام ایران میں نام نہاد انقلابی کونسلوں کا جال پھیلا جسے روکنے میں حکومت ناکام رہی۔ ان مقامی کونسلوں نے سینکڑوں افراد کو ''غیر اسلامی'' طریقے اختیار کرنے یا پہلویوں کی ملازمت کے جرم میں قتل کر دیا۔ مرکزی طاقت ختم ہونے کے بعد ایسے مقامی اداروں کا ابھر آنا انقلاب کی اپنی خصوصیت تھی۔ خمینی نے ان زیادتیوں کی مذمت کی اور کہا کہ یہ اسلامی قانون کی خلاف ورزی اور انقلاب کی توہین ہے مگر انہیں منتشر نہیں کیا بلکہ اپنی سرپرستی میں لے آئے اور اپنی حکومت کی حمایت کا گراس روٹ

ذریعہ بنالیا۔ خمینی کو عراق کے ساتھ جنگ کا سامنا بھی کرنا پڑا۔ 20 دسمبر 1980 کو عراقی صدر صدام حسین کی فوجوں نے امریکہ کی شہہ پر جنوب مغربی ایران پر حملہ کر دیا۔ خمینی کو اپنے سماجی اصلاحات کے منصوبے ملتوی کرنے پڑے اس تمام عرصہ میں امریکی یرغمالیوں سے شاید کوئی مقصد حاصل ہوتا رہا جب ان کی افادیت ختم ہوگئی تو انہیں 20 جنوری 1981 کو نئے امریکی صدر رونلڈ ریگن کے عہدہ سنبھالنے پر رہا کر دیا گیا۔

یرغمالیوں کی وجہ سے نئی اسلامی جمہوریہ کا امیج خراب ہوا۔ اس بحران کے دوران بڑے شیطان کی ناانصافیوں کے متعلق سنگین الزامات سے قطع نظر ان افراد کو یرغمالی بنانا کوئی مذہبی یا اسلامی کارنامہ نہیں تھا۔ اس کے برعکس اگرچہ امریکیوں کو یرغمالی بنانا اکثر ایرانی تحسین کی نظر سے نہیں دیکھتے تھے مگر بہت سے اسے علامت کے طور پر سمجھ سکتے تھے۔ امریکی سفارت خانہ ایرانی زمین پر بیرونی ملک کا قبضہ تھا اور سفارت خانے یعنی اس علاقہ پر طلباء کا قبضہ امریکی حاکمیت اعلیٰ پر حملے کے مترادف تھا۔ بعض افراد کی نظر میں امریکی شہریوں کا خود اپنے سفارت خانہ میں قیدی ہونا اس وقت کی یاد دلاتا ہے جب ایرانی امریکہ کی سازش سے خود اپنے وطن میں قیدیوں کی طرح رہتے تھے اور امریکہ پہلوی آمریت کی حمایت کرتا تھا مگر یہ انتقامی سیاست تھی مذہبی سیاست نہیں تھی۔ سفارت خانہ پر قبضہ کے ابتدائی دنوں میں بعض یرغمالیوں کے ہاتھ پاؤں باندھ دیے گئے اور انہیں بولنے سے منع کیا گیا۔ انہیں کہا گیا کہ امریکہ نے ان کا ساتھ چھوڑ دیا ہے۔ کچھ عرصہ بعد یرغمالی نسبتاً بہتر جگہ رکھے گئے مگر اس طرح کا ظلم اور بدسلوکی اسلام سمیت تمام بڑے مذاہب کے بنیادی اصولوں کی خلاف ورزی ہے کوئی مذہبی نظریہ یا عمل مستند نہیں ہوسکتا اگر اس کی بنیاد انسانی ہمدردی نہیں۔

ہندو توحید پرست بدھ اور تاؤ کے پیرو سب مانتے ہیں کہ مقدس حقیقت کہیں باہر نہیں بلکہ ہر فرد ہر انسان کے اندر جلوہ گر ہے اس لئے اس کے ساتھ احترام سے پیش آنا چاہیے۔ بنیاد پرست چاہے یہودی ہوں، عیسائی یا مسلمان ہوں ان کا مذہب اس کٹھن آزمائش میں ناکام ہوجاتا ہے۔ اگر وہ طیش اور نفرت کی دینیات بن جائے۔ دراصل کسی کو اس طرح یرغمالی بنانا، قیدیوں سے سلوک کے سلسلہ میں اسلامی قوانین کی خلاف ورزی ہے۔ قرآن کا تقاضہ ہے کہ مسلمان اپنے دشمنوں سے بھی انسانی سلوک کریں (باقاعدہ جنگ کے بغیر امریکیوں کو یرغمال

بنائے رکھنے کا امکان خود ہی ختم ہو جاتا ہے) کسی کو قیدی بنانا خلاف قانون ہے۔ اسلام کہتا ہے کہ قیدیوں کے ساتھ برا سلوک نہ کیا جائے اور جنگ ختم ہونے کے بعد انہیں بطور احسان یا تاوان لے کر رہا کر دیا جائے۔ اگر تاوان کی ادائیگی ممکن نہ ہو تو قیدی کو ملازمت تلاش کرنے دی جائے تاکہ وہ اپنی کمائی سے تاوان ادا کرے۔ جس مسلمان کی سرپرستی میں اسے دیا جائے لازم ہے کہ مطلوبہ رقم جمع کرنے میں وہ اس کی مدد کرے۔'' قیدیوں کے ساتھ سلوک کے متعلق ایک حدیث پیغمبر اسلامؐ سے منسوب ہے۔ ''تم انہیں وہ کھانا دو جو تم خود کھاتے ہو، وہی لباس پہناؤ جو تم پہنتے ہو اگر تم ان سے کوئی سخت کام لو تو اس میں تم ان کی مدد کرو'' شیعہ جو غیر ملکوں میں یرغمال بنائے جانے والے ائمہ کا احترام کرتے ہیں ان کے لئے کسی کو یرغمال بنانا خاص طور پر سے ناپسند ہونا چاہیے۔ اس طرح کسی کو یرغمال بنانے کا تعلق شاید سیاسی سمجھ بوجھ سے ہو لیکن اس کا مذہب یا اسلام سے قطعاً کوئی تعلق نہیں۔

بنیاد پرستی حالت جنگ میں ہے اور بنیاد پرست یہ سمجھتے ہیں کہ وہ ایک دشمن دنیا سے اپنی بقاء کی جنگ لڑ رہے ہیں اس سے ان کا ذہن متاثر ہوتا ہے اور بعض اوقات غلط سوچنے لگتا ہے۔ خمینی جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں کئی دوسرے بنیاد پرستوں کی طرح شک اور بدگمانی کے شکار تھے۔ 20 نومبر 1979 کو پہلی دفعہ یرغمالی بنانے کے تھوڑے عرصہ بعد سینکڑوں مسلح سنیوں نے مکہ (سعودی عرب) پر قبضہ کر لیا اور اپنے لیڈر کے متعلق اس کے مہدی ہونے کا دعویٰ کیا۔ خمینی نے اس گستاخی کو امریکہ اور اسرائیل کی مشترکہ سازش کہہ کر اس کی مذمت کی۔ سازش کا یہ خوف عام طور پر اس وقت پیدا ہوتا ہے جب لوگ سمجھتے ہیں کہ وہ تباہی کے دہانے پر کھڑے ہیں ایران میں مایوسی کا عالم تھا حکومت کے خلاف خمینی کی مقبولیت کے باوجود بے چینی بڑھ رہی تھی حکومت پر تنقید یا اس کی مخالفت کی اجازت نہیں تھی۔ 1981 کے دوران دوسرے بڑے علماء (آیت اللہ) کے ساتھ خمینی کے تعلقات خراب ہونے لگے۔ ریڈیکل اسلامسٹ اور سیکولرسٹ کے مابین جنگ جیسی صورتحال تھی اسلامسٹ مکمل طور پر شرعی قوانین کا نفاذ چاہتے تھے۔ 22 جولائی 1981 کو بنی صدر (جو صرف ایک سال صدر رہا) کو برطرف کر دیا گیا اور وہ پیرس فرار ہو گیا۔ 28 جون کو خمینی کا سب سے برا رفیق آیت اللہ بہشتی اور اسلامی انقلابی پارٹی کے 75 اراکین پارٹی ہیڈ کوارٹر پر بم کے حملے میں مارے گئے اس وقت تک خمینی ملازمتوں کے معاملہ میں عام لوگوں کو ترجیح دیتے

رہے تھے مگر اکتوبر میں انہوں نے حجتہ الاسلام علی خامنہ ای کو صدر بننے کی اجازت دی اب مجلس میں علماء کی اکثریت ہوگئی تھی۔1983 تک حکومت کی مخالفت مکمل طور پر دبا دی گئی۔ بنی صدر کے جانے کے بعد مجاہدین خلق زیرزمین چلے گئے۔ نیشنل فرنٹ، نیشنل ڈیموکریٹک پارٹی (مصدق کے پوتے کی زیرقیادت) اور شریعت مداری کی مسلم پیپلز ری پبلکن پارٹی سب منتشر کر دی گئیں۔ خمینی کا مقصد اب خیالات میں یکسانیت پیدا کرنا تھا۔

جیسا کہ انقلاب کے بعد اکثر ہوتا ہے نئی حکومت بھی اپنے پیشروؤں کی طرح آمرانہ ہوتی گئی۔ دشمنوں سے تنگ آ کر خمینی نے دوسرے ماڈرن سیکولرسٹ انقلابی نظریہ سازوں کی طرح نظریاتی ہم آہنگی پر زور دینا شروع کیا اسلامی معنوں میں یہ ایک نئی پسپائی تھی۔ یہودیت کی طرح اسلام بھی عمل میں ہم آہنگی کا تقاضہ کرتا ہے۔ مگر نظریاتی آرتھوڈوکسی (فرسودہ خیالی) کبھی اس کا مقصد نہیں رہا۔ مذہبی مقامات میں شیعہ مجتہدین کے عمل کی تقلید کرتے تھے مگر ان سے یہ توقع نہیں کی جا سکتی تھی کہ وہ کسی مجتہد کے عقیدہ سے بھی متفق ہوں۔ اب خمینی کا اصرار تھا کہ ایرانی لوگ ولایت فقیہہ کی تھیوری تسلیم کریں اور تمام اپوزیشن کا خاتمہ کریں ''اظہار خیالات کی یکسانیت کامیابی کا راز ہے لوگ خیالات کی وحدت کے بغیر روحانی کمال نہیں حاصل کر سکیں گے۔ رائے اور خیالات میں کوئی جمہوریت نہیں ہوتی لوگوں کو سپریم فقیہہ کی پیروی کرنی چاہیے جس کے صوفیانہ عمل سے اسے ''مذہب میں کمال'' حاصل ہوا ہے تب وہ ائمہ کے رستہ پر چل سکیں گے۔''

مگر اس کا مطلب آمریت نہیں تھی مخالف دنیا میں زندہ رہنے کے لئے مسلمان کو اتحاد کی ضرورت تھی۔ ''آج اسلام کا مقابلہ دشمنوں اور کافروں سے ہے۔'' خمینی نے آذر بائیجان کے ایک وفد سے کہا ''ہمیں طاقت حاصل کرنی ہے، طاقت خدا سے رجوع کرنے اور ہم خیالی سے حاصل ہوتی ہے اگر مسلمانوں کو سپر پاورز کا مقابلہ کرنا ہے تو انہیں آپس میں لڑنا نہیں چاہیے، اگر ایران کو نئے سرے سے متحد ہونا ہے تو اس کے لئے سخت محنت کرنی چاہیے اب تک وہ برسوں سے جدیدیت کے عمل کی وجہ سے دو قوموں میں تقسیم رہا ہے۔''

مغرب میں اس خبر سے وحشت پھیل گئی کہ خمینی نے ایرانی والدین سے کہا ہے کہ وہ مذہب کے مخالف بچوں سے اپنا رشتہ توڑ لیں اور مذہب کا مذاق اڑانے والے ایرانیوں پر ارتداد کا فتویٰ لگا کر انہیں موت کی سزا دیں۔ اس سے اس فکری آزادی کی خلاف ورزی ہوتی تھی جو یورپ اور

امریکہ میں ایک مقدس قدر سمجھی جاتی تھی۔ مگر مغرب کے لوگ یہ ماننے پر مجبور تھے کہ خمینی کے دل میں ایرانی عوام کی محبت میں کمی کبھی نہیں آئی۔ جن میں بازاری، مدرسوں کے طلباء، کم معروف علماء اور غرباء سبھی شامل تھے۔ انہیں شاہ نے اپنے جدیدیت کے پروگرام میں شامل نہیں کیا تھا۔ اس لئے وہ جدید خیالات نہیں سمجھتے تھے جہاں سیکولرسٹ، روایت کی مزاحمت کو دلیرانہ عمل سمجھتے تھے خمینی کے پیرواب بھی خدا کی حاکمیت کو سب سے بلند درجہ دیتے تھے اور فرد کے حقوق کی اہمیت نہیں سمجھتے تھے۔ وہ خمینی کو سمجھ سکتے تھے مگر مغرب کو نہیں سمجھتے تھے۔ وہ اب بھی مذہبی اور جدید دور سے پہلے کے انداز میں بات کرتے تھے جو اندازِ مغرب کے لوگ نہیں سمجھ سکتے تھے مگر خمینی میں پاپائیت کا زعم نہیں تھا انہوں نے بڑے اصرار کے ساتھ کہا کہ میری ''معصومیت'' کا یہ مطلب نہیں کہ میں غلطی نہیں کرسکتا۔ جو میں نے کل کہا تھا اسے شاید آج بدل دوں اور آنے والی کل کو شاید اسے بھی بدل دوں۔'' انہوں نے کونسل آف گارڈینز کے علماء سے دسمبر 1983 میں کہا ''اس کا یہ مطلب نہیں کہ میں نے کل جو بیان دے دیا ہے اس پر قائم رہوں۔''

اس کے باوجود ''خیالات کی یکسانیت'' ایک لحاظ سے پابندی تھی بعض لوگ تو اسے اسلام کو مسخ کرنے کے مترادف سمجھتے تھے۔ یہودی اور عیسائی بنیاد پرست بھی اپنے مختلف طریقوں سے عقیدہ کی یکسانیت پر زور دیتے تھے مگر بڑی سختی کے ساتھ یہ دعویٰ کرتے ہوئے کہ مذہب کے متعلق صرف ان کا بیان مستند ہے۔ خمینی کا یکساں اظہار اسلام کے ایک ناگزیر اور لازمی جزو کو اس کی سطح سے گرا کر ایک نظریہ کی سطح پر لے آیا۔ خمینی کے اپنے نظریات کو اتنی اہمیت دینے کا مطلب بت پرستی کا الزام سر لینا تھا مگر اس میں احساس کا عنصر بھی شامل تھا۔ برسوں سے خمینی مذہب کی دشمن ایک سیکولر حکومت کی جارحیت اور ظلم سے لڑ رہے تھے اب وہ صدام حسین سے جنگ کر رہے تھے اور اسلامی جمہوریہ کے ساتھ دنیا بھر کی دشمنی سے بھی پوری طرح باخبر تھے۔ یکساں اظہار ایک دفاعی حربہ تھا۔ ایران کو ایک بار پھر اسلامی ملک بناتے ہوئے خمینی خدا کی دشمن دنیا میں ایک نئی وسیع اور دشمنوں میں محصور ریاست تخلیق کر رہے تھے۔ ظلم اور خطرات کے تجربہ کے علاوہ انہیں احساس تھا کہ وہ سیکولرازم سے ایک ایسی دنیا میں لڑ رہے ہیں جہاں روحانیت بدترین جارحیت سے دوچار ہے۔ ظلم و جبر کا تجربہ اتنا دل خراش تھا کہ اس سے مذہب کا جابرانہ تصور پیدا ہوا۔

خمینی جانتے تھے کہ انقلاب جدید دنیا کی ریشنل عملیت پسندی کے خلاف بغاوت ہے۔

لوگوں نے ثابت کر دیا تھا کہ وہ اعلیٰ مقاصد کے لئے جان قربان کر سکتے ہیں۔'' کیا کوئی شخص اچھا مکان حاصل کرنے کے لئے اپنا بیٹا شہید کروا سکتا ہے؟'' انہوں نے کاریگروں کے مجمع سے پوچھا (دسمبر 1979) '' یہ مسئلہ نہیں ہے۔ مسئلہ ایک دوسری دنیا ہے۔ شہادت دوسری دنیا کے لئے ہے۔ اس شہادت کی تمنا خدا کے ولیوں اور پیغمبروں نے کی ہے۔ لوگ بھی انہیں معنوں میں اس کی تمنا کرتے ہیں۔ سائنسی ریشنلزم زندگی کے معنی نہیں بتا سکتا۔ یہ ہمیشہ متھ کا اعزاز رہا ہے۔ مغرب میں مائتھالوجی ترک کرنے سے بعض حلقوں میں خلا پیدا ہو گیا جسے سارتر خدا سے مشابہ گھاؤ کہتا ہے۔ لاتعداد ایرانی اپنی روزمرہ اور سیاسی زندگی میں روحانیت کی اچانک کمی سے اپنی سمت کھو بیٹھے تھے خمینی کو یقین تھا کہ لوگ سہہ جہتی مخلوق ہیں۔ ان کی ضروریات مادی ہیں اور روحانی بھی ہیں اور وہ ایک ایسے ملک کے لئے جان دینے کو تیار ہیں جس نے مذہب کو ان کی شناخت کا مرکز بنا دیا ہے۔ اس طرح وہ اپنی مکمل انسانیت پھر حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ خود خمینی نے بحران میں بھی سیاست کا ماورائی پہلو کبھی نہیں بھلایا۔ جب ایران۔عراق کے درمیان جنگ شروع ہوئی بنی صدر نے سابق شاہ کے فوجی افسروں کو جیل سے رہا کرنے کا مشورہ دیا تا کہ وہ جنگ میں حصہ لیں اور مناسب ہدایات دیں۔ خمینی نے انکار کر دیا۔ انقلاب کا مقصد معاشی خوشحالی یا علاقائی سالمیت نہیں۔ خمینی نے حضرت علی کے متعلق ایک مثال دی '' شام میں معاویہ (اُمیہ خاندان کے بانی) کے ساتھ جنگ سے پہلے حضرت علی نے اپنے سپاہیوں کے سامنے توحید کے موضوع پر ایک تقریر کی جب فوج کے افسروں نے پوچھا کہ کیا اس موقعہ پر (توحید کے متعلق) یہ وعظ موزوں تھا۔ علیؑ نے جواب دیا '' اسی کے لئے تو ہم معاویہ سے لڑ رہے ہیں کوئی دنیاوی فائدہ ہمارے مدنظر نہیں۔'' جنگ کا مقصد اُمت کی وحدت کو سلامت رکھنا تھا جسے خدا کی وحدت کا مظہر ہونا چاہیے۔ مسلمان توحید کی خاطر لڑ رہے تھے ان کی لڑائی شام کو فتح کرنے کے لئے نہیں تھی۔

یقیناً یہ قابل نفرت بات ہے مگر اس سے ایک مسئلہ پیدا ہو گیا۔ مائتھوس اور معنی دونوں انسانوں کی ضرورت ہیں۔ ریشنل لوگوس بھی ان کی ضرورت ہے جدید زمانہ سے پہلے یہ دونوں حلقے ناگزیر سمجھے جاتے تھے مگر صرف اس لئے کہ متھ ریشنل اور منطقی لفظوں میں بیان نہیں ہو سکتی تھی وہ عملی سیاست میں اظہار نہ پا سکی۔ یہ کام مشکل تھا اور بعض اوقات اس سے مذہب اور سیاست میں عارضی دوری پیدا ہوئی۔ امامت کے فلسفہ سے واضح تھا کہ صوفیانہ وژن اور منہ زور عملیت

پسندی میں کوئی ہم آہنگی نہیں ہوسکتی اگر چہ یہ عملیت پسندی ریاست کے سربراہ کے لئے ضروری ہے۔ خمینی بعض اوقات مائتھوس اور لوگوس کے درمیان نازک فرق کو دیکھ نہیں سکے اس لئے اس کی بعض پالیسیاں مہلک ثابت ہوئیں۔ یرغمالیوں کے بحران کے بعد تیل کی آمدنی میں اچانک کمی اور ریاست کی طرف سے ناکامی سرمایہ کاری کی وجہ سے معیشت کی حالت خراب ہوئی۔ نظریاتی بنیادوں پر ملازمتیں ختم کرنے سے ریاستی محکمے اور صنعتیں ماہرین کی خدمات سے محروم ہوگئیں۔ مغرب کے ساتھ تعلقات خراب کرکے ایران نے ضروری ساز و سامان فالتو پرزوں اور تکنیکی مشوروں کی سہولت گنوادی۔1982 تک افراط زر میں بہت زیادہ اضافہ ہوااشیائے ضرورت کی قلت ہوگئی اور عام آبادی میں بے روزگاری تیس فیصد اور شہروں میں پچاس فیصد بڑھ گئی۔ اس حکومت کے لئے لوگوں کی بدحالی ندامت کا سبب بنی جس نے اقتدار حاصل ہونے پر سماجی بھلائی کو مذہبی وجوہات کی بنیاد پر اپنے اور تخیل ایجنڈے میں سرفہرست جگہ دی تھی۔ خمینی نے غریبوں کی امداد کے لئے ہر ممکن کوشش کی۔ انہوں نے ان کی مدد کے لئے فاؤنڈیشن اور دوسری تنظیمیں بنائیں جنہیں پہلوی حکومت کے زمانے میں سخت مصائب جھیلنے پڑے تھے ورکشاپوں اور فیکٹریوں میں اسلامی ایسوسی ایشن کارکنوں کو سود کے بغیر قرضے مہیا کرتیں۔کنسٹرکشن اداروں نے کسانوں کے گھر بنانے کے لئے نوجوان ملازم رکھے۔ اس کے علاوہ زراعت صحت اور سماجی بہبود کے محکموں اور جنگ کے علاقوں میں خصوصی طور پر نوجوان کو ملازمتیں دی گئیں مگر ان کوششوں میں عراق کی جنگ سے رکاوٹ پڑ گئی اگر چہ اس جنگ میں خمینی کا ہاتھ نہیں تھا۔

خمینی عام دنیا تصوف کی دنیا کے مابین تناؤ سے واقف تھے وہ جانتے تھے کہ ایک جدید ریاست کے لئے عوام کی حمایت اور ایک نمائندہ حکومت ضروری ہے۔ جیسا کہ مغرب نے خود جدیدیت کے عمل میں جان لیا تھا کہ صرف یہی ایک طرز حکومت ہے جو ایک صنعتی اور تکنیکی معاشرہ بنانے میں کامیاب ہوسکتی ہے۔ ولایت فقیہہ کا تصور جدید سیاسی اداروں کو اسلامی تناظر دینے کو کوشش تھی تا کہ لوگوں کے لئے وہ بامعنی ہو جائیں۔ سپریم فقیہہ اور کونسل آف گارڈینز منتخب مجلس کو مذہبی اور صوفیانہ معنویت دیں گے مسلم عوام کے لئے یہ ضروری ہے کیونکہ وہ مغرب کے سیکولرسٹ آئیڈیل سے ہم آہنگ نہیں ہوسکے۔ چنانچہ ولایت فقیہہ پارلیمنٹ کی عملی سرگرمیوں کے لئے ایک صوفیانہ بنیاد فراہم کرنے اور جدید کو قدیم کے دائرے کے اندر رکھنے کی کوشش تھی مگر

ولایت فقیہہ کا تصور انہوں نے نجف کے ایک مدرسہ میں وضع کیا تھا۔ کاغذ پر اچھی نظر آنے والی تھیوری پر جب ایران میں عمل کیا گیا تو اس سے مسائل پیدا ہوئے یہ بات 1981 کے آغاز میں ہی ظاہر ہوگئی تھی جو زندگی بھر خمینی کو پریشان کرتی رہی۔

1981 میں مجلس نے بعض اہم زرعی اصلاحات تجویز کیں جن سے وسائل کی منصفانہ تقسیم یقینی ہو جاتی۔ خمینی نے لوگوں کے لئے مفید اس تجویز کی حمایت کی اگر چہ یہ شریعت کے حکم کی خلاف ورزی تھی۔ اسے یہ بھی پتہ تھا کہ جب تک ایران میں ایسی بنیادی اصلاحات نہ ہوں ایران فیوڈل اور زرعی ہی رہے گا اور جدیدیت کا ہر عمل سطحی ہوگا مگر زرعی اصلاحات کے بل کے لئے مشکلات پیدا ہوگئیں۔ آئین کے مطابق تمام قوانین کونسل آف گارڈینز کے ذریعہ پاس ہونے تھے انہیں اختیار تھا کہ وہ ایسے قوانین رد کردیں جنہیں غیر اسلامی سمجھیں کونسل کے اکثر علماء بڑے بڑے جاگیردار تھے جب ان کے سامنے یہ بل پیش کیا گیا تو اپنے فیصلے کے حق میں شرعی قوانین کا حوالہ دے کر انہوں نے اسے ویٹو کر دیا۔ خمینی نے انہیں سمجھانے کی کوشش کی ''علماء کسی طور پر بھی ایسے معاملات میں دخل نہ دیں جنہیں وہ نہیں سمجھ سکتے۔ یہ ایک ناقابلِ معافی گناہ ہوگا کیونکہ اس طرح علماء قوم کا اعتماد کھودیں گے۔'' علماء مذہب اور فقہ جانتے تھے مگر جدید اقتصادیات سے واقف نہیں تھے۔ اسلامی جمہوریہ ایک جدید ریاست ہونی چاہیے اسے ماہرین کی ضرورت ہے جو اپنی مہارت کے میدانوں کے اندر کام کرسکیں۔

مگر تعطل جاری رہا۔ زرعی اصلاحات کے سوال پر کونسل نے جھکنے سے انکار کر دیا اس لئے خمینی نے زیادہ مذہبی اپروچ سے کام لیا۔ ''اپنی اصلاح کے بغیر دوسروں کی اصلاح ممکن نہیں۔'' انہوں نے علماء کے ایک گروپ سے کہا علماء لوگوں کو اسلام کی سمت واپس نہیں لاسکتے اگر وہ خود غرض ہوں اور طاقت کی لاحاصل جنگ میں شامل ہوں۔ ہر عالم کا فرض ہے کہ اپنی خود پرستی پر قابو پائے جو ملک کی اسلامی ترقی میں رکاوٹ بنی ہوئی ہے۔ اس کا حل ایسی سطح پر آنا ہے جہاں اپنے آپ کو نظر انداز کیا جاسکے جہاں ذاتی مفاد نہیں ہوگا وہاں کوئی لڑائی، کوئی فساد نہیں ہوگا۔ خمینی کا یہ اندازِ فکر براہ راست تصوف کا فیض تھا اور عرفان حاصل کرنے کے لئے اس کی صوفیانہ ریاضت کا ثمر تھا کہ تلاش حق میں انسان جب خدا کی طرف بڑھتا ہے تو رفتہ رفتہ ذاتی آلائشوں سے پاک ہوتا رہتا ہے یہاں تک کہ وہ خود غرضی سے نجات پا کر خدا کے زندگی کو بدل دینے والے وژن

کا مشاہدہ کرتا ہے مگر جدید سیاست کے تقاضے بہت مختلف تھے۔ کونسل کے علماء خمینی کی بات نہیں سنتے تھے۔ عام طور پر سیاست ان عورتوں اور مردوں کے لئے پر کشش ہوتی ہے جنہیں اپنی بڑائی کا احساس ہوتا ہے۔ جدید سرکاری ادارے اس طرح کے ایثار کی بجائے مفاد کی دوڑ میں شامل ہو کر کام کرتے ہیں۔ جب انہوں نے اپنی ولایت فقیہہ کی تھیوری سوچی تھی تو خمینی کو یقین ہو گا کہ کونسل کے علماء اپنے صوفیانہ اور روحانی کردار کا ثبوت دیں گے حالانکہ وہ عام گھٹیا لوگوں کی طرح ظاہر پرستی اور مادیت کے جال میں گرفتار تھے۔

تعطل ختم کرنے کے لئے مجلس کے باہمت سپیکر حجۃ الاسلام ہاشمی رفسنجانی نے خمینی پر زور دیا کہ وہ زرعی اصلاحات بل پاس کرانے کے لئے اعلیٰ فقیہہ کی حیثیت سے اپنے خصوصی اختیارات کام میں لائیں۔ آئین نے اسلامی معاملات میں فقیہہ کو قطعی اختیار دیا تھا اور وہ کونسل کے فیصلے منسوخ کر سکتا تھا۔ خمینی مصلحت کے اسلامی اصول کا حوالہ دے سکتے ہیں۔ رفسنجانی نے مشورہ دیا جو فقیہہ کو ثانوی قوانین بنانے کا اختیار ایسے مسائل کے متعلق دیتا ہے جن کا براہ راست ذکر قرآن اور سنت میں نہیں اگر لوگوں کی بھلائی کا تقاضا ہو۔ مگر خمینی ایسا نہیں کرنا چاہتے تھے۔ انہیں احساس ہونا شروع ہو گیا تھا کہ سپریم فقیہہ کی پوزیشن اداروں کو کمزور کر سکتی ہے جن کی اسلامی جمہوریہ کو ضرورت ہے اگر اسے ماڈرن دنیا میں زندہ رہنا ہے۔ وہ ضعیف العمر تھے اپنے ذاتی کرشمہ کے زور پر اگر وہ سرکاری اداروں کے فیصلے بدلتے یا منسوخ کرتے رہتے تو مجلس اور کونسل جیسے ادارے اپنا اعتبار کھو دیتے اور آئین بھی خمینی کی موت تک ہی زندہ رہتا۔ چنانچہ مجلس اور کونسل کے درمیان تعطل جاری رہا۔

خمینی نے ان ایرانی بچوں کی مثال دے کر علماء کو غیرت دلائی جو عراق کے ساتھ جنگ میں ہر روز شہید ہو رہے تھے یہ نوعمر شہید صوفیانہ بصیرت کو عملی پالیسیوں میں بدلنے کے اخلاقی خطرات کی نشان دہی کر رہے تھے۔ جنگ شروع ہوتے ہی نوعمر لڑکے مسجدوں میں آ کر التجائیں کرنے لگے کہ انہیں محاذ جنگ پر بھیجا جائے۔ ان میں سے بہتوں کا تعلق غریب گھرانوں اور جھگیوں سے تھا۔ تباہ حال بستیوں کے یہ نوخیز مکین انقلاب کے دوران نئے اسلامی جذبہ سے سرشار ہوئے تھے۔ انقلاب کے بعد پھر جمود اور اکتاہٹ کا زمانہ واپس آ گیا تو بعض غریبوں کے لئے مخصوص وقف اداروں میں چلے گئے جبکہ دوسروں نے جہاد میں کام کرنا شروع کر دیا مگر اس کا محاذ جنگ

کے جوش وجذبہ سے کوئی مقابلہ نہیں تھا۔ ایران فنی لحاظ سے جنگ کے قابل نہیں تھا۔ اس کی آبادی میں بے تحاشہ اضافہ ہوگیا تھا جس میں نوجوانوں کی تعداد سب سے زیادہ تھی غریبوں کے لئے وقف ادارے نوجوانوں سے بھرے ہوئے تھے چنانچہ کم وبیش بیس لاکھ نوجوان جنگ کے لئے تیار کھڑے تھے۔ حکومت نے ایک حکم جاری کیا جس کی رو سے بارہ برس عمر کے لڑکے بھی والدین کی اجازت کے بغیر جنگ کے لئے بھرتی ہو سکتے تھے۔ وہ امام کی حفاظت میں ہوتے تھے اور موت کی صورت میں انہیں جنت میں جانے کا یقین دلایا جاتا تھا۔ ہزاروں کم عمر لڑکے سرخ فیتے سروں پر پہنے ہوئے جنگ میں شامل ہوجاتے۔ ان میں سے بعض فوج کے آگے دوڑتے ہوئے بارودی سرنگیں صاف کرتے اور کسی سرنگ کے پھٹنے سے ان کی دھجیاں ہوا میں اڑ جاتیں۔ دوسرے عراقی ٹینکوں پر خودکش حملے کرتے کئی خطوط نویس خصوصی طور سے محاذ جنگ پر ان کی وصیتیں لکھنے کے لئے جاتے مگر ان کی وصیتیں اکثر خمینی کے نام خطوط کی صورت اختیار کر لیتیں جن میں اس روشنی کا ذکر کیا جاتا تھا جو امام خمینی کے ذریعے ان کی زندگیوں میں آئی تھی اور وہ خوشی جو جنت کے راستے میں اپنے دوستوں کے دوش بدوش لڑتے ہوئے انہیں حاصل ہوتی تھی۔

یہ نوجوان امام حسین کے نقش قدم پر چل رہے تھے انہوں نے انقلاب پر خمینی کا یقین بحال کر دیا۔ یہ زہد وتقویٰ کی سب سے اعلیٰ سطح ہے جس کے ذریعے ایک مسلمان اپنی ذات کی نفی کرتا ہوا خدا کی قربت حاصل کرتا ہے۔ اپنے بزرگوں کے برعکس یہ نئی نسل فطرت کی غلام مفاد پرست اور مادیت کی دیوانی نہیں تھی وہ چاہتے تھے کہ ایران ایک خداپرست ملک صحیح معنوں میں بن جائے۔ جب عورتیں اور مرد مادی اور دنیاوی چیزوں کو اہمیت دیتے ہیں تو وہ انسانیت کی سطح سے گر کر کمتر انسان بنتے ہیں۔ ''موت کے معنی (زندگی کا) خاتمہ نہیں بلکہ موت ایک نئی زندگی کا آغاز ہے۔'' شہادت مغرب کے ریشنل پریگمیٹیزم (عملیت پسندی کے خلاف ایرانی بغاوت کا ایک نازک اور اہم موڑ بن گئی تھی مگر خمینی کے اس اصرار کے باوجود کہ شہادت زندگی کا انجام نہیں ہزاروں معصوم بچوں کو جنگ کی آگ میں دھکیل دینا، مذہب اور اخلاق کے تمام مسلمہ اصولوں کی خلاف ورزی تھی۔ اس سے ان اعلیٰ انسانی قدروں کی توہین ہوتی تھی جو مذہبی اور سیکولر طبقوں دونوں کے لئے یکساں طور پر قابلِ احترام ہیں۔ نابالغ بچوں کی شہادت مذہب کو مسخ کرنے کی ایک اور کوشش ہے جس کے مرتکب تینوں توحید پرست مذاہب کے بنیاد پرست ہیں اس کی وجہ

شاید وہ خوف ہے جو طاقتور دشمنوں کے خلاف لڑنے سے پیدا ہوتا ہے جو ہماری تباہی کے درپے ہیں۔مگر اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ ایک صوفیانہ اور دیو مالائی آمر کو عملیت پسند فوجی اور سیاسی پالیسی ساز بنانا کتنا ہلاکت خیز ہے۔ ملا صدرہ نے جب تصوف کے حوالے سے خود پرستی اور انا کی موت کی بات کی تھی تو اس نے ہزاروں بچوں کی رضا کارانہ جسمانی موت کا تصور بھی نہیں کیا تھا۔ وہی بات کہ روحانی دنیا میں کامیاب رویہ اگر عام اور ظاہری دنیا میں عملی طور پر اور بالکل اسی طرح اپنایا جائے تو وہ نہ صرف بربادی کا سبب بنتا ہے بلکہ غیر اخلاقی بھی ہوتا ہے۔صحیح معنوں میں ایک اسلامی طرز حکومت ایجاد کرنا واقعی مشکل کام تھا۔اب نحیف اور بیمار خمینی نے ایک بار اور ایک آئینی مسئلہ پر اپنی رائے دی اس بار کونسل آف گارڈینز لیبر قوانین کے راستے میں حائل تھی۔جن کے متعلق ان کا دعویٰ تھا کہ وہ شریعت کے خلاف ہیں۔خمینی جن کی حمایت کونسل کے رجعت پسند علما کی بجائے عوام دوست مجلس کو حاصل تھی، نے اعلان کیا کہ ریاست اس امر کی مجاز ہے کہ اگر لوگوں کی بھلائی کے لئے ضروری ہو تو وہ بنیادی اسلامی سسٹم بدل دے۔شریعت صنعتی دور سے پہلے کا قانون ہے اور اسے جدید دنیا کے تقاضوں کے مطابق بنانے کی خاطر اس میں انقلابی تبدیلیوں کی ضرورت ہے۔انہوں نے کہا کہ:

''ریاست کسی قسم کے بھی سماجی معاشی لیبر زرعی شہری اور دوسرے نظام کو بنیادی اسلامی نظام سے بدل سکتی ہے اور افواج (جن پر ریاست کا اجارہ ہے) کے ذریعہ عام اور جامع پالیسیاں نافذ کر سکتی ہے۔''

خمینی نے آزادی کا اعلان کیا تھا کہ ایسے عملی معاملات میں ریاست کے پاس اختیار ہونا چاہیے اور اسے روایتی مذہب کی شدید قانونی پابندیوں سے رہائی حاصل کرنی چاہیے چند ہفتوں کے بعد وہ اس سے بھی آگے گئے۔صدر خامنہ ای نے اس کا مطلب یہ لیا کہ سپریم فقیہہ کو قانون کی توجیہہ کا حق حاصل ہے۔خمینی نے جواب دیا کہ اس کا مطلب یہ نہیں تھا۔انہوں نے دہرایا (فقیہہ کی حیثیت سے اپنے اصول کے حوالے کے بغیر) کہ حکومت کے پاس صرف مذہبی قانون کی توجیہہ کا اختیار ہی نہیں بلکہ وہ تو خود اس قانون کے اظہار کا ذریعہ ہے حکومت اس مذہبی قانون کا نہایت اہم حصہ ہے جسے خدا نے پیغمبر کو سونپا ہے اور جو تمام سرسری مذہبی قوانین سے افضل ہے بلکہ اسے نماز روزہ اور حج جیسے اسلام کے ستونوں پر بھی سبقت حاصل ہے۔

حکومت کو اختیار ہے کہ وہ کسی بھی قانونی معاہدے کو یکطرفہ طور پر منسوخ کر دے اگر معاہدہ ملک اور اسلام کے مفاد میں نہیں۔ حکومت مذہبی یا سیکولر کسی بھی معاملے کو روک سکتی ہے اگر وہ اسلام کے مفاد کے خلاف ہے۔

شیعہ صدیوں سے مذہب اور سیاست دونوں کے مدار کی علیحدگی پر زور دیتے تھے۔ روحانیت اور مذہب کی مائتھوس کہ جس نے معنی تو دیئے مگر وہ سیاست کی پریگمیٹک (عملیت پسند) لوگوس سے بالکل مختلف تھی۔ اب خمینی کا اصرار تھا کہ حکومت کو لوگوں کی بھلائی اور اسلام کی خدمت سے نہیں روکنا چاہیے۔''

اکثر لوگوں نے فرض کر لیا کہ خمینی اپنی حکومت کی بات کر رہے ہیں اور اپنی ولایت فقیہہ کی ڈاکٹرین کو بڑھا چڑھا کر اسلام کے ستونوں سے بھی گویا بہتر بتا رہے ہیں۔ مغرب میں لوگ خمینی کو خبطی سمجھتے تھے مگر سپیکر رفسنجانی نے دیکھا کہ خمینی نے فقیہہ کا ذکر ہی نہیں کیا۔ خمینی کے جان نثار حامیوں کو اس نے یہ کہہ کر حیران کر دیا کہ حکومت سے خمینی کی مراد کونسل ہے۔ 12 جنوری 1988 کو ایک خصوصی لیکچر کے ذریعے رفسنجانی نے ولایت فقیہہ کی نئی توجیہہ کی۔ ''خدا نے قرآن کے ذریعے تمام وہ قوانین پیغمبرؐ اسلام کو نہیں بتائے جن کی مسلمانوں کو ضرورت تھی اس نے اپنے اختیارات حضرت محمد ﷺ کو سونپ دیئے تھے اور انہیں اجازت دی کہ وہ ضمنی معاملات میں اپنی بصیرت سے کام لیں۔ اب امام خمینی، سپریم فقیہہ نے اپنے اختیارات مجلس کو دے دیئے ہیں جسے اپنی صوابدید سے نئے قوانین بنانے چاہئیں۔'' کیا اس کا مطلب یہ ہوا کہ ایران جمہوریت کے معاملہ میں مغرب کے نقش قدم پر چل رہا تھا؟ بالکل نہیں قانون سازی کا اختیار لوگوں نے نہیں بلکہ خدا نے دیا ہے جس نے اپنے اختیارات پیغمبرؐ کو ائمہ کو اور اب امام خمینی کو دیئے ہیں، لوگوں نے نہیں بلکہ انہوں نے مجلس کو قانون سازی کا اختیار دیا ہے۔ ''تم نے دیکھا کہ جمہوریت مغرب سے بہتر شکل میں یہاں رائج ہے۔ یہ فقیہہ کی اجازت سے لوگوں کے ذریعے لوگوں کی حکومت کا بہتر سٹائل ہے۔'' پھر بھی جیسا کہ مغرب میں ہوا جدید ریاست کے تقاضوں نے ایران کو جمہوری طرز حکومت پر مجبور کر دیا مگر اس بار اس کا پیکج اسلامی تھا جس سے لوگ اپنا رشتہ جوڑ سکتے تھے اور اپنی شیعہ روایات سے ہم آہنگ ہو سکتے تھے۔

رفسنجانی نے شاید مبالغہ سے کام لیا تھا مگر خمینی خوش تھے۔ 1988 کے انتخابات میں انہوں

نے علماء کا ذکر کئے بغیر لوگوں سے محض مجلس کی حمایت کرنے کے لئے کہا لوگ جو معیشت کی بہتری کے لئے بے چین تھے انہوں نے خمینی کا اشارہ سمجھا اور موقعہ ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ علماء نے انتخابات میں اپنی آدھی نشستیں ہار دیں۔ نئی مجلس میں 270 میں سے صرف 65 اراکین نے مدرسوں کی روائتی تعلیم حاصل کی تھی۔ خمینی کو ان نتائج سے بھی خوشی ہوئی۔ انہوں نے زیادہ پریگمیٹک (عملیت پسند) سیاست دانوں کو گرین سگنل دیا جو 1988 کے موسم سرما میں آئین کے اندر ترمیم کرنا چاہتے تھے۔ اکتوبر میں انہوں نے واضح کیا کہ علماء کو ملک کی ترقی میں حائل ہونے کی اجازت نہیں ملنی چاہیے۔ تعمیر نو کے پروگرام کی رہنمائی ماہرین، وزراء، سائنسی اور ریسرچ مراکز اور مجلس کی خصوصی کمیٹیوں کے ہاتھوں میں ہونی چاہئیں۔ دو مہینے بعد انہوں نے آئین پر نظر ثانی کے لئے کمیٹی بنائی۔ ولایت فقیہہ کی حیثیت کم ہونے سے پر جوش اسلامسٹ مایوس ہوئے مگر عملیت پسند لوگ خمینی کی نیک خواہشات کے ساتھ کامران ہوئے۔

جب جون 1989 میں خمینی کا انتقال ہوا تو سیکولر اور مذہبی فریقوں کے مابین محاذ آرائی کھل کر سامنے آ گئی۔ مغرب میں خمینی عوام دشمن سمجھے جاتے تھے۔ وہاں لوگ ان کے جنازے پر ایرانیوں کا گہرا غم والم دیکھ کر ششدر رہ گئے۔ ہجوم اس زور وشور سے ان کے جنازے کے گرد جمع ہوا کہ لاش باہر گر گئی گویا کہ وہ امام کو ہمیشہ اپنے پاس رکھنا چاہتے تھے۔ بہر حال ان کی موت کے بعد اسلامی جمہوریہ ٹوٹ کر بکھر نہیں گئی بلکہ اس میں زندگی اور لچک کے نئے آثار نظر آئے۔ 9 جولائی 1989 میں پاس ہونے والے آئین کا رخ ایک سیکولر اور عملیت پسند طرز حکومت کی طرف تھا۔ اب نہ سپریم فقیہہ سے صوفیانہ قوتیں منسوب کی جاتی تھیں نہ وہ خود بخود اس اعلیٰ ترین منصب پر فائز ہوتا تھا۔ اس کے لئے اسلامی قانون سے اچھی طرح واقف ہونا ضروری تھا مگر لازمی نہیں تھا کہ سینئر مجد د ہو۔ اگر اس عہدہ کے لئے متعدد اُمیدوار ہوتے تو سیاسی بصیرت کسی اُمیدوار کی فیصلہ کن خوبی ہوتی تھی۔ مجلس بزرگان کے پاس ویٹو کرنے کا حق محفوظ تھا مگر اس کے اختیارات نئی ثالثی کونسل کے محدود کر دیئے تھے جو مجلس کے ساتھ تمام تنازعے طے کرتی تھی۔ ان تبدیلیوں کی وجہ سے مجلس ان تمام اصلاحات پر عمل کرنے کے قابل ہو گئی جن کا راستہ بزرگان نے روک دیا تھا۔ خمینی کے جنازے کے دن آیت اللہ خامنہ ای کے فقیہہ بننے کا اعلان کر دیا گیا اور 28 جولائی 1989 کو رفسنجانی نیا منتخب صدر بن گیا۔ اس کی کابینہ میں انتہا پسندوں کو نظر انداز

کر دیا گیا۔ اس کے ایک تہائی وزراء نے مغرب میں تعلیم پائی تھی۔ انہوں نے معاشی معاملات میں حکومت کی سرمایہ کاری کے اثرات زائل کرنے کی کوشش کی اور ایران میں زیادہ مغربی سرمایہ کاری کی حمایت کی مگر اس سے بھی مسائل پیدا ہوئے۔ انتہاپسندوں نے عملیت پسندوں کے خلاف لڑائی جاری رکھی۔ بزرگان اب بھی اصلاحات کی راہ میں دیوار بن سکتے تھے مگر ریاست کی ضرورت ایرانیوں کو بڑی اجتماعیت اور سیکولرازم کی طرف لے جارہی تھیں جن کی بنیاد شیعی روایات نہ کہ مغربی روایات پر تھی۔ اب لوگ نئی اقدار سے پہلے کی طرح بیزار نہیں تھے کیونکہ اب وہ انہیں ایک سازگار اسلامی فضا میں پا کر بہتر طور سے سمجھ سکتے تھے۔

یہ تبدیلی ایران کے ممتاز دانش ور عبدالکریم سروش کی تصنیفات میں دیکھی جاسکتی ہے۔ سروش نے سائنس کی تاریخ لندن یونیورسٹی میں پڑھی تھی اور انقلاب کے بعد خمینی کی حکومت میں ممتاز عہدوں پر فائز رہا تھا۔ آج وہ سیاسی اسٹیبلشمنٹ کا حصہ نہیں پھر بھی حکومت کے اراکین پر اس کا گہرا اثر ہے۔ اس کے جمعہ کے خطبے کثرت سے نشر ہوتے ہیں مسجدوں اور یونیورسٹیوں میں بھی اس کے خطبات کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ سروش خمینی اور شریعتی دونوں کا مداح ہے مگر ان دونوں سے آگے ہے۔ اسے مغرب کے متعلق بہتر علم حاصل ہے۔ یہاں تک کہ بیسویں صدی کے آخر تک اکثر ایرانیوں کی شناختیں تین تھیں۔ اسلام سے پہلے کی شناخت، اسلامی شناخت اور مغربی شناخت۔ انہیں ان تینوں کو ہم آہنگ کرنا ہے کیونکہ ہر مغربی چیز زہر آلود نہیں ہوتی۔ مگر سروش کے لئے مغرب کا انتہا پسند سیکولرازم قابل قبول نہیں۔ سائنسی ریشنلزم اس کی رائے میں مذہب کا زندہ اور متحرک متبادل نہیں ہوسکتا۔ انسانوں کے لئے ہمیشہ ایسی روحانیت کی ضرورت ہوتی ہے جو انہیں مادیت سے آگے لے جائے۔ ایرانیوں پر لازم ہے کہ وہ جدید سائنس کی اقدار سمجھیں مگر اپنی شیعی روایات پر بھی قائم رہیں۔ اسلام میں بھی تبدیلیاں ہونی چاہئیں۔ فقہ کو نئی صنعتی دنیا سے ہم آہنگ ہونا ہے۔ شہری حقوق کا تصور عام ہو اور ایسا اقتصادی نظام جو اکیسویں صدی کے تقاضے پورے کرے۔ سروش علماء کی حکمرانی کے خلاف بھی ہے کیونکہ مذہب کا مقصد اتنا عظیم ہے کہ اسے صرف علماء کو نہیں سونپا جاسکتا۔ سروش کو قدامت پسند ملا ہراساں کرتے ہیں مگر اس کی مقبولیت سے اندازہ ہوتا ہے کہ اسلامی جمہوریہ بعد از انقلاب دور کی طرف بڑھ رہی ہے جس کی وجہ سے وہ مغرب کے قریب آجائے گی۔

یہ بات اس وقت بھی واضح تھی جب 23 مئی 1997 کو حجۃ الاسلام سید خاتمی بھاری اکثریت سے صدر بن گئے۔ سید خاتمی نے 30 ملین میں سے 22 ملین ووٹ حاصل کئے تھے اس نے فوراً یہ بات واضح کردی کہ وہ مغرب سے بہتر تعلقات کے خواہش مند ہیں۔ مجلس بزرگان اب بھی خاتمی کی اصلاحات کے راستہ میں حائل ہے مگر اس کا انتخاب ایرانیوں کی بھاری اکثریت کی اس گہری خواہش کا مظہر ہے کہ وہ بھرپور اجتماعی زندگی اسلامی قانون کی بہتر توجیہہ غریبوں کے لئے معاشی تحفظ اور عورتوں کے لئے ترقی اور احترام چاہتے ہیں مگر اسلام سے روگردانی کی کوئی خواہش نہیں۔ 1999 میں یہ بات اور واضح ہوگئی جب ایرانی طلباء جمہوریت اور ایسی اسلامی حکومت کا مطالبہ کرتے ہوئے سڑکوں پر نکل آئے جس کا راستہ رجعت پسند علماء نہ روک سکیں۔ ایرانی اب بھی اپنی طرز حکومت شیعی پیکج کے مطابق چاہتے ہیں جس پیکج نے نئی قدریں اس وقت کی نسبت زیادہ قابلِ قبول بنادی ہیں جب انہیں غیر ملکی سمجھا جاتا تھا یہ اس طرح ممکن ہے کہ پرجوش مذہبی تحریکیں غور وفکر سے کام لیں اپنی جارحیت اور غیض وغضب پر قابو پائیں تو تخلیقی طور سے ایک دوسری پراثر انداز ہوسکتی ہیں۔ تشدد سے گزر کریں اور ماضی کے دشمنوں سے دوستی کرلیں۔

مذہب جتنا دبایا جائے اتنا ابھرتا ہے بلکہ تشدد کا راستہ اختیار کرتا ہے۔ 1981 میں مصر کے اندر یہ بات اس وقت اور واضح ہوگئی جب مغربی دنیا نے ایک سنی بنیاد پرست کے ہاتھوں سادات کے قتل کی خبر بڑے افسوس کے ساتھ سنی۔ سادات اسرائیل کے خلاف 1973 کی جنگ کے سلسلہ میں چھ اکتوبر کی تقریبات میں شریک تھا اچانک ایک ٹرک پریڈ کی قطار میں سے نکل کر صدر کے سامنے آگیا۔ جب صدر نے دیکھا کہ فرسٹ لیفٹیننٹ خالد اسلامبولی ٹرک سے کود کر دوڑتا ہوا اس کی طرف بڑھ رہا ہے تو یہ سمجھ کر کھڑا ہوگیا کہ افسر اسے سیلوٹ کرنا چاہتا ہے مگر اس کی مشین گن سے سادات پر گولیاں برسنی شروع ہوگئیں۔ خالد مسلسل سادات پر گولیاں برساتا رہا یہاں تک کہ جب وہ خود زخمی ہوگیا تو بھی یہ سلسلہ بند نہ ہوا ''یہ کتا، یہ کافر میرے حوالے کرو'' وہ چیختا رہا۔ حملہ صرف پچاس سیکنڈ جاری رہا۔ مگر سادات کے علاوہ سات افراد ہلاک اور 28 زخمی ہوئے۔

اس حملہ سے مغرب کو سخت صدمہ ہوا۔ وہ سادات کو پسند کرتے تھے۔ خمینی کے برعکس سادات ایسا مسلمان حکمران تھا جسے وہ سمجھ سکتے تھے ان کی رائے میں وہ متعصب ہوئے بغیر مخلص تھا۔ مغرب میں لوگ اسے اسرائیل کے ساتھ امن کی کوششوں اور اس کی 'کھلا دروازہ' پالیسی کی

وجہ سے چاہتے تھے۔ امریکی اور یورپین حکمرانوں اور سیاستدانوں کے ایک ہجوم نے سادات کے جنازے میں شرکت کی۔ نہ کوئی عرب لیڈر آیا اور نہ ہی سڑکوں پر دورویہ قطاریں باندھے لوگ کھڑے تھے سادات کے قتل کی رات قاہرہ کی سڑکیں بالکل خاموش تھیں۔ مصر کے لوگ سادات کے لئے نہیں روئے نہ وہ اس کے جنازے پر غم سے نڈھال ہوئے جدید مغرب اور مشرق وسطیٰ کے روایت پسند معاشروں کے درمیان ایک بار پھر دراڑ پڑ گئی وہ اتنے دور ہو گئے کہ حالات کے متعلق ایک دوسرے کا نظریہ نہیں جان سکتے تھے۔

جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں کہ مصریوں کی ایک معقول تعداد سادات کی حکومت کو اسلام کی بجائے 'جاہلیہ' سے زیادہ قریب سمجھتی تھی۔ 1980 میں عیدالاضحیٰ کے موقعہ پر 'جماعت الاسلامیہ' کے طلبا (جنہیں قاہرہ میں اپنا سمر کیمپ لگانے سے روک دیا گیا تھا) نے مسجد صلاح الدین پر قبضہ کر لیا۔ کیمپ ڈیوڈ کی مذمت کی اور سادات کو تاتاریوں کے ہلاکو سے تشبیہہ دی۔ جو تیرھویں صدی میں منگولوں کے حاکموں میں سے تھا جو کہتے ہیں کہ مسلمان ہو گیا تھا مگر برائے نام مسلمان ہوا تھا۔ معتوب جماعت کے دوسرے اراکین نے حکومت کے خلاف مسلح جہاد کی خفیہ تنظیموں میں شمولیت اختیار کر لی تھی۔ خالد اسلامبولی جس نے مینا یونیورسٹی میں تعلیم پائی تھی۔ انہیں میں سے ایک تنظیم کا رکن تھا۔

سادات بھی مخالفت سے باخبر تھا اور نہیں چاہتا تھا کہ اس کے ساتھ بھی وہی ہو جو اس کے دوست شاہ کے ساتھ ہوا تھا۔ 1978 میں جب ایران میں انقلاب نے زور پکڑا اس نے ایک قانون بنایا جس سے روگردانی کی سزا شہری حقوق پاسپورٹ اور جائیداد سے محرومی تھی۔ شہریوں کو کسی تنظیم میں شامل ہونے، نشریات میں حصہ لینے، ایسا مواد شائع کرنے سے منع کر دیا گیا جس سے قومی اتحاد وامن کو نقصان پہنچے۔ اپنے خاندان، اپنے گھر میں ہوتے ہوئے کسی معمولی سی بات پر بھی سزا ہو سکتی تھی۔ سادات کی زندگی کے آخری مہینوں میں حکومت اور زیادہ ظالم ہو گئی۔ 3 ستمبر 1981 کو سادات نے اپنے 1536 مخالفین گرفتار کر لئے جن میں وزراء، سیاستدان، دانشور، صحافی، مبلغ اور اسلامی گروہوں کے اراکین شامل تھے۔ ان میں سے ایک قید ہونے والا اسلامسٹ محمد اسلامبولی، سادات کے قاتل کا بھائی تھا۔

سادات کے قاتلوں کے مقاصد سمجھنے میں ہمیں عبدالسلام خراج کی تصنیف ''الفریضہ

الغائبہ'' سے کچھ مدد مل سکتی ہے جو سادات کے قتل کے بعد دسمبر 1981 میں شائع ہوئی۔ اس میں کسی قسم کی معذرت نہیں تھی۔ نہ وہ عام لوگوں کے لئے لکھی گئی تھی۔ اسے تنظیم کے اراکین میں ذاتی طور پر تقسیم کیا گیا تھا۔ اس کے ذریعہ نادر موقعہ ہمارے ہاتھ آتا ہے کہ ہم جان سکیں کہ جنگجو مسلمان آپس میں کیا باتیں کرتے ہیں ان کے خدشے ان کی بے تابیاں، ان کی بے چینیاں کیا ہیں۔

مسلمانوں کے سامنے ایک فوری مقصد تھا'' خدا نے پیغمبرؐ کو صحیح اسلامی ریاست قائم کرنے کا حکم دیا تھا خدا پہلے ہی مسلمانوں سے اپنا حکم نہ ماننے کی وجہ سے خفا تھا کیا اب بھی وقت نہیں آیا کہ خدا کے حکم کی تعمیل ہو۔ مسلمانوں پر لازم ہے کہ خدا کی رضا پوری کرنے کے لئے ہر ممکن ذریعہ سے کام لیں پچھلی نسلوں جیسی غلطی نہ کریں جو سمجھتی تھیں کہ تشدد کے بغیر، پرامن ذرائع سے اسلامی ریاست قائم ہو جائے گی جبکہ اس کا واحد طریقہ مقدس جنگ یعنی جہاد ہے۔''

فراج کا کہنا تھا کہ اگرچہ مسلمان اس مقدس تشدد پر عمل نہیں کرتے مگر یہ فرض سب سے اہم ہے۔ صدیوں سے یہ اسلامی روایت کا حصہ ہے۔ اپنا مؤقف بیان کرتے ہوئے افراج اکثر سید قطب کا انداز اختیار کر لیتا اور اس عمل میں وہ اسلامی تصور کو بگاڑ دیتا تھا۔ بگاڑنے کا یہ عمل بھی جبر کے تجربہ سے ابھارا تھا۔ اسے اصرار تھا کہ انصاف پسند معاشرہ بنانے کا ایک ہی ذریعہ تلوار ہے۔ اس نے ایک حدیث کا حوالہ دیا کہ ''جو شخص مذہب کی خاطر لڑنے کے لئے تیار نہیں اس طرح مرے گا جیسے وہ کبھی مسلمان نہیں تھا یا کسی ایسے شخص کی طرح ہے جو منافقت سے پر ہو اور صرف ظاہراً مسلمان ہو۔'' قرآن میں خدا واضح طور پر مسلمانوں سے مخاطب ہے ''تمہیں لڑنے کا حکم ہے چاہے تمہیں اچھا نہ لگے'' وہ مسلمانوں کو حکم دیتا ہے کہ انہیں مار دو جو خدا کے سوا کسی کو خدا سمجھتے ہیں۔ تم ان پر ٹوٹ پڑو اور انہیں قیدی بنالو انہیں گھیرے میں لے لو اور ہر ممکن جگہ ان کا انتظار کرو۔

فراج کے خیال میں یہ آیات ان آیات کے بعد نازل ہوئیں جن میں مسلمانوں کو اپنے دشمنوں کے ساتھ امن سے رہنے اور شائستگی کے ساتھ بات کرنے لئے کہا گیا تھا۔ اس لئے وہ آیات منسوخ ہو گئیں جن میں قرآن نے تشدد سے بیزاری کا اظہار کیا تھا۔

مگر فراج ایک مشکل میں تھا قرآن صرف ان بت پرستوں کے خلاف ہے جو خدا کے سوا

کسی اور کو خدا مانتے ہیں مگر سادات کا دعویٰ مسلمان ہونے کا تھا اور وہ پانچوں ارکان کا پابند تھا پھر مسلمان اس سے کیونکر لڑ سکتے تھے؟ فراج کو ابن تیمیہ کے ایک فتوے سے مدد ملی جس نے چودھویں صدی میں کہا تھا کہ منگول حاکم جو مسلمان ہوئے تھے وہ دراصل مرتد تھے کیونکہ انہوں نے شریعت کی بجائے اپنے قانون کے ذریعے حکومت کی تھی۔ فراج نے اعلان کیا کہ مصر کے موجودہ حکمران منگولوں سے بھی بدتر ہیں۔ منگولوں کے قوانین میں یہودیوں اور عیسائیوں کے قوانین کا بھی کچھ حصہ تھا مگر آج مصر کا قانون نظام بے دینی پر مبنی ہے جسے کافروں نے بنایا ہے اور نوآبادیاتی طاقتوں نے مسلمانوں پر مسلط کر دیا ہے۔

''اس دور کے حکمران اسلام کے منکر ہیں وہ سامراج کے ٹکڑوں پر پلے ہیں چاہے وہ عیسائیت، کمیونزم یا صیہونیت کا سامراج ہو۔ ان کے ناموں کے سوا اسلام سے ان کا کوئی تعلق نہیں اگرچہ وہ نماز پڑھتے اور روزے رکھتے ہیں اور مسلمان ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں۔''

جن طلباء نے 1980 میں صلاح الدین مسجد پر قبضہ کیا تھا انہوں نے بھی سادات کا موازنہ منگول حکمرانوں سے کیا تھا۔ فراج کے خیالات انتہا پسندوں کے ایک مختصر گروہ تک محدود نہیں رہے۔ 1980 کے عشرہ تک وہ عام ہو چکے تھے اور مختلف مقامات میں ان پر بحث ہوتی تھی۔

فراج مانتا تھا کہ اسلامی قانون کی رو سے جہاد مسلمانوں کی اجتماعی ذمہ داری ہے۔ کوئی ایک فرد یہ مقدس جنگ شروع کرنے کا مجاز نہیں بلکہ اس کا انحصار ملت کے اجتماعی فیصلہ پر ہے اس قانون کا اطلاق اس صورت میں ہوتا ہے جب غیر ملکی دشمن حملہ آور ہوں آج کے حالات زیادہ خطرناک ہیں کیونکہ مصر میں کافروں نے اقتدار سنبھال لیا ہے۔ اس لئے جہاد انفرادی حیثیت سے بھی ہر اس مسلمان پر فرض ہو گیا جو لڑ سکتا ہو۔ اسلام کی اتنی عظیم روایت صرف اس ایک نکتہ میں سمٹ کر رہ گئی تھی۔ کہ سادات کے مصر میں اچھا مسلمان ہونے کا ایک ہی ثبوت، حکومت کے خلاف پرتشدد مقدس جنگ میں حصہ لینا ہے۔

فراج ان سوالات کا جواب بھی دیتا تھا جو اس کے نوجوان شاگردوں کے لئے باعث پریشانی تھے۔ اگرچہ وہ قتل کی منصوبہ بندی کر رہے تھے مگر جہادی چاہتے تھے کہ ان کا روّیہ جس قدر ممکن ہوا اخلاق کے تقاضوں کے مطابق ہو۔ کیا اپنا منصوبہ چھپانے کے لئے جھوٹ بولنا جائز ہے؟ ظالم حکمران پر حملے میں اگر بعض معصوم لوگ بھی گولیوں کی زد میں آ کر مارے جائیں تو اس

کا جواز کیا ہوگا؟ مصر، جہاں خاندان بڑے مضبوط اور منظّم ہیں نوجوان بیٹے جاننا چاہتے تھے کہ والدین کی اجازت کے بغیر کیا کسی سازش میں شریک ہونا مناسب ہے؟ یہ فکر بھی لاحق تھی کہ اسرائیل سے فلسطین آزاد کرائے بغیر سادات کے خلاف جہاد کا نتیجہ کیا ہوگا یا یہ کہ دونوں میں سے ترجیح کسے دی جائے فراج نے اس کا یہ جواب دیا کہ فلسطین کے لئے جہاد کی قیادت صرف سچے مسلمان لیڈر کے پاس ہونی چاہیے کوئی کافر اس کا اہل نہیں۔ خدا کی طرف سے براہ راست مداخلت پر بھی اسے بہت اعتماد تھا۔ ایک دفعہ صحیح اسلامی ریاست قائم ہوجائے تو یروشلم خودبخود آزاد ہوجائے گا۔ خدا نے قرآن میں وعدہ کیا ہے کہ اگر مسلمان کفار سے لڑیں تو خدا تمہارے ہاتھوں ان کی اصلاح کرے گا ان پر لعنت مسلط کرے گا اور ان کے خلاف تمہارے ہاتھوں ان کی اصلاح کرے گا۔ اس کے لفظی معنی فراج نے یہ لئے کہ اگر مسلمان پہل کریں تو خدا مدد کرے گا اور فطرت کے قوانین بدل دے گا۔ کیا ہم جنگ میں معجزوں کی توقع کرتے ہیں؟ فراج نے ''ہاں'' میں جواب دیا۔

دیکھنے والے حیران تھے کہ سادات کے قتل کے بعد کوئی قابل ذکر واقعہ نہیں ہوا۔ لگتا ہے کہ سازشیوں نے اقتدار پر قبضہ کرنے کا کوئی پروگرام نہیں بنایا تھا۔ نہ ہی انہوں نے بغاوت کی کوشش کی۔ اس کی وجہ غالباً یہ ہوگی کہ انہوں نے صدر کو قتل کرکے پہلا قدم اٹھا دیا تھا۔ فراج کے مطابق باقی سب کچھ تو خدا کو کرنا تھا حالانکہ سازشی جانتے تھے کہ ان کا مقابلہ زبردست دشمنوں سے ہے۔ فراج سمجھتا تھا کہ ناکامی کا خوف حماقت ہے۔ مسلمان کا فرض خدا کا حکم ماننا ہے۔ ''ہم نتائج کے ذمہ دار نہیں'' ایک بار کافروں کی حکومت ختم ہوجائے تو ہر چیز مسلمانوں کے پاس ہوگی۔

کئی دوسرے بنیاد پرستوں کی طرح فراج بھی لفظی معنی ہی سمجھتا تھا وہ لفظ کو اس طرح پڑھتا گویا کہ سچائی پوری تفصیل کے ساتھ اس میں سما گئی ہے اور روزمرہ زندگی پر براہ راست اور ہو بہو اس کا اطلاق ہوسکتا ہے۔ مذہبی کتابوں کی مائتھوس کو عملی مقاصد کے لئے بلیو پرنٹ بنانے میں جو خطرات مضمر ہیں اس سے ان کی نشاندہی بھی ہوتی ہے۔ پرانا آئیڈیل لوگوس اور عقل کو الگ رکھنا تھا مگر سیاسی عمل، عقل کا مدار تھا۔ سائنسی ریشنلزم کی اجارہ داری کے خلاف بغاوت کے جوش میں یہ سنی بنیاد پرست عقل کا دامن چھوڑ رہے تھے چنانچہ انہیں یہ تلخ تجربہ ہوا کہ اگرچہ سادات کے قاتلوں نے حرف بہ حرف خدا کے حکم پر عمل کیا مگر خدا نے مداخلت نہیں کی نہ اسلامی ریاست بنائی۔ سادات

کے بعد حسنی مبارک آسانی سے صدر بن گیا اور سیکولرسٹ ریاست آج تک قائم ہے۔

فرض سے غفلت کے متعلق خیالات چند انتہا پسند جماعتوں تک محدود نہیں تھے بلکہ مصری معاشرے میں بہت پھیل چکے تھے بہت کم مصری سادات کا قتل چاہتے تھے، اکثر اس کے قتل کی خبر سن کر دم بخود رہ گئے تھے مگر اس کے قتل کے بعد ان کا پرسکون ہونا حیرانی کا باعث تھا۔ مثال کے طور پر الازہر کے شیوخ نے قتل کی مذمت کی مگر سادات کے لئے کسی کا دل نہیں رویا۔ قتل کے فوراً بعد جامعہ الازہر کے میگزین کے پہلے شمارے میں سادات کی کوئی تصویر شائع نہیں ہوئی، دوسرے صفحہ پر قتل کی بس سرسری سے خبر دے دی گئی تھی۔ مذہبی اسٹیبلشمنٹ میں سے صرف ایک شخص، مفتی کھل کر فرض سے غفلت کے خلاف سامنے آیا جس نے فراج کے مضمون کا بھرپور جواب دیا۔ اس نے بتایا کہ کسی دوسرے مسلمان کو مرتد کہنے کی اجازت نہیں۔ اسلام میں تکفیر کا چرچا کبھی عام نہیں ہوا کیونکہ دلوں کا حال صرف خدا جانتا ہے۔ اس نے جنگ کے متعلق آیات پر تاریخی پس منظر کے حوالہ سے بحث کی۔ یہ بتایا کہ ان کی شان نزول ساتویں صدی میں مدینہ کے مخصوص حالات تھے اس لئے ان کا اطلاق بیسویں صدی میں مصر کے حالات پر نہیں ہوسکتا۔ The Journal of Islamic Mysticism میں شائع ہونے والے (21.12.81) اپنے ایک مقالے میں فرض کرلیا گیا کہ اس کے قارئین فراج کے خیالات سے باخبر ہوں گے۔ حالانکہ فرض سے غفلت کی اشاعت میں زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی اور اکثر لوگوں نے ابھی اسے پڑھا بھی نہیں تھا غالباً مذہبی حلقوں میں اس کا چرچا رہا اور اس طرح وہ سکہ رائج الوقت بن گیا تھا۔ مصریوں کی غالب اکثریت قتل کو سخت گناہ سمجھتی تھی مگر سادات کے قتل کے معاملے میں ان کا عمل واضح نہیں تھا دراصل ناصر کی موت کے بعد زمانہ بدل گیا تھا۔ اب مصری اپنے رہنماؤں میں اسلامی خوبیاں دیکھنا چاہتے تھے اور سیکولرازم سے دور ہو رہے تھے۔

حسنی مبارک نے اپنے ملک کے مذہبی موڈ کا اندازہ کرلیا تھا۔ اس نے سادات کے زیر عتاب لوگوں میں سے اکثر کو جیلوں سے رہا کردیا۔ وہ اسلامسٹ تحریکوں پر رفتہ رفتہ قابو پانے کی کوشش کرتا رہا مگر مخصوص گروہوں کو اس نے فوراً نشانہ بنایا۔ اس نے اخوان المسلمین (جو ابھی تک سرکاری طور پر تسلیم نہیں کی گئی تھی) کو پارٹی الیکشن میں حصہ لینے کی اجازت دے دی اور انہیں موقعہ دیا کہ وہ حکومت میں اپنی جگہ بنالیں۔

اسلامک الائنس (اخوان المسلمین کی نئی سیاسی تنظیم) نے بڑی ہوشیاری کے ساتھ اپنے آپ کوانتہاپسندوں سے دور کرلیا اور اسلامی ریاست بنانے کے لئے پرامن طریقہ سے کام کرنے لگے۔ مصراب بڑا مذہبی ملک ہے۔1960 کے عشرہ میں ناصرازم کی طرح وہاں آج اسلام کا بول بالا ہے۔ اخوان کا نعرہ کہ ''اسلام مسائل کا واحد حل ہے'' زیادہ سے زیادہ افراد میں مقبول ہو رہا ہے۔ ذاتی کردارو اخلاق کا مسئلہ میگزینوں اور رسائل کا موضوع بنا ہوا ہے۔ اسلامی مسائل پر میڈیا میں زوروشور کی بحثیں ہوتی ہیں۔ اسلامی لباس ہرطرف نظر آتا ہے۔ مرد اور عورتیں کلاس روموں میں اب الگ الگ ہوتے ہیں اور دونوں کے لئے نماز کے مقامات مخصوص ہیں۔ یہ خواہش اب بھی موجود ہے کہ مصر مکمل طور پر اسلامی قانون کی طرف واپس آئے اور اسلام اس کے آئین کی بنیاد ہو۔ مذہبی اُمیدوار ہر انتخاب میں مضبوط ہوتے ہیں۔ مصر برائے نام کثیر الجماعتی جمہوری ملک ہے اب بھی کرپشن کی بھرمار ہے۔ حکومت آمرانہ ہے اور ریاستی پارٹی محض حکمران پارٹی بننے سے انکار کرتی ہے لوگوں کا خیال ہے کہ اگر انتخابات منصفانہ ہوئے تو لوگ زیادہ تر مذہبی رہنماؤں کے حق میں ووٹ ڈالیں گے اس لئے اسلام حسنی مبارک کی حکومت کے لئے سب سے بڑا چیلنج بن گیا ہے۔

1970 کے عشرے کا مذہبی احیاء تکمیل پا چکا ہے۔ ہر طبقے اور ہر عمر کے مصری اب اعتدال پسند بنیاد پرستی کے حق میں ہیں۔ اکثر مصریوں کو سیاست میں دلچسپی نہیں مگر مذہب کی طرف مائل ہونے کی وجہ سے مذہبی لیڈروں کے لئے انہیں معاشی اور سماجی بحران میں منظّم کرنا آسان ہے۔ کئی نوجوان اب بھی محسوس کرتے ہیں کہ جدید مصری معاشرہ ان کے مفاد کی پرواہ نہیں کرتا۔ سائنس، ریاضی اور انجینئرنگ کے طلباء کا میلان اب بھی انتہا پسندوں کی جانب ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ سخت گیرانہ مسلم طرز حیات انہیں سیکولرازم کے مقابلہ میں ایک مؤثر متبادل مہیا کرتا ہے اور وابستگی کا احساس دیتا ہے۔ ایسی وابستگی اور یکجہتی جنہیں جدید معاشرہ میں حاصل کرنا مشکل ہے مگر جو انسان کی اہم ترین ضرورت ہے وہ گھڑی کی سوئیاں پیچھے نہیں کرنا چاہتے تھے بلکہ اسلامی تصورات کو عصری تقاضوں سے ہم آہنگ کرنا ضرورت سمجھتے تھے۔

سادات کے قتل سے پیدا ہونے والی گہری اور زبردست بے چینی مبارک کی محدود مراعات وآزادی اور جزوی جمہوریت کے بیس برس بعد بھی سطح کے نیچے سلگ رہی ہے۔ فرق یہ ہے کہ اب

اسلامسٹ زیادہ منظّم ہیں امریکی مبصر پیٹرک گافنی 1991 میں دوبارہ مینا گیا تو دیکھا کہ سڑک پر نماز جمعہ ادا کرنے والا ہجوم 1970 کے عشرہ کی نسبت زیادہ منظّم تھا۔ انتشار اور بدنظمی کے دن گزر گئے تھے۔ تیس اور چالیس برس کی عمر کے اکثر نمازی سفید لباس پہنے ہوئے تھے اس طرح وہ ایک جدا اور مرکزی سب کلچر کی تشکیل کا تاثر دے رہے تھے جس کی اپنی ایک سمت تھی اپنی شناخت تھی گافنی نے ایک بہت بڑی سرکاری عمارت بھی دیکھی جس میں وزارت داخلہ کے دفاتر تھے اور جس کا مقصد ریاست کی بے پایاں طاقت کی نشاندہی کرنا تھا۔ انتشار اور بدنظمی کے سابق مرکز میں نظم وضبط کی اس علامت کا ان اسلام پسندوں سے کوئی تعلق نہیں تھا جن کا رخ قاہرہ کی بجائے مکہ کی طرف تھا۔ دو متضاد دنیائیں مصر میں دوش بدوش آباد ہیں جن کے ملاپ کی کوئی صورت نہیں۔

چنانچہ یہ حیرانی کی بات نہیں کہ 'دو قوموں' میں اس وقت جنگ ہو رہی ہے۔ اکثر اوقات گرفتاریوں کے علاوہ انتہا پسند اسلام پسندوں اور پولیس کے درمیان گولی چلنے کی خبریں آتی رہی ہیں۔ ویسے تو اسلامسٹوں کی اکثریت، سیکولر معاشرے سے بنیاد پرستوں کی دوری پر قناعت کئے ہوئے ہے مگر ان کی ایک مختصر تعداد تشدد پر آمادہ رہتی ہے۔ 1986 سے امریکیوں اسرائیلیوں اور ممتاز مصریوں پر سیاسی وجوہات کی بناء پر حملے ہوتے ہیں۔ 1987 میں اسلام پسندوں نے ایک سابق وزیر داخلہ ابو بہاو اور ہفتہ وار المصور کے ایڈیٹر نبوی احمد کو گولی ماردی۔ اکتوبر 1990 میں انہوں نے مصری پارلیمنٹ کا صدر رفعت محجوب قتل کر دیا اور ایک پرعزم سیکولرسٹ فراج فودا 1992 میں ان کی گولیوں کا نشانہ بن گیا۔ اسی سال امریکی اور یورپین سیاحوں پر پہلی بار حملہ کیا گیا۔ سیاحت چونکہ مصر کی نہایت اہم ضرورت ہے اس لئے مبارک نے اس حملہ کا جواب بڑی سختی اور اندھا دھند گرفتاریوں سے دیا گویا کہ آگ پر تیل چھڑک دیا۔ 1997 تک انسان حقوق کی جماعتوں نے دعویٰ کیا کہ بیس ہزار لوگ شک کی بنیاد پر مصری جیلوں میں بغیر مقدمہ چلائے بند تھے ان میں بھی بعض محض اشتعال انگیز پمفلٹ رکھنے یا کسی میٹنگ میں شامل ہونے کی وجہ سے گرفتار کئے گئے تھے۔ 17 نومبر 1997 کو دہشت انگیز گروپ جماعت الاسلامیہ نے اٹھاون غیر ملکی سیاح اور چار مصری قتل کر دیئے اور یہ بھی بتا دیا کہ یہ حملہ آخری نہیں کیونکہ مجاہدین اس وقت تک اپنے حملے جاری رکھیں گے جب تک کہ حکومت ان کے اراکین کو اذیتیں دیتی اور قتل کرتی رہے گی۔ جنگ جاری ہے مصر میں سنی مسلمانوں کی ایک مختصر اقلیت مایوسی اور بے بسی سے مجبور ہو

کر اسلام کو قتل کا جواز مہیا کرنے والی آئیڈیالوجی میں بدلنے کی کوشش کرتی ہے اور اس طرح مذہب کا حلیہ بالکل بگاڑ دیتی ہے۔

مصر کی طرح اسرائیل بھی زیادہ مذہبی ملک بن رہا ہے۔ یہ 1980 کے عشرے میں ہیزیڈم کے سیاسی عروج سے صاف ظاہر تھا الٹرا آرتھوڈوکس یہودیوں کی ایک اقلیت اسرائیلی ریاست کو خلقی طور پر بدی سمجھتی تھی۔ ''ایک غلاظت جو تمام غلاظتوں پر محیط ہے ایک کفر جس میں ہر کفر شامل ہے۔ اپنی اصلی حیثیت میں صیہونیت ہمارے مذہب کی تمام بنیادی باتوں سے بالکل انکار کرتی ہے۔'' پیرامیتل ڈومب نے 1975 میں اپنے ایک نیوز لیٹر میں لکھا ''یہ مجسم ارتداد ہے جو نیچے گہرائیوں، بنیادوں اور جڑوں میں اتر جاتا ہے۔'' مگر اکثر ہیزیڈم اتنی دور نہیں جاتے تھے وہ ریاست کو مذہبی لحاظ سے اہمیت نہیں دیتے تھے اور اس سے بے تعلق رہتے تھے۔ اس غیر جانبداری نے انہیں سیاست میں حصہ لینے کا اہل بنا دیا۔ وہ اپنا سیاسی کام مذہب کی روشنی میں دیکھ سکے تھے مذہبی قانون سازی کے ذریعے وہ اسرائیلی معاشرہ کو مسیحائی انقلاب کے لئے بہتر طور پر تیار کر سکتے تھے۔ لیتھونین مناگڈم کا رویہ زیادہ عملیت پسند تھا انہوں نے اپنے قدم یشیوا کی دنیا میں مضبوطی سے جما لئے تھے اور ریاست سے اپنے اداروں کے استحکام کا کام لیتے تھے۔ انہیں ریاست، دفاع، خارجہ پالیسی اور داخلی معاملات سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ کسی جماعت کی حمایت کا بس ایک ہی معیار یشیوا کی مالی اور سیاسی اعانت تھی۔

ہیزیڈم کے سامنے اب بھی اپنی بقاء بڑا مقصد تھا۔ 1960 کے عشرے سے غیر یہودیوں کے ساتھ ان کا یہ رویہ سخت ہو گیا تھا۔ 1961 میں یروشلم کے اندر آئیکمن کے مقدمہ نے ایک نیا شعور پیدا کر دیا جس کی وجہ سے ہیزیڈم نے ارادہ کر لیا کہ وہ ان سیکولر یہودیوں سے دور ہیں گے جنھوں نے اس میں حصہ لیا تھا انہوں نے اپنے آپ کو جدید تہذیب کے ساتھ حالت جنگ میں پایا اور ان سیکولر یا مذہبی یہودیوں اور غیر یہودیوں کے لئے بھی ان کے پاس کہنے کے لئے کچھ نہیں تھا جو یہودیت کے بارے میں ان کے خیالات سے متفق نہیں تھے ظلم و جبر کے تجربہ نے ایک بار اور مذہبی افق تنگ کر دیا تھا اور نظریاتی مطابقت کی اہمیت بڑھا دی تھی۔ ہیزیڈم کے پاس الفاظ نہ خیالات تھے جنہیں وہ بامعنی طریقہ سے یشیوا سے باہر یا ہیزیڈک عدالتوں میں بیان کرتے وہ اپنے اسرائیلی ہمسایوں سے اسی طرح اجنبیت محسوس کرتے جیسے وہ جلاوطنی میں غیر

یہودیوں سے محسوس کرتے تھے۔

پھر بھی آشوب کے متعلق ان کی نئی آگہی نے انہیں یہودیت کی کمزوری کا احساس دلا دیا تھا تورات کے تحفظ کے لئے وہ سیاسی عمل میں شرکت کے لئے تیار تھا ان کا رویہ ایداہ ہیریڈس کے ایک رکن(1950s) نے خوب بیان کیا ہے:

ہم کمزور ہیں۔اچھے ہتھیار ہمارے مخالفوں کے پاس ہیں۔بکھرے اور بٹے ہوئے ہم ان طوفانوں کے سامنے کھڑے ہیں جو ہمیں مٹا دینا چاہتے ہیں وہ قانون جو ہماری بستی کے لئے خطرہ ہین ہماری زندگی المناک اور نا قابل برداشت بنا دیں گے۔چنانچہ ہمیں ہوشیار رہنا چاہیے اور وہ حملے پسپا کر دینے چاہئیں جو حکومت کے اندر سے ہم پر ہوتے ہیں۔

مگر1950 میں حالات ساز گار نہیں تھے اگودت اسرائیل نے1952 میں آئی ڈی ایف میں عورتوں کی بھرتی کے مسئلے پر لیبر حکومت سے علیحدگی اختیار کر لی تھی اور اس وقت سے پارلیمنٹ میں اس کا کوئی نمائندہ نہیں تھا لیکن1977 میںLikud کی کامیابی کے بعد اگودت مخلوط حکومت میں شامل ہو گئے کونسل آف تورات، اگودت کی مشاورتی کمیٹی بزرگ ربیوں کو لے آئی جنہیں صیہونی ذہنی لحاظ تاریخ کے کباڑ خانے کی نذر کر چکے تھے مگر ہیزیڈم اور منا گڈم کے درمیان پرانی رقابت (جس کا برسوں سے کوئی پتہ نہیں تھا) کونسل میں ایک بار پھر تازہ ہو گئی اور وہ ایک ہی فنڈنگ (مالی امداد) کے لئے دوڑ میں ایک دوسرے کو مخالف سمجھنے لگے اس صورتحال نے نئی ہیزیڈی پارٹیوں اور نئے سیاسی کھلاڑیوں کو جنم دیا مثلاًRabbi Etezer Schoc ہیڈ آف پونو ویز یشیوا اور اسرائیل میں لیتھونین جیوری شیپارڈک یہودیوں کے اثر کی وجہ سے فکر مند ہو گیا۔یہ شیپارڈک یہودی1948 کے بعد عرب ملکوں سے اسرائیل کے اراکین کے زیر اثر اسرائیل آ رہے تھے اور شاچ خوف زدہ تھا کہ ہیزڈک کا یہ وسیع حلقہ اثر یسنکیڈگ یشیوا کے حصہ کی امداد خود حاصل کر لے گا اس خطرے کے سد باب اور شیپارڈکوں کو خوش کرنے کے لئے اس نے ایک شیپارڈک پارٹی ''ششس توراہ گارڈینز'' بنائی اس کا سربراہ شیپارڈک ربی اویدیا یوسف بنا۔شیپارڈک، یورپی یہودیوں کی طرح صیہونیت سے نفرت نہیں کرتے تھے۔1948 میں اسرائیلی ریاست بننے تک انہیں مسلمانوں کی زیادتیوں سے سابقہ نہیں پڑا تھا نہ ہی ان میں گیٹو کی ذہنیت پیدا ہوئی تھی۔وہ ملکی معاملات میں حصہ لینے سے گریز نہیں کرتے تھے اور سیاسی زندگی میں جوش وخروش کے ساتھ حصہ

لیتے تھے۔1984 کے انتخابات میں شس نے پارلیمنٹ میں چار نشستیں جیتیں۔

تاہم 1988 میں ساتویں Luba Vitcher Rebbe نے Misnagdim ربی شاچ کا اقتدار ختم کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ اس نے اپنے تمام ساتھیوں کو آئندہ انتخابات میں اگودت کو ووٹ دینے کا حکم دیا۔ وہ یہ بھی چاہتا تھا کہ اگودت کے ذریعہ حکومت کو یہودیت کی وضاحت پر مجبور کرے۔ اس حرکت سے اسرائیلی ریاست کی بہتری میں ہیزیڈم کی عدم دلچسپی کا اظہار ہوتا تھا۔ اگر اسرائیلی حکومت ربی کی خواہشات پر عمل کرتی اور ملی جلی شادیوں سے ہونے والی اولاد کو غیر یہودی قرار دیتی تو کئی امریکی یہودی ناراض ہوجاتے جنہوں نے اسرائیل کے لئے امریکہ میں نمایاں خدمات سرانجام دی تھیں۔ اسرائیل کی زندگی کے لئے امریکی امداد بالکل ناگزیر تھی مگر Lubavitcher Rebbe کو اس کی پرواہ نہیں تھی۔ وہ یہودی دنیا میں محض اپنے مقاصد کی تکمیل چاہتا تھا۔ اس کے بعض نمائندے ان لوگوں سے الجھ پڑے تو اپنے آپ کو یہودی سمجھتے تھے مگر حلاکائی کے معیار پر پورے نہیں اترتے تھے۔ اگر اسرائیلی ریاست رسمی طور سے ان کے یہودی نہ ہونے کا اعلان کردیتی تو Lubavitch کے لئے بڑی آسانی ہوجاتی تاہم ربی کی مداخلت نے اگودت میں ہیزیڈکوں کے اراکین کی تعداد بڑھادی اس لئے اس کی مخالفت کے سلسلہ میں ربی شاچ نے ایک نئی Misnagtic پارٹی ''توراہ بیزز'' بنادی۔

اسرائیلی عوام حیران رہ گئے جب مذہبی جماعتوں نے 1988 کے انتخابات میں اٹھارہ نشستیں جیت کر ایک ریکارڈ قائم کردیا۔ اس کے نتیجہ میں اب لیبر اور لیکوڈ میں طاقت کا توازن انہیں کے پاس تھا۔ سیکولرسٹ سیاستدان، جو پہلے آرتھوڈوکس یہودیوں سے نفرت کرتے تھے اور انہیں بوسیدہ اور متروک سمجھتے تھے اب اپنی ٹوپیاں ہاتھ میں لئے ان سے تعاون کی بھیک مانگتے تھے تاکہ ان کی مدد سے حکومت بناسکیں ہیزیدم ہمیشہ کی طرح اسرائیلی ریاست کے مخالف تھے وہ اب بھی یہی سمجھتے تھے کہ سیکولر یہودی مذہب کو تباہ کرنا چاہتے ہیں وہ اپنا سیاسی کام ایک دفاعی کوشش ایک لازمی بدی کے طور پر کرتے تھے۔ ''اسے دشمن کے کیمپ میں چوری سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔'' ربی ناتھن گروسمین نے 1991 میں لیتھونین اخبار ''یاٹڈ نمین'' میں لکھا۔ اس کے باوجود ہیزیڈم نے اس ریاست میں بے مثال قوت حاصل کی جس کے ساتھ وہ اپنے آپ کو حالت جنگ میں سمجھتے تھے آشوب کے زمانہ سے ہیزیڈم یورپی جیوری کی گمشدہ دنیا از سرنو تخلیق کرنا چاہتے

تھے۔ مشرقی یورپ کی پرانی زندگی ان کی نظر میں ایک سنہرے دور جیسی تھی۔ وہ ماضی کے بڑے بڑے ربیوں سے انسپریشن لیتے تھے مگر 1980 کے عشرے کے آخر تک وہ انہیں بھی پیچھے چھوڑ گئے معبد کی تباہی (سن 70 عیسوی) کے بعد ربی شاچ کی طرح کوئی مذہبی یہودی طاقتور نہیں ہوا۔ اس نے 1988 تک دو سیاسی جماعتوں کی قیادت کی اور بڑے بڑے سیاستدان اس کے فیصلہ کن ووٹ کی خاطر اس کی خوشامد کیا کرتے تھے۔ یہ حقیقت ڈرامائی طریقہ سے 26 مارچ 1990 کے دن واضح ہوگئی۔ یدالیو باسکٹ بال سٹیڈیم (تل ابیب) اسرائیلی سیکولر کلچر کا نمائندہ ہے۔ اسرائیل میں باسکٹ بال تقریباً قومی کھیل ہے۔ یہ کھیل ''یہودی'' کے متعلق صیہونیوں کے خواب کی نمائندگی کرتا ہے۔ اب تنگ وتاریک یشیوا میں کمر دہری کئے ہوئے تلمود پر جھکنا نہیں نہ آرتھوڈوکسی کے سیاہ چیتھڑے جسم پر لادنا ہے بلکہ چاق وچوبند ہوکر بین الاقوامی سطح پر دشمنوں کا مقابلہ کرنا اور انہیں انہی کے کھیل میں ہرانا ہے۔ 1990 میں مارچ کی اس شام سٹیڈیم Maccabus (قومی باسکٹ بال ٹیم) کے پرجوش حامیوں کی بجائے دس ہزار باریش ہیزیڈم سے بھرا تھا الترا آرتھوڈوجس سیکولر اسرائیل کے مرکز میں پہنچ گئے تھے اور کم ازکم اس شام انہوں نے ان کے سب سے بڑے قلعہ پر قبضہ کرلیا تھا۔ یہ واقعہ ٹیلی کاسٹ ہو رہا تھا جسے سیکولر اور مذہبی اسرائیلی دونوں یکساں دلچسپی کے ساتھ سارے ملک میں دیکھ رہے تھے۔ ربی ساچ اپنے ساتھیوں کو بتانے ہی والا تھا کہ آنے والے انتخابات میں کیسے حصہ لیں اسرائیلیوں نے جان لیا تھا کہ طاقت کا توازن گھنگھرایالی زلفوں اور لمبی ٹوپی والے بوڑھے ربی کے ہاتھوں میں ہے جو آرامی اور عبرانی دونوں زبانیں ملاکر عجیب سی زبان بولتا ہے جسے سننے والے اکثر سیکولرسٹ اس کی بات سمجھ نہیں سکتے اس شام ربی ساچ نے لیکوڈ اور لیبر کی قسمت کا فیصلہ کردیا۔

اسرائیل اور فلسطینیوں کے درمیان امن کا عمل بڑی مشکل سے آگے بڑھ رہا تھا مگر اس سے نیشنل کولیشن کی گورنمنٹ مین پھوٹ پڑگئی۔ لیبر اور لیکووڈ دونوں نے چھوٹی جماعتوں کے ساتھ ایجاد کی کوششیں شروع کردیں چھوٹی جماعتوں کا واحد بڑا بلاک مذہبی جماعتوں پر مشتمل تھا۔ لیبر پارٹی نے ایک غیر رسمی معاہدہ شاچ اور اگودت سے کیا ہوا تھا مگر شاچ کے ایک لیڈر ربی یوسف کا خیال تھا کہ لیبر کے ساتھ اتحاد سے اپنی پارٹی ٹوٹ جائے گی۔ شیپارڈکس کا رجحان قوم پرستی کی جانب تھا انہیں عربوں سے نفرت تھی اور وہ ان علاقائی رعایات کے سخت خلاف تھے جو

لیبر کے زیرِ غور تھیں ربی شاچ مدد کو آیا اس نے شاچ میں اپنے ساتھیوں سے خطاب کیا اور انہیں آنے والے مذاکرات کے متعلق ہدایات دیں۔

جن اسرائیلیوں نے اسے ٹیلی ویژن پر سنا وہ ربی کی مختصر سی تقریر سن کر نہ صرف حیران ہوئے بلکہ اس میں پوشیدہ بعض خدشات بھی ان پر آشکار ہوئے۔ اس نے مخلوط حکومت سے متعلق مذاکرات کا براہ راست ذکر نہیں کیا نہ ہی ان مسائل پر بات کی جو باقی قوم کے لئے پریشانی کا سبب تھے۔ وہ فلسطینیوں کے حقوق، قومی دفاع یا امن کی خاطر علاقائی تبدیلیوں جیسے مسائل سے بے تعلق رہا۔ اس نے اسرائیل اور ریاست کے حق میں ایک لفظ بھی نہیں کہا۔ یہودی ریاست کو ذریعہ نجات سمجھنے کی بجائے اس نے ان ''خوفناک'' حالات کا ذکر کیا جن میں ہیزیڈم رہتے تھے۔ ربی اسرائیل۔ عرب جنگوں کے متعلق فکر مند ہونے کے بجائے مذہب کے خلاف صیہونیوں کی طویل جنگ سے پریشان تھا۔ ''آج ہم جو جنگیں (روایت کے مخالفوں سے) لڑ رہے ہیں وہ آج شروع نہیں ہوئیں، وہ پہلی عالمی جنگ کے زمانہ میں ہی شروع ہو چکی تھیں، دنیا کا مالک ہی جانتا ہے کہ اب اور کیا ہوگا''۔ ربی نے شدید جذبات میں آ کر کہا: ''یہودی قتل تو ہو سکتا ہے تباہ نہیں ہو سکتا۔ اس کے بعد اس کے بچے تورات سے اپنی وفاداری کا حق ادا کرتے رہیں گے۔ برا ہوا کہ انہیں دشمن سمجھ لیا گیا ہے۔''

لیبر حلقوں کو ان کے مقدس وعظ سننے پڑے اور یہ دیکھ کر مایوسی ہوئی کہ انہیں نہ صرف غیر یہودی بلکہ یہودی دشمن قرار دیا گیا۔ ''کیا لیبر کوئی مقدس چیز ہے؟ کیا انہوں نے ماضی سے رشتہ نہیں توڑا اور نئی تورات کی خواہش نہیں کی یہ لوگ غیر یہودیوں سے بہتر نہیں وہ سبت اور یوم کپر کے متعلق کچھ نہیں جانتے ایسے لوگوں پر کیوں کر بھروسہ کیا جا سکتا ہے کہ وہ یہودیوں کے نازک اور اہم مسائل کے سلسلہ میں صحیح فیصلے کریں گے۔ لیبر سیاست دانوں کے ساتھ کوئی سودے بازی نہیں ہو سکتی۔ جب وہ پارلیمنٹ میں ہوں تو بھی مذہب کی بہتری میں دلچسپی نہیں لیتے۔ بلکہ ایسے قوانین بنانا چاہتے ہیں جن سے یہودی مذہب تباہ ہو جائے۔'' یدالیہو سٹیڈیم میں اس شام کی اہمیت صرف یہ نہیں تھی کہ رب شاچ نے تنہا اور کسی مدد کے بغیر توازن لیکووڈ کے حق میں کر دیا تھا بلکہ یہ شام ہیزیڈم کے اس عظیم الشان سفر کی نشان دہی بھی کرتی تھی جس کے ذریعے وہ ایک معتوب فرقہ کی بجائے طاقتور گروہ بن گئے تھے۔ اس واقعہ سے یہ بھی ظاہر ہوا کہ اسرائیل میں دو

قومیں آباد ہیں جو نہ تو ایک دوسرے کی زبان سمجھتی ہیں نہ انہیں ایک دوسرے کے مسائل سے دلچسپی ہے۔اس سے وہ نفرت بھی آشکارا ہوئی جو ہیزیڈم کے پندار تقدس کی بنیاد بنی اور جس کی وجہ سے صرف غیر یہودی نہیں بلکہ یہودی بھی ان کے ظلم کا نشانہ بنے۔

انتہا پسند مذہبی صیہونی اور گش کے اراکین بھی لڑنے کے لئے تیار تھے وہ ایسے باغی تھے جنہوں نے ایک طرف تو سیکولر قومیت اور دوسری طرف آرتھوڈوکسی کے خلاف انقلاب دیکھا۔ دنیا یہودیوں کے لئے بالکل بدل گئی تھی۔انہیں احساس ہوا کہ جلاوطنی کی روایات سے منسلک رہنا ضروری نہیں۔ کیونکہ مسیحائی عہد شروع ہو چکا ہے۔شبیتائی زیوی کے بعد یہودیوں کے اس عقیدہ کا پہلا بڑا اظہار تھا۔اس وقت بھی یہودیوں کو عبوری دور کا احساس تھا اور وہ سمجھے تھے کہ انہیں ایک بے مثال تبدیلی کا سامنا کرنا ہے مگر جہاں شبیتائیوں نے گیٹو کی پابندیوں کے خلاف بغاوت کی تھی گش کے اراکین کو علاقائی حد بندی کا احساس تھا۔انہیں بھی شبیتائیوں کی طرح حد بندیوں کا وہم تھا اور گو کہ ان کی توجہ ارض اسرائل پر مرکوز تھی مگر وہ یہودیت کی حدیں واضح کرنے کی لڑائی بھی لڑ رہے تھے۔ وہ سیکولر اور مذہبی یہودیوں کے درمیان حائل دیواریں گرا دینا چاہتے تھے گکسٹ سمجھتے تھے کہ ہیزیڈم کے خیالات بیک وقت صیہونی اور آرتھوڈوکس ہیں۔سیکولرازم سے بھی وہ مطمئن نہیں تھے کیونکہ ان کی رائے میں مذہب کے بغیر صیہونیت مکمل نہیں۔مگر یہ کٹھن دور تھا گکسٹ محسوس کرتے تھے کہ لیکوڈ حکومت نے انہیں پارلیمنٹ سے نکال کر ان سے غداری کی ہے اور عربوں سے دوستی کر کے نجات کا عمل روک دیا ہے۔

صورتحال اس وقت اور واضح ہوگئی ہے۔جب انتفاضہ کے نام سے 1987 میں فلسطینیوں کی جدوجہد شروع ہوئی اور جس نے لیبر حکومت کو امن کا معاہدہ کرنے پر مجبور کر دیا جو معاہدہ گکسٹ کی نظر میں کیمپ ڈیوڈ سے بھی بدتر تھا کیونکہ اس کے ذریعہ مغربی کنارے کی مقدس زمین کے بعض حصے عربوں کے حوالے کر دینے کا وعدہ کیا گیا تھا۔گکسٹ بھی یہودیوں کی مثال اپنے آپ کو غیر یہودیوں میں جلاوطنی کے اندر محصور سمجھنے لگے مگر ان غیر یہودی دشمنوں کے ساتھ ان کے ایسے یہودی ہم مذہب بھی شامل تھے جو انہیں ایسی کامیابیوں سے روک رہے تھے جو ان کے بس میں تھیں۔

آخر کار اس مقدس زمین کے بارے میں گش کی خوشی اس کے انتقام میں بدل گئی جو مختلف

مواقع پر سب سے پہلے عربوں کے خلاف بدترین تشدد میں ظاہر ہوا۔ ان کی تحریک کے بھلے دنوں میں گش آبادکاروں نے اعلان کیا تھا کہ وہ مقبوضہ علاقوں میں فلسطینیوں کی ''مدد'' کے لئے آئے ہیں۔ ان کا مقصد دونوں قوموں کے درمیان ''نفرت کی دیوار'' گرانا ہے۔ حالانکہ جن الفاظ اور لہجہ میں وہ اس قسم کا دعویٰ کرتے تھے ان سے اشتعال اور منافقت کی بوآتی تھی۔ ''ہم تمہیں قتل کی عادت سے پاک کرنے آئے ہیں جس کے تم عادی ہو چکے ہو۔'' لیونگر نے 1970 کے عشرے میں یہ وعدہ کیا تھا۔ اس کا رویہ بتدریج اشتعال انگیز ہوتا گیا۔ وہ مغربی کنارے کے عرب قصبوں میں بندوق لئے بڑی رعونت کے ساتھ گھومتا رہتا تھا اگرانہی دنوں کسی بستی پر فلسطینیوں کا حملہ ہوتا تو وہ اپنے آدمیوں کے ساتھ عربوں کی دکانوں اور گاڑیوں پر حملہ آور ہوتا اور ان کے شیشے اور دروازے توڑ دیتا کبھی انہیں آگ لگا دیتا۔ ''انتفاضہ'' کے آغاز کے بعد اس نے کہا کہ جب کبھی وہ ہبرون جاتا ہے تو اس کے تن بدن میں آگ سی لگ جاتی ہے جو اسے سکون سے نہیں رہنے دیتی۔ 1988 میں جب اس کی کار پر جبرون میں فلسطینیوں نے پتھر مارے تو لیونگر کار سے کود کر باہر آ گیا اور ان پر فائرنگ شروع کر دی جس سے خالد صالح جان بحق ہوا جو اپنی دکان کے باہر کھڑا تھا اور جس نے پتھر مارنے میں کوئی حصہ نہیں لیا تھا۔ اس کے بعد لیونگر گویا پاگل ہو گیا اس نے اندھا دھند فائرنگ کی اور اونچی آواز مین گالیاں بکتا رہا۔ اپنے مقدمہ میں بیان دیتے ہوئے اس نے کہا ''اگرچہ اس نے کوئی قتل نہیں کیا مگر اے کاش کہ اسے کسی عرب کو قتل کرنے کا اعزاز حاصل ہوتا۔''

گش کے اراکین اس سلسلہ میں مختلف رائے رکھتے تھے کہ اسرائیل میں عربوں سے کیا سلوک کیا جائے اس پر سب متفق تھے کہ اس سرزمین پر فلسطینیوں کا کوئی حق نہیں نہ یہاں ان کے لئے کوئی جگہ ہے۔ یہ نفرت اور اخراج کا سبق یہودی مذہب کو بگاڑتا تھا اسرائیل کے پیغمبر تورات اور تلمود کے علماء انصاف محبت اور شفقت پر زور دیتے ہیں وہ ان اجنبیوں کے ساتھ بھی مہربانی کا سلوک چاہتے ہیں جن کا تعلق ان کے قبیلے سے نہ ہو مگر جو ان کے ساتھ ان کی زمین پر رہتے ہوں ربی ہلل مسیح کے ایک بزرگ ہم عصر نے اسے یہودیت کی تعلیمات کے سنہری اصول میں اس طرح بیان کیا ہے ''دوسروں کے ساتھ وہ سلوک نہ کرو جو تم اپنے ساتھ نہیں چاہتے'' بہرحال بنیاد پرستانہ مہارت کے ساتھ گکسٹ نے انجیل کے صرف جارحانہ حصوں پر توجہ دی جن میں خدا نے اسرائیلیوں کو حکم دیا تھا کہ ''وہ مقامی لوگوں کو زمین سے نکال دیں، ان کے ساتھ کوئی معاہدہ نہ

کریں، ان کی مقدس نشانیاں مٹا دیں حتیٰ کہ ان کا قلع قمع کر دیں۔'' انہوں نے اپنے عقیدہ کی یہ توجیہہ کی کہ یہودی خدا کی برگزیدہ مخلوق ہیں جس کے معنی ہیں کہ وہ ان قوانین کے پابند نہیں جن قوانین کی پابند دوسری قومیں ہیں یعنی یہودی پاک اور سب سے الگ ہیں۔ شلومو اوسیز نے کہا کہ ''خدا کے حکم مطابق ہماری زمین پر غیر یہودیوں کے قومی حقوق اور ان کے انسانی اور اخلاقی پہلوؤں کا خیال رکھنے سے زیادہ اہم زمین کا فتح کرنا ہے۔''

اکثر ککسٹ چاہتے تھے کہ فلسطینیوں کو اسرائیل میں رہائشی اجنبیوں کی طرح رہنے دیا جائے جب تک وہ اسرائیلی ریاست کا احترام کریں ان کے ساتھ اچھا سلوک کیا جائے مگر وہ اسرائیل کے شہری نہیں بن سکتے نہ ان کے کوئی سیاسی حقوق ہوں گے۔ دوسرے یہودی فلسطینیوں کو یہ رعایات دینے کے بھی روادار نہیں تھے اور انہیں وہاں سے نکالنا چاہتے تھے ایک مختصر اقلیت انجیل میں Amalekites کی مثال سامنے رکھتے ہوئے فلسطینیوں کا قتل چاہتی ہے۔ ''ایسی ظالم قوم کہ خدا نے کسی رحم کے بغیر اسرائیلیوں کو ان کے قتل کا حکم دیا۔'' 1988 میں ربی اسرائیل ہیں نے نسل کشی تورات کا ایک حکم کے عنوان سے ایک مضمون بار ایلین یونیورسٹی کے سرکاری میگزین میں شائع کیا کہ فلسطینی یہودیوں کے سامنے اسی طرح ہیں جیسے روشنی کے سامنے تاریکی اور وہ Amalekites جیسے سلوک کے مستحق ہیں۔'' اسی سال ایک گش آباد کار ہیم تزوریا نے لکھا کہ ''نفرت قدرتی اور صحت مند جذبہ ہے۔''

''ہر نسل میں ہمیں ایسے لوگوں کا سامنا ہوتا ہے جو ہمیں مٹا دینا چاہتے ہیں چنانچہ ہر نسل کا اپنا امالیک (Amalek) ہوتا ہے۔ ہماری نسل کا امالیک ازم ہمارے بزرگوں کی زمین پر ہماری قومی نشاۃ ثانیہ کے خلاف عربوں کی نفرت ہے۔''

3 مئی 1980 کو چھ یشیوا طالب علم جبرون میں قتل ہوئے جس کی وجہ سے بعض انتہا پسند ککسٹ انتقام لینے پر تیار ہوئے لوینی ایک آباد کار اور یہودایٹ زیون ایک گش آباد کار دونوں نے پانچ عرب میئروں کی کاروں میں بم نصب کئے جن کا مقصد ان کے قتل کی بجائے انہیں مسخ کرنا تھا تاکہ وہ یہود دشمنی کے نتائج کی عبرتناک مثال بن کر زندہ رہیں۔ جب ربی ہیم ڈرک مین تک یہ خبر پہنچی تو وہ فرط مسرت سے چیخا کہ ''اسرائیل کے تمام دشمن تباہ ہوں۔'' اکثر اسرائیلی اس حملہ کی خبر سن کر کانپ گئے (جس میں صرف دو میئر زخمی ہوئے) بلکہ یہ جان کر انہیں اور زیادہ

نفرت ہوئی کہ دونوں اسرائیلی حملہ آور کرائے کے قاتل تھے۔ اپریل 1984 میں حکومت نے ایک یہودی انڈر گراؤنڈ تنظیم کی موجودگی کی خبر دی جس نے قبۃ الصخرہ کو بم سے اڑانے کی سازش تیار کی تھی جو اسلامی دنیا کا تیسرا مقدس مقام ہے۔

1967 کی چھ روزہ جنگ میں آئی ڈی ایف نے مشرقی یروشلم اور قدیم شہر اردن سے چھین لیا تھا۔ جنگ کے چند روز بعد اسرائیل نے بین الاقوامی برادری کی ایما کے بغیر یہ علاقے اپنی ریاست میں شامل کر لئے اور یروشلم کو ہمیشہ کے لئے یہودی ریاست کا دارالحکومت بنا دیا۔ یہ ایک متنازعہ فیصلہ تھا کیونکہ 1947 سے اقوام متحدہ نے اعلان کر دیا تھا کہ یروشلم بین الاقوامی زون ہونی چاہیے اور چھ روزہ جنگ کے بعد یہ مطالبہ کیا تھا کہ اسرائیل وہ تمام علاقے یروشلم سمیت خالی کر دے جن پر اس نے جنگ کے دوران قبضہ کیا ہے۔ ایک مختصر عرصہ کے لئے عیسائیوں کی حکومت کے سوا (1187-1099) 638 سے یروشلم مسلمانوں کا شہر ہے۔ یروشلم جسے مسلمان 'القدس' کہتے ہیں مکہ اور مدینہ کے بعد مسلمانوں کا تیسرا مقدس ترین شہر ہے۔

قبۃ الصخرہ جو 691ء میں مکمل ہوئی مسلمانوں کی پہلی بڑی تاریخی یادگار ہے۔ یقین کیا جاتا ہے کہ اسی مقام پر ابراہیم نے اپنا بیٹا قربانی کے لئے پیش کیا تھا اور روایت ہے کہ اسی مقام سے پیغمبرؐ معراج پر گئے تھے۔ یہودی دنیا میں بھی یہ مقام مقدس سمجھا جاتا ہے۔ کیونکہ یہ گنبد ہیکل سلیمانی پر واقع ہے اور ہیکل کی تعمیر بادشاہ سلیمان سے منسوب ہے۔

تاہم صدیوں سے یروشلم میں مسلمانوں اور یہودیوں کے درمیان کوئی تناؤ نہیں تھا۔ یہودی سمجھتے تھا کہ ان کا معبد جو رومنوں نے 70 عیسوی میں تباہ کیا تھا صرف مسیح کے ذریعہ دوبارہ تعمیر ہو سکتا ہے۔ اس لئے اس علاقہ کے سلسلہ میں یہودیوں کی نیت میں کوئی خرابی نہیں تھی جسے مسلمان حرم الشریف کہتے ہیں۔ سولہویں صدی سے یہودیوں کی نظر میں واحد مقدس مقام مغربی دیوار ہی ہے جو قبۃ الصخرہ کے بالکل نیچے واقع ہے اور جو شاہ ہیروڈ کے ٹمپل کی آخری یادگار ہے (پہلے صدی عیسوی) عثمانی سلطان سلیمان نے (1566-1494) یہودیوں کو اسے سرکاری پناہ گاہ بنانے کی اجازت دی۔ کہتے ہیں کہ درباری معمار سنان نے ایک سادہ سا مقبرہ بنا کر یہودیوں کو دیا۔ اس مقدس شہر میں عربوں اور یہودیوں کی دوستی کا دور عرب اسرائیل آویزش کے ساتھ ختم ہوا اس مقدس علاقہ نے 1920 کے عشرے سے بہت ظلم وستم اور تشدد دیکھا قدیم شہر اور مشرقی یروشلم

پر اردن کے قبضہ کے دوران 67-1948 کے درمیان یہودیوں کو مغربی دیوار کے پاس جانے کی اجازت نہیں تھی ۔ قدیم شہر کے یہودی ضلع میں واقع قدیم سینی گاگ تباہ کر دیئے گئے تھے۔ 1967 میں مغربی دیوار کی طرف یہودیوں کی واپسی چھ روزہ جنگ کا نہایت جذباتی لمحہ تھا وہ لمحہ سیکولر یہودیوں کے لئے بھی بہت بڑا واقعہ تھا۔

جب جنگ کے بعد اسرائیلیوں نے یروشلم کو اپنی ریاست میں شامل کر لیا تو وعدہ کیا کہ عیسائی اور مسلمان بے روک ٹوک اپنے مقدس مقامات پر جا سکیں گے۔ حرم الشریف پر مسلمانوں کا کنٹرول جاری رہا۔ اگر چہ مذہبی صیہونیوں اور الٹرا قوم پرست اسرائیلیوں کی رائے میں حکومت کی یہ پالیسی غلط تھی وہ چاہتے تھے کہ اسے یہودیوں کو واپس کیا جائے مگر حکومت اپنی پالیسی پر قائم رہی ۔ ہیکل اس وقت تک نہیں بن سکتا تھا جب تک کہ مسیح کے ذریعہ نجات حاصل نہ ہو۔ یہ ایک پابندی تھی جس نے صدیوں میں ایک تو ہم جیسی طاقت حاصل کر لی۔

1980 کے عشرے کے آغاز تک صورتحال بدلنی شروع ہوگئی لیوینی اور ایٹز یون صرف دو یہودی انتہا پسندی نہیں تھے جو نجات کے استقبال کے طور پر ہیکل کی از سر نو تعمیر کی فکر میں تھے مسیح کی واپسی کیونکر ممکن ہے جبکہ وہ مقدس مقام قبۃ الصخرہ کی وجہ سے ناپاک ہے۔ دوسرے بنیاد پرستوں کی طرح وہ چاہتے تھے کہ خود پہل کریں احتیاط کو بالائے طاق رکھیں اور ہیکل سلیمانی کو اس مسلم یادگار سے نجات دلائین تا کہ مسیح کے لئے راستہ ہموار ہو۔ اگر انہوں نے پہلا قدم اٹھایا تو خدا یقیناً مداخلت کرے گا اور تاریخ میں مداخلت کرتے ہوئے اس ایمان افروز عمل کی جزا دے گا۔ مسیح کا انتظار ختم ہوگا اور اسرائیل کے لوگوں کو نجات حاصل ہوگی۔ لیوینی اٹزیون اور ان کے سازشی ساتھی سمجھتے تھے کہ عربوں کو حرم الشریف کا کنٹرول دے کر اسرائیلی حکومت نے بہت بڑے گناہ کا ارتکاب کیا ہے۔ قبۃ الصخرہ ان کی نظر میں میں نفرت انگیز اور ان کی نسل کی روحانی کوتاہیوں کی سزا تھی۔

یہودیوں کی زیر زمین تنظیم کا ایک ماہر یوشوا بن شوشان تھا جسے یقین تھا کہ قبۃ الصخرہ بدروحوں کا مسکن ہے جن کا تعلق دشمنوں سے ہے اور جو نجات کے رستہ میں رکاوٹ ہیں ۔کیمپ ڈیوڈ کے مذاکرات کے دوران اسی نے لیوٹیایٹزون کو اس نفرت انگیز یادگار سے نجات پانے کے لئے کہا تھا کیونکہ ان مذاکرات میں اس کے مطابق ان بدروحوں کا ہاتھ تھا۔ یہ یادگار تباہ کر کے

انہیں بے اثر کیا جا سکتا ہے پھر امن کا یہ مردود عمل اچانک رک جائے گا یا کم از کم اس ڈرامائی عمل سے دنیا بھر کے یہودی چونک اٹھیں گے اور ان میں اپنی مذہبی ذمہ داریوں کا احساس پیدا ہو گا اور وہ دشمن کے ساتھ صلح کے مذاکرات سے باز آ جائیں گے۔

یہ ایک ہلاکت خیز لمحہ ہو سکتا تھا۔ نہ صرف یہ کہ قبۃ الصخرہ پر بم مارنے سے امن کے مذاکرات ختم ہو جاتے بلکہ اس کے نتیجہ میں ایک ایسی جنگ شروع ہو جاتی جس میں تمام دنیائے اسلام پہلی بار اسرائیل کے خلاف صف آرا ہوتی۔ واشنگٹن میں عسکری ماہرین متفق تھے کہ سرد جنگ کے تناظر میں جب کہ روس عربوں کی اور امریکہ اسرائیل کی حمایت کر رہا ہے قبۃ الصخرہ کی تباہی سے تیسری عالمی جنگ شروع ہو سکتی تھی۔ ایٹمی تباہی کے خوف نے ان انتہا پسند لکسٹوں پر کوئی اثر نہیں کیا۔ انہیں پورا یقین تھا کہ زمین پر تباہی پھیلانے سے وہ آسمانی قوتیں متحرک کر دیں گے اور خدا مجبور ہو جائے گا کہ ان کی مدد کے لئے مداخلت کرے اور اسرائیل کو بچانے کے لئے مسیح بھیجے۔

یہ کبالائیوں کے دماغ کا فتور تھا۔ یہ بنیاد پرستوں کی اس ذہنیت کی لرزہ خیز مثال تھی کہ مائتھالوجی کو ایک لائحہ عمل بنالیا جائے۔ عملی سطح پر سازشیوں کی منصوبہ بندی میں کوئی خلاف عقل بات نہیں تھی لیوینی نے آئی ڈی ایف میں دہشت پسند کے طور پر اعلیٰ تربیت پائی تھی۔ اسے دھماکہ خیز مواد کے استعمال میں مہارت تھی اس نے دو سال تک حرم الشریف کا بغور مطالعہ دہشت گردی کے نقطۂ نظر سے کیا تھا اور جولان کی پہاڑیوں کے اسرائیلی فوجی کیمپوں سے بھاری مقدار میں دھماکہ خیز مواد خریدا تھا۔ اس نے اٹھائیس (Precision) بم تیار کئے تھے۔ جن کے پھٹنے سے خود قبۃ الصخرہ کی تباہی تو یقینی تھی مگر اس کے گرد نواح محفوظ رہتے وہ حملہ کرنے کے لئے بالکل تیار تھے مگر محض اس لئے اپنے منصوبہ پر عمل نہ کر سکے کہ کوئی بھی ربی انہیں آشیرواد دینے کے لئے تیار نہیں تھا۔ اس سازش سے واضح ہو گیا کہ عقل سے انحراف کر کے معجزات پر انحصار مذہبی اور اخلاقی دیوالیہ پن کی علامت ہے اس کی وجہ سے یہودی ریاست بالکل تباہ ہو سکتی تھی۔ یہ ہلاکت خیز مسیحائیت، کی اس تمنا کی مظہر بھی تھی جو ایک عرصہ سے ماڈرن تجربہ اور فکر کا حصہ بن گیا تھی وہ اپنی ہی تباہی کا ذریعہ بھی تھی کیونکہ اس سازش نے گش امونیم کی ساکھ ہمیشہ کے لئے ختم کر دی۔

اخلاقی دیوالیہ پن ہی تحریک کی خصوصیت بھی تھی جس کا بانی ربی میئر کہانے تھا پارلیمنٹ میں اس کے انتخاب (1984) سے اکثر اسرائیلی پریشان ہو گئے تھے اس نے زندگی نیویارک میں

شروع کی تھی۔ وہاں اس نے ''یہودی ڈیفنس لیگ'' بنائی تھی جو یہودیوں پر سیام فام نوجوانوں کے حملوں کا بدلہ لینے کے لئے تھی۔ وہ 1974 میں اسرائیل آیا اور کریات عربہ میں آباد ہو گیا جہاں اس نے اپنی تنظیم کا نام بدل کر ''کاچ'' رکھ دیا۔ اس کا مقصد اب عربوں کو ڈرانا اور انہیں اسرائیل چھوڑ دینے پر مجبور کرنا تھا۔ اس کی یہودیت اس قدر تنگ نظر اور متعصّبانہ تھی کہ مذہب کا حلیہ بگاڑتی ہوئی لگتی تھی اس نے ایک انٹرویو دیتے ہوئے کہا کہ یہودیت کے پیغامات لاتعداد نہیں اس کا بس ایک ہی پیغام ہے کہ وہ کرو جو خدا چاہتا ہے اور خدا بس یہ چاہتا ہے کہ ہم اس ملک میں آئین اور یہودی ریاست قائم کریں۔ پاکیزگی کا یہودی تصور اب کہانے کی توجیہہ سے انوکھے سیاسی معنوں میں بدل گیا تھا خدا چاہتا ہے کہ ہم سب سے الگ اپنے ملک میں رہیں بالکل جدا تاکہ غیروں سے ہمارا رابطہ برائے نام ہو اس کے معنی یہ تھے کہ عرب یہاں سے بہر حال چلے جائیں۔ ابراہیم سے وعدہ آج بھی اتنا ہی مؤثر ہے جتنا کہ پہلے دور میں تھا۔ اس لئے عرب غاصب ہیں چنانچہ انجیل کی مانتھوس نسل کشی کے سیاسی پروگرام کا جواز بن گئی چھ روزہ جنگ میں فتح کے بعد یہودی نجات کی دہلیز پر کھڑے تھے۔ یہودیت کے اس ایک ہی حکم کی وجہ سے ان کی منزل بالکل سامنے تھی۔ انہیں تمام علاقوں پر قابض ہو جانا چاہیے تھا عربوں کو نکال دینا اور ہیکل سلیمانی کو غیر یہودیوں سے پاک کر دینا تھا۔ اگر وہ یہ سب کچھ کر لیتے تو نجات کا مرحلہ بہ آسانی اور بخوبی آ سکتا تھا مگر اسرائیل اس مشن میں ناکام ہو گیا تھا۔ مسیح اب بھی آئے گا مگر یہود دشمنی کے بہت بڑے طوفان کے موقعہ پر ایسا طوفان جو اپنی شدت میں آشوب سے بھی بدتر ہوگا اور جو یہودیوں کو مجبور کر دے گا کہ وہ خدا کا یہ واحد حکم مانیں اور اسرائیل میں آباد ہو جائیں۔

موت اور بربادی کا تاریک تصور اخلاق اور مذہب کا دشمن ہے یہ نفرت اور انتقام کی خواہش سے لبریز ہوتا ہے۔ کہانے کے ہاتھوں مذہب کی اس حد تک بگڑی ہوئی شکل طویل اذیت اور جبر کے اثرات کے مظہر تھی جسے اگر موقعہ ملتا تو روح کی گہرائیوں میں اتر جاتی کہانے ہر طرف دشمن ہی دشمن دیکھتا تھا جو سب ایک جیسے تھے چاہے عیسائی اور نازی ہوں، سیاہ فام روسی یا عرب ہوں ہر چیز یہودیوں کی اذیت اور اس اذیت کے انتقام کے تناظر میں دیکھی جاتی تھی کہ اسرائیلی ریاست یہودیوں کے لئے خدا کی نعمت نہیں ہے بلکہ غیر یہودیوں سے خدا کا انتقام ہے۔

خدا نے ریاست یہودیوں کے لئے نہیں بنائی نہ یہ ان کے بھلے کاموں کا انعام ہے بلکہ اس

نے طے کرلیا کہ وہ مزید اپنے نام کی توہین برداشت نہیں کرسکتا نہ ان لوگوں کی تضحیک اور اذیت برداشت کرسکتا ہے جن کے نام اس کے نام پر اس لئے اس نے اسرائیلی ریاست بننے کا حکم دیا جو جلاوطنی کی مکمل تردید ہے۔ جب کوئی یہودی پٹتا ہے یا اس کے ساتھ کسی غیر یہودی کے ہاتھوں زیادتی ہوتی ہے تو یہ خدا کے نام کی توہین ہے''جب کوئی یہودی ذلیل ہوتا ہے تو خدا شرمندہ ہوتا ہے جب یہودی پر حملہ ہوتا ہے تو یہ خدا کے نام پر حملہ ہے'' اور یہودی کی طرف سے پرتشدد جوابی حملہ خدا کے نام کی تقدیس ہے۔''

اسی طرف فکر کی وجہ سے کہانے کے حامی بروچ گولڈسٹین نے ہیبرون میں انتیس فلسطینی عبادت گزاروں کو گولی ماردی۔ (25فروری(1994)اس نے 24اگست1929 کو فلسطینیوں کے ہاتھوں مارے جانے والے 59یہودیوں کا بدلہ لیا تھا۔اس انتقام سے خود اسرائیل اور دوسرے علاقوں میں خوف ودہشت کا اضافہ ہوا جس میں مسلمانوں کا ہاتھ بھی تھا۔

فلسطینی1973کے بعد دنیائے اسلام میں مذہبی تجدید کے اس عمل میں شریک نہیں تھے جس سے اکثر لوگ متاثر تھے۔عربوں کی شکست کا سامنا وہ سیکولر اور قوم پرستانہ انداز میں کرنا چاہتے تھے۔یاسر عرفات نے ایک بار پھر تنظیم آزادی فلسطین (پی۔ایل۔او) کو منظم کیا اور فلسطینی مسئلہ کا حل تلاش کرنے کے لئے گوریلا جنگ دہشت گردی اور ڈپلومیسی کا راستہ اختیار کیا۔ پی۔ایل۔او ہر لحاظ سے ایک سیکولر تحریک تھی مگر1971میں غزہ کے اندر ایرل شیرون کے ہاتھوں پی۔ایل۔او کے سخت نقصان کے بعد شیخ احمد یاسین نے ایک اسلامی تحریک مجمعہ کی بنیاد رکھی جس نے اخوان المسلمین کی طرح فلاحی پروگرام کے ذریعہ اپنی سرگرمیوں کا آغاز کیا۔1987تک غزہ پٹی میں مجمہ نے دواؤں،علاج کے مراکز، یوتھ کلب،کھیل وتفریح،قرآنی تعلیم کی کلاسوں پر مشتمل ایک فلاحی تنظیم قائم کردی۔اسے مالی امداد خلیجی ریاستوں کے علاوہ اسرائیل سے بھی ملتی تھی کیونکہ اس طرح اسرائیل پی۔ایل۔او کی اہمیت کم کرنی چاہتا تھا۔اس وقت یاسین کو اسرائیل کے خلاف مسلح جدوجہد میں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ محض ایک ریفارمر تھا جو جدیدیت کی سہولتیں غزہ کے مسلمان پناہ گزینوں کے لئے فراہم کرنا چاہتا تھا وہ یہ بھی چاہتا تھا کہ فلسطینیوں کی کلچری شناخت سیکولرازم کی بجائے اسلام ہو۔ مجمعہ کی مقبولیت سے اس کے ساتھ اکثر فلسطینیوں کے اتفاق رائے کا اندازہ ہوتا ہے انہیں عرفات پر فخر تھا مگر اس کے سیکولر خیالات صرف فلسطینی ایلیٹ کی سمجھ

میں آتے تھے جنہیں جدید مغربی تعلیم کی سہولت حاصل تھی۔

اسلامی جہاد کی آئیڈیالوجی بالکل مختلف تھی وہ مصر کی جہادی تنظیم کی طرح زیرزمین ایک نیٹ ورک تھا۔ اسلامی جہاد کے اراکین فلسطینی المیہ کو مذہب کی روشنی میں دیکھتے تھے اور سید قطب کی آئیڈیالوجی کے مطابق اس سے نمٹنا چاہتے تھے وہ فلسطینی سیکولر سوسائٹی کا رشتہ دور جاہلیت سے جوڑتے تھے۔ اسلامی جہاد کے اراکین اپنے آپ کو اسلام کا پہلا جیش سمجھتے تھے جو دنیا بھر میں اسلام کے دشمنوں کے خلاف معرکہ آرا تھا۔ ان کے مفکر شیخ عودا نے بتایا وہ تمام امت کی بھلائی کی خاطر لڑ رہے ہیں۔ مجمعہ کے برعکس اسلامی جہاد اسرائیل کے خلاف مسلح جدوجہد کے حق میں تھا۔ اکتوبر 1985 میں آئی ڈی ایف کی ایک تقریب میں اس کے کارکنوں نے مغربی دیوار پر دستی بم پھینکا کیونکہ وہ اسرائیل کے مذہبی مقامات نشانہ بنانا چاہتے تھے اب تک یہ تنظیم غزہ سے مغربی کنارے تک پھیل چکی تھی۔

9 دسمبر 1987 کو انتفاضہ کے نام سے غزہ میں انقلابی فلسطینی تحریک منظر عام پر آ گئی جو مشرقی یروشلم اور مغربی کنارے تک پھیل گئی۔ 1967 سے فلسطینیوں کی ایک پوری نسل ان مقبوضہ علاقوں میں اسرائیلی سینگینوں کے سائے میں جوان ہوئی تھی۔ وہ پی ایل او قیادت کی وجہ سے پریشان تھے جواب تک ان کے لئے آزادی نہیں حاصل کر سکی تھی وہ اس ذلت ظلم اور اذیت سے بھی دل گیر تھے جو ظالم دشمن طاقت کے ہاتھوں ان کا مقدر بن چکی تھی۔ اسرائیلی سمجھتے تھے کہ مقبوضہ علاقوں کے عرب ان کی حکومت پر صبر کر لیں گے مگر 1987 تک اسرائیلیوں کے خلاف عربوں کی نفرت انتہا تک پہنچ گئی تھی اور فلسطینی ریاست کی خواہش شدت اختیار کر گئی۔ اس نئی بغاوت کی نوجوان قیادت نے اسرائیلیوں کے قبضہ اور ان کی طاقت تسلیم کرنے سے انکار کر دیا اور ہر فلسطینی کو جدوجہد میں حصہ لینے کے لئے کہا اس طرح عورتوں اور بچوں نے بھی اسرائیلیوں کی بندوقوں اور اعلیٰ ہتھیاروں کو نظر انداز کر کے ان پر پتھر برسائے۔ انتفاضہ کی جدوجہد سے عرب دنیا اور بین الاقوامی برادری بہت متاثر ہوئی۔ اس سے اسرائیلیوں کی تحریک امن کو بھی تقویت ملی کیونکہ انتفاضہ نے ہر قیمت پر آزادی حاصل کرنے اور اسرائیل کی غلامی سے نجات پانے کا تہیہ کر لیا تھا۔ انتفاضہ نے رابن جیسے اسرائیلی پالیسی کے پابند لوگوں کو بھی متاثر کیا ایک سپاہی کی حیثیت سے رابن نے جان لیا تھا کہ آئی ڈی ایف کے ذریعے عورتوں اور بچوں کو مار پیٹ کر جھکنے

پر مجبور کر دینا ممکن نہیں ۔1992 میں جب وہ اسرائیل کا وزیر اعظم بنا رابن پی ایل او کے ساتھ مذاکرات کے لئے تیار تھا۔ اگلے سال پی ایل او اور اسرائیل نے اوسلو معاہدہ پر دستخط کئے ۔

انتفاضہ کے آغاز میں ہی ایک نئی تنظیم 'حماس' بنائی گئی جس نے فلسطینیوں کی جدو جہد کو ایک اسلامی زاویہ دیا۔ انتفاضہ کی قیادت سیکولر تھی مگر مجمع کے بعض اراکین نے حماس اسلامی تحریک مزاحمت بنائی جو فلسطینی قوم پرست تحریک اور اسرائیلیوں دونوں کے خلاف معرکہ آرا تھی ۔ وہ سیکولر لوگوں کے خلاف لڑتے تھے تا کہ فلسطین کی اسلامی روح زندہ رہے نوجوان حماس میں جوق در جوق شامل ہونے لگے کچھ نوجوانوں کا تعلق پناہ گزینوں کے کیمپوں سے تھا مگر متوسط طبقے سے تعلق رکھنے والے اور سفید کالر مزدور بھی ان کے ساتھی تھے یہ ایک پر تشدد تحریک تھی جو ظلم کو برداشت کرنے سے پیدا ہوئی تھی ۔18 اکتوبر 1990 میں حرم الشریف کے اندر سترہ فلسطینیوں کے قتل نے حماس کی دہشت پسندی کو اور ہوا دی ۔مٹ جانے کے خوف سے مجبور ہر کر حماس نے ان فلسطینیوں پر بھی حملہ کیا (جنہیں وہ اسرائیل کے ساتھی سمجھتے تھے) ''یہ ہمارے دشمن ہمیں ختم کر دینے کے لئے پورا زور لگا رہے ہیں'' ان کے ایک ترجمان نے 1993 میں کہا ''اس لئے اسرائیل کے ساتھ کوئی تعاون بدترین جرم ہے'' اسلامی جہاد کی طرح حماس بھی عرب اسرائیل آویزش کو اسلامی نقطۂ نظر سے دیکھتا تھا حماس کے اراکین سمجھتے تھے کہ فلسطینی المیہ کی وجہ اسلام سے روگردانی ہے۔ فلسطینی صرف اس وقت اسرائیل کو شکست دے سکیں گے جب وہ اسلام کی طرف لوٹ آئیں گے حماس کو یقین کو یقین تھا کہ اسرائیلیوں کی کامیابی کا راز یہودی مذہب ہے اور یہ کہ اسرائیل اسلام کی تباہی پر کمر بستہ ہے اس لئے ان کا دعویٰ تھا کہ وہ اپنے دفاع کے لئے لڑتے ہین ہیبر ون میں گولڈسٹین کے ہاتھوں فلسطینی عبادت گزاروں کے قتل کے بعد حماس نے عہد کر لیا کہ وہ جان کا بدلہ جان سے لیں گے حماس کے کارکن چہلم ختم ہونے کا انتظار کرتے رہے ۔چہلم ختم ہونے کے بعد سات اسرائیلی ایک خود کش حملہ میں مقبوضہ علاقوں میں نہیں بلکہ اسرائیل کے اندر افولا میں مارے گئے ایک ہفتہ کے بعد 13 اپریل 1994 کو ایک اور خود کش حملہ میں پانچ اسرائیلی ہذیرا میں مارے گئے پرانے تشدد سے نیا تشدد پیدا ہوا تھا۔

ان خود کش حملوں کی وجہ سے کئی اسرائیلی اوسلو معاہدہ سے برگشتہ ہو گئے جس پر ابھی پچھلے سال ہی دستخط ہوئے تھے اور جس کے ذریعہ پی ایل او نے 1948 کی سرحدوں کے اندر

اسرائیل کا وجود تسلیم کر لیا تھا۔ دہشت اور تشدد ختم کرنے کا وعدہ کیا تھا اس کے عوض پانچ سال کے لئے غزہ اور مغربی کنارے میں فلسطینیوں کو محدود خود مختاری کی پیش کش کی گئی جس کے بعد فیصلہ کن مذاکرات اسرائیلی بستیوں، فلسطینی پناہ گزینوں کے لئے تاوان اور یروشلم کے مستقبل جیسے مسائل پر شروع ہوتے مگر خود کش حملوں سے ظاہر ہو گیا تھا کہ عرفات کو ان اسلامی ملی ٹینٹ افراد پر اختیار نہیں تھا جو اس کی سیکولر حکومت کے خلاف تھے یا دائیں بازو کے وہ چند اسرائیلی جو سمجھتے تھے کہ رابن نے اوسلو معاہدہ کے ذریعہ اسرائیل کی سلامتی خطرہ میں ڈال دی ہے۔

کلکسٹ ربی، بالخصوص اوسلو معاہدہ کے خلاف تھے۔ مقدس زمین فلسطینیوں کو دینے کا وعدہ کر کے حکومت سے بدترین جرم سرزد ہوا ہے اس لئے جولائی 1991 میں ربی شپیرا اور چودہ دیگر گش ربیوں نے فوجوں کو اس وقت اپنے اعلیٰ افسران کا حکم نہ ماننے کے لئے کہا جب آئی ڈی ایف نے مقبوضہ علاقے خالی کرنے شروع کئے۔ ایسا کرنا سول وار شروع کرنے کے مترادف تھا دوسرے ربیوں نے سوال اُٹھایا کہ کیا رابن ''روڈیف'' بن گیا ہے۔ روڈیف جو ایک یہودی کی زندگی کے لئے خطرہ ہوتا ہے اگر ایسا ہے تو یہودیوں کے قانون کی رو سے اس کی سزا موت ہے۔ 4 نومبر 1995 کو یگل امیر ہسبڈر پیشوا کے ایک سابق طالب علم نے تل ابیب میں ایک امن ریلی کے دوران رابن کو قتل کر دیا بعد میں قاتل نے بتایا کہ یہودیوں کے قانون کا مطالعہ کر کے اس نے جانا کہ ''رابن'' ایک روڈیف یعنی یہودیوں کا دشمن ہے اس لئے اس کا قتل مجھ پر فرض تھا۔ سادات کے قتل کی طرح رابن کے قتل نے واضح کر دیا کہ مشرق وسطیٰ میں دو جنگیں لڑی جا رہی ہیں ایک عرب اسرائیل آویزش اور دوسری جنگ مصر اور اسرائیل جیسے ملکوں میں مذہبی اور سیکولر طاقتوں کے درمیان ہو رہی ہے صرف مذہبی یہودی ہی اپنے آپ کو ظلم اور نفرت کا نشانہ نہیں سمجھتے تھے بلکہ سیکولر یہودیوں کا بھی یہی حال تھا وہ بھی یہی سمجھتے تھے کہ مذہبی یہودی انہیں حقارت سے دیکھتے ہیں اور ان کا رویہ ظالمانہ ہے۔ یروشلم میں گھومتے ہوئے نامور ناول نگار آموس اوز کو یاد آیا کہ پہلے زمانہ کے صیہونی، آرتھوڈوکس یہودیت سے نفرت کرتے تھے ''وہ اپنے دلوں سے اور اس دنیا سے اس کا نام ونشان مٹا دیتے،'' نفرت وحقارت کی شدت کی وجہ سے انہوں نے اس دنیا کو بے جان لفظوں اور مردہ روحوں کا ڈھیر کہا سیکولر حلقوں کی اس نفرت کا جواب ہیزیڈم نے اسی انداز میں دیا۔ شہر کی دیواروں پر اوز نے سیاہ سواستیکا کے نشان اور یہ الفاظ لکھے کہ ''ہٹلر کے ایجنٹ

صیہونی مردہ باد' ٹیڈی کولک (یروشلم کا لیبر میئر) جہنم میں جائے اوز کوڈوسدان اپنا ٹیچر بھی یاد آیا جس نے کہا تھا کہ ''یہودیوں کی تاریخ میں سیکولر صیہونیت کی حیثیت وقتی اور عارضی ہے آرتھوڈوکس یہودیت کا دور پھر آئے گا'' اب جب کہ وہ ایک الٹرا آرتھوڈوکس علاقہ میں گھوم رہا تھا اس کا دم گھٹ رہا تھا اور وہ ہیزیڈم کے پھلنے پھولنے اور ہیزیڈی یہودیت کی تب وتاب سے مرعوب ہورہا تھا، اس کے پھلنے پھولنے سے تمہارا اپنا روحانی وجود خطرہ میں ہے یہ اس دنیا کی جڑیں بھی کھوکھلی کردے گا جو تم نے اپنی وراثت کے طور پر چھوڑ کر جانے کے لیے بنائی ہے جب تم اور تم جیسے دوسرے لوگ یہاں سے رخصت ہو چکے ہوں گے۔'' سیکولر اسرائیلیوں کو بھی مٹ جانے کا خوف ہے اور مذہبی دشمنوں کا سامنا کرتے ہوئے ان میں بھی ایک مبہم سے خوف کی لہر دوڑ جاتی ہے۔

اوز مسئلہ کی تہہ تک پہنچ گیا تھا۔ بنیاد پرست اور سیکولر کسی مذہب کے ہوں آپس میں اس لئے لڑتے ہیں کہ مذہب کے متعلق ان کے تصورات بالکل مختلف ہیں۔ گش ایمونم کے متعلق بات کرتے ہوئے اوز نے اسے ''ظالم اور ضدی فرقہ کہا جو یہودیت کے کسی تاریک کونہ سے نمودار ہوا ہے اور وہ سب کچھ تباہ کرنا چاہتا ہے جو ہمیں عزیز ہے اور ہمارے لئے مقدس ہے۔'' لبرل اور سیکولر حلقوں کے لئے وہ یہودی ہوں عیسائی کہ مسلمان شخصی خودمختاری اور فکری آزادی جیسی قدریں محترم اور مقدس ہیں وہ ان ایشوز پر سمجھوتہ کرسکتے ہیں نہ کوئی رعائیت دے سکتے ہیں۔ یہ اصول لبرل یا سیکولر کی شناخت کے لئے اتنی مرکزی اہمیت رکھتے ہیں کہ اگر انہیں کوئی خطرہ ہو تو لوگ سمجھتے ہیں کہ ان کی اپنی زندگی خطرے میں ہے جس طرح بنیاد پرستوں کو سیکولر لوگوں کے ہاتھوں مٹ جانے کا خوف تھا اور جیسا لبرل سمجھتا تھا کہ ''گش ہم میں خوں ریزی کی مجنونانہ اور بیہمانہ خواہش پیدا کرنی چاہتا ہے۔ گش کا اصلی مقصد نابلوس یا ہیبرون فتح کرنا نہیں بلکہ اسرائیل پر یہودیت کا ایک بگڑا ہوا تصور مسلط کرنا ہے اس فرقہ کا حقیقی مقصد عربوں کو اسرائیل سے نکالنا اور اس کے بعد یہودیوں پر ظلم کرنا ہے' ہمیں اپنے چھوٹے پیغمبروں کی درندگی کی نذر کرنا ہے۔'' مذہبی اور سیکولر دونوں ایک دوسرے کو شک اور خوف کی نظر سے دیکھتے تھے ان میں سے کوئی بھی صاف نہیں دیکھ سکتا دونوں مخالفوں کی زیادتیاں اور ظلم یاد کرتے ہیں جس سے ان کے زخم تازہ ہو جاتے ہیں اس لئے وہ امن قائم نہیں کرسکتے۔

امریکہ میں بھی مذہبی اشتعال اور محاذ آرائی موجود تھی مگر وہاں مذہبی بنیاد پرست متحمل اور قانون کے پابند تھے بنیاد پرست اپنے صدر قتل نہیں کرتے تھے نہ انقلاب لاتے اور لوگوں کو یرغمال بناتے تھے تاہم مذہبی معاملات میں دشواریاں موجود تھیں گیلپ پول کرائے گئے تو پتہ چلا کہ امریکہ کی مذہبی آبادی تقریباً دو یکساں حصوں میں منقسم اور دو مخالف کیمپوں میں بٹی ہوئی ہے۔

جون1984 میں ہونے والے گیلپ پول سے پتہ چلا کہ 43فیصد امریکی اپنے آپ کو لبرل کہتے ہیں جبکہ 41فیصد کنزرویٹو ہیں۔ بڑے فرقوں میں گہرے اختلافات ہیں۔ رائے دینے والے اکثر لوگوں نے بتایا کہ اختلافات شدید ہیں اور مخالفین کا باہمی رویہ منافقانہ ہے جس کی اصلاح باہمی قربت اور میل جول سے بھی نہیں ہوتی۔ دوسرے پول کرانے سے پتہ چلا کہ اگرچہ صرف نو فیصد امریکی اپنے آپ کو بنیاد پرست مانتے ہیں مگر پروٹیسٹنٹ بنیاد پرستی کے بنیادی فوائد پر مضبوطی سے قائم لوگ بہت زیادہ ہیں۔

44فیصد کا عقیدہ ہے کہ نجات صرف مسیح کے ذریعہ ممکن ہے۔

30فیصد اپنے آپ کو ازسرنو پیدا ہونے والے کٹر عیسائی کہتے ہیں۔

28فیصد کا ایمان ہے کہ انجیل کا ہر لفظ لفظی معنوں میں پڑھنا چاہیے۔

27فیصد اس بات سے انکار کرتے ہیں کہ انجیل میں سائنسی اور تاریخی غلطیاں موجود ہیں۔

امریکی بنیاد پرستی کی کامیابی میں صرف جیری فالویل اور دوسرے ٹیلی وینجلسٹس کا ہاتھ نہیں تھا بلکہ امریکی کلچر اور امریکہ کی مذہبی زندگی میں ایسے عناصر موجود تھے جو مذہب کی 'لفظی فارم' کے لئے سازگار تھے اور جن کی وجہ سے بنیاد پرستی کو امریکہ میں ایک زرخیز زمین ملی تھی۔ تاہم 1980 کے عشرے میں امریکہ کے اندر بنیاد پرستی کو ایک سخت دھچکا لگا۔ کوئی صدر قتل ہوا نہ دہشت گردی ہوئی بنیاد پرستوں کو ایک سکینڈل کے ذریعے نقصان اٹھانا پڑا۔ سکینڈل جو اپنے انداز میں اخلاق و مذہب کا بدترین دشمن تھا جس سے خطرہ تھا کہ وہ ٹیلی وینجلسٹوں کو فروعات، دولت لوٹنے اور جنسی بدعنوانیوں کے الزامات میں دفن کردے گا کیا امریکی بنیاد پرستی کی فطرت میں کوئی ایسی بات تھی جس کی وجہ سے1987 کا ٹیلی ویژن سکینڈل پیدا ہوا؟

ڈاکٹرین کے بارے میں عیسائیوں کی تشویش کی وجہ سے پروٹیسٹنٹ بنیاد پرستوں نے دوسری تحریکوں سے مختلف رستہ اختیار کیا تھا۔ عمل پر یہودیوں اور مسلمانوں کے اصرار کا مطلب تھا

کہ ان مذاہب کے بنیاد پرستوں نے اپنی روایات کی دیومالائیں نظریوں میں بدل دی تھیں ان سے بعض بدترین زیادتیاں اس وجہ سے سرزد ہوئیں کہ وہ ان اساطیر کو عملی دنیا میں حقیقت کی شکل دینا چاہتے تھے انہوں نے اہلیت کے جدید معیار پر اترنے کی کوشش بھی کی۔ یہودی اور مسلمان بنیاد پرستوں نے اپنی دیومالائیں پریگمیٹک لوگوں میں بدل دی تھیں تاکہ عملی نتائج حاصل ہوں پروٹیسٹنٹ بنیاد پرستوں نے دوسرے طریقہ سے متھ غلط راستے پر ڈال دی تھی۔ انہوں نے عیسائیوں کی دیومالائیں سائنسی حقائق میں بدل دی تھی۔ جس سے ایسا دوغلا پن پیدا ہوگیا تھا کہ جو نہ اچھا مذہب تھا نہ اچھی سائنس تھی۔ ایسا کرنا روحانیت کی روایت کے خلاف تھا اور اس سے سخت تناؤ بھی پیدا ہوا کیونکہ مذہبی صداقت، ریشنل صداقت نہیں، نہ ہی وہ سائنسی طریقہ سے ثابت ہوسکتی ہے۔ چونکہ پروٹیسٹنٹ بنیاد پرست وجدان اور تصوف کو نظرانداز کرنے کی طرف مائل تھے اس لئے ان کا رابطہ لاشعور اور شخصیت کی گہرائیوں سے بھی ٹوٹ گیا تھا جس کے نتیجہ میں احیاء کی امریکی تحریک بعض اوقات مریضانہ انداز اور بدنظمی کی صورت اختیار کرلیتی تھی۔

1980 کے عشرے کے آخر تک بعض بنیاد پرست اس ریشنل مذہب کے خلاف بغاوت پر تیار ہوگئے۔ جنس، جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں بنیاد پرستوں کے لئے بڑا مسئلہ تھی ان میں سے اکثر لوگ عورت اور مرد کی حدوں کے متعلق پریشان رہتے تھے شاید یہ حیرانی کی بات نہیں کہ جب بغاوت ہوئی تو وہ جنسی صورت میں ہوئی اور جنس ہی اس کا عنوان بنی۔

ٹیلی ویژن اور پبلک کی خوشنودی جو بعض اوقات اس کے ساتھ آتی ہے روحانی لحاظ سے بےخبر اور غافل لوگوں کے لئے ایک جال کی طرح ہیں شخصیت پرستی میں نہ صرف خود پسندی شامل ہوتی ہے جو ان کی نفی میں رکاوٹ بن جاتی ہے بلکہ ٹیلی وینجلسٹ کا رشتہ حقیقت سے ٹوٹ بھی سکتا ہے۔ دولت کے ڈھیر جو بڑے بڑے نیٹ ورک کماتے ہیں انجیل کے اس حکم کی خلاف ورزی ہے، جس کے ذریعہ دولت کی ہوس سے منع کیا گیا ہے۔ پی ٹی ایل (Praise the Lord and the People that Love) (خدا کی ثناء کرو اور ان لوگوں کی ثناء کرو جو محبت کرتے ہیں) کے جم اور دامی نے بکرز کو ان کے عیاشانہ طرز زندگی کی وجہ سے تنقید کا نشانہ بنایا چند برسوں سے The Choriote Observer لکھ رہا تھا کہ وہ اپنے ناظرین کو تو قربانی اور لوگوں کی مدد کا سبق دیتے ہیں کہ اپنی دولت ضرورت مندوں میں تقسیم کردیں مگر بکرز نے خود ایک عمارت کی تعمیر پر

375,000ڈالرخرچ ہیں اوراس میں فرش سے چھت تک آئینے لگانے پر22,000ڈالڑخرچ کئے ہیں۔ یہ سب کچھ لنچ برگ میں فالویل کی پالیسی سے بالکل مختلف تھا جواپنی سادگی اورقناعت کی وجہ سے پہچانی جاتی تھی۔

بکرز اپنی مسیحی تھیم پارک 'ہیریٹج یوایس اے' کی وجہ سے زیادہ ترمشہور تھے جس کے ذریعہ انہوں نے ڈزنی میں شمالی امریکہ کے اندرایونجلیکوں کی زندگی پیش کی تھی اس میں کوئی شک نہیں کہ اسے کافی مقبولیت حاصل ہوئی۔امریکی ماہربشریات سوزین ہارڈنگ نے اپنے ایک مضمون میں لکھا ہے کہ ''بکرز جان بوجھ کرفالویل کے سہل سادہ اور کامن سینس مذہب کے خلاف بغاوت کررہے تھے اور بنیاد پرستی کوایک نئے پوسٹ ماڈرن دور میں دھکیل رہے تھے۔''انیسویں صدی کے آخری دنوں سے امریکی بنیاد پرست جدیدیت کے چیلنج کا جواب دینے کے لئے اپنامذہب پوری طرح ریشنل بنانے کی کوشش میں لگے ہوئے تھے اس سلسلہ میں انہوں نے سیدھی سادی دانش اورعقل کی خوبیاں بیان کیں انہوں نے ایسے انداز میں اصلیت کواپنایا تھا کہ تخیل اور وہم میں تمیز ہوسکتی تھی انہوں نے تمام دنیا الگ الگ شعبوں میں بانٹ دی تھی جن میں سچ جھوٹ سے بالکل الگ تھا اور مذہبی، سیکولر اور لبرل عیسائیوں سے مختلف تھے ان کا اخلاقی اصول علیحدہ تھا۔ بنیاد پرستوں نے ایسا مخالف کلچر پیدا کیا تھا جس میں وہ سب کچھ موجود تھا جو'بے خدا دھارے' میں نہیں تھا۔ وہ ایک ایسا مذہب تھا جوشک کی بجائے یقین'فرق مراتب' کھلے سوالات اورنئی دنیا کے بدلتے ہوئے کردار پیش کرتا تھا۔ پوسٹ ماڈرن کلچر کی دوسری اقسام کی طرح ہیریٹج یوایس اے کی خصوصیت عورتوں مردوں کا میل جول رنگین نظارے کھیل کوداد عیش وعشرت تھی۔

اپنے مذہب کوسائنسی اورریشنل بنانے کی کوشش میں بنیاد پرستوں نے مذہب کوغیرقدرتی صورتحال میں دھکیل دیا جیسے بنیاد پرستوں نے ڈارون کے سائنسی ریشنلزم کے خلاف بغاوت کی جیسا کہ ہارڈنگ 'امریکن کرسچین ہسٹری' کے متعلق اپنے بیان میں کہتا ہے کہ 'ہیریٹج یوایس اے' انواع واقسام کی چیزوں کا مرقع تھا سچ کے واقعاتی ہونے پرزور دینے کی بجائے اس کی نمائش میں مصنوعی اورغیرقدرتی چیزوں کے یکجا ہونے کی طرف توجہ دی جاتی تھی۔خرید کے مرکز کا طرزِ تعمیر نوآبادیاتی اور وکٹوریہ کے عہد کی یاددلاتا تھا۔ بلی گراہم کا ''اصلی گھر'' دکھایا گیا تھا مگر دیوار پر لگی تصویروں میں اس کا انہدام اورنئی تعمیر دکھائی گئی تھی اصل مقصد اسے اس کی اصلی جگہ کی بجائے

دوسری جگہ پر ہونا دکھانا تھا۔ یروشلم کے اس بالائی کمرے کی ہو بہو نقل بنائی گئی تھی جس کے متعلق روایت ہے کہ وہاں مسیح نے اپنا آخری کھانا کھایا تھا اور جو جان بوجھ کر ایک نقل کی طرح بنائی گئی تھی ٹیلی ویژن سٹوڈیو میں چرچ سروس کرائی جاتی تھی مگر نشر نہیں ہوتی تھی بکرز نے باقاعدہ کمیونین سروس یا وعظ کبھی نشر نہیں کیا سارا زور اداکاری، تفریحی پروگراموں، دلچسپ مناظر اور تخیل وتصور پر تھا۔

ہارڈنگ کا کہنا ہے کہ بکرز (صرف خدا کی لامحدود محبت پر زور نہیں دیتے تھے بلکہ درگزر اور معافی کا ایسا لامتناہی تصور بھی وضع کر رہے تھے جو گناہ کا جواز بن سکے اور گناہ کے ارتکاب سے پہلے ہی اس کی بخشش کی ضمانت ہو۔ ہم پہلے دیکھ چکے ہیں کہ عبوری دور میں کوئی نہ کوئی بغاوت سر اٹھا لیتی ہے۔ پرانے اصول اور پرانا طرز حیات بعض ایمان دار لوگوں کے بدلتے ہوئے حالات کے لئے سازگار نہیں ہوتے۔ وہ پابندیوں کا بوجھ محسوس کرتے ہیں اور کسی نئی چیز کی تلاش میں رہتے ہیں۔ انہیں پرانی رکاوٹیں کرنے، پرانے ٹابو توڑنے سے سکون حاصل ہوتا ہے اور بعض تو اس حد تک آگے گئے ہیں کہ انہوں نے 'مقدس گناہ' کی دینیات ایجاد کر لی ہے۔ جب مارچ 1987 میں وہ سکینڈل جس کی وجہ سے قوم دم بخود رہ گئی تھی، بالآخر بے نقاب ہوا تو خیال پیدا ہوا کہ ایسی کوئی بات پی۔ ٹی۔ ایل کے نیٹ پر شاید نشر ہوتی رہی ہو'شارلٹ آبزرور' نے الزام لگایا کہ 1980 میں جم بکر نے ایک چرچ سیکرٹری جیسیکا کو نشہ آور دوا کھلائی اس کے ساتھ شرمناک سلوک کیا اور اسے خاموش رکھنے کے لئے 250,000 ڈالر ادا کئے۔ اس کے فوراً بعد پتہ چلا کہ ٹامی ایک گانے والی گیری پکیسٹن پر ایسا عاشق ہوا کہ اپنی شادی سے ہاتھ دھو بیٹھا۔ جب یہ واردات ظاہر ہوئی تو بکرز بالکل نہیں شرمائے بلکہ بڑی ڈھٹائی کے ساتھ ٹیلی ویژن پر آ کر ان گنت ناظرین سے خدا کی لامحدود محبت اور بخشش کی باتیں کرنے لگے۔

لنچ برگ میں فالویل کی سلطنت، قدامت پسند قبل از جدیدیت مذہب کی پابندیاں جاری رکھنے کی ایک کوشش تھی جس سے لوگوں کو ضروری پابندیوں اور حدود پر عمل کرنے میں مدد ملی تھی۔ بکرز کے واقعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان پابندیوں کے نہ ہونے کا کیا نتیجہ نکلتا ہے۔ جہاں دوسری بنیاد پرست تحریکیں ظلم اور جبر کے تجربہ سے پیدا ہوئی تھیں بکرز کی پوسٹ ماڈرن عیسائیت اواخر بیسویں صدی کے اس رجحان کی غماز تھی کہ ''سب چلتا ہے'' بے شمار دولت ہونے کی وجہ سے

بکرز سمجھتے تھے کہ وہ جو چاہیں کر سکتے ہیں۔ کسی بات کی کوئی حد مقرر نہیں تھی سچ اور جھوٹ کی پرانی قسمیں اس طرح آپس میں خلط ملط کر دی گئی تھیں جیسے ہیریٹج یو ایس اے میں حقیقت اور فسانہ گڈ مڈ ہوتے تھے۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ یہ سب عیسائیت کے مسخ ہونے کی صورتیں تھیں۔

پھر ایک نئے فتنہ نے سر اٹھایا۔ جم بکر نے پی۔ٹی۔ایل سے استعفیٰ دیا اور جیری فالویل کو عارضی نگران کی حیثیت سے نیٹ ورک بچانے کے لئے کہا۔ پھر جم سویگرٹ کی طرف متوجہ ہوا۔ جس نے سکینڈل سے پردہ اٹھایا تھا اور جس کے متعلق جم نے دعویٰ کیا کہ اس طرح سویگرٹ پی۔ٹی۔ایل پر قبضہ کرنا چاہتا تھا۔ سویگرٹ اپنے طور پر ادارے میں اپنی جگہ بنانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کے پروگرام 145 ملکوں میں دیکھے جاتے تھے۔ جس کی وجہ سے اسے دعویٰ تھا کہ وہ آدھی دنیا میں نشر ہوتے ہیں مگر اس نے ایک طوائف لاوُزنیپا کے پاس باٹن روگ میں جانا شروع کر دیا۔ اس عورت نے اپنی کہانی سناتے ہوئے بتایا کہ سویگرٹ کو ذلت اور توہین کے سوا سیکس میں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ اپنی بربادی پر بھی تلا ہوا تھا۔ یہ جاننے کے باوجود کہ لوگ اسے موٹل میں آتے جاتے ہوئے دیکھتے اور پہچانتے ہیں وہ پھر بھی باز نہ آیا یہاں تک کہ آسمان ٹوٹ پڑا۔ اس کی بدچلنی کا راز مورگن گوون نے فاش کیا تھا جس پر سویگرٹ نے اپنے پروگرام میں سخت اعتراض کئے تھے۔ سویگرٹ پینٹی کوسٹلسٹ تھا۔ پہلے پینٹی کوسٹلزم بنیاد پرستی کا مخالف تھا۔ عقل سے نچنے کے علاوہ اس میں خدائی سچ کو الفاظ سے ماوراء بتایا جاتا تھا۔ اس طرح اسے لاشعور کی دنیا میں بے سوچے سمجھے قدم رکھنے کے خطرہ سے دوچار اور عقل و استدلال ترک کرنے کی وجہ سے آنے والی تباہیوں کا ہمیشہ سامنا تھا۔ ابتدائی پینٹی کوسٹلزم کی خصوصیت نسلی اور طبقاتی دیواریں گرانا تھیں۔ سویگرٹ ہم جنسوں کے خلاف اپنی بدزبانی کے لئے مشہور تھا۔ یہ بدزبانی اس کی اپنی دبی ہوئی جنسی خواہشات اور میلان ظاہر کرتی تھی۔ اس نے دوسرے پادریوں اور مخالف ٹیلی وینجلسٹس پر شدید حملے کئے اور مورل میجارٹی کے احتسابی جہاد میں شامل ہو گیا۔ انسانی ہمدردی اور عقل کا ڈسپلن نظر انداز کر کے سویگرٹ نے ایک ایسا مذہب بنا لیا تھا جو نہ صرف اپنے لئے بربادی کا باعث تھا بلکہ مذہب اور اخلاق کا بھی دشمن تھا۔

امریکی صحافی لارنس رائٹ، سویگرٹ کے جذباتی وعظوں میں دلچسپی لینے لگا تھا۔ اسے اندازہ ہوا کہ سویگرٹ ریشنل جدیدیت کی پابندیوں کے خلاف بغاوت کر رہا تھا۔ یہ بغاوت بڑی

شدید اور جذباتی تھی۔ رائٹ کے اپنے بچپن کے مذہب کی بنجر دانش ورانہ نفاستوں سے برسوں دور، اس نے دیکھا کہ اس کی اپنی شخصیت کا ایک حصہ سویگرٹ کی طرح اپنی احتسابی ذہنیت سے آزادی کے لئے بے چین ہے اور یہی حال سویگرٹ کے سامعین کا تھا جو بڑے کیف آور انداز میں اس کا وعظ سنتے تھے۔

وہ اپنے تحت الشعور کی گہرائیوں میں عقل اور معنوں کو پیچھے چھوڑتا ہوا اور زیادہ دور چلا جاتا اپنے پوشیدہ خدشات، بے نام خواہشات اور جذبات کے اندر جو تہہ میں بلبلے بن کر ابھرتے ہیں۔ مگر اب بھی وہ اس خام رگ کی طرف کانپتے اور گرے پڑتے ہوئے بڑھتے جو منتظر رہتی تھی۔ کبھی اس کی آواز بلند ہوتی، کبھی کانپتی کبھی اس کی گرامر اس کا ساتھ چھوڑ دیتی مگر وہ جانتا تھا کہ وہ رگ کہاں ہے اسے دیکھتے ہوئے خوف اور خواہش دونوں کا احساس پیدا ہوتا کیونکہ وہ ایک ایسی رگ ہے جو مذہب کے ساتھ جڑی ہوئی ہے جو محفوظ رہنا چاہتی ہے چاہے جانے کی خواہش رکھتی ہے۔ بالآخر وہ اس رگ کو چھیڑتا ہے تو آنسو بہتے ہیں سامعین اپنے ہاتھ اوپر اٹھائے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ ہنستے کبھی روتے ہیں خدا کی تعریف کرتے ہیں کوئی انجانی زبان بولتے ہیں، درد، خوشی اور عام لوگوں کے درمیان اپنے اس تجربہ کی شدت سے کانپتے ہیں۔

جدیدیت سے قبل کے دور کی بہترین روحانیت جان آف کراس، اسحٰق لوریا اور ملا صدرہ کی روحانیت تھی۔ انہوں نے ایسی جذباتی بے اعتدالیوں سے اس لئے منع کر دیا تھا کہ ان کا مذہب کے ساتھ کوئی تعلق نہیں تھا۔ ان کا کہنا تھا کہ باطن کا سفر پرسکون، منظّم اور عقل کی مدد سے مکمل ہوتا ہے۔ کبالا میں کسی کی شمولیت ممکن نہیں تھی۔ جب تک کہ اس کی عمر چالیس برس نہ ہو۔ شادی شدہ اور جنسی توازن حاصل کر چکا ہو۔ جدید دور نے علم کے وجدانی راستے نظر انداز کر دیئے تھے اور اس سلسلے میں تصوف کی روایت بہت حد تک ترک کر دی تھی۔ سویگرٹ کے پروگراموں کی مقبولیت ظاہر کرتی تھی کہ لوگ اس ضرورت سے زیادہ ریشنل دنیا میں سکھ کا سانس لینا چاہتے ہیں۔ کیف ونشاط کی خواہش رکھتے ہیں مگر اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا تھا کہ ایسی خواہش توازن کھو سکتی ہے۔ سویگرٹ کے ہیجان کا تعلق روحانیت کی بجائے جنسی تقاضوں سے تھا۔

بنیاد پرستوں کے مذہب کی ناکامی ان کے اس طیش اور نفرت میں ظاہر ہوئی جسے انہوں نے سکینڈل کے دوران آپس میں روا رکھا تھا۔ جب سویگرٹ کو جیسیکا کے ساتھ بکر کے جنسی

تعلقات کی خبر ملی تو وہ ''جم بکر پر کتے کی طرح جھپٹا''۔ سویگرٹ کے ایک سابق رفیق نے بتایا ''اسے چیرا پھاڑا اور برباد کر دیا۔'' اس کے بعد بکر نے جیری فالویل پر حملہ کیا۔ اس پر الزام لگایا کہ پی۔ٹی۔ایل کو بچانے کے بہانے وہ اس پر قبضہ کرنا چاہتا ہے۔ فالویل نے اس حملہ کا جواب دینے کی خاطر پریس کانفرنس بلائی جہاں اس نے ان افراد کے حلفیہ بیان پیش کئے جنہوں نے قسم کھا کر کہا تھا کہ جم بکر کے ساتھ ان کے جنسی تعلقات تھے۔ پریس کانفرنس میں فالویل نے ٹیمی فے کی ایک تحریر بھی پیش کی۔ جس میں اس کے وہ مطالبات درج تھے جو اس نے خاموش رہنے کے معاوضہ کے طور پر پیش کئے تھے۔300,000 ڈالر سالانہ جم کے لئے100,000 اپنے لئے پی۔ٹی۔ایل کی کتابوں اور تمام ریکارڈوں پر رائلٹی، ان کے لئے عمارت400,000 ڈالر کی دو کاریں سیکورٹی سٹاف قانونی فیس مع ان ماہرین کی فیس کے جو بکرز کی مالی بدعنوانیوں کی پڑتال کر رہے تھے۔ اس طرح بنیاد پرستوں کی عظیم مہم ایک بنجر اور اخلاق باختہ انجام کو پہنچی۔ سکینڈل سے ایک سال پہلے فالویل پر اعتماد تھا۔ اس نے مورل میجارٹی کا نام بدل کر ''دی لبرٹی فاؤنڈیشن'' رکھ دیا تھا اور اعلان کیا تھا کہ اس کے اکثر ممبر 1988 کے انتخابات میں مقامی، ریاستی اور وفاقی سطح پر حصہ لیں گے۔ مگر پی۔ٹی۔ایل کی زبردست ناکامی کے بعد فالویل نے 4 نومبر 1987 کو مورل میجارٹی اور دی لبرٹی فاؤنڈیشن کی صدارت سے استعفیٰ دے دیا اور اعلان کیا کہ اس کا سیاسی کھیل ختم ہوا۔ جس طرح اس نے صدارتی انتخابات میں رونلڈ ریگن کے لئے کام کیا اس طرح وہ آئندہ کسی امیدوار کے لئے کام نہیں کرے گا۔ سکینڈل کے دوران اس کے اپنے ''اولڈ ٹائم گوسپیل آور'' کی آمدنی کم ہوگئی اور فالویل اپنی پرائیویت گوسپل منسٹری کی طرف واپس آنے پر مجبور ہوگیا۔ اب بھی وہ قوم کی خامیوں کے متعلق وقتاً فوقتاً غل مچاتا رہتا تھا مگر وہ اس آنے والے مذہبی جماعتوں کے اتحاد کی پیش بینی نہیں کر سکا جسے امریکہ میں طوفان بن کر آنا تھا۔ جب صدارت کے لئے پیٹ رابرٹسن کی کوشش ناکام ہوگئی تو بنیاد پرستوں کی جارحیت جو1979 میں بڑی امیدوں اور بڑی اُمیدوں اور بڑے زور وشور سے شروع ہوئی تھی، بے اثر ہوگئی۔ ''دی نیو کرسچین رائٹ' بدنامی اور رسوائی کے بعد بکھر گئی اگرچہ عیسائی انفرادی حیثیت میں ووٹ حاصل کرنے کی کوشش کرتے رہے مگر سیکولر حلقے عام طور پر یہی سمجھتے رہے کہ بنیاد پرستی کا فتنہ ٹل گیا ہے مگر بنیاد پرستی کا خاتمہ نہیں ہوا تھا۔ درحقیقت وہ امریکہ کے اندر ایک نئے خطرناک اور انتہا پسندانہ

دور میں داخل ہوگئی تھی۔28 نومبر 1987 کو نیویارک کا رینڈل ٹیری، چیری ہل نیوجرسی کے ایک اسقاط کلینک میں تین سو ''محافظ'' لے کر گیا وہاں انہوں نے تقریباً گیارہ گھنٹے عبادت اس جگہ کی جسے ٹیری نے ''جہنم کا زینہ'' کہا۔ گیارہ گھنٹوں تک وہ وہاں دعائیں مناجاتیں اور عبادتیں کرتے ہوئے عورتوں اور اسٹاف کو کلینک میں جانے سے منع کرتے رہے۔ شام تک 211 محافظ گرفتار کر لئے گئے مگر ٹیری نے فاتحانہ انداز میں کہا کہ ''کوئی بچہ نہیں مرا۔'' یہ آپریشن ''ریسکیو'' کا پہلا کارنامہ تھا۔ آپریشن ریسکیو نے بڑے کلچری دھارے کو قاتل کا نام دے کر اس کے خلاف اعلان جنگ کیا تھا۔ یہ امیجری بذات خود ایک جنگ تھی۔1988 میں اٹلانٹا کے مقام پر ایک جمہوری کنونشن کے دوران تحریک شروع ہوئی جسے ٹیری نے ''محاصرہ اٹلانٹا'' کا نام دیا اس سے تعلق رکھنے والے تیرہ سو مظاہرین اسقاط کلینک کا راستہ روکنے کے الزام میں پکڑے گئے۔ تب سے انہوں نے تمام کینیڈا اور امریکہ میں اسقاط کے خلاف دن منائے اور نسائیت کی برائیوں اور لبرل حکومت کے خلاف لیکچر دیئے۔ اسقاط کے خلاف اپنی کاروائی کو ''انجیل کی نافرمانی'' کہتے تھے۔ فالویل اور رابرٹسن کے برعکس ٹیری قانون کی خلاف ورزی کے لئے تیار تھا۔ بنیاد پرستی سے اس کا مقصد ایسی قوم پیدا کرنی تھی جو ایک بار پھر یہودی عیسائی اخلاقیات کو اپنی سیاست، اپنے عدالتی نظام، اپنے قومی اخلاق کی بنیاد بنائے۔ ایسی قوم نہیں جو ہیومن ازم کی نامعلوم اور غیر یقینی دنیا میں بھٹکتی پھرے بلکہ ایسا ملک جس کے برتر واعلیٰ قوانین اس کی مضبوط چٹان بنیں۔

یہ مہم صرف اسقاط کے متعلق نہیں تھی جس طرح سکوپس کا مقدمہ صرف ارتقاء کے متعلق نہیں تھا۔ ولیم جیننگز برائن (1920) کی طرح ٹیری اور اس کے ساتھی سمجھتے تھے کہ وہ سیکولر جدیدیت کی ایک بدترین شکل کے خلاف لڑ رہے ہیں۔ تیری کو یقین ہے کہ اگر ان کی مہم ناکام ہوئی تو یہ بات امریکہ کے مفاد میں نہیں ہوگی مگر اسے اعتماد ہے کہ 'ہمارے پاس لوگوں کی ایک فوج ہے' ہماری کوششوں کے نتیجہ میں ''بچوں کا قتل رک جائے گا ہم کلچر کو پیچھے لے جائیں گے۔ تشکیل نو (Reconstruction) کی تحریک (جس کے بانی گیری ناتھ اور راؤسس جان رشیونی تھے) بھی سیکولر ہیومن ازم کے خلاف جنگ میں مصروف ہے۔ ان کی جنگ مورل میجارٹی کی جنگ سے زیادہ شدید ہے۔ تشکیل نو کے حامیوں نے پرانے ہزار سالہ جشن کے انتشار اور مایوسیوں سے جان چھڑائی اور ایک نیا حیات آفرین نظریہ اپنالیا مسلمان بنیاد پرستوں کی طرح نارتھ اور رش

ڈونی کو بھی خدا کی حاکمیت کی بڑی فکر ہے۔ایک مسیحی تہذیب موجود ہونی چاہیے جوشیطان کی شکست کے بعد ہزار سالہ بادشاہت کوممکن بنادے۔ری کنسٹرکشن ازم کا بنیادی تصور تسلط اور حکومت ہے خدانے آدم اورنوح کودنیا مطیع کرنے کا کام سونپا تھا۔اب عیسائی اس حکم کے وارث ہیں انہیں یہ اختیار حاصل ہے اور یہ ان کی ذمہ داری ہے کہ مسیح کے آنے سے پہلے زمین پر مسیح کی حکومت قائم کریں۔اس سلسلہ میں عیسائیوں کو کچھ نہیں کرنا عیسائی تو صرف اس فتح سے مستفید ہوں گے۔خداہی ماڈرن حکومت کوغارت کردے گا۔

اس عرصہ میں تشکیل نو کے حامی حکومت کرنے کی تربیت حاصل کررہے تھے تاکہ جب سیکولر ہیومن ازم کی حکومت ختم ہوتو وہ اقتدار سنبھال سکیں۔انسانی ہمدردی کا جذبہ نظرانداز کر کے وہ عیسائیت کی صورت مسخ کرتے ہیں وہ سمجھتے ہیں کہ جب بادشاہت آئے گی توریاست اور چرچ میں کوئی دوری نہیں ہوگی۔جمہوریت کا خاتمہ ہوگا اور سوسائٹی نئے سرے سے انجیل کے خطوط پر منظم کی جائے گی۔انجیل کے ہرقانون پر پوراعمل ہوگا۔غلامی کا دور واپس آجائے گا بچوں کی پیدائش پر پابندی ختم ہوجائے گی (کیونکہ اہل ایمان کی اولاد میں اضافہ ہوناچاہیے) زانی ہم جنس پرست، دین کی توہین کرنے والے، نجومی اور ہرقوم کی بلائیں، سب کا خاتمہ ہوگا۔نافرمان بچے پتھر مار مار کر ہلاک کردیئے جائیں گے۔سرمایہ دارانہ معیشت نافذ ہونی چاہیے۔سوشلسٹ اور بائیں بازو کی حمایت کرنے والے سب گنہگار ہیں۔خداغریبوں کے ساتھ نہیں غریبی اور ظلم میں برا قریبی رشتہ ہے۔ٹیکس فلاحی پروگراموں کے لئے وقف نہیں ہوناچاہیے کیونکہ کاہلوں کی امداد برائی کی امداد کرنے کے مترادف ہے۔تیسری دنیا کے معاملہ میں بھی یہی صورتحال ہے۔تیسری دنیا نے اپنی اخلاقی بے راہ روی اوراوراپنے الحاد کی وجہ سے اپنے اقتصادی مسائل اپنے لئے خود پیدا کئے ہیں انجیل نے غیرملکی امداد سے بھی منع کیا ہے۔فتح کا انتظار کرتے ہوئے جس میں شاید کچھ دیر ہوعیسائیوں کوخدا کے بلیو پرنٹ (احکام) کے مطابق سوسائٹی کی ازسرنوتعمیر کے لئے تیار رہنا چاہیے اورحکومت کی ان پالیسیوں کی حمایت کرنی چاہیے جوانجیل کے اصولوں سے قریب ہوں۔جس حکومت کا خواب نارتھ اورشدونی نے دیکھا ہے وہ ہرلحاظ سے آمرانہ ہے وہاں کسی اورنقطۂ نظر کی گنجائش نہیں، جمہوریت نہیں، اپوزیشن نہیں، نہ شخصی آزادی ہے۔ویسے تو امریکہ میں ایسے مذہب کی مقبولیت کے امکان کم ہیں مگر کہتے ہیں کہ کسی بڑے بحران کے موقعہ پرایک آمرانہ مذہبی

حکومت لبرل طرز حکومت کی جگہ لے سکتی ہے۔عیسائیت نے آخر سرمایہ داری کو بھی تو اپنا لیا تھا جو عیسیٰ مسیح کی تعلیمات کی کھلی خلاف ورزی تھی اس لئے بدلے ہوئے حالات میں ایک فسطائی نظریہ کی حمایت کا کام بھی عیسائیت سے لیا جا سکتا ہے۔

بعض زیادہ قدامت پسند پینٹی کوسٹلسٹ ،تشکیل نو کے مذہب میں دلچسپی لیتے ہیں اگر چہ رشڈ ونی کی رائے ان کے متعلق اچھی نہیں، پاٹ رابرٹسن ایک عبوری دور کا شخص لگتا ہے۔ وہ ایک تجدید پسند اور بپٹسٹ ہے اس کا رجحان پینٹی کوسٹلزم کی طرف بھی ہے۔ نارتھ کی طرح اسے بھی خیال ہے کہ مسیح کی آمد شاید ابھی دور ہو۔ یہ ایک ایسا خیال ہے جو اسے قابل از ہزار یہ یا پری ملینیل ازم سے الگ کر دیتا ہے اس عرصہ میں عیسائیوں کے لئے ضروری ہے کہ اقتدار سنبھالنے کے لئے اپنی طاقت بڑھائیں تاکہ انجیل کے اصولوں پر مبنی ایک معاشرہ بنائیں۔ ورجینیا میں اپنی یونیورسٹی کا نام بدل کر اس نے ریجنٹ یونیورسٹی رکھ دیا اس کے مطابق ریجنٹ بادشاہ کی عدم موجودگی میں حکومت کرتا ہے۔کالج کا مقصد بادشاہت آنے پر سات سو طلباء کو اقتدار سنبھالنے کے لئے پہلے ہی تیار کرنا ہے جب The Fundamentals (1910-15) شائع ہوئی اس وقت سے امریکہ میں بنیاد پرستی بدل چکی ہے۔ اس میں ایک طرف تو پوسٹ ماڈرن رجحانات اور دوسری طرف آمرانہ نظریہ (ایک جماعت کی حکومت، ریاست کی مکمل اطاعت) پیش کیا گیا ہے۔

بنیاد پرستی ختم ہونے والی نہیں امریکہ میں ایک عرصہ سے مذہب ہی حکومت کی مخالفت کو ایک سمت دیتا ہے اور اس مخالفت کی تشکیل کرتا ہے اس کا عروج و زوال ہمیشہ ترتیب وار رہا ہے۔ گزشتہ چند برسوں کے حالات سے پتہ چلتا ہے کہ قدامت پسند اور لبرل اب بھی حالت جنگ میں ہیں جو جنگ کہ اب بالکل واضح ہو چکی ہے۔1992 میں فالویل (جواب بھی پرانی قسم کی بنیاد پرستی پر یقین رکھتا ہے) نے اعلان کیا کہ بل کلنٹن کے صدر منتخب ہونے سے امریکہ میں شیطان آزاد ہو گیا۔ کلنٹن تماش بینوں کے ہاتھوں میں اقتدار دے کر فوج اور قوم دونوں کو تباہ کر دے گا حکومت کی امداد سے چلنے والے ہسپتالوں کو اسقاط کی اجرت دینا اور ہم جنسی کے حقوق کی توثیق کرنا ایسی نشانیاں ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ امریکہ نے خدا کے خلاف جنگ کا اعلان کر دیا ہے۔

1993 میں لوگ جنگ میں مارے گئے 28 فروری 1993 کو وی بیورو آف الکوحل، تمبا کو

اور آتشین اسلحہ، نے ڈیوڈ کورش کی برانچ، ڈیوڈین کمپاؤنڈ (واکوٹیکساس) پر چھاپہ مارا کیونکہ اس کے متعلق مشہور تھا کہ وہ اسلحہ جمع کر رہا ہے۔ درحقیقت ٹیکساس کے کئی دوسرے شہریوں کی طرح اس کا اسلحہ خانہ بھی تھا مگر اس نے ایسا کوئی منصوبہ نہیں بنایا تھا کہ حکومت کے خلاف کوئی انقلابی قدم اٹھائے۔ ان پر حملہ کرنے کا مقصد بھی امریکی حکومت کی جائز قانونی حیثیت اور طاقت کا مظاہرہ تھا مگر اس کا الٹا اثر ہوا۔ ایف۔ بی۔ آئی نے کمپاؤنڈ کا محاصرہ کرلیا۔ ڈیوڈین کی عمارتیں آگ کی نذر کیں، اس ہنگامہ میں ستر عورتیں، مرد اور بچے مارے گئے۔ دراصل یہ اس فرقہ سے حکومت کی ناواقفیت، محصور لوگوں کے خلاف اس کی بے بسی اور حالات پر قابو نہ پاسکنے کی افسوسناک نااہلیت کا مظاہرہ تھا۔

دوسری طرف زیادہ انتہا پسند عیسائی، سیکولر حکومت کے ساتھ لڑنے کی تیاریاں کر رہے ہیں۔ ''کرسچین آئی ڈینٹٹی'' کے نام سے ایک فسطائی گروپ کا کتاب میں کوئی ذکر نہیں کیا گیا کیونکہ اس نے بنیاد پرستی کو بہت پیچھے چھوڑ دیا ہے نہ وہ اس کی حمایت کرتا ہے۔ اس گروپ کو عیش ونشاط کے تصور سے نفرت ہے ان کا خیال ہے کہ عیش ونشاط کے تصور نے امریکی مذہب کی قوت سلب کرلی ہے۔ وہ بدی کی قوتوں کے خلاف لڑنے کے لئے تیار ہیں۔ یہودیوں سے دشمنی کی وجہ سے وہ صیہونیت کے حق میں بنیاد پرستوں کی حمایت کے خلاف ہیں۔ کیونکہ وہ صیہونیت کو بہت بڑا گناہ سمجھتے ہیں ان کی رائے میں یہودیوں نے ''منتخب لوگوں'' کا لقب آریاؤں سے چرایا ہے اب یہودیوں نے ارض مقدس پر ڈاکہ ڈالا ہے اور اسے چرالیا ہے حالانکہ اسے برطانوی عملداری میں ہونا چاہیے وہ سمجھتے ہیں کہ آخری دنوں کی جنگ مشرق وسطیٰ میں نہیں امریکہ میں ہوگی۔ وہ ایک نئی آفت، ایک نئے آشوب کی پیش گوئی کرتے ہیں جس کے ذریعہ گوری نسل اور امریکہ کا خاتمہ ہوجائے گا۔ وہ وفاقی حکومت پر آنے والی تباہی کی پیش بینی کرتے ہیں وفاقی حکومت کو وہ زوگ یعنی صیہونیوں کی مقبوضہ حکومت کہتے ہیں جس پر شیطان اور یہودی مسلط ہیں اور اس کا مقصد آریہ قوم کی تباہی ہے۔ ان میں سے بعض افراد نے شمال مغربی امریکہ کے دور دراز مقامات پر ملی ٹینٹ گروپ بنالئے ہیں جہاں وہ گولہ بارود اور اسلحہ جمع کرتے ہیں اور آخری جنگ کی تیاریاں کرتے ہیں کرسچین آئی ڈینٹٹی کی سرگرمیوں اور مقاصد کا اندازہ لگانا مشکل ہے وہ ایک تحریک نہیں بلکہ کئی تنظیموں کا مجموعہ ہے۔ ان کے اراکین کی تعداد زیادہ نہیں۔ اراکین زیادہ سے

زیادہ ایک لاکھ اور کم از کم پچاس ہزار ہوں گے مگر اس کے رجحانات پریشانی کا سبب ہیں بنیاد پرستوں کی طرح وہ بھی خوف اور نفرت کی وجہ سے دنیا سے کنارہ کر گئے ہیں مگر اسے تسخیر ضرور کرنا چاہتے ہین انتہا پسند بنیاد پرستوں کی طرح انہیں بھی ہر طرف اپنے خلاف سازش کا گمان رہتا ہے مگر انہوں نے اپنی فسطائی ذہنیت کی وجہ سے امریکی حکومت کے خلاف نفرت اور جدید زندگی سے کنارہ کشی میں بنیاد پرستوں کو پیچھے چھوڑ دیا ہے۔ انجیل کی ڈاکٹرین اور اس کے مسائل سے انہیں کوئی واسطہ نہیں۔ آئی ڈینٹٹی گروپ امریکہ میں اپنے لئے ایک الگ آریائی ریاست بنانا چاہتا ہے۔ کرسچین آئی ڈینٹٹی نے علیحدگی اور دہشت کا ایسا نظریہ تراشا ہے جس کی امریکہ کی تاریخ میں کوئی مثال نہیں۔ تشکیل نو کی طرح یہ آئی ڈینٹی گروپ بھی اس افسوسناک حقیقت کی طرف ایک واضح اشارہ ہے کہ مستقبل میں جس طرح لوگوں کی بے بسی، مایوسی اور بے چینی کے اظہار کے لئے مذہب کو ذریعہ بنایا جاسکتا ہے سیکولر اسٹیبلشمنٹ اور بڑے فرقے، بے شک سمجھیں کہ امریکہ میں بنیاد پرستی کا سورج ڈوب رہا ہے مگر بعض عیسائیوں کے خیال میں جنگ ابھی جاری ہے۔ فیڈرل حکومت تباہ ہونی چاہیے اور آویزش اکیسویں صدی میں جاری رہے گی۔

مذہب ختم نہیں ہوا بلکہ کہیں کہیں پہلے سے زیادہ ملی ٹینٹ ہو چکا ہے۔ تینوں توحید پرست معاشروں میں بنیاد پرستوں نے مذہب کو نجی معاملہ بنانے یا اسے دبانے کے خلاف سخت غم و غصہ کا اظہار کیا ہے اور بزعم خود اسے معدوم ہونے سے بچایا ہے۔ یہ جدوجہد بہت کٹھن رہی ہے اور اس کے دوران مذہب بعض دفعہ مسخ بھی ہوا ہے۔ شاید مذہب کی شکست کی طرف یہ ایک اشارہ ہو مگر بنیاد پرستی اب نئی دنیا کا حصہ بن چکی ہے۔ بنیاد پرستی اس بے کراں مایوسی، علیحدگی، بے چینی اور غیض و غضب کی ترجمان ہے جسے کوئی حکومت نظر انداز نہیں کر سکتی۔ اب تک بنیاد پرستی سے عہدہ برآء ہونے کی کوششیں زیادہ کامیاب نہیں ہوئیں۔ اس سلسلہ میں ماضی سے ہم جو سبق سیکھ سکتے ہیں ان سے مستقبل میں ہمیں بنیاد پرستی میں چھپے ہوئے خطرات سے نمٹنے میں مدد ملے گی۔

حرفِ آخر

ہم اس طرح مذہبی نہیں ہوسکتے جس طرح جدیدیت سے قبل قدامت پسند دور میں ہمارے بزرگ ہوا کرتے تھے۔ یہ وہ وقت تھا جب مذہب کے اساطیر، اس کی دیومالائیں اور مراسم زرعی تہذیب کی ناگزیر حدیں قبول کرنے میں لوگوں کی مدد کرتی تھیں۔ اب ہمارا رخ مستقبل کی طرف ہے اور ہم میں وہ لوگ جو جدید دنیا کے ریشنلزم کی پیداوار ہیں ان کے لئے روحانیت کے پرانے انداز سمجھنا آسان نہیں۔ ہم نیوٹن سے مختلف نہیں ہیں۔ مغرب میں وہ پہلا آدمی جو سائنسی روح سے سرشار تھا، مگر جس کے لئے مائتھالوجی کا سمجھنا ناممکن تھا۔ ہم روائتی مذہب کے کتنے ہی دلدادہ ہوں یہ ہمارا قدرتی رجحان ہے کہ ہم سچ کو واقعاتی، تاریخی، مشاہداتی اور تجرباتی اعتبار سے دیکھتے ہیں۔ اکثر لوگوں کا کہنا ہے کہ اگر مذہب کو سنجیدگی سے لینا ہے تو اس کی مائتھالوجی تاریخی ہونا چاہیے اور اس بھرپور انداز سے عملی دنیا میں قدم رکھنے کی اہلیت بھی ہونا چاہیے جس کی توقع اس سے جدید دنیا کو ہے جیسا کہ لوگوں کی بڑھتی ہوئی تعداد نے بالخصوص مغربی یورپ میں (جسے بیسویں صدی میں اس المیہ کا تجربہ ہوا ہے) مذہب کو ماننے سے انکار کیا ہے۔ جو لوگ سچ تک پہنچنے کا واحد ذریعہ استدلال، عقل وشعور کو سمجھتے ہیں ان کے لئے یہ ایک اصولی اور دیانتدارانہ پوزیشن ہے جیسا کہ سائنسدان سب سے پہلے اس بات پر زور دیں گے کہ ریشنل لوگوں کے لئے ایسے قطعی اور آخری معنی کے متعلق سوالات پر بات کرنا ممکن نہیں جو تجرباتی اور مشاہداتی انکوائری کی پہنچ سے باہر ہیں۔ ہماری صدی میں نسل کشی کی دہشت کا سامنا کرتے ہوئے عقل کے پاس کہنے کے لئے کچھ نہیں۔

اب جدید کلچر کے دل میں ایک خلاء ہے۔ جسے مغرب نے اپنے سائنسی انقلاب کے ابتدائی دور میں ہی محسوس کر لیا تھا۔ کائنات خالی ہونے کے ڈر سے پاسکل سہم گیا۔ ڈیکارٹ نے ایک ساکت و جامد کائنات کے اندر انسان کو ایک تنہا مستقل باشندہ پایا۔ ہوبس نے خدا کو دنیا سے دستبردار ہوتے دیکھا۔ نیٹشے نے اعلان کیا کہ خدا مر گیا ہے۔ انسانیت اپنی سمت کھو بیٹھی ہے۔ کچھ ایسے لوگ ہیں کہ مذہب کے نہ ہونے سے، اس کی ہمہ وقت پابندیوں سے نجات پا کر آزادی سے سانس لے رہے ہیں۔ سارتر کہ جس نے جدید انسانی ذہن پر خدا کے دیئے ہوئے گھاؤ کا اقرار کیا ہے یہ کہا ہے کہ خدا کے وجود سے انکار اب بھی ہمارا فرض ہے۔ کیونکہ اس نے ہماری آزادی سلب کی ہے۔ البرٹ کامیو کو یقین تھا کہ خدا کا انکار عورتوں اور مردوں کو اس قابل بنا دے گا کہ وہ اپنی تمام توجہ اور محبت بنی نوع انسان کے لئے وقف کر دیں۔ کچھ دوسرے لوگ ہیں جو روشن خیالی کے دور کے آئیڈیل پر بھروسہ کرتے ہوئے مستقبل کی طرف دیکھتے ہیں۔ انہیں اس وقت کا انتظار ہے جب انسان زیادہ ریشنل زیادہ حقیقت پسند اور روادار ہوگا۔ وہ ایک خیالی اور دور افتادہ خدا کے احترام کی بجائے ایک انسان، ایک فرد کی مقدس آزادی کا احترام کرے گا۔ انہوں نے روحانیت کی ایک سیکولر فارم تخلیق کی ہے جو ان کی بصیرت ان کی ماورائیت اور کیف و انبساط کا وسیلہ ہے اور انہوں نے دل و دماغ کے لئے اپنے نئے ڈسپلن وضع کئے ہیں۔

اس کے باوجود لوگوں کی ایک بڑی تعداد اب بھی مذہبی رہنا چاہتی ہے۔ اور انہوں نے مذہب کی نئی صورتیں وضع کرنے کی کوشش کی ہے۔ بنیاد پرستی بھی ان نئے مذہبی تجربات میں سے ایک تجربہ ہے۔ اور جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں اسے مذہب کو واپس بین الاقوامی ایجنڈے پر لانے میں ایک حد تک کامیابی ہوئی ہے۔ مگر بنیاد پرستی نے اس کی اکثر مقدس اقدار بعض اوقات نظر انداز کی ہیں۔ بنیاد پرستوں نے اپنے مذہب کی مائتھوس، لوگوس میں بدلی ہیں۔ یا تو یہ ضد کر کے کہ ان کے مذہبی عقائد سائنسی لحاظ سے درست ہیں یا اپنی پیچیدہ اور پہلودار مائتھالوجی سیدھے سادے نظریہ میں تبدیلی کر کے یہ کام کیا ہے۔ اس طرح انہوں نے ایک دوسرے کی تکمیل کرنے والے علم کے سرچشمے اور انداز آپس مین گڈ مڈ کر دیئے ہیں جنہیں جدیدیت سے قبل کی دنیا میں عام طور پر لوگوں نے الگ رکھنے کا دانش مندانہ فیصلہ کیا تھا۔ بنیاد پرستوں کا تجربہ اس قدامت پسندانہ بصیرت کی سچائی ظاہر کرتا ہے۔ یہ اصرار کر کے کہ عیسائیت کی سچائیاں واقعاتی

اور سائنسی لحاظ سے معتبر ہیں امریکی پروٹیسٹنٹ بنیاد پرستوں نے مذہب اور سائنس دونوں کو تماشہ بنادیا ہے۔ وہ یہودی اور مسلمان جنھوں نے سیکولرنظریات کی مسابقت میں اپنا مذہب استدلالی اور باقاعدہ طریقہ سے پیش کیا، انہوں نے بھی انتخاب کے بے رحمانہ عمل میں اپنی پوری روایت کومحض ایک نکتہ میں بند کرکے اسے مسخ کیا ہے۔ اس کے نتیجہ میں رواداری اپنائیت اور ہمدردی پرمبنی تعلیمات کی جگہ نفرت اور انتقام کے مذہب نے لے لی ہے۔ ایسے مواقع بھی آتے ہیں جب ایک معمولی اقلیت قتل کی اجازت اور آشیرواد مذہب سے لیتی ہے۔ ان بنیاد پرستوں کی ایک بڑی اکثریت بھی جو اس دہشت پسندی کے خلاف ہے ایسے لوگوں کی شدید مخالفت پر اتر آتی ہے جو اس کے خیالات سے متفق نہیں ہوتے۔

مگر بنیاد پرستوں کی تندی وتیزی سے خیال آتا ہے کہ ماڈرن کلچر بھی انسانوں سے انتہائی مشکل مطالبہ کرتا ہے۔ اس نے بے شک ہم پرنئی دنیاؤں کے دروازے کھولے ہیں۔ ہماری نظر میں وسعت اور گہرائی پیدا کی ہے اور ہم میں سے بہتوں کو اچھی اور پرمسرت زندگی گزارنے کے قابل بنایا ہے۔ اس کے باوجود اس نے ہماری خودنگری اور خودشناسی اکثر مجروح کی ہے۔ مگر اسی کے فیض سے دنیا کے متعلق ہمارے ریشنل اندازنظر نے ہمیں بتایا ہے کہ دنیا کی تمام رونق انسان کے دم سے ہے اور وہی ہر چیز کو ناپنے کا پیمانہ ہے اسی نے ہمیں مافوق الفطرت خدا کی محتاجی سے نجات دلائی ہے۔ اس نے ہماری کمزوری، عدم تحفظ اور بے وقعتی بھی آشکارا کی ہے۔ کوپرنیکس نے ہمیں کائنات کے مرکز سے بے دخل کردیا کانٹ نے کہا کہ ہمیں کبھی یہ یقین نہیں ہوتا کہ ہمارے خیالات ہمارے دماغوں سے باہر موجود کسی حقیقت سے ہم آہنگ ہیں۔ ڈارون نے ہمیں جانور قرار دیا فرائیڈ نے بتایا کہ مکمل طورر پر ریشنل مخلوق ہونا تو دور کی بات ہے انسان لاشعور کی طاقتوں، غیر ریشنل قوتوں کے رحم وکرم پر ہے جن تک رسائی بڑی مشکل کے ساتھ ہوسکتی ہے۔ اور یہ بات واقعی جدید تجربہ سے ثابت ہوچکی ہے۔ ریشنیلٹی یا حقیقت پسندی کو مسلک بنانے کے باوجود جدید تاریخ سیاسی انتقام کی کاروائیوں اور عالمی جنگوں سے بھری ہوئی ہے۔ اس واقعات کا عقل واستدلال سے کوئی واسطہ نہیں۔ سائیکی کی گہرائیوں میں اترنے کی اہلیت نہ ہونے کے باوجود (جو اہلیت کہ پرانے قدامت پسند مذہب کی دیو مالاؤں اور صوفیانہ ریاضتوں سے کبھی حاصل ہوتی تھی) لگتا ہے کہ عقل بعض اوقات ہماری اس بہادرنئی دنیا میں اپنے حواس گم دیتی ہے۔ بیسوی

صدی کے آخر میں لبرل اور روشن خیال طبقوں کا مفروضہ کہ انسانیت اور زیادہ روشن خیالی اور رواداری کی طرف بڑھ رہی ہے ایک ایسا خواب ہے جس کی کوئی تعبیر نہیں۔ کسی برتر دیومالائی صداقت کی پابندی کے بغیر عقل بعض اوقات ایک ظالم عفریت بن سکتی ہے۔ اوراس سے وہ جرائم سرزد ہوتے ہیں جو بنیاد پرستوں کے مظالم سے اگر بڑے نہیں تو انہی جیسے ہوتے ہیں۔

جدیدت کارآمد، فلاحی اور انسان دوست رہی ہے۔ مگر ابتدائی دور میں بالخصوص، اس نے ظالم بننے کی ضرورت بھی محسوس کی ہے۔ یہ بات ترقی پذیر ملکوں کے معاملہ میں خاص طور پر صحیح ہے، جنہوں نے مغربی کلچر کو جارحانہ، سامراجی اور اجنبی پایا تھا۔ مسلمان ملکوں میں جدیدیت کا عمل زیادہ مشکل اور زیادہ مختلف تھا۔ مغرب میں وہ ایجاد اور آزادی سے عبارت تھا۔ مگر مصر اور ایران میں نقالی اور محتاجی اس کے دامن گیر تھے۔ اوراس بات سے مسلم ریفارمر اور نظریہ ساز بخوبی واقف تھے۔ اسی وجہ سے ان ملکوں میں جدیدیت کی روش بدل گئی تھی۔ ناقص آلات غلط اجزا اور گندے انڈوں اچھا کیک نہیں بن سکتا اچھا کیک بنانے کے لئے ضروری ہے کہ مقامی تکنیک اور صحیح اجزاء سے کام لیا جائے۔ افغانی، عبدہ، شریعتی اور خمینی جیسے اسلامی رہنما یہی چاہتے تھے کہ زندگی میں آگے بڑھنے کے لئے مسلمان اپنی مہارت اور اپنے وسائل کام میں لائیں۔

مگر مغرب میں ان لوگوں کے لئے جنہوں نے مذہبی انداز میں سوچنا چھوڑ دیا ہے مذہب کی یہ نئی زندگی ناقابلِ فہم ہے۔ بالخصوص ایسی حالت میں جبکہ اس کا اظہار ظلم اور تشدد کے ذریعے ہوا ہو۔ جدید معاشرہ تیزی کے ساتھ مذہبی اور سیکولر ''دو الگ قوموں'' میں بٹ گیا ہے۔ دونوں ایک ہی ملک میں رہتے ہیں مگر ایک دوسرے کی بات نہیں سمجھتے یا مسائل کو ایک نقطۂ نظر سے نہیں دیکھتے۔ ایک کیمپ میں جو بات صحیح سمجھی جاتی ہے دوسرے کیمپ میں غلط قرار پاتی ہے۔ سیکولر اور مذہبی دونوں ایک دوسرے سے بری طرح خوفزدہ ہیں اور جب دونوں کے ورلڈ ویو میں تصادم ہوتا ہے۔ تو اجنبیت اور علیحدگی کا احساس اور بڑھ جاتا ہے۔ یہ ایک خطرناک صورتحال ہے۔ بنیاد پرستی ختم ہوتی نظر نہیں آتی۔ بعض مقامات پر وہ اور زیادہ زور پکڑ رہی ہے یا اس کی انتہا پسندی میں اور شدت آرہی ہے۔ اب لبرل اور سیکولر اسٹیبلشمنٹ کیا کر سکتی ہے؟ یہی کہ پل بنائے اور رابطوں کے ذریعے مستقبل کی لڑائیوں کے امکانات ختم کرے؟

جبر کرنا اور کچلنا کسی مسئلہ کا حل نہیں۔ ہمیشہ ان سے غلط نتائج لازمی طور پر سامنے آتے ہیں

اور بنیاد پرستوں کے علاوہ امکانی بنیاد پرستوں کو بھی انتہا پسندی کے راستہ پر ڈال دیتے ہیں امریکہ میں پروٹیسٹنٹ بنیاد پرست سکوپس مقدمہ میں اپنی ذلت اور توہین کے بعد اور زیادہ رجعت پسند اور زیادہ انتہا پسند ہو گئے۔ سُنی بنیاد پرستی کی بدترین شکل ناصر کے اسیری کیمپوں سے ابھری۔ اور شاہ کے ظلم و جبر نے اسلامی انقلاب کی راہ ہموار کی۔ بنیاد پرستی، جنگ کا راستہ ہے۔ بنیاد پرستوں کو ہمیشہ اپنی ہستی فنا ہونے کا خوف رہتا ہے۔ یہودی بنیاد پرست، صیہونی ہوں کہ الٹرا آرتھوڈوکس، آج بھی ہٹلر کے مظالم(Holocaust) یا یہود دشمن تباہی کے خوف سے لرزتے ہیں۔ سیکولرازم کے عمل کو جارحیت کی شکل میں دیکھنے والوں کی روحوں میں جبر نے گہرے گھاؤ لگائے ہیں اور ان کے مذہبی خیالات غلط راستہ پر ڈال کر انہیں غیر روادار اور پرتشدد بنا دیا ہے۔ بنیاد پرستوں کو سازش ہر طرف نظر آتی ہے اور کبھی کبھی تو وہ مجنونانہ غصے کی گرفت میں آ کر ہوش وحواس کھو دیتے ہیں۔

پھر بھی سیکولر اور پریگمیٹک مقاصد کے لئے بنیاد پرستی کا استعمال غلط نتائج کا حامل ہوتا ہے۔ سادات نے مصر کے مسلمانوں کو مطمئن کرنے کی کوشش کیں اور جماعت الاسلامیہ کے ساتھ اچھے تعلقات رکھے تا کہ اپنی حکومت کو جائز اور قانونی ثابت کر سکے اور اپنی طاقت وحکومت مستحکم کرے۔ اسرائیل نے حماس کی حمایت پہلے اس لئے کی کہ پی۔ایل۔او کی اہمیت کم کرے۔ دونوں صورتوں میں انہیں کنٹرول کرنے اور اپنی مرضی پر چلانے کی کوشش سیکولر سٹیٹ کے لیے مہلک ثابت ہوئی۔ لازم ہے کہ ان مذہبی تحریکوں کے زیادہ منصفانہ اور معروضی معنی متعین کئے جائیں۔

پہلے تو یہ مان لینا چاہئے کہ ان کی دینیات اور نظریات کی جڑیں خوف میں پیوست ہیں۔ مذہبی عقائد اور اصولوں کی نئی تعبیریں کرنا، رکاوٹیں کھڑی کرنا علیحدگی اور جدائی کی سرحدیں بنانا، اپنے رفقاء کو الگ محفوظ مقام پر رکھنا جہاں سختی کے ساتھ قانون کی حکمرانی ہو، یہ تمام خواہشات مٹ جانے کے خوف سے پیدا ہوتی ہیں۔ جس کی وجہ سے تمام بنیاد پرستوں کو ڈر ہے کہ سیکولر حلقے انہیں صفحۂ ہستی سے مٹا دینے پر تلے ہوئے ہیں۔ یہ نئی دنیا جو ایک لبرل کی نظر میں اتنی دلآویز و پرجوش ہے ایک بنیاد پرست کی رائے میں بے خدا بے معنی اور بے ثمر ہے۔ قبل از ہزاریہ یا پری میلینم کے وژن میں (جو جدیدیت کے بعض مثبت اداروں کو ابلیسانہ سمجھتا ہے) نسل کشی کے خواب بسے

ہوئے ہیں۔ اور اس کی نظر میں انسانیت ایک خوفناک انجام کی طرف بڑھ رہی ہے۔ یہ اس خوف اور مایوسی کا کھلا ثبوت ہے جو جدیدیت کی وجہ سے اکثر بنیاد پرستوں کے دلوں میں پیدا ہوئی۔ ہم نے ان کی اندھی انتہا پسندی دیکھی ہے جس سے ان کے عزائم کا پتہ چلتا ہے۔ ناممکن ہے کہ کسی دلیل کی مدد سے خوف دور کیا جائے یا جابرانہ طریقوں سے اسے ختم کیا جا سکے۔ زیادہ بہتر ہوگا کہ ہم اس مرض کی تہہ تک پہنچیں۔ چاہے کوئی لبرل یا سیکولر یہ منظر برداشت نہ کرے۔ یہ جاننا بھی ضروری ہے کہ یہ تحریکیں ماضی کی حقیر فرسودہ یادیں نہیں۔ وہ جدید ہیں اور لوگوں کو جدید بناتی ہیں۔ پروٹیسٹنٹ بنیاد پرست انجیل کو لفظی ریشنل طریقہ سے پڑھتے ہیں جو قبل از جدیدیت روحانیت کی زیادہ صوفیانہ اور مثالی اپروچ سے بالکل مختلف ہے۔ خمینی کی 'ولادت فقیہہ' کی تھیوری صدیوں پرانی شیعہ روایت کو انقلابی انداز میں نئے معنی دینے کے مترادف ہے۔ مسلم مفکرین نے آزادی کے اصول سکھائے۔ انہوں نے ایسے سامراج دشمن نظریات کو جنم دیا تو تیسری دنیا کی عصری تحریکوں کے تصورات سے ہم آہنگ تھے۔ الٹرا آرتھوڈوکس یہودیوں نے بھی (جنہوں نے جدید معاشرہ سختی کے ساتھ منہ موڑ لیا تھا) دیکھا کہ ان کے مدرسے بھی بنیادی طور پر جدید اور رضا کارانہ ادارے تھے۔ انہوں نے تورات پر عمل کرنے میں پہلے سے کہیں زیادہ سختی سے کام لیا تھا۔ اور سیاسی نظام سے فائدہ اٹھانا اسی طرح سیکھا کہ مذہبی یہودیوں کے مقابلہ میں زیادہ طاقت حاصل کر لی جس کا سلسلہ تقریباً دو ہزار سال تک جاری رہا۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ مذہب نے جدیدیت اختیار کرنے میں لوگوں کی مدد کی ہے۔ شبیتانی ازم، کوئیکر ازم، میتھڈ ازم اور اسلامی تصوف نے یہودیوں، عیسائیوں اور مسلمانوں کو بڑی تبدیلیوں کے لئے تیار کیا ہے اور ایسا ذریعہ مہیا کیا ہے جس کی مدد سے وہ نئے خیالات تک پہنچ سکیں۔ امریکی جن کے پاس اپنے جمہوریہ کے بانی رہنماؤں کی خدا پرستی کے لئے وقت نہیں تھا وہ عظیم بیداری (Great Awakening) کے سائے میں جدوجہد کے لئے تیار تھے۔ مسلمانوں نے بھی اپنی روحانیت کی زندگی اور حرکت کے زور پر سیاست اور مذہب کی علیحدگی کے ماڈرن آئیڈیل اپنا لئے تھے۔ دراصل یورپ میں بھی پہلے پہل سیکولرازم اور سائنسی ریشنلٹی دونوں مذہبی ہونے کے طریقے سمجھے جاتے تھے۔ بعض نئی تحریکیں، (جن کا جائزہ ہم لے چکے ہیں) بھی جدیدیت کی طرف مائل کرنے والی تحریکیں رہی ہیں۔ حسن البنا، شریعتی بلکہ خمینی بھی، سبھی مسلمانوں کو جدیدیت کی طرف لے جانا چاہتے تھے مگر

اس کے لئے وہ اپنا اسلامی پس منظر لازمی سمجھتے تھے کیونکہ وہ مغرب سے درآمد شدہ نظریات کی نسبت اس پس منظر سے زیادہ مانوس تھے۔ بس اسی طرح وہ خود شناسی کے اہل ہو سکتے تھے اور ان کی مدد کر سکتے تھے جو جدیدیت کے عمل سے نمائندہ اور جمہوری حکومت جیسے اداروں کی اہمیت ثابت کرنے کے لئے مجبوراً باہر رہ گئے تھے۔ یہ جدیدیت کو روحانیت کے مدار میں تلاش کرنے کی ایک اور کوشش بھی تھی۔ قبل از جدیدیت مذہب ہمیشہ مائیتھوس اور لوگوس کو ایک دوسرے کا معاون سمجھتا تھا۔ اسلامی مصلحین نے حکومت کے واقعیت پسندانہ فرائض کو ہمیشہ مذہب اور تصوف کی حدود کے اندر رکھا تھا۔

یہ بھی سیکولرازم کی اجارہ داری کے خلاف بنیاد پرستوں کی بغاوت کا حصہ تھا۔ یہ خدا کو سیاسی میدان میں واپس لانے کا ایک طریقہ تھا جہاں سے اسے نکال دیا گیا تھا۔ کئی طریقوں سے بنیاد پرستوں نے جدیدیت کے ذریعہ ہونے والی علیحدگیوں (چرچ اور ریاست میں علیحدگی سیکولر اور مذہب میں علیحدگی) کو ماننے سے انکار کیا ہے، اور کھوئی ہوئی وحدت کو از سر نو بحال کرنے کی کوشش کی ہے۔ مذہبی صیہونی، سیکولر صیہونیوں کی بغاوت کے خلاف بغاوت کر رہے تھے۔ جنہوں نے مذہب سے اپنی بے تعلقی اور آزادی کا اعلان کر دیا تھا۔ وہ دیاڈسپورا (جلاوطنی) کی نسبت ارض مقدس میں تورات اور خدا کی زیادہ حاکمیت چاہتے تھے۔ شریعتی اور خمینی دونوں کا اصرار تھا کہ مذہب کو سیاست سے الگ کرنا ناممکن ہے۔ قطب نے مصر میں سیکولر حکومت کی خدا سے بیگانگی کی مذمت کی تھی۔ جنہوں نے جدیدیت کی سیکولر حقیقت پسندی پوری طرح جذب نہیں کی تھی وہ اب بھی زندگی کے ان دیکھے پہلوؤں سے آگاہ تھے اور اس کی جھلک طرز حکومت میں دیکھنا چاہتے تھے۔ ایسا کرنے سے ان کے ماڈرن ہونے میں کیا کمی آتی ہے یہ بات ان کی سمجھ سے باہر تھی۔ جبکہ وہ اچھی طرح یہ جانتے تھے کہ اس کا مطلب دور جدید سے قبل کے مذہب کے بعض پرانے قدامت پسندانہ پہلوؤں سے رشتہ توڑنا ہے۔ بنیاد پرستوں کی مذہبی اصلاح کا مطلب ایسا ایکٹوازم (سرگرمی) ہے جسے اب تک غیر مذہبی سمجھا گیا مگر اسے ناگزیر کہا جاتا ہے۔ مذہبی صیہونی بنیاد پرست عیسائی اور مسلمان سب ایسی انقلابی تبدیلیوں پر مصر ہیں جن کی مدد سے جدید سوسائٹی کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر چلنا ممکن ہو۔ خدا کے نام پر جنگ کا مقصد ایک ایسے معاشرہ کے دل میں موجود خلاء کو بھرنا ہے جس کی بنیاد سائنسی ریشنلزم پر تھی۔ اچھا ہوتا اگر

بنیاد پرستوں کو برا بھلا کہنے کی بجائے سیکولر اسٹیبلشمنٹ نے ان کے کسی مخالف کلچر نظریہ پر گہری نظر ڈالی ہوتی۔ شکری مصطفیٰ کی کمیون، سادات کی کھلا دروازہ پالیسی کا مخالف امیج تھا۔ اخوان المسلمین کے فلاحی مراکز اور جماعت الاسلامیہ کے عملی اقدام، غریبوں کے ان مسائل سے حکومت کی مجرمانہ غفلت کی تلافی تھی جنہیں اسلام نے زبردست اہمیت دی ہے۔

ان تحریکوں کی طاقت اور مقبولیت سے اندازہ ہوتا ہے کہ مصر کے لوگ سیکولر رجحان کے باوجود مذہبی ہی رہنا چاہتے ہیں۔ ایران میں خمینی کے مسلک نے یہی کیا۔ شاہ کے خلاف محاذ آرائی میں اضافہ کے ساتھ ساتھ خمینی نے ائمہ کی اکثر خوبیاں اپنا کر اپنی شخصیت کو شاہ کی آمرانہ شخصیت کا شیعی متبادل بنایا جو اکثر ایرانیوں کے لئے نہایت پرکشش تھی۔ اسی طرح یہودیوں کے یشیوا نے سیکولرسٹ تعلیم کے پریگمیٹک انداز کے خلاف ایک تضاد مہیا کیا یہ تعلیم ایسی سوسائٹی میں دی جاتی تھی جس نے خدا اور اس کا قانون زندگی سے نکال دیئے تھے۔ یشیوا کے طلباء کی تعلیم کا اصل مقصد خدا کی تلاش تھی وہ محض مفید معلومات حاصل کرنا نہیں چاہتے تھے۔ انہوں نے ہمیشہ سے زیادہ تورات کی تعلیم کو اپنی زندگی کا مرکز بنایا۔ یہ متبادل معاشرے بناتے ہوئے بنیاد پرست ایک ایسے کلچر سے اپنی مایوسی کا اظہار کرتے تھے جس میں روحانیت کے لئے کوئی جگہ نہیں تھی۔

معاشرے کا تقدس بحال کرنے کی مہم اتنی جنگجویانہ تھی کہ جارحیت کی صورت اختیار کر گئی اور مسخ ہوگئی۔ یہ مہم اس عالمگیر ہمدردی سے محروم ہے جس کا ہونا تمام مذاہب، مذہبی زندگی کے لئے لازمی سمجھتے ہیں۔ اس کے برعکس اس نے علیحدگی کی، نفرت اور غصہ بلکہ تشدد کی آئیڈیالوجی کا پرچار کیا۔ مگر غصہ پر بنیاد پرستوں کی اجارہ داری نہیں تھی۔ ان کی تحریکوں نے اکثر ایک جارحانہ سیکولرازم کے ساتھ جدلیاتی رشتہ قائم کیا جس کی نظر میں مذہب اور اسے ماننے والوں کی شاید ہی کوئی عزت تھی۔ سیکولرسٹ اور بنیاد پرست اشتعال اور الزام و جواب الزام کے گرداب میں پھنسے رہے۔ اگر اب بھی بنیاد پرست اپنی مذہبی روایات کا خیال کرتے ہوئے اپنے دشمنوں کا نقطۂ نظر بہتر طور پر سمجھیں تو سیکولر حلقے بھی رواداری، وسیع نظری، کشادہ دلی اور انسان دوستی کی اقدار کا زیادہ احترام کریں گے کہ یہ اقدار ماڈرن کلچر کی روح رواں ہیں۔ وہ ان خدشات، اضطراب اور تقاضوں پر ہمدردانہ توجہ دیں، جن کا سامنا ان کے کتنے ہی ہم نفس بنیاد پرستوں کو کرنا پڑتا ہے اور جنہیں کوئی معاشرہ آسانی سے نظر انداز نہیں کرسکتا۔